یکے از مطبوعاتِ مجلسِ ترقی ادب لاہور

تشکیلِ انسانیت

از

رابرٹ بریفالٹ

مترجمہ

عبدالمجید سالک

مجلسِ ترقی اَدَب، ۲ نرسنگھ داس گارڈن کلب روڈ، لاہور

ناشر

کریم احمد خاں معتمد مجلس ترقی ادب ، لاہور

مطبع

دین محمدی پریس سرکلر روڈ، لاہور

زیرِ اہتمام ملک محمد عارف

باجازت و شُکریہ

میسرز جارج ایلن واتون لمیٹڈ ، لندن

With the kind permission of and thanks to
Messrs George Allen and Unwin Ltd. London.

قیمت :- پانچ روپے

فہرست

حصہ اوّل

ارتقائے انسانی کے ذرائع اور وظائف

حصّہ دوم

تہذیب یورپ کا شجرۂ نسب

حصّہ سوم

نظامِ اخلاق کا ارتقا

حصّہ چہارم

یوٹوپیا (خیالی دُنیا) کی تمہید

چند اشارات!

اس کتاب کا مصنف رابرٹ بریفالٹ ۱۸۷۶ء میں بمقام لندن پیدا ہوا۔ اور ۱۱۔ دسمبر ۱۹۴۸ء کو وفات پائی۔ انگلستان کا بہت بڑا ماہر علم الانسان تاریخ کا فلسفی اور ناول نگار تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس نے لندن میں تعلیم حاصل کی۔ اور صرف اٹھارہ سال کی عمر میں ایم بی ایس کی ڈگری لے کر ۱۸۹۶ء میں نیوزی لینڈ چلا گیا۔ وہاں اس نے پریکٹس شروع کر دی۔ اور نیوزی لینڈ انسٹی ٹیوٹ کی آک لینڈ برانچ کا صدر منتخب ہو گیا۔ جس کے رسالے میں ڈاکٹری کے متعلق ایک سلسلۂ مقالات لکھا۔ پہلی جنگ عظیم چھڑ جانے پر فوج میں بھرتی ہوا۔ اور فرانس۔ فلینڈرز اور گیلی پولی میں خدمات انجام دے کر "ملٹری کراس" کا اعزاز حاصل کیا۔ جنگ کے بعد واپس انگلستان آیا۔ اور ڈاکٹری پریکٹس ترک کر کے اقتصادی و عمرانیاتی مسائل پر لکھنا پڑھنا شروع کر دیا۔

رابرٹ بریفالٹ نے نفسیاتی زاویۂ نگاہ سے علم الانسان کے متعلق اپنے نظریات متعدد کتابوں میں بیان کئے۔ اس کی کتاب "مدرز" (امہات) تین جلدوں میں اس سلسلے کی نہایت عالی پایہ کتاب سمجھی جاتی ہے جس میں احتسابات و ادارات کے ماخذوں پر ناقدانہ تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس کی کتاب "میکنگ آف ہیومینیٹی" جس کا اردو ترجمہ "تشکیل انسانیت" کے نام سے پیش کیا جا رہا ہے۔ ایشیا اور یورپ میں یکساں مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے ارتقائے انسانی پر معاشری علم الانسان کے نقطۂ نگاہ سے غور کیا ہے۔ اور اس کے مدارج پر عالمانہ و ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔ قدیم ترین انسانی معاشروں سے لے کر زمانۂ حال کی تنظیمات تک کا تدریجی ارتقا کا بیان کیا ہے۔ عقلی فکر۔ رواجی فکر اور فوقی فکر کے کارناموں اور ان کے باہمی تصادمات و تعاملات کو واضح کرنے کے بعد یورپ کی موجودہ تہذیب و ثقافت کے ماخذوں اور سرچشموں کا سراغ لگایا ہے۔ اور بتایا ہے کہ اس تہذیب نے کس طرح مشرق اور اس کے بعد یونان و روما سے فیضان حاصل کیا۔ اور پھر عربوں نے یورپ کی "ولادت نو" میں کتنا بڑا پارٹ ادا کیا۔

مصنّف نے اسلام کے تہذیبی۔ ثقافتی اور علمی اثرات کا جس عالمانہ و فراخ دلانہ دیانت سے اعتراف کیا ہے۔ وہ اس کے خالص علمی نقطۂ نظر کا پتہ دیتا ہے۔

حصّہ سوم میں نظام اخلاق کے ارتقاء کے مختلف پہلوؤں پر غور و فکر کرنے کے بعد جن نتائج کا استخراج کیا ہے۔ اس سے کسی صحیح الفکر انسان کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ یہی وہ مطالعہ و تحقیق کی صحت مندی ہے جس کی وجہ سے مناسب سمجھا گیا۔ کہ اس کتاب کا اردو میں ترجمہ کر دیا جائے تاکہ ہمارے پڑھنے والوں کے سامنے فکر و نظر کی نئی راہیں کھلیں۔ اور وہ بھی مسائل و واقعات کو ان کی صحیح روشنی میں دیکھ سکیں۔

کسی زمانے میں ترجمے کے متعلق اہل علم کا خیال یہ تھا۔ کہ مترجم کو مصنّف کا ایک پیراگراف پڑھ کر اس کے مطالب کو اپنے الفاظ میں بیان کر دینے چاہئیں۔ اور پھر اسی طرح دوسرے پیراگراف کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ ترجمے کا یہ طریق ناولوں اور افسانوں میں تو شاید کام دے جائے۔ لیکن میرا عقیدہ یہ ہے۔ کہ علمی کتابوں کے ترجمے کے لئے نہایت ناموزوں ہے۔ علمی کارناموں کا ترجمہ کرتے وقت مصنّف کے الفاظ کو نہایت احتیاط سے ملحوظ خاطر رکھنا چاہئے۔ اور جہاں تک ہو سکے لفظی ترجمہ کرنا چاہئے۔ تاکہ مصنّف کے مطالب و مفاہیم کو ذرا سا صدمہ بھی نہ پہنچنے پائے۔ چونکہ اب اردو زبان ہر قسم کے علمی مطالب اور ہر نوع کے اسالیبِ اظہار و بیان پر قادر ہو چکی ہے۔ اس لئے میرا تجربہ یہ ہے۔ کہ اس میں علمی مطالب کو بعینہٖ منتقل کرنے میں نہ کوئی دقت ہوتی ہے۔ نہ محاورۂ اردو کو کوئی ضرر پہنچتا ہے۔ چونکہ رابرٹ بریفالٹ کا اندازِ تحریر عالمانہ اور مشکل ہے۔ اور اچھے انگریزی دانوں کو بھی اس کے مطالب پر حاوی ہونے میں کسی قدر تکلّف ہوتا ہے۔ اس لئے اُردو ترجمہ پڑھنے والوں کو بھی اس کتاب کا مطالعہ خاص توجہ سے کرنا ہو گا۔ گو میں نے اپنی طرف سے سُلجھاؤ پیدا کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔

مجھے امید ہے۔ کہ اہل علم میری اس حقیر کوشش کی قدر کریں گے۔

مسلم ٹاؤن لاہور
یکم ستمبر ۱۹۵۸ء

عبدالمجید سالک

تشکیلِ انسانیت

پہلا باب

ترقی، حقیقت اور قدر کی حیثیت سے

(۱)

انسان کا اکتشاف

انیسویں صدی کے ذہنی انقلاب نے تاریخِ انسانی کے متعلق ہمارے تصورات کو بالکل اسی طرح متغیر کر دیا ہے جس طرح سترھویں صدی کے ذہنی انقلاب نے آفاقی کائنات کے متعلق ہمارے افکار کو بدل دیا تھا۔ بطلیموسی دنیا کی مانند نسلِ انسانی کی رفتارِ زندگی کے متعلق ہمارے تصورات نہایت بے حقیقت اور ادنیٰ اور ناقص تھے۔ ہماری آفرینش کی اولین حد ۴۰۰۴ سنہ قبل مسیح تسلیم کر لی گئی تھی۔ اور اس تاریخ تک پہنچنے سے بہت پہلے تاریخ کی "روایاتی داستان" اپنی ابتدائی کہانی کی طرح زیادہ تر نسلی، خاندانی اور مذہبی تعظیم و تکریم سے تعلق رکھتی تھی۔ اور خالص افسانوی صنمیاتی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔ پھر جس طرح سائنس کے بیدار کن علم نے

کائنات کے متعلق بے حقیقت نظریات کے گنبدوں کو توڑ کر اُن آفتاب افروز لامحدود خلاؤں کا انکشاف کیا۔ جن میں ہماری لرزتی ہوئی زمین رواں دواں ہے۔ اسی طرح اس کی درخشاں ترقی سے افسانوں کی دھند بھی چھٹ گئی۔ اور ہمیں موقع دیا گیا کہ ہم انسان کی طول طویل اور حیرت انگیز رفتار ترقی کو اُس کے طبعی و قدرتی منظر اور زمانے میں دیکھ سکیں۔ وہ ازمنہ جو کبھی داستانوں اور افسانوں کے جنات اور عفریتوں سے آباد تھے۔ اب اُن قوموں کی گزرگاہ نظر آنے لگے جنھوں نے ہماری ثقافت کی تعمیر میں حصہ لیا تھا۔ یورپا دیوی کریٹ کی دو شاخہ سروں والی کشتیوں پر سوار چلی آرہی تھی۔ جو سرزمین نیل اور سواحل ایجہ سے اٹلی اور ہسپانیہ کی طرف درمیانی سمندر کو طے کر رہی تھیں۔ گدھوں کے گھنٹیاں بجاتے ہوئے کارواں دو دریاؤں کی سرزمین سے ثقافت کے ساز و سامان لے کر سر پر چوٹیاں رکھنے والے ہتیوں کی سرزمین سے یوکسین اور فریجیا تک پہنچ رہے تھے۔ اور یہ ثقافت تخلیق عالم کی اس تاریخ سے بہت پہلے وجود میں آچکی تھی۔ جو آرچ بشپ آشر نے مقرر کی تھی۔ اس ثقافت کے کشمیر پہنچنے سے دس ہزار برس پیشتر ہم دیکھتے ہیں کہ میگڈلینیا کے باشندے اپنے مندروں کے غاروں کو مشجروں اور کتبوں سے آراستہ کر رہے تھے۔ اور حیوانات کے مصنوعی چہرے پہن کر اپنے رسوم میں رقص کر رہے تھے۔ اور یہ چہرے اسی قسم کے تھے جو ایٹک کی دوشیزائیں "آرٹیمس برورونیا" کے معبد میں پہننے والی تھیں۔ اور وہ جن کے عجیب و غریب دہانوں سے ایسکیلیس کے گیتوں کے ٹپے گاتے جانے والے تھے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ آخری برفانی زمانے کی یہ وحشیانہ ثقافت بھی ایک پکے ہوئے پھل کی طرح تھی۔ جو لاکھوں برس کی درجہ بدرجہ اور مرحلہ بہ مرحلہ ترقی کے بعد پیدا ہوا تھا اور یہ اعصار و ازمنہ کا تسلسل بھی خلائے فلکیاتی کے فاصلوں کی طرح ہمارے تخیل کی استطاعت سے باہر ہے۔

جب زمان و مکان کی اس وسیع فراخی کا تصور کیا جاتا ہے۔ تو ہمارا پورا

منظر بلکہ خود تاریخ کے معنی تک بدل جاتے ہیں۔ کرۂ ارض کو کائنات کا مرکز قرار دینے کے متعلق جو نظریہ تھا۔ اُس میں بھی ہمارا تصوّر محض غیر صحیح ہی نہ تھا بلکہ حقیقت سے بالکل اُلٹ تھا۔ نسلِ انسانی کی رفتارِ زندگی کے متعلق تصور یہ تھا کہ اس میں مسلسل انحطاط پیدا ہو رہا ہے۔ وحشی انسان جن کو قدیم انسانیت کی وحشت و بربریت کے نمایندے سمجھنا چاہیے تھا۔ اُن شریف و نجیب اور مہذّب قوموں کے مورث سمجھے گئے۔ جو فطرتِ انسانی کے کسی ناگزیر قانون کے ماتحت زوال و انحطاط کی گہرائیوں میں غرق ہو گئیں۔ ماضی کو گم گشتہ نیکی اور دانش کا خزینہ سمجھ لیا گیا۔ اور بے حقیقت حال کے مقابلے میں اس کو محض قدامت کی وجہ سے فوقیت و برتری دی گئی۔ غرض علم تاریخ کا سب سے بڑا وظیفہ یہ قرار پایا کہ ہم اپنے دُور دراز کے قدیم بزرگوں کی خوبیوں کو بڑھ چڑھا کر ایک زوال پذیر زمانے کے سامنے بطور مثال پیش کریں۔

ابھی صرف ایک یا دو نسلیں ہی گزری ہیں کہ اس قسم کے عجیب و غریب خیالات نامقبول ہونے لگے ہیں۔ اور ابھی اس جد و جہد کا غبار اُڑ ہی رہا ہے۔ پوری طرح بیٹھا نہیں۔ چنانچہ سر ایڈورڈ ٹائلر نے اپنی مشہور کتاب "قدیم ثقافت"[1] میں "نظریۂ انحطاط" کی تردید پر بڑی محنت کی ہے۔ اور ایک طول طویل باب اس کے لئے مخصوص کر دیا ہے۔ اس میں سر ایڈورڈ نے اپنے خیالات کی حمایت میں ممتاز معاصرین کی تحریروں سے طویل اور گرما گرم فقرے نقل کئے ہیں۔ اور "مفروضہ ترقی" کے نظریہ پر شدید حملے کئے ہیں۔ ٹائلر کی یہ کتاب ۱۸۷۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ گزشتہ صدی کے واجب الاحترام اور بیباک ترین مفکرین میں کارلائل کا نام بہت نمایاں ہے۔ اُس نے بھی تمام مخلص اور فیاض انسانوں کی طرح جب دنیائے حاضر کے عیبوں اور حماقتوں کو دیکھا۔ تو زمانہ حال کے لوگوں کے لئے اس سے زیادہ بلند نصب العین پیش نہ کر سکے۔ کہ وہ ماضی کے طور طریقوں کی نقل و تقلید کریں۔ اور لطف یہ ہے

[1] Primitive Culture

کہ جس زمانے کو اُس نے قابلِ تقلید نمونے کے طور پر منتخب کیا۔ وہ تیرھویں صدی تھی! ترقی کا خیال اور نوعِ انسانی کو مکمل بنانے کا تصور کارلائل کے نزدیک ہمیشہ طنز و استہزا کا نشانہ بنا رہا۔

زمانۂ حال میں لوگ جان گئے ہیں کہ دُنیا نے انسانی بربریت اور حیوانیت سے ترقی پاکر اپنے موجودہ مرتبے پر پہنچی ہے۔ اور اس کے طلوع کا نور شجاعت و نجابت کے ادوار پر روشنی نہیں ڈالتا۔ بلکہ ایسے ایسے کابوس پیش کرتا ہے جن کے تصور سے ہم اپنی نیند میں چیخ مار کر بیدار ہو جائیں۔ مدت دراز تک ہمارے مورث ایسے وحشی تھے۔ جو قدیم نسلوں سے بھی زیادہ وحشی اور اُجڈ اور ظالم تھے جن کے بعض نمونے اب بھی باقی ہیں۔ گو تیزی سے غائب ہو رہے ہیں۔ انسان کی زندگی ہابز کے قول کے مطابق "بے حقیقت۔ قابلِ نفرت۔ وحشیانہ اور کوتاہ تھی۔ ثقافت کے اولین لڑکھڑاتے ہوئے قدم بھی اتنی طویل مدت کے دوران میں اُٹھائے گئے۔ جن کے سامنے تاریخ اور ازمنہ کا تصور بالکل بے حقیقت معلوم ہوتا ہے۔ آگ۔ مویشیوں کی گلہ بانی۔ پارچہ بافی۔ ظروف سازی۔ کاشتکاری۔ دھاتوں کی دریافت۔ گھوڑوں کی سدھائی اور نہایت طاقتور اور حوصلہ مند لوگوں کے ساتھ جہازوں میں سوار ہو کر سمندر میں جانا۔ یہ نہایت "زلزلہ افگن" ایجادات و انکشافات تھے۔ جنھوں نے ہزارہا سال کے وقفوں سے انسانیت کو حرکت دی۔ اور اس کو وحشت و قدامت سے ایک قدم آگے بڑھایا۔ یہ حیرت انگیز انقلابات، گزشتہ چند لاکھ برس کی مدت میں رونما ہوئے ہیں۔ نسلِ انسانی اپنے وجود کے زیادہ تر حصے میں دوسرے حیوانوں کے گلوں کی طرح بن جتی زمین پر آوارہ پھرتی رہی ہے۔ اس کا طرزِ زندگی حیوانوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھا۔ اور وہ بھی ضروریات۔ آب و ہوا۔ سردی۔ قحط یا بارش وغیرہ سے حیوانوں ہی کی طرح متاثر ہوتی تھی۔ انسان کی ذہنیت بھی بنیادی طور پر حیوان سے مختلف نہ تھی۔ فکر کی پہلی اور دھندلی جھلکیاں اس کی اعانت کرنے کے ساتھ اس کو پریشان

بھی کرتی تھیں۔ انسان بھی انہی جذبات و محرکات سے متاثر ہوتا تھا جو حیوانوں کے شامل حال تھے۔ اور جن پر وہ مبہم طور پر فضیلت حاصل کر رہا تھا۔

انسانی ترقی کا خیال مختلف ادوار کے فکر میں کہیں کہیں دھندلا سا ضرور دکھائی دیتا ہے۔ اٹھارھویں صدی میں عقائد کے جوش و خروش کا جو تصور سامنے آیا۔ گلوٹین کے پھل کے عین نیچے ایک Condorcet کا ایمان۔ ان چیزوں کا اعلان اسی مجرد اور تخیلی رنگ میں ہوا جس سے "قدیم معاشرے" کی خیالی تصویریں سامنے آجاتی تھیں۔ اب یہ سب کچھ فلسفیانہ نظریات اور مذہبی دعاوی کے دائرے سے نکل کر سائینسی تصریح کی حد میں منتقل ہو چکا ہے۔ حیاتیات اور ارضیات کے مجموعی نتائج سے۔ ماضی کی تحقیقِ آثارِ قدیمہ سے قبل تاریخ کی اور انسانیات کی تحقیق سے نظریۂ قیاس کا عقیدہ پیدا ہوا (گو اس کی دریافتوں کے خلاف ہزار تعریض و تشنیع ہو) جس نے ایک مرئی حقیقت پیش کر دی۔ یہ حقیقت کسی اور عقیدے یا ایمان کا اظہار نہ تھا بلکہ بجائے خود ایک نئے عقیدے اور محرکِ عمل کی حیثیت رکھتی تھی۔

پہلے پہل تو انسان کے ماخذ اور اس کی ابتدا کے متعلق انکشاف پر چھوٹی شرم کا لرزہ طاری ہوا جیسا کہ عام طور پر ایسے حالات میں ہوتا ہی ہے لیکن اس کے بعد حیرت و انبساط اور عمل انگیز امید کا احساس پیدا ہو گیا ہم دیکھتے ہیں کہ نسلِ انسانی نے اپنے ادنیٰ اور پست وجود سے آگے بڑھ کر مسلسل اور حیرت انگیز نشو و نما کی منزلیں طے کیں۔ اور اگرچہ ہمارے موجودہ معیاروں کے مطابق اس میں بہت طویل مدت صرف ہوئی لیکن حقیقت میں حیوانی زندگی کے ارتقائے ماقبل کے مقابلے میں یہ بہت سریع اور نتیجہ خیز رفتار رکھتی۔ آج کل کی پوری انسانی دنیا۔ اس کے عجائبات اور اس کی طاقتیں۔ اس کی خوبیاں (اور اس کے نقائص) اسی ارتقا کی پیداوار ہیں۔ اس کے عناصر ایک ہی جست میں ظاہر نہیں ہوئے انسان نے ان کو کسی دوسرے کرے سے حاصل نہیں کیا۔ نہ وہ اس دنیا کا جزو

لائیفک ہی تھے جس میں انسان پیدا ہوا تھا بلکہ ان تمام عناصر کو انسان نے نہایت حقیر سی ابتدا سے آہستہ آہستہ ترقی دے کر پیدا کیا ہے۔ اور چونکہ یہ تمام انسانی اشیا و عناصر خود انسان ہی کے بنائے ہوئے ہیں۔ اور چونکہ ہماری دُنیا نہایت قدیم اور نہایت اجڈ قسم کے انسانی معاشروں سے ترقی پا کر بنی ہے اور اس ترقی کا ہر قدم انسانی سعی۔ انسانی محنت اور انسانی ہمت کا ثمرہ ہے۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ اس ترقی کا ایک ایک انچ دہشت و بربریت کی تاریکیوں میں سے انسان ہی نے طے کیا ہے۔ اور اس رفتار میں اُس نے وہ وہ تکلیفیں اُٹھائی ہیں اور مشکلات کے ایسے ایسے پہاڑ کاٹے ہیں جن کی وسعت اور خوفناکی کا اندازہ نہایت عمیق تجزیہ ہی سے کیا جا سکتا ہے۔

"انسان بندروں کی اولاد ہے" یہ فقرہ پہلے زمانے میں اور بعض حلقوں میں اب بھی قانون ارتقا کے خلاف تحقیر و استہزا کے قہقہوں کا باعث رہا ہے۔ یہ گویا زندگی کے ایک بنیادی قانون کا سطحی بیان تھا جو نیم خواندہ عوام تک پہنچ گیا اور انھوں نے اس کو بیہودگی کی حد تک پہنچا دیا لیکن اس سے آکسفرڈ کے پادریوں کو ایک ہتھیار ہاتھ آگیا جس سے وہ ہر علمی انکشاف کو استہزا سے قتل کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ یہاں تک کہ اس عقیدے کے سرگرم ترین حامی یہ دیکھ کر پریشان ہو جاتے تھے۔ کہ اس کو بیان کرتے وقت ہر شخص خندۂ دندان نما سے کام لیتا تھا یا کم از کم آنکھ ضرور مار دیتا تھا سچ ہے۔ کون سا شخص بندروں کو اپنا مورث بیان کریگا۔ اور پھر اپنی متانت کو بھی قائم رکھے گا۔ لہٰذا ہمارا فرض یہ ہے۔ کہ اس مسئلے کو بیان کرتے وقت عذر و معذرت۔ الفاظ کے ہیر پھیر اور حُسنِ بیان سے اُس کی ناگواری کو کم کرنے کی کوشش کریں"۔ انسان ہرگز بندروں کی اولاد نہیں ہے۔ کم از کم اُن بندروں کی اولاد تو یقیناً نہیں جو آج کل موجود ہیں۔ بلکہ میمونی نوعیت کے اُن مورثوں سے ہے۔ جو اب معدوم ہو چکے ہیں۔ انسان کسی بُوزنے کا وارث نہیں بلکہ کسی آدم نما جانور کی اولاد ہے۔ جو آج کل کے بعض حیوانات اند زندہ

انسانوں کا مشترک مورث ہے"! یہ حقیقت ہے خواہ کتنی ہی ناگوار۔ بدنما اور کاواک ہو۔ یہ ثمرے ہیں علوم مادی کے۔ کہ ہر قسم کے شعور۔ جذبے کو خاک میں ملا دیتے ہیں خیر تفنّن برطرف۔ اگر بالکل سچ پوچھئے۔ تو معلومات حاصلہ کی پوری کائنات میں اس ناگوار و بدنما" حقیقت سے زیادہ واجب الاحترام اور عظیم الشان حقیقت کوئی نہیں۔ نہ کائنات کے حیرت انگیز عجائبات۔ نہ ستاروں والے آسمان۔ نہ ضمیر انسانی بستاروں والا آسمان۔ جو انسانی وقار و تمکنت پر جذبات سے معرا سائینس کی دوسری وحشیانہ ضرب ہے۔ کیا ہے؟ صرف بڑا ہے۔ اور اس کے ستارے بھی بڑے ہیں ضمیر کیا ہے؟ اگر یہ تعصبات کا دوسرا آسان سا نام نہیں۔ تو کسی بڑی چیز کا ایک جزو ہوگا لیکن بوزنہ کی نسل کا صرف اپنے اندرونی خواص و قوا کی مدد سے۔ اپنے اندرونی خصائص کے کشف سے۔ ایک بوزنہ۔ حیوان۔ جانور۔ وحشی کو کسی خارجی طاقت کی امداد کے بغیر مخالف فطرت کے تھپیڑوں اور اپنے نظام جسمانی کی غیر یقینی کیفیت کے باوجود۔ ایک "انسان" بنا دینا جو "نیم دیوتا"، مفکر، عامل حق و انصاف کا حامی اور طالب اور اپنے تجویز کردہ تمام دیوتاؤں کے مقابلے میں زیادہ کامیابیاں اور کامرانیاں حاصل کرنے والا ہے۔ یہ اتنا بڑا معجزہ اور کارنامہ ہے۔ کہ اگر ہم کسی حقیقت کے سامنے انتہائی احترام اور خاموش حیرت سے سر جھکا سکتے ہیں۔ تو وہ صرف یہ حقیقت ہے۔

یہ امر تحقیق نامہ کے عامۃ الورود مسلّمات میں سے ہے۔ کہ انسان ایک جزو ضعیف ہونے کے باوجود اپنے تمام متصورہ اوصاف سے لازماً بلند اور ماورا ہے لیکن جب یہ دیکھا جائے کہ انسان کو کوئی عطیہ یا ودیعت میسر نہیں۔ اور اس نے اپنے اوصاف کسی ماورائے انسان" دائرے سے حاصل نہیں کئے بلکہ جو کچھ اس کے پاس ہے۔ وہ اس نے صرف اپنی کوشش سے نہایت محنت و مشقت کے ساتھ آہستہ آہستہ حاصل کیا ہے۔ تو اس کی یہ غیر معمولی ندرت نہایت رفیع و برتر حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ عالم انسانی اور قدر انسانی کو جو بلند اور ماورائی حیثیت

حاصل ہے۔ وہ انسان کی کسی وہبی قوت کا کرشمہ نہیں بلکہ اس کی سعی عمل کا نتیجہ ہے وہ خود بھی رفعت و برتری کا حامل تھا لیکن اس میں اس کی تخلیق اور پیداکاری کی رفعت کا اضافہ ہوگیا ہے۔ یہ انسانی اوصاف۔ یہ قوتیں۔ یہ انہماک۔ یہ جوش و خروش۔ یہ شجاعتیں۔ یہ آرزوئیں۔ پھر اس کے عدل و ایثار کی پاکیزہ خوبیاں۔ اور اس کی عظیم روح تخلیق جس نے آرٹ۔ شاعری اور خطابت میں پا بلیکینان۔ اور ڈیسے۔ جیوکانڈا اور ہملیٹ پیدا کئے۔ اس کا وہ ہمہ گیر ذہن جو دنیا پر حکمرانی کرتا ہے۔ اس کی قوتوں کو قابو میں لاتا اور ان کی تشکیل جدید کرتا ہے۔ وہ مقدس شعلہ جو زندگی کی سطح سے اوپر بلند ہوکر موت کا مقابلہ کرتا ہے۔ برائی کا مقابلہ کرتا ہے۔ جھوٹ سے پنجہ کرتا ہے حق کی حمایت کرتا ہے۔ اور سچائی کا وفادار ہے۔ غرض جو کچھ بھی انسان ہمیشہ رہا ہے۔ اب بھی ہے اور آیندہ ہونے کی آرزو رکھتا ہے وہ اس وصف اور اس طاقت کی مجموعی پیداوار ہے۔ جو خود اس کے اندر موجود ہے جس نے انتہائی ادنیٰ اور دھندلی ابتدا سے شروع کرکے اسے موجودہ حد تک پہنچایا ہے۔ اور مطلوبہ تغیر کے تدریجی مراحل کو مسلسل طے کرتا ہوا اس وقار و احترام کا معمار اور خالق بن گیا ہے جس نے اس کو کائنات کی انتہائی رفیع اور برتر مخلوقات کا ہمہ تن بنا دیا ہے۔ آدم خور کے مکروہ چہرے اور جھکی ہوئی صورت و ہیئت کو دیکھو۔ گوریلا کی تھوتھنی اور اس کی آنکھوں کی چمک کو ملاحظہ کرو جس میں شیر ببر کی شان اور غزال کے بانکپن کا نام و نشان نہیں لیکن یہی وہ ابتدائی چیز تھی جس نے انسانی کوشش سے نشو و ارتقا حاصل کرکے بڑے بڑے نتائج و ثمرات پیدا کئے۔ انسان حیوانات سے کسی قدر کم حیثیت تھا۔ لیکن اس نے کام کرکے اپنے آپ کو فرشتوں سے کسی قدر بلند بنا دیا۔

یہ اندرونی طاقت جس نے یہ نادرالوجود اور غیر معمولی کیفیت پیدا کی کہ انسان ایک درندہ حیوان سے انسان بن گیا۔ اپنی اس کامیابی کو پہنچ کر بے حرکت نہیں ہوگئی۔ وہ برابر مصروف کار رہی ہے۔ اس کا تخلیقی کام برابر جاری رہا

ہے۔ اور وہ تغیر و انقلاب کی فضا میں برابر بلند پرواز رہی ہے۔ اس کا مشکن انسان کے اندرونہ میں ہے۔ اور آج بھی وہ مصروف عمل ہے۔ اس کا محیّر العقول کام تخلیقی عمل کے ہر حصے میں جاری وساری ہے۔ اور وہ انسان کی پیدائش کی طرح تہذیب جدید کی تولید میں بھی حیرت انگیز طور پر مصروف ہے۔ یہ بلاشبہ غیر معمولی اور اچنبھے کی بات ہے کہ موزنہ صاحب فکر انسان کا مورث اعلیٰ ہے۔ اور یہ بھی اچنبھے کی بات ہے کہ ایک لایعنی شور مچانے والا وحشی ایک یونانی فلسفی کا باپ ہے لیکن یہ بھی کچھ کم اچنبھے کی بات نہیں کہ دسویں صدی بیسویں صدی کی ماں ہے!

بعض اوقات ہم سوچتے ہیں کہ انسانی زندگی کس قدر کم حیثیت اور غیر مؤثر چیز ہے۔ انسان شور بہت مچاتا ہے لیکن حاصل بہت کم کرتا ہے۔ کبھی کبھی ناکامی۔ مایوسی اور شرم وافسوس اس کی سعی کو برباد کر دیتے ہیں اور کام کسی منزل پر نہیں پہنچتا۔ بلکہ محض دیوانے کا خواب ہو کر رہ جاتا ہے لیکن فکر کا یہ طریقہ صحیح نہیں۔ ذرا اس پر غور کرو۔ کہ ادنیٰ ترین اور ساجز ترین انسانی زندگیوں کے کام کے مجموعی نتائج اور قطعی ویقینی اثرات کیا ہیں؟ انہی "کم حیثیت اور غیر مؤثر" زندگیوں نے کائنات کا یہ اثاثہ فراہم کیا ہے۔ کہ اس خلا کے نئے نظام میں سے عالم انسانی جلوہ گر ہو گیا۔

۲

تغیّر۔ ارتقا۔ ترقی

اگرچہ انسانی ارتقا وترقی کا قانون نسل انسانی کی داستان کے ہر حصے میں نمایاں نظر آتا ہے لیکن اب تک زمانہ حاضر کے فکر میں اس نے حقیقت ثابتہ کی حیثیت ہرگز اختیار نہیں کی۔ بلکہ اس کے برعکس اس کی حیثیت اب تک ایک شدید اختلافی اور نزاعی تصور کی ہے۔ اور اس کے متعلق زمانہ حاضر کے افکار

و آبا اور تصانیف و کتب میں بے شمار شبہات پیدا کئے گئے ہیں۔ یہ صحیح ہے۔ کہ "نظریہ انحطاط" کم از کم اپنی پرانی شکل میں اب قابلِ تائید نہیں رہا۔ اور غالباً اسی وجہ سے پردۂ گمنامی میں پوشیدہ ہوگیا ہے۔ خواہ ارتقا و ترقی کے متعلق ہمارے تصورات کچھ بھی ہوں لیکن پتھر کے زمانے کے آدمی سے آج کل کے انسان تک جو مراحل گزرے ہیں۔ اُن کے متعلق واضح طور پر اور بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ یہ ارتقا و ترقی کے عمل کا نتیجہ ہے۔ لیکن اس حقیقت کو ایک مسلسل عملیہ کی حیثیت سے تسلیم کرنا اور اس کو پوری تاریخ کے دوران میں (از منۂ یونان سے لے کر موجودہ زمانے تک جو ہمارے تاریخی منظر کی پرانی کوتاہ بینی کا مظہر ہے) ایک قانونِ عمل کی حیثیت سے مؤثر ماننا ابھی مسلّم نہیں ہوا۔ بلکہ اس پر گوناگوں شکوک و اعتراضات وارد کئے جا رہے ہیں۔ بلکہ بعض حالات میں تو اس سے قطعی انکار کر دیا جاتا ہے۔

اس تشکک کے وجوہ و مبانی بے شمار و متنوع ہیں۔ ان میں سے بعض کی جڑیں تو خود ہماری فطرت میں گہری چلی گئی ہیں بعض ایسے دھندلا دینے والے حالات کی پیداوار ہیں جن کی وجہ سے عملیۂ ارتقا کی ہیئت اور اُس کی یکجہتی نظر سے پوشیدہ ہو جاتی ہے۔ اور بعض ایسی فکری دشواریوں کا نتیجہ ہیں۔ جو خود اس تصوّر کی نوعیت کے اندر مضمر ہیں۔

آیا ہمیں یہ منصب حاصل ہے کہ کسی عملیہ کو ترقی آموز قرار دے دیں؟ تغیر کے معنی ہم کو معلوم ہیں۔ ارتقا کو بھی ہم جانتے ہیں (کم و بیش ہی سہی) لیکن ترقی کس کو کہتے ہیں۔ اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا جس وقت ہرقلیتوس نے کائنات کے تسلسل (بلا انقطاع) کا نظریہ پیش کر کے کہا۔ کہ تمام اشیا مسلسل و متواتر بدلتی رہتی ہیں۔ اور ہم تجربے کے ایک ہی دریا میں دو دفعہ غسل نہیں کر سکتے۔ تو اس حکیم نے ترقی کی تصدیق کرنا تو درکنار کسی قانونِ ارتقا کی طرف بھی اشارہ نہیں کیا۔ پھر جب ہم نے محض تغیر کے تصوّر میں اس

حقیقت کا اضافہ کیا۔ کہ تغیر کا ہر آنے والا مرحلہ اُس سے پہلے مرحلے سے معیّن اور متاثر ہوتا ہے۔ اور خصوصاً زندگی کی شکلیں اسی طرح صورت پذیر ہوتی ہیں یعنی مسلسل و متواتر ایک دوسرے سے ارتقا حاصل کرتی جاتی ہیں۔ تو ہم نے محض تغیر سے ایک قدم آگے بڑھایا۔ اور عمل ارتقا میں ایک نئے عامل کا پتہ چلایا لیکن یہ یاد رہے کہ ہمیں ترقی کا سراغ نہیں ملا۔

ہم تغیر کے اس بہاؤ کی جو قدر معیّن کرتے ہیں۔ کیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اس کو "خوب" بھی کہتے ہیں۔ یعنی اُس کے اچھا ہونے کا اعلان کرتے ہیں؟ کہا گیا ہے کہ "ارتقا ایک حقیقت ہے اور ترقی ایک احساس ہے"۔ آخر ہمیں اس پُر زور اور حوصلہ افزا اعلان کرنے کا کیا حق ہے۔ کہ جو کچھ بھی ہو جاتا ہے۔ وہ پہلے سے بہتر ہی ہوتا ہے؟ کیا دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہمارا مخصوص نقطۂ نظر ہی تمام خوبیوں اور اچھائیوں کا معیار ہے لہٰذا جس کو ہم اچھا کہہ دیں وہی بہتر سمجھا جانا چاہئے۔

فرض کیجئے کہ نسلِ انسانی اپنے زمانۂ طفولیت میں انسانی زندگی کا نہایت عمیق اور معقول حد سے زیادہ احترام کرتی تھی۔ اور اس زمانۂ طفولیت کے بعد جو مختلف تغیرات رونما ہوئے۔ ان سے دوسرے نتائج کے علاوہ ایک نتیجہ یہ نکلا۔ کہ آج کل کے انسان کو انسانی گوشت کی لطیف خوشبو اور اس کے عمدہ غذائی اوصاف معلوم ہو گئے۔ اور اس نے نہایت ذوق شوق سے آدم خوری شروع کر دی۔ اب تصور کیجئے کہ ان حالات کے ماتحت ہمیں اُن غیر مہذب وحشیوں اور جنگلیوں سے کس قدر نفرت ہوگی۔ جو اس قدر نفیس اور سہل الحصول غذا سے بے خبر رہے۔ اور ہمیں اپنے آبا و اجداد پر کس قدر رحم آئے گا جن کو اتنی عقل نہ تھی۔ کہ "ڈین سوفٹ" جیسے نادرِ روزگار مصنف کی نصیحت کو پوری طرح قبول کرتے۔ اور مسئلہ ناداری اور آئرلینڈ کے سوال کو بنیادی طور پر حل بھی کر لیتے۔ اور اس کے ساتھ ہی قوت ذائقہ اور قوت ہاضمہ کی نئی نئی عشرتیں حاصل

کرتے۔ یہ کہہ کہ ہم اپنے ذوقِ صحیح اور اپنے معیارِ شائستگی پر فخر کرتے۔ اور اس کو اپنی ترقی کا طرۂ امتیاز سمجھتے۔

یہ صحیح ہے۔ اور اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ کہ ترقی کا تصور جمالیاتی اور اخلاقی اقدار پر مبنی ہے۔ اور جب ہم کہتے ہیں۔ کہ انسان خنزیر سے بلند تر ہے۔ وحشی سے زیادہ صاحبِ فکر ہے۔ اور آدم خور کے مقابلے میں زیادہ منصف مزاج ہے تو ہم محض حقیقت کی نقل پر اضافہ کرتے ہیں۔ اور ایک اخلاقی فیصلے کا اعلان کرتے ہیں لیکن اس کے بعد ایک نیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ ان تمام اقدار کا منبع اور ان کی تہ میں کیا ہے؟ اگر ان کا کوئی معیارِ صحت ہے۔ تو وہ کیا ہے؟

سوچیئے کہ آپ کے سامنے وہ پہلی جلجلی سی کانپتی ہوئی چیز پڑی ہے۔ جو غیر عضوی دنیا سے الگ ہوکر اب "زندہ" کہلاتی ہے۔ اگرچہ آپ کے لئے یہ امر بے حد دشوار ہے۔ کہ اس کے زندہ ہونے کے آثار معین کریں لیکن اس کے طور طریقے میں آپ کو ایسے آثار و علائم صاف نظر آجائیں گے۔ جو اس کی زندگی کے شاہد ہوں گے۔ وہ چیز کھاتی ہے۔ بڑھتی ہے۔ پھولتی پھیلتی ہے۔ اس کی توانائی میں ان کاموں کی تمام صلاحیتیں اور تمام رجحانات صاف نظر آتے ہیں۔ جو سب زندہ وجود کیا کرتے ہیں۔ آیا زندگی کے یہ تمام افعال اور قیام و بقا کے لئے جد و جہد جو انفرادی خیالات و کیفیات کے مطابق اس چیز سے صادر ہوتی ہے۔ واضح طور پر اس امر کا ثبوت نہیں۔ کہ زندگی کا ایک بنیادی دگونا معلوم تقاضا زندہ رہنا ہے۔ اور زندہ چیز کی زندگی کا جزوِ لاینفک یہی ہے؟ افعال کا تنوع جو اس قدر سادہ سی مخلوق میں بالکل محدود ہوتا ہے۔ جزوی طور پر ہمارے مشاہدہ کے تجرباتی وصف سے اور جزوی طور پر ان محرکات سے پیدا ہوتا ہے۔ جو ان افعال کا باعث ہوتے ہیں۔ یہ تمام افعال بلا استثنا صرف ایک ہی مقصد کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ یعنی زندگی کی طرف۔ اگر یہ ناکام رہ جائیں تو زندگی ختم ہوجاتی ہے۔ ان وجوہ اور بعض دوسری وجوہ کی بنا پر یہ معقول بات نہیں۔ کہ

ان کو علیحدہ علیحدہ قوا و اوصاف کا مجموعہ سمجھا جائے۔ جو ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو موجود ہیں۔ اور آزادانہ نوعیت رکھتے ہیں۔ بلکہ معقول یہی بات ہے۔ کہ انہیں ایک ہی ترتیب کا نتیجہ سمجھا جاتے۔ لیکن یہ بلبلی سی چیز زندگی کے اُن افعال اور اُن کے زیادہ پیچیدہ اور ناقابلِ فہم کیمیاوی مظاہر کا اس قدر واضح اظہار کرتی ہے۔ کہ اُن میں سے بعض آپ کے مشاہدے میں بھی نہیں آتے۔ توانائی کی یہی ترتیب جس سے ماحول کے عوامل کے ماتحت یہ افعال سرزد ہوتے ہیں اس سے بھی زیادہ کام کرتی ہے۔ آپ گزشتہ ادوار و ازمنہ پر اُوپر سے نیچے تک نظر ڈالئے۔ پھر اس کیچڑ جیسی چیز کو دیکھئے تو آپ کو نظر آئے گا۔ کہ اس میں حیرت انگیز تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ اور یہ ایک عربی افسانے کے چھلاوے کی طرح مختلف اور عجیب و غریب شکلیں اختیار کر رہی ہے۔ کبھی سَو سر والا سانپ بن جاتی ہے کبھی سمندری مخلوق کبھی مچھلی کبھی سانپ۔ کبھی چھچھوندر اور کبھی گلہری۔ اور اس میں سے خود تم بن جاتے ہو۔ یعنی وہی چیز ایک اچھے خاصے انسان کا روپ دھار لیتی ہے۔ یہ یقینی بات ہے کہ تغیر و استحالہ کے اس عجیب تماشے میں محض تبدیلیوں ہی کی خرمستی کا ہنگامہ نہیں۔ بلکہ اس سے کچھ زیادہ حقائق مضمر ہیں۔ یہ بھوک۔ توالد و تناسل اور زندگی کے دوسرے مظاہر کی طرح اس کے وجود کا وظیفہ اور کردار ہے۔ اور اُس نظامِ ترتیب کا ایک مظہر ہے جس پر زندگی مشتمل ہے۔ حیات کے اس عمل و کردار سے پتہ چلتا ہے۔ کہ جس طرح اس کا نظام جسمانی کھانے پینے اور پھولنے پھلنے کا متقاضی ہے۔ اسی طرح اپنی تنظیم کی توسیع و تعمیر پر بھی مجبور ہے۔ اور کوئی خاص خلقی و فطری ضرورت اس کے لئے مُصر ہے۔ جو بھوک سے کم شدید محرک نہیں۔ اس خیال کے برعکس یہ حقیقت برابر قائم ہے کہ امیبا اب بھی موجود ہے۔ پوری زندگی ابھی ارتقا پذیر نہیں ہوئی۔ اس کے آغاز پر طول طویل زمانہ گزر جانے کے بعد بھی اس کی ابتدائی شکلیں اِلی الآن کما کان قائم و موجود ہیں۔ اور کم از کم اپنے بیرونی خاکے کے اندر اس کے مختلف مرحلے اور

ان کے مظاہر پہلو بہ پہلو آج کل کے زمانے تک محفوظ ہیں۔ یہ تمام چیزیں غیر متغیر صورت میں باقی کیونکر رہیں۔ اس کے لئے ہمیں فرض کر لینا چاہئے کہ مخلوقات میں سے بہت ہی قلیل التناسب ایسی اشیا ہیں جن میں ارتقا کا عمل مؤثر ہوا ہے لیکن اُن کی اکثریت وہیں کی وہیں ہے جہاں آغاز میں تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نشوو ارتقا کا عمل صرف اُس حالت میں مؤثر ہوا ہے جب سازگار حالات نے زندگی کے اس حقیقی رُجحان کو حرکت میں لا کر مصروف عمل کیا ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ اس قسم کا رُجحان اور اس قسم کی قوت زندگی کے ہر مظہر کا جزو لاینفک ہے۔ ہر زندہ شے کو زندہ رہنے کے لئے لازم ہے۔ کہ اپنے آپ کو ماحول کے تقاضوں کے مطابق بنائے۔ خواہ وہ کتنے ہی مخالف و معاند ہوں۔ اس کی توانائی اور اس کا عمل اُن حالات و شروط سے ہم آہنگ ہونا چاہئے جو خارجی واسطے سے اس پر عائد ہوتی ہوں۔ اور اس واسطے کا تقاضا یہی ہے کہ زندگی کا ہر عمل اس کے موافق اور سازگار ہو۔ کھانے۔ سانس لینے، اور نسل بڑھانے کے افعال صرف اپنے مقصد ہی کو پورا نہیں کرتے۔ بلکہ اُن محصور حقائق کے تعلق میں جو ان افعال کے مطابق ہوں۔ اُن کو انجام دیتے ہیں۔ ان افعال کو ماحول کے مطابق بنانا صرف وظیفہ حیات ہی نہیں۔ بلکہ اُس کی جان و روح یہی ہے اس موافقت اور سازگاری کا حصول زندگی کی لازمی ساخت و ترکیب کا اُسی طرح ایک جزو ہے جس طرح اُس کی نسیجوں میں آکسیجن پہنچانا ضروری ہے۔ اور ایسا ہی مؤثر جذبہ ہے۔ جیسے بھوک اور محبت ہیں۔

اُمیبا چونکہ موجود ہے۔ اس لئے وہ بھی انسان ہی کی طرح خارجی حالات سے موافقت کرنے پر مجبور ہے لیکن بدلتے ہوئے حالات کے ماتحت مواقع اور ضروریات کے جواب میں توافق کا جو تغیر بھی پیدا ہوتا ہے۔ وہ زندگی کی قوتوں میں اضافہ کرتا ہے۔ اس کے وظائف کا دائرہ اور اُن کے عمل کی آزادی وسیع تر ہو جاتی ہے۔ مچھلی کا پر۔ دوسرے جانداروں کے ہاتھ پاؤں اور پنجے پڑ جانے

حیوانات کے "جعلی پاؤں" سے یقیناً بہت زیادہ کارآمد ہیں۔ آنکھ۔ رنگ جلد کے دھبے یا بدلنے والے رنگ کے مقابلے میں زیادہ مفید ہے۔ اور عصبی حس پروٹو پلازم (اولیں مادہ حیات) کی زود حسی سے زیادہ واضح ہے۔ یہ اثر گویا مجموعی اور کُلّی ہے۔ آپ کی خوردبین کی تختی پر آپ میں اور امیبا میں جو تفاوت نظر آتا ہے۔ وہ صرف توافق کے فرق سے بہت زیادہ ہے۔ گو حقیقت میں یہ ایک خاص پہلو ہے۔ اور اُسی توافق کا نتیجہ ہے۔ امیبا کی طرح آپ بھی عائد شدہ حالات کے مطابق زندہ رہنے کا جتن کرتے ہیں۔ لیکن آپ کچھ اس سے زیادہ کرتے ہیں۔ آپ ان حالات پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ کی فعالیتیں بے اندازہ حد تک آزاد ہیں۔ اور اُن کا دائرہ غیر معلوم طور پر وسیع ہے۔ بہت سی مشکلات ہیں۔ جن کے خلاف حیوانی زندگی جدوجہد اور تنازع للبقا کے عمل میں مصروف ہے لیکن آپ ان مشکلات پر غالب آچکے ہیں۔ آپ کی زندگی نے ہزاروں نئے ماحول فتح کئے ہیں۔ اور آگے بڑھ کر عمل کے نئے نئے دائرے پر قبضہ کیا ہے۔ آپ کی زندگی کی ابتدائی ضروریات اس کے امکانات اور اس کے منازل کا حلقہ اور اُن کی ہیئت وسعت پاکر بالکل نئی شکلیں اختیار کر چکی ہے۔ تغیرات کے طویل سلسلے اور ارتقا کے دوران میں یہ عمل مسلسل اور متواتر جاری رہا ہے۔ خواہ یہ ارتقا کی داخلی اور بنیادی استعداد کا لازمی نتیجہ ہو۔ یا تدریجی موافقتوں کا مجموعی اثر ہو۔ بہرحال انجام کے اعتبار سے ایک ہی چیز ہے۔ یہ صرف تغیر نہیں۔ یہ مجموعی تغیر سے بھی کسی قدر بڑھ کر ہے۔ یہ وہ تغیر ہے جو مسلسل کامیابیوں کی سمت میں رہنمائی کرتا ہے۔ زندگی کی فعالیت کے حالات شروط پر قابو پانے کی طاقت کو بڑھاتا ہے۔ اور اس دائرے اور اس قوت کو وسیع سے وسیع تر کرتا چلا جاتا ہے۔

سرسری نظر سے دیکھئے۔ تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ زندگی روزِ اوّل ہی سے ایک مقرر و معیّن منزل کی طرف گامزن رہی ہے لیکن در اصل بینایاتی نظریہ

حقائق کے مطابق نہیں ہے۔ عمل ارتقاء ریڑھ کی ہڈی والے جانوروں۔ دودھ پلانے والے حیوانوں اور انسانوں میں جاری تو معلوم ہوتا ہے لیکن یہ راہِ راست اور شعوری طور پر اُن کی طرف گامزن نہیں۔ نشو و ارتقا کے بیسیوں بلکہ سینکڑوں بے انتہا مختلف نمونے اور خطوط آزمائے گئے۔ جب کہیں جاکر ارتقاء ریڑھ کی ہڈی والے جانوروں کی ترکیب یا دودھ پلانے والے جانوروں کے دماغ تک پہنچ سکا۔ یہ عمل واحد خط اور بڑھتے ہوئے خم و پیچ پر مشتمل نہ تھا۔ بلکہ ایک نہایت گنجان پیچیدہ۔ پھیلے ہوئے اور چھوٹی بڑی شاخوں والے درخت کی مانند تھا جس میں ایک شاخ تو کامیابی کی پھننگ تک پہنچ گئی لیکن ہزاروں شاخیں مرجھا کر رہ گئیں یعنی اس عمل میں ہزاروں ایسی چیزیں تھیں جن میں چندوں کامیابی اور چندوں ناکامی کے اندھیرے پیش آتے۔ اس سلسلے کے کسی ادنیٰ مرحلے پر یا کسی مرحلے پر بھی ایسی پیشگوئی یا پیش بینی نہیں کی جاسکتی جس سے اس کی تکمیل اور کامیابی ثابت ہوسکے۔ پروٹوزون (ابتدائی یک خلیہ جانور) پہلے سے مقدر نہ تھا۔ ارتقا کی ترقی پہلے سے مقرر و معین نہ تھی۔ بلکہ ٹٹول ٹٹول کر آگے قدم بڑھاتی تھی۔

انسانی ترقی ہی انسانی ارتقا ہے۔ اس کے اور عضویاتی زندگی کے درمیان ایسے فرق ہیں۔ جو نوعیت کے لحاظ سے گہرے اور اہمیت کے اعتبار سے عظیم الشان ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ترقی ایک ہی ناگزیر عمل کا تسلسل ہے۔ اس کی قوتِ محرکہ اور اس کے قطعی و اساسی رجحانات ایک ہی ہیں۔ زندہ توانائی کی ترتیب جو پروٹوزون کے محصور حالات کے متعلق زندگی کے ردِ عمل کی قوتِ محرکہ ہے۔ انسان میں بھی اسی طرح مصروفِ عمل ہے۔ کیونکہ حیاتیاتی اعتبار سے غور کیا جائے تو انسان بھی پروٹوزواہی کا اجتماع ہے۔ اس کا غیر محدود تنوع۔ اس کی پیچیدگیاں اس کی رفعت و برتری کے اسباب۔ اس کا طرزِ عمل۔ اس کا فکر۔ اس کی تاریخ۔ اس کی کامیابیاں اور کوششیں۔ ان

سب چیزوں کا سرچشمہ صرف وہی ابتدائی اور اساسی رجحانات ہیں۔ جو امیبا کے محرکِ عمل ہیں۔ ارتقا کی رفتار میں شروع سے آخر تک کوئی نیا محرک پیدا نہیں کیا گیا محرک جذبے کا اظہار جس مخصوص ہیئت میں ہوتا ہے۔ صرف اسی میں تغیر کی گنجائش ہے۔ کیونکہ زندگی میں جس چیز کو ہم (کوئی بہتر لفظ نہ ملنے کی وجہ سے) "رجحان" یا "محرک" کہتے ہیں۔ اس کی کوئی مخصوص شکل وہیئت نہیں۔ یہ حقیقی رابطہ کے تجربے کی دعوت پر ایک خاص تاثر کی صورت اختیار کرکے ایک معروف مشاہدے اور تصورات کی خواہش کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔ یہ اسی عرفانی تجربے کی گوناگوں حقیقت ہے۔ جو رنگا رنگ شیشوں کے گنبد کی طرح زندگی کے ناقابلِ تغیر دوام کی درخشانی کو داغدار کردیتی ہے"۔ خود "محرک" کے اندر کوئی اس قسم کی مخصوص ہیئت موجود نہیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ کوئی خیال۔ کوئی تصور اور کوئی فکر کسی حالت میں فطری وجبلی نہیں ہوسکتا۔ نہ عضویاتی طور پر قابلِ انتقال ہوسکتا ہے۔ گدھے کی بھوک سامنے لٹکتے ہوئے سیب کی صورت اختیار کرلیتی ہے جس کی طرف اس کی خواہش کو حرکت ہوتی ہے لیکن زندگی کی بنیادی ترکیب میں نہ سیبوں کی خواہش موجود ہے۔ نہ بھوک ہے۔ اور نہ کوئی ایسے متعلقات ہیں جن کو ماہرینِ نفسیات "ابتدائی محرکات" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس میں سوائے اس کے اور کوئی چیز نہیں۔ کہ وہ اپنے تسلسل۔ اپنے استقلال اور اپنی توسیع کے لئے اپنی توانائی کو صرف کرنا چاہتی ہے۔ جو خواہشات آپ کے لئے یا کسی اور انسان کے لئے موجبِ تحریک ہوتی ہیں۔ خواہ وہ سائنٹیفک صحت واقعات سے متعلق ہوں۔ یا اعلیٰ درجے کی موسیقی کی خواہش ہو۔ سوشل سدھار۔ ربڑ کی کمپنیوں کے حصوں یا فلسفہ کی آرزو ہو۔ وہ صرف اس شکل وصورت کا نام ہے۔ جو عرفانی قوتیں ابتدائی محرکات کو بخشتی ہیں۔ یا یوں کہنا چاہئے۔ کہ وہ عرفانی قوت جو امیبا اور پوری حیات کو آمادۂ عمل کرتی ہے۔

انسانی ارتقا کا رُخ اور اس کے نتائج کا پیمانہ صرف اپنی قوت متحرکہ ہی

نہیں۔ بلکہ خود زندگی پر مبنی ہے۔ انسان کے لئے اور حقیقت میں پوری زندگی کے لئے کامیابی۔ ارتقا اور ترقی کا مطلب صرف یہ ہے کہ زندگی کے احوال پر روز افزوں اقتدار حاصل کیا جاتے۔ یہ چیز انسان کی آلاتی ترقی میں اور قوائے فطرت پر اس کے روز افزوں اقتدار و اختیار سے ظاہر ہے۔ جو اُس نے عہد حجری کے زمانۂ ماقبل کے چقماقوں سے لے کر آج کل کے جیٹ طیاروں تک حاصل کیا ہے لیکن آرٹ۔ فکر۔ مذہب۔ اخلاق۔ سیاسیات غرض انسانی فعالیت کے تمام شعبوں کی سرگرمیاں اسی مقصد آخری کے لئے ہیں۔ اور قطعی طور پر اسی سمت میں ترقی کر رہی ہیں۔ انسان کے عالمانہ و عارفانہ قوٰے کی غیر محدود توسیع کی وجہ سے زندگی کا ماحول اُس پر کھل گیا ہے۔ اور اس سے لامحدود پیچیدگیوں کے شاخسانے نکل آئے ہیں۔ ابتدائی مرحلۂ حیات میں یہ ماحول صرف اُس رقیق و سیال مادے کے طبعی و کیمیاوی اوصاف تک محدود تھا جس میں وہ زندگی شور پذیر تھی۔ لیکن انسانی زندگی کے لئے وہی ماحول کائنات اور اُس کے مسائل تک وسیع ہو گیا۔ اس میں وہ تمام قوتیں بھی شامل ہو گئیں۔ جو خود اُسی کی مخلوق تھیں۔ اور مختلف و متنوع حاجات و خواہشات پیدا ہوئیں جنہوں نے انسان میں زندگی کے محرکات کو معروضی اور منتشر کر رکھا ہے۔ ایک فرد کی حیثیت سے انسان کی ترقی کے احوال و شروط میں ایک نہیت و شمار کا بھی اضافہ ہو گیا۔ مرکب الجسم عضویاتی ترکیب کا ایک نیا نمونہ "انسانیت" کی شکل میں پیدا ہو گیا۔ جس میں انفرادی ترقی کو وسیع تر وحدت کی ترقی کے مطابق و موافق بنانے کی ذمہ داری بھی عائد ہو گئی۔ لہذا زندگی کے مادی احوال پر قابو پانا اُس کام کے مقابلے میں کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتا جو انسان پر اُس کی طاقتوں کی نوعیت اور اُن کے عمل کی وجہ سے عائد ہوتا ہے۔ اس میں انسانی زندگی کے تمام لامحدود متنوع اور پیچیدہ احوال شامل ہیں۔ اور یہ کام اپنے مختلف پہلوؤں میں اسی قدر پیچیدہ اور متنوع واقع ہوا ہے جس قدر خود انسانی زندگی گوناگوں اور دشوار

ہے۔ اس میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں۔ جن کی خواہش اور تمنا انسان کو پیدا ہوتی۔ ہر وہ چیز جس کی طرف اُس کے دل و دماغ متوجہ ہوئے۔ اس کی حسرتوں کا ہر راز اُس کے خوابوں کی ہر شکل۔ اس کا ہر نصب العین۔ ہر عقیدہ۔ ہر کوشش اور ہر شعلۂ زندگی اس کام کے دائرے میں شامل ہے۔ انسانی زندگی دائمی طور پر اور متواتر جدوجہد میں مصروف ہے۔ تاکہ آزادانہ ترقی کا اختیار۔ مسرت کا اختیار۔ عمل کا اختیار۔ احساس کا اختیار۔ تخلیق کا اختیار۔ فہم و فکر کا اختیار اور اشتراک عمل اور انصاف کا اختیار حاصل کرسکے۔

یہی وجہ ہے کہ ترقی اس قدر رنگا رنگ۔ اس قدر ہزار پہلو اور اس قدر پیچیدہ میں ڈالنے والی چیز ہے۔ اور اس کو عام طور پر نافہمی کا شکار بنا دیا گیا ہے۔ اس لئے کہ ہمیں اس میں بے شمار مخلوط اشکال نظر آتی ہیں۔ جو بظاہر متضاد و متضاد رجحانات کی مظہر ہیں۔ اس میں پانچویں صدی کے یونان کے نصب العین بھی شامل ہیں اور بیسویں صدی کے امریکہ کے افکار بھی ہیں۔ تخیلات کے زمانے کے مطمحِ نظر بھی ہیں۔ اور سائنس کے ارتقا کے رجحانات بھی ہیں۔ ذہنی اور دماغی قوت کے کارنامے بھی ہیں۔ اور مادی طاقتوں کے بھی۔ لذت پرستی بھی ہے اور ایثارِ نفس بھی۔ یہ ابتدائی خواہشات اور آرزوئیں نہ صرف باہم متضاد ہیں۔ بلکہ ان پر اس کام کا دائمی بوجھ بھی پڑا رہتا ہے۔ کہ موافقت اور سازگاری کی آزمائش میں بھی پوری اتریں اور حیات و کائنات کے اساسی حقائق سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش کریں۔ گویا یوں سمجھنا چاہیئے کہ ارتقا کے اندر ایک اور ارتقا ہے۔ اور اصول و افکار۔ خواہشات و خیالات کے مابین تنازع للبقا جاری ہے۔

لہٰذا یہ صاف ظاہر ہے۔ کہ مذکورہ بالا پیمانے سے اور انسانی ترقی کے کسی پہلو کی عمدگی کے متعلق قطعی نوعیت اور وصف کے تعین کی جو کوششیں کی جاتی ہیں۔ وہ بالکل خیالی اور بیکار ہیں۔ اور اس کے علم یا مادی قوت یا نفاستِ ذوق یا اخلاق کے متعلق جو تصریحات کی جاتی ہیں۔ اُن سے نظریہ پرستوں کے کسی

مخصوص زاویہ نگاہ کا پتہ تو چلتا ہے لیکن عمل ارتقا کی نوعیت واضح نہیں ہوتی۔ یہ تصریحات بھی بے سود اور بے نتیجہ ہیں۔ اس قسم کی تعیین ہر حال میں مصنوعی ہوگی۔ اس قسم کی ہر ہیئت اور نوعیت انسانی ترقی کا ایک پہلو ہے۔ جو اُن سب کو شامل ہے۔ وہ کبھی ایک سمت میں بڑھتی ہے کبھی دوسری سمت میں گامزن ہوتی ہے۔ ایک مرحلے میں ایک نمونے اور نصب العین کے مطابق اور دوسرے مرحلے میں ایک مختلف بلکہ کاملاً متضاد نمونے کے مطابق نشوونما حاصل کرتی ہے۔ تاہم یہ مختلف و متضاد نصب العین خواہ ایک سمت کو ترقی کریں۔ خواہ دوسری سمت کو۔ بہرحال اس کو ترقی ہی کہا جائے گا۔ کیونکہ اس سے مقصود صرف وہ طاقت ہے۔ جو انسانی زندگی کو اس کے احوال پر حاوی اور مختار بناتی ہے۔ یہ طاقت روزافزوں "کُل" کی زندہ طاقت کا ایک لازمی جزو بن جاتی ہے۔

اس ترقی کے دوران میں اکثر ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ کوئی ایک وصف بظاہر بالکل غائب و معدوم ہو جاتا ہے۔ کسی خاص پہلو میں نقصان و انحطاط پیدا ہو جاتا ہے اور یوں گویا بعض لوگوں کو موقع مل جاتا ہے۔ کہ اس خاص پہلو کے متعلق گمراہ کن مقالے کہنے لگیں لیکن جس طرح کسی بڑی مہم کے آغاز میں ابتدائی قربانیاں لازماً کرنی پڑتی ہیں۔ اسی طرح یہ نقصانات بھی برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ تاکہ بعد میں اُن کی سَو گُنا تلافی ہو جائے۔ اور ترقی ایک بلند تر سطح پر زیادہ قوت کے ساتھ نمایاں ہو۔

انسانی ترقی بھی عضویاتی ارتقا کی طرح کسی غایائی اور مقررہ منزل مقصود کی طرف براہِ راست گامزن نہیں ہوتی۔ ہر حالت اور کیفیت میں ترقی کا راستہ ٹھہر ٹھہر کر اور ٹٹول ٹٹول کر ہی طے کرنا پڑتا ہے۔ اور منازلِ مقصود کا تعیّن زیادہ تر کوتاہ بینی ہے۔ اس راستے پر ناکامیاں بھی کامیابیوں کی طرح عام ہیں۔ گویا یہ راستا زیادہ تر دردناک بربادیوں سے پٹا پڑا ہے۔ ترقی صرف پے درپے آزمائشوں اور لغزشوں سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ لغزشیں اور غلطیاں زیادہ تر انسان کی عظیم تعمیرات کی بنیادوں میں موجود ہوتی ہیں۔ چنانچہ جب اُن کی تصحیح و تلافی کی جاتی

ہے۔ تو بعض اوقات پوری تخریب اور جدید تعمیر سے کام لینا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی ترقی کے اقدام کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ کہ تہذیبوں کو محو کیا جائے۔ اور بنی بنائی دنیاؤں کو تباہ و برباد کر دیا جائے۔

تاریخ کے قدیم فلسفوں کا تعلق انسانیت کے بجائے مملکتوں اور قوموں تک محدود تھا اور وہ زیادہ تر تہذیبوں کے صعود و ہبوط۔ سلطنتوں کے عروج و زوال اور ثقافت کے جزر و مد پر اظہار خیالات کرتے تھے۔ اسی طرح آج کل کے زمانے کا فکر تہذیب کے ادوار کے تصورات میں مبتلا ہے۔ ۵ ۶ ۷ ۱ کے زمانے سے لے کر اب تک یہی معمول رہا ہے۔ کہ تہذیب انسانی کے نشو و ارتقا کو انفرادی زندگی کی مثال پر قیاس کیا جاتے اور توسیع و ترقی کی سرعت کو جوش شباب اور زوال و انحطاط کو کہن سالی اور فرسودگی سے تعبیر کیا جائے میں اس سلسلے میں یہ اصطلاحات بالکل خالی خولی اور بے معنی الفاظ کی حقیقت رکھتی ہیں۔ ان کا مطلب کچھ بھی نہیں کسی نسل اور کسی فرد کی زندگی کے درمیان مماثلت کی کوئی وجہ اور کوئی قرینہ موجود نہیں۔ سوائے اس نظریہ کے کہ انفرادی سن رسیدگی کی وجہ یہ ہوتی ہے۔ کہ نظام جسمانی خود اپنے ہی فضلات و نقصانات کے اجتماع سے رفتہ رفتہ رکاؤ اور بندش کا شکار ہو جاتا ہے لیکن حیوانی نسلیں کہنگی اور فرسودگی کے باعث تباہ نہیں ہوتیں۔ بلکہ وہ تغیر پذیر حالات کا مقابلہ کرنے میں اپنے وسائل توافق میں ناکام رہنے اور زیادہ بہتر طریق پر موافقت پیدا کرنے والی نسلوں سے مسابقہ کی وجہ سے ختم ہو جاتی ہیں۔ جب کبھی انسانی نسلوں اور معاشروں کے زوال "کہنگی" کی یقینی تشخیص ہو گئی ہے۔ انھوں نے ہمیشہ ترقی کی رفتار میں اپنا مقام حاصل کرنے کے لئے اپنے قوائے ارتقا میں زندگی کی روح پھونکی ہے اس اعتبار سے معاشرے کی زندگی (کہنگی کی تشبیہ کا یہی ایک قرینہ ہے) اس بات پر منحصر ہے۔ کہ اخراج فضلات میں اس کا عمل آزاد ہو۔ اور اس کو متروک بے سود جھوٹی اور فرسودہ اقدار و اشیا کے ترک کر دینے پر قدرت

ناقص ہو۔

انسانی تنظیم اور ثقافت کی ہر شکل جو اب تک معرضِ وجود میں آئی ہے۔ اس امر کی مظہر ہے۔ کہ اس نے عائد شدہ حالات کے ساتھ صرف جزوی اور نامکمل موافقت پیدا کی ہے۔ اس نے عدم موافقت حالات کے باوجود نشوو ارتقا حاصل کیا ہے۔ لیکن وہ جتنی آگے بڑھتی چلی گئی ہے۔ اسی قدر یہ ابتدائی وہ فطری رکاوٹ ترقی کے امکانات کے راستے میں حائل ہوتی رہی ہے۔ لہذا ایک وقت ایسا آجاتا ہے کہ یا تو یہ ناسازگاریاں۔ یہ غلطیاں یہ نقائص اور فلسفیانہ تاریخ کے یہ جراثیم زوال نظر انداز کرنے پڑتے ہیں۔ یا نشوونما کا یہ مرحلہ ختم ہوکر نابود ہو جاتا ہے۔ معاشرے کو داخلی یا خارجی عمل سے بالکل نئے سانچے میں ڈھالنا پڑتا ہے۔ اور اس کی عصمت وعفت کا جال از سرِ نو بننا پڑتا ہے۔

یہ بحران از سرِ نو اور زیادہ موثر ترقی کی ضروری تیاری کا حکم رکھتے ہیں۔ ترقی کا تقاضا یہ ہے۔ کہ وقتاً فوقتاً تمام حالات واشیا کی کایا پلٹ دی جائے انسانی ارتقا عضوی عمل سے بھی زیادہ اس امر کا متقاضی ہے۔ کہ ضعیف و نحیف پیداواروں اور ناقص ساختوں کو نابود کر دیا جائے۔ اور ان کی جگہ نئی اشیا کی تعمیر کی جائے۔ یہ دونوں عمل یکساں طور پہ ترقی کے ذریعہ واقع ہوتے ہیں بارہا بڑے بڑے انقلابی ہنگاموں نے دنیا کو ازسرِ نو تباہی اور انتشار میں غرق کر دیا۔ وحشی قوموں نے جالسوز ستم کئے۔ بڑی بڑی جنگوں نے دنیا کی روشنی کو تاریکی میں بدل دیا۔ اور اس کو کاملاً تباہ کر دینے کی ٹھان لی لیکن ان تمام بلاؤں اور آفتوں نے ہمیشہ ترقی کے مقصدِ اولی کو فائدہ پہنچایا ہے نسلِ انسانی کا قانون طوفان اور روشنی دونوں سے استفادہ کرنا ہے۔ تمام حوادث کے اندر عمل کرتا ہے۔ ہنگاموں کو استعمال کرتا ہے۔ چنانچہ وہ مفید ہو جاتے ہیں۔ تباہ ہونے کے قابل چیزیں تباہ ہو جاتی ہیں۔ اور ناقابل تخریب اشیا آزاد

ہوجاتی ہیں۔ یہاں تک کہ بعض لوگ تو ان ہنگاموں کو پسندیدہ اور ضروری" ادویہ" سمجھنے لگتے ہیں۔

لیکن ایک بات جو اس پورے عمل کو ضروری اور ممکن بناتی ہے ۔ یہ ہے ۔کہ انسانی ترقی کی حاصل کردہ فتوحات میں سے کوئی چیز کبھی معدوم نہیں ہوتی ۔ وقت اپنے بچوں کو کھا جانے والا عفریت نہیں ۔ تہذیب تباہ نہیں ہوتی تہذیبیں" تباہ ہوتی ہیں ۔ جو چیز موافقت پیدا نہیں کرتی ۔تباہ ہو جاتی ہے لیکن جو ماحول کو سازگار بنا لیتی ہے وہ محفوظ رہتی ہے ۔ مِنووا کی ثقافت پامال ہو جاتی ہے ۔تو وہ دوبارہ ہزار گنا شان و شوکت کے ساتھ یونان میں جنم لیتی ہے ۔یونان تباہ ہو جاتا ہے ۔ تو پوری دُنیا زرخیز اور سیر حاصل ہو جاتی ہے ۔رومی دُنیا وحشی قوموں کے لشکروں کے غیظ و غضب کا شکار ہو جاتی ہے ۔تو زمانہ حال کا یورپ جلوہ گر ہو جاتا ہے ۔ترقی کے اس سفر میں ایک قوم دوسری کی جگہ لیتی رہتی ہے ۔لیکن مسلسل نو ریت میں سے کوئی چیز بھی نابود نہیں ہونے پاتی ۔ ہر بیج جو زمین کے اندر دفن ہو جاتا ہے ۔ پہلے سے بہتر لہلہاتی ہوئی فصل پیدا کر دیتا ہے ۔کلدانی ۔مصری ۔یونانی ۔رومی ۔یورپی قومیں باری باری اس مشعل کو اٹھاتی ہیں لیکن انسانی ترقی کا مشعل بردار جلوس مسلسل رواں رہتا ہے ۔ارتقائی ترقی میں نسلیں اور قومیں افراد ہی کی طرح بے حقیقت ہوتی ہیں ۔ افراد بھی اور نسلیں ۔سلطنتیں اور تہذیبیں بھی گزر جاتی ہیں لیکن انسان آگے بڑھتا چلا جاتا ہے ۔اصل چیز انسان کی مجموعی ترقی ہے ۔ اور اس کی حرکت میں ہم دیکھتے ہیں ۔کہ علیحدہ علیحدہ دھارے مل ملا کر وسیع تر ندیوں کی صورت اختیار کرتے چلے جاتے ہیں ۔ ترقی کا مطلب صرف پیش قدمی ہی نہیں ۔ بلکہ اس کا مقصد روز افزوں توسیع ہے ۔ جو مسلسل طور پر نسل انسانی کو ایک منظم اور مشترک نمو کے وسیع تر دائروں کے اندر شامل کرے ۔ اور صرف درخشاں تہذیبوں اور اعلیٰ درجے کی ثقافتوں

ہی کی تخلیق پہ اکتفا نہ کرے ۔ بلکہ ایک عظیم تر اور بلند تر انسانیت کی طرف لے جائے

۳

ترقی ایک قدر کی حیثیت سے

اب اس سوال کی طرف آئیے ۔ کہ ہم ارتقا کو ترقی کے نام سے موسوم کرنے کا کیا حق رکھتے ہیں ۔ اس کے عمل کو ایک جمالیاتی اور اخلاقی قدر قرار دے کر اس کو "اچھا" اور بہتری کا عمل کیوں کہتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے ۔ کہ یہ تعیّنِ قدر خود زندگی سے متعلق ہے ۔ اور اقدار کے لئے کوئی دوسری وجہ اور بنا موجود ہی نہیں ۔ اس قسم کے تمام اچھے ۔ بُرے ۔ اعلیٰ ۔ ادنیٰ بلند اور پست کے لئے صرف زندگی ہی تنہا معیار اور پیمانہ ہے ۔ زندگی کے فطری و بنیادی محرکات کا حصول "خوب" ہے ۔ اور ان کی ناکامی "ناخوب" ہے ۔ جو چیز اس حصول کو تقویت دیتی ہے یعنی زندگی کے اقتدار کی توسیع میں معاون ہے وہ "خوب" ہے ۔ اور جو چیز اس کو بگاڑتی اور خراب کرتی ہے ۔ وہ "ناخوب" ہے ۔ حقیقت میں ان اقدار بلکہ تمام اقدار کے واحد معنی اور ان کی تنہا بنیاد یہی ہے ۔ ان معنی سے الگ وہ محض الفاظ ہیں ۔ جن کا کوئی مدلول نہیں ۔

آپ یہ کہہ سکتے ہیں ۔ کہ ممکن ہے ۔ خود زندگی ہی ایک عظیم خیانت ، ایک فریب اور ایک بہت بڑی غلطی ہو ۔ لیکن ازراہِ نوازش ذرا یہ غور کیجئے ۔ کہ آپ یہ فیصلہ کسی ایسے غیر معلوم ۔ غیر متعین اور محض خیالی نقطے سے کر رہے ہیں ۔ جو زندگی کے دائرے سے باہر ہے ۔ اور جو فیصلہ آپ کر رہے ہیں ۔ اس کے معنی اسی طرح قطعاً کھوکھلے اور بے مغز ہیں ۔ جیسے کسی زمانے کے متکلمین مابعد الطبیعیات کے جنون میں تمام علائق اور احوال سے باہر بیٹھ کر "واجب الوجود" اور "قطعی الوجود" پر گفتگو کیا کرتے تھے ۔ یعنی خواص و صفات سے الگ ایک شے کا تصور کیا کرتے تھے ۔ آپ آزاد ہیں کہ تمام اقدار سے انکار کر دیں ۔ خوب

ناخوب، اعلیٰ، ادنیٰ کے الفاظ اپنی لغت سے خارج کر دیں۔ گو جب تک آپ زندہ ہیں۔ اپنے وجود کے کسی ثانیہ میں بھی ان اقدار کے "استعمال" سے بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ اور اگر آپ ان الفاظ کو استعمال کریں گے۔ تو صرف اسی صورت میں جائز طور پر استعمال کر سکیں گے۔ کہ آپ اُن معانی کو پیش نظر رکھیں جو خود زندگی کے ناقابلِ تبدیل رجحانات نے اُن کے لئے معیّن کر رکھے ہیں جب (بعض لوگوں کے معمول کے مطابق) انسانی ارتقا کی پوری قدر و قیمت اور اُس کے حاصلات ہی سے انکار کر دیا جائے۔ اور کوئی Nordau یا Carpenter تہذیب کو ایک مصنوعی بیماری قرار دے دے۔ اور طبعی حالات کی طرف مراجعت کرنے کی حمایت کرے۔ تو اس کا یہ رویہ تہذیب کے خلاف بغاوت نہیں۔ بلکہ خود زندگی سے باغی ہونا ہے۔

ہم خوش نہیں ہیں۔ زمانۂ حال کے انسان کو ایسی مشکلات اور ایسے مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ کہ ابتدائی زمانے کا انسان کبھی ایسے پریشان کن اور ہولناک حالات سے دوچار نہ ہوا تھا اور نہ ہو سکتا تھا۔ ہمارے نزدیک اس ابتدائی انسان کے مسائل حیات قابل رشک طور پر سادہ معلوم ہوتے ہیں۔ ہمیں رنج و مایوسی کے ایسے ذرائع سے سابقہ پڑ رہا ہے۔ جو ہمارے وحشی آبا و اجداد کے لئے کوئی وجود نہ رکھتے تھے۔ بلکہ اُن کی سمجھ ہی میں نہیں آ سکتے تھے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے۔ کہ جن حالات کی دُنیا میں وہ لوگ زندگی بسر کر رہے تھے۔ ہم اُن حالات سے بہت آگے بڑھ چکے ہیں۔ اور ہماری مساعی کا میدان بالکل جدید اور وسیع تر دائروں میں منتقل ہو چکا ہے۔ جہاں تمام طاقتوں کو لازماً نئی نئی مخالفتوں پیچیدگیوں۔ رکاوٹوں اور خرابیوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ یہ ہر قسم کی ترقی کا ضروری "جرمانہ" ہے۔ اگر ہم ان سے محفوظ رہتے۔ تو اس کا یقینی مطلب یہی ہوتا۔ کہ ہماری نشو و نما رُک گئی ہے۔ اور ہمارے اندر زندگی کی قوتیں مُردہ ہو رہی ہیں۔ ہر قابلیت کی

نشو ونما اور توسیع کے لئے ضروری ہے۔ کہ درد و تکلیف کی قابلیت بھی نشوونما پائے۔ لیکن اس قیمت اور اس "جرمانے" کے باوجود زندگی اُس کے انعام کے لئے برابر جدوجہد کرتی رہتی ہے۔ اور روسو کے وہ شاگرد جو ہمیں چاروں ہاتھ پاؤں کے بل چلنے کی ترغیب دے رہے ہیں۔ اگر اُن سے یہ کہا جائے۔ کہ ذہنی اور مادی اعتبار سے بحر جنوبی کے آدم خوروں سے اپنی جگہ بدل لیں۔ تو غالباً سب سے پہلے وہی اس سے انکار کر دیں گے۔ اگر ہم "مسرت" ہی کو انسانی اقدار کا معیار تسلیم کریں۔ تو پھر ہم وحشت کی زندگی کے "فطری حالات" پر کیوں ٹھہر جائیں؟ اس معیار کے مطابق صرف یہی نہیں۔ کہ وحشی کا مقام مہذب انسانوں سے بالاتر رکھنا ہوگا۔ بلکہ حیوان کا مقام وحشی سے اونچا اور امیبا کا مقام بلاشبہ حیوان سے بلند تر تسلیم کرنا پڑے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ "غیر موجود" کو جدوجہد اور طلب معاش کرنے والے وجود سے بالاتر رکھنا ہوگا اس سے ظاہر ہے۔ کہ انسانی ترقی سے انکار کرنے والوں کا منطقی مقصود "تاہینی" نہیں بلکہ "نروان" ہے۔

وہ خدائی بے اطمینانی جو زمانہ حال کے حالات کو مطعون و مردود قرار دیتی ہے۔ اور جو اپنے تخلیقی پہلو میں ترقی کی حقیقی محرک ہے۔ اپنی عام اور کہنہ صورت میں جو انسان کی ماندگی اور بے کیفی کی خصوصیت ہے۔ ایک ایسا عمل ہے۔ جو ماضی کو "مسرت" قنوطیت کے رنگوں میں ظاہر کر کے اس کی بدنمائی کو دور کرتا ہے۔ اور صرف اس کی خوشگوار درخشانی اور دلکشی کو قائم رکھتا ہے۔ حقیقی "حال" ہمارے تمام نازک اعصاب پر سوار رہتا ہے۔ اور ہمیں تناؤ اور دباؤ کا مقابلہ کرنے کے لئے انتہائی برداشت اور استقلال سے کام لینا پڑتا ہے۔ اور ہر قدم پر ہمارا جی چاہتا ہے۔ کہ گر جائیں اور زندگی دُنیا اور زمانہ حال کے حقائق پر لعنت بھیجیں۔

جب ہم ماضی کا تصور کرتے ہیں۔ اور اپنے ذہن میں اس کی پسندیدہ

تصویر کے خدوخال جانتے ہیں۔ تو ہمیں مسرت و اطمینان کا احساس ہوتا ہے۔ ماضی ہم پر کوئی دباؤ نہیں ڈالتا۔ ہمیں فکر و تشویش کا شکار نہیں بناتا۔ ہمارے نازک اعصاب کے لئے کوفت کا باعث نہیں بنتا۔ تو کیا ماضی حال سے بہتر نہ تھا؟ یہ وہم و فریب انسان کی ساخت میں مضمر ہے۔ بلکہ خود زندگی کی فطرت کی گہرائیوں میں جڑ پکڑ چکا ہے لیکن جس روشنی میں ہم ماضی کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں۔ اس کی ایک دُھندلی سی تنقیدی کرن بھی اس وہم کے اندھیرے کو دُور کر دینے کے لئے کافی ہے۔ اس امر کا تصوّر کرنا بے حد خوشگوار ہے۔ کہ ہم اپنے تمام موجودہ ذہنی ساز و سامان اور شوق و شغف کے ساتھ مسٹر ایچ جی ویلز کی ایجاد کردہ مشین میں "گاگا" کی سیاحت زمانی سے کس قدر لطف اندوز ہو سکتے ہیں لیکن اپنے آپ کو ذہنی و جسمانی طور پر اپنے تاریخی تصوّرات کی اُن عشرت گاہوں میں منتقل کر دینا "بک" کی سیاحت نہیں۔ بلکہ اُن تمام شکوک و شبہات۔ افکار و تشویشات اور مسائل اور جہالتوں کا سامنا کرنا ہے۔ جو زمانۂ حال کے مقابلے میں زیادہ تکلیف دہ واقع ہوتی تھیں۔ ہمارے سیّاح کے لئے صرف زندگی کی غلاظت و کثافت ہی انتہائی ناگوار نہ ہوگی بلکہ ہمیں معلوم ہوگا۔ کہ ہمارے لئے زندگی کے تمام احوال و کوائف قطعی طور پر ناقابلِ برداشت ہوں گے۔

سوال یہ ہے کہ پریشان کُن زمانۂ حال سے چھٹکارا پانے کے لئے ہم ماضی کا کونسا زمانہ منتخب کریں گے؟ اور اپنی پسندیدہ دُنیا کی تلاش میں اپنے آپ کو کہاں لے کر جائیں گے؟ یونان کو لیجئے۔ پیریکلیس اور ایکروپولس کا ایتھنز۔ اور اس کی اکاڈیمی کے جُھنڈ! ہم اس چھوٹے سے گندے قصبے میں قدم رکھتے ہی ہیں۔ کہ اس کی کچی اور ناپختہ گلیاں نظر آتی ہیں۔ اور ہم گرد و غبار سے اندھے ہو جاتے ہیں۔ آگے بڑھتے ہیں۔ تو کوڑے کرکٹ کے بکھرے ہوئے ڈھیر نظر آتے ہیں۔ اور دُکانوں سے جہاں پیاز کی تھیلیں

بھری ڈوریاں دھوپ میں لٹک رہی ہیں۔ کڑھائیوں کے کڑکڑاتے ہوئے تیل کی بو ہمارے نتھنوں میں داخل ہوتی ہے۔ چوک میں تنگ و تاریک جھونپڑے ہیں جن کے پہلو میں انجیر کے درخت کے پاس گوبر کا انبار پڑا ہے۔ کوئی گھر نہیں۔ کوئی آسائش کی جگہ نہیں۔ بڈھا پوری پیڈیز سلامیس کے اوپر جانوروں کی طرح ایک غار میں رہتا ہے۔ اور وہاں زندہ دنیا کے خلاف صدائے نفرت بلند کرتا ہے۔ لیکن یقین کیجئے کہ اُس کا مسکن ایتھنز کے اکثر باشندوں کے گھروں سے بہتر ہے۔ زندگی خوفناک طور پر غیر یقینی ہے۔ کچھ معلوم نہیں کہ ہم کب کسی تکلیف میں مبتلا ہو جائیں۔ جلا وطن کر دیئے جائیں۔ یا زہر کا پیالہ پینے پر مجبور کر دیئے جائیں۔ یونان کی وہ تمام غیر فانی تخلیقات۔ ایسکیلی ناٹک۔ مکالماتِ فلاطون۔ پارتھینان۔ وہ فکر و فلسفہ۔ وہ فن۔ وہ شعر جن کی تسکین بخش متانت ہمیں خدائی سکون و اطمینان سے بہرہ اندوز کر رہی ہے۔ تمام ایسے حالات میں معرضِ وجود میں آتے تھے۔ جو دور دہشت سے مختلف نہ تھے۔ یعنی یہ سکون و متانت بولشویکی حالات کی پیداوار تھی۔ اس کے علاوہ جنگ ہر وقت ملک کے دروازوں پر دستک دیتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ کل کی بات ہے۔ جنگ خود ہمارے دروازوں پر بھی پہنچ گئی تھی۔ نہایت ہولناک اور مہیب جنگ : اور ہم پوری تاریخ میں اس کے اعادے کے عادی ہو چکے ہیں۔ لیکن ہم اپنی حالیہ جنگ میں اس امر کا تصور نہ کر سکتے تھے۔ کہ جرمنی فتح پانے کی حالت میں لندن کو بالکل نابود و معدوم کر دے گا۔ ہر چھوٹے بڑے مرد کو تہ تیغ کر کے اور عورتوں اور بچوں کو غلام بنا کر بیچ دے گا۔ لیکن یہی طرزِ عمل تھا۔ جو ایتھنز والوں نے میلوس۔ شیون۔ ہسٹیا اور دوسرے یونانی شہروں کے ساتھ روا روا رکھا۔ اور یہی طریقہ تھا جس کے استعمال کا فیصلہ اُن لوگوں نے ایکرو پولس کے سائے تلے مائیٹلین کے متعلق کیا۔ تمام باشندے غلام بنا کر فروخت

کر دیئے گئے۔ باپ ۔ ماں ۔ بھائی ۔ بہن ایک دوسرے سے الگ کر کے ڈیلوس کے بازاروں اور علاقہ لیوان کے قحبہ خانوں میں بکھیر دیئے گئے یہ طریقہ تھا جس سے پیریکلیس کے زمانے کے یہ دیوتا سروپ یونانی یونان کے مفتوح و مغلوب شہروں کے ساتھ سلوک کرنے کے عادی تھے ۔ ابھی تک ہمارے اخبار "ڈیلی میل" نے یہ خیال ظاہر نہیں کیا ۔ کہ جرمنی کے وحشی "ھن" بھی وہی طریقہ اختیار کریں گے ۔ جو بوری پیڈیز اور افلاطون کے ہم وطنوں نے اختیار کیا تھا ۔

پھر کیا ہم اپنے لیئے امپیریل روما میں مسکن منتخب کرنا پسند کریںگے ۔ جب انٹونینس کے زمانے میں روما اپنے اوج کمال پر تھا ۔ اور جس کو تاریخ انسانی کا انتہائی خوشحال و شادمان زمانہ قرار دیا گیا ہے ؟ اُس زمانے میں روما کی تنگ اور پیچیدہ گلیاں دن دہاڑے بھی محفوظ نہ تھیں ۔ ہر قسم کے چور ۔ رہزن گرہ کٹ ہر جگہ کثرت سے موجود تھے ۔ یہاں تک کہ اچھے خاصے معزز شرفا جن کی انگلیاں انگشتریوں سے آراستہ ہوتی تھیں ۔ آپ کے ہاتھ کو بوسہ دیتے وقت ایک آدھ چیز اڑا لینے کے عادی تھے ۔ اور رات کے وقت تو لاٹھیوں سے مسلح ملازموں کی ایک پوری قطار ساتھ لئے بغیر گھر سے باہر نکلنا قطعی طور پر حماقت سمجھا جاتا تھا ۔ لوگ یونہی دفعتًہ غائب ہو جاتے تھے ۔ اور جب کبھی نوٹینین مارش یا ولیجرنس کے قلعوں کی فوج ڈاکوؤں کے جتھوں کو اپنے علاقوں سے نکال دیتی تھی ۔ تو وہ بیچ بیچ شہر پر ہی قبضہ کر لیتے تھے ۔ اُس زمانے میں کوئی جنگ نہ تھی ۔ "رومن امن و امان" کا دَور دَورہ تھا لیکن تحقیق و استفسار کے قوانین ۔ لوگوں کے اندرون خانہ معاملات کے متعلق حکومت کا تجسس ۔ "اشیائے تعیش" پر ٹیکسوں کی بھرمار ۔ اشیائے خوردنی کی ناقابل برداشت قیمتیں ۔ سمندر کے غیر یقینی وسائل نقل و حمل کے ناکام رہنے پر قحط و ناپابی اور پھر خوراک کے کارڈ (راشن کارڈ) غرض ذاتی مشکلات اور دشواریوں کی کوئی

انتہا نہ تھی۔ ہر گھر میں اور ہر سرائے میں جاسوسوں اور مخبروں کا ایک ہمہ گیر نظام اور خفیہ پولیس کا عمل دخل سخت وحشت انگیزی کا باعث تھا۔ کسی جگہ بھی آزادی سے بات چیت کرنا ممکن نہ تھا۔ تمام مصنفین نے اتفاق رائے سے اس صورت حال پر فریاد وفغاں کی ہے۔ ٹیسی ٹس لکھتا ہے "آزادانہ سوچنا اور بات کرنا قطعاً ناممکن ہے" فلوس ٹرمبیٹوس کا خیال یہ ہے کہ اگر موت کی خواہش نہیں رکھتے۔ تو کسی قسم کی جدت کا خیال بھی ذہن میں نہ آنے دو۔" ایپک ٹیٹس نے لکھا ہے کہ "کسی شخص پر بھی اعتبار نہ کرو۔ کیونکہ اس طرح تم بے خبری ہی میں فوجی سپاہیوں کے جال میں پھنس جاؤ گے۔ ایک افسر عام غیر فوجی لباس میں تمہارے پاس آ بیٹھتا ہے۔ اور شہنشاہ پر نکتہ چینی شروع کر دیتا ہے۔ تم بھی آزادی سے اپنا خیال ظاہر کر دیتے ہو۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ تم کو ہتھکڑی بیڑی پہنا کر جیل میں بھیج دیا جاتا ہے" کیا ہمیں ازمنہ مظلمہ کو پسند کرنا چاہیئے؟ آگے چل کر ہم اُس زمانے کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کریں گے۔ یا کیا ہم یورپ کی بیداری کے آغاز کا زمانہ پسند کریں گے۔ مثلاً دانتے کے فلارنس کا زمانہ؟ دانتے خود اس کے متعلق کلمہ خیر نہیں کہتا۔ اور بحیثیت مجموعی اس کی سفارش نہیں کرتا۔ زمانہ احیائے علوم کا روما۔ پیرس؟ ٹیوڈر زمانے کا لندن؟ جس میں ٹاور کے جیل خانے اور جلاد کی تلوار کا سایہ ہر بڑے آدمی کی زندگی پر اور پھانسی کا سایہ ہر غریب آدمی پر پڑ رہا تھا۔ لہٰذا ان مقامات کو پسند کرنے کی بھی کوئی وجہ نہیں۔

اب آپ دُنیائے حاضرہ کے کنارے پر یعنی سترھویں صدی میں پہنچ جائیے۔ اور فوراً *Roi soleil* کے دربار میں آئیے۔ جو نئی روشنی کا مرکز تھا۔ اور ساری دُنیا کے لئے تہذیب وشائستگی اور شان وشوکت کے معیار قائم کر رہا تھا۔ بلاشبہ اُس زمانے میں بدرروئیں عام طور پر ٹوٹی ہوئی

تھیں۔ اور اکثر شرفا اپنے طبیبوں اور عطاروں کی توہمات کا شکار ہو رہے تھے۔ بادشاہ اور دربار شاہی کی عالی مرتبہ خواتین "پائیوریا" میں مبتلا تھیں۔ جس کی وجہ سے اُن کے سانس میں نہایت مکروہ بدبو پیدا ہو رہی تھی۔ اور چونکہ خواتین مردوں کی طرح اپنے سر نہیں مُنڈاتیں۔ اس لئے بعض اوقات حیرت انگیز باتیں دیکھنے میں آتی تھیں۔ لوگ اپنی انگلیوں سے کھانا کھاتے تھے۔ اور "موسیو" کا ہیٹ جسے وہ میز پر بھی پہنے رہتا تھا بہت زیادہ سلام کرنے کی وجہ سے چکٹ سا ہو جاتا تھا۔ لیکن آپ گھبرایئے نہیں۔ یہ محض بے حقیقت تفصیلات ہیں۔ ہمارا ان سے کوئی تعلق نہیں ہم تو ذہنی آزادی۔ ذوقِ صحیح۔ خوب صورت زندگی اور بلند مقاصد کی تحریک کے آرزومند ہیں۔ لیکن اس اعتبار سے بھی یہ جگہ قطعاً غیر موزون ہے۔ کیونکہ جو لوگ ذہنی طور پر آزاد تھے۔ وہ جہالت اور عدم رواداری کا شکار ہو کر جیل خانوں میں بند تھے۔ یا خوف و دہشت کی وجہ سے اپنے مسوّدات کو نذرِ آتش کر رہے تھے۔ یا ہالینڈ میں جا کر خفیہ طور پر زندگی بسر کر رہے تھے

ہمارا دائرہ انتخاب اب بہت ہی محدود ہو گیا۔ سچ تو یہ ہے۔ کہ کوئی ایسا زمانہ موجود نہیں جس کے حالات کا نقشہ معلوم ہو جانے کے بعد ایسے ہوں کہ ہمارے احساسات کو صدمہ نہ پہنچائیں۔ اور ہمیں غیظ و نفرت سے معمور نہ کر دیں۔ یہ تمام زمانے حالات آج کل کے لوگوں کے لئے فی الحقیقت قابلِ برداشت نہیں ہو سکتے۔ اس کو بھی چھوڑ دیجئے۔ ذرا یہ بتایئے۔ کہ ہم میں سے کتنے ہیں۔ جو ملکہ وکٹوریا کے زمانے کے وسط میں زندگی بسر کرنا چاہیں۔ اور اُن حالات کو گوارا کریں۔ جو ابھی ہمارے حافظہ میں تازہ ہیں

بعض لوگ عامیانہ انداز سے "ترقی" اور "تہذیب" (یہ الفاظ بلاشبہ اخبارات اور سیاسیات کی ہنگامہ آرائی کی وجہ سے بہت ہی پست اور مبتذل ہو چکے ہیں) کی ہنسی اُڑاتے ہیں۔ اور ناک بھوں چڑھا کر کہتے ہیں۔ کہ یہ "تہذیب"

فطرت انسانی جیسی متین اور غیر منفک چیز پر محض بیرونی اور سطحی رنگ روغن کا حکم رکھتی ہے۔ وہ لوگ آج کل کے زمانے میں اس تضحیک کے ساتھ صدگونہ طنز و استہزا بھی شامل کر رہے ہیں۔ کیونکہ تباہی کی قوتوں نے آج کل قیامت مچا رکھی ہے۔ اور دُنیا کو تباہ و برباد کر دینے کا تہیہ کر رکھا ہے۔

اس مظلومی کو کیوں قبول کیا گیا۔ اور یہ جنگ کس لئے چھیڑی گئی؟ کیا اس کا صرف یہ مقصد نہ تھا۔ کہ انسانی ترقی کا ورثہ محفوظ رہے۔ اور دُنیا پہلے سے بہتر ہو جائے؟ جنون و دیوانگی کی یہ طاقتیں ہزاروں دوسرے عیوب و امراض کے ساتھ (جو ماضی کی یادگار رہتے) مادی طور پر پھوٹ پڑنے سے پہلے ہی ہماری ناپختہ و ناتکمل انسانیت کے اندر موجود تھیں۔ اُبل رہی تھیں اور پک رہی تھیں۔ ہم انسانی ارتقا کے ایک بے حد نازک بُحران کے اندر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ پھر بھی یہ بُحران نشوونما کے عمل عروج کا ایک حصّہ ہے کیونکہ یہ اُس کے تخریبی پہلو کی انتہائی شدّت کا مظہر ہے۔ اور جن ابوالہولی معمّاؤں کو ہمارے سامنے پیش کر رہا ہے۔ وہ نہایت پریشان کُن اور جابرانہ واقع ہوتے ہیں۔

اس لئے اب ہمارا بے حد ضروری وظیفہ یہ ہے۔ کہ اپنی انتہائی استعداد کے مطابق اس ارتقا کی نوعیت کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ جس کے قوانین عالمِ انسانی کی تقدیروں کی تشکیل کرتے ہیں۔ اس رفیع و پیچیدہ اور خوفناک عمل کے اندر ناقابل بیان لمبے۔ مہیب مصائب۔ ذلت۔ فرومائگی۔ غلاظت اور دناءت کے طوفان برپا ہیں۔ جن کے درمیان انسان (اپنی تمام کمزوریوں اور حماقتوں کے باوجود) جد وجہد کر رہا ہے۔ کہ اپنے آپ کو درندے سے دیوتا بنا دے۔ اب سوال یہ ہے کہ اُس نے یہ کام کیونکر کیا؟

دوسرا باب

تاریخ کی تعبیرات

۱

در نموئی نظریات ۔ ذہن ۔ نسل

یہ سوال غور و فکر کے لئے نہایت مہتم بالشان ہے۔ لیکن اس کا جواب نہایت سادہ ہے۔ اور اس قدر واضح ہے۔ کہ اس کی دریافت کے لئے کسی تعمق کی ضرورت نہیں۔ تاہم ایک روشن اور واضح صداقت کی حیثیت سے اس کو تسلیم کرنا تو درکنار۔ غیر مبہم وضاحت کے ساتھ اس کی قطعی تشکیل بھی نہیں کی گئی۔ بلکہ اس کے برعکس معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس سیدھے سادے جواب کو جان بوجھ کر ٹالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور اس کی جگہ عمیق، مشرح اور پیچیدہ تصریحات اور تاریخ کے نظریات اور فلسفوں کی وہ بھرمار کی گئی ہے۔ کہ سارا معاملہ الجھ کر قطعی طور پر دھندلا ہو گیا ہے۔ کوئی ایسی علمی تحقیق نہیں یہاں تک کہ مابعد الطبیعیات کی علت العلل کی تفتیش بھی، جس کے متعلق فکر انسانی اتنا کمزور اور غیر موثر رہا ہو۔

اگرچہ اس بھول بھلیاں کو محض پہلے سے قائم شدہ خدائی سکیم سے متعلق قرار نہیں دیا گیا (جیسا کہ آگسٹین اور بعد میں بوسوے اور شلیگل کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے) لیکن ابتدا میں جتنی کوششیں اس نقطۂ نظر سے

کی گئیں۔ کہ اس عقدے کا کوئی نہ کوئی خاکہ اور منصوبہ ضرور موجود ہے۔ ان تمام کوششوں میں یہی فرض کیا گیا۔ کہ یہ ذہن انسانی یا اس کے کسی پہلو کی بے نقابی ہے۔ جو کائنات محیط سے علیحدہ اور خود مختار حیثیت میں واقع ہوتی ہے یہ لوگ کسی ایسی علت کے متلاشی تو رہے جس کی بنا پر واقعات کی یکساں تعبیر کی جا سکے لیکن علائق اور ماحول کی ان کیفیتوں کو کاملاً نظر انداز کر گئے جن کے درمیان، عالم انسانیت ردّ عمل کا ثبوت دیتا ہے۔ یہ مثالی تصورات جن کے ساتھ "خدائی سکیم" اور "روشنی کی مملکت" کے تخیلات بھی شامل ہوتے رہے۔ جرمن فلسفے کی لطیف فضا میں کانٹ۔ لیسنگ اور شیلنگ سے نیچے اترتے ہوئے مطلق و نامحدود" کے دھندلکوں میں ہیگل کے "Idea" کے موضوعی انکشاف تک پہنچ گئے۔

انسانی نشو و ارتقا کے ماحولی اثرات سے یہ تغافل اور بے پروائی آج کل کے زمانے میں بھی (مثلاً جرمن مولد و منشا کے تصور میں) موجود ہے جس کی بنا پر پرانے جنگی فاتحوں کے غرور نسل کا ترفع کیا جا رہا ہے۔ اس کو ناقابل تبدیل استحکام کی وہی وجہ تصور کیا جا رہا ہے۔ اور تاریخ انسانی کا سب سے بڑا فیصلہ کن مؤثر تسلیم کیا جا رہا ہے۔ نسل پرستی کے علمبردار خالص سائنسی مصطلحات کو نہایت شان سے استعمال کرتے ہیں۔ کھوپڑیوں کی پیمائش۔ بالوں کے رنگ کے اختلاط۔ مینڈل کے نظریات وراثت نسلی اور "نابغوں کے اعداد فی مربع میل" پر بحث کرتے ہیں۔ اور وائسمان (Weismann) کے حیاتیات میں ماحول کے اثر کو نظر انداز کر کے "وراثت" کو ترجیح و برتر ثابت کرنے کے جو دلائل دیئے گئے ہیں۔ ان سب کو صف آرا کر کے نسل پرستی کا "پیغمبر" یہ ثابت کرتا ہے۔ کہ دنیا کی ہر قابل قدر چیز اور ہر قابل ذکر شخصیت اسی خاص نسل کی پیداوار ہے جس سے خود اس (پیغمبر) کا تعلق ہے (ٹیوٹن۔ بربری۔ نورڈک یا جو بھی نسل ہو) وہ کہتا ہے کہ یونانی، اور یسوع مسیح اور دانتے سب کے سب جرمن تھے۔ یا یہ کہ ماکنگ اطالوی تھے۔

یا یہ کہ تہذیب شمال سے جنوب کی طرف گامزن ہوئی تھی ۔ یا جنوب کی طرف سے شمال کی طرف بڑھی تھی ۔ اور یہ نسل کی پاکیزگی کا یا نسلوں کے باہمی اختلاط کا نتیجہ ہے ۔" نسل ہی ہر چیز ہے تجسس و تفحص ختم ہوا عظیم اسباب و علل کا ماخذ یہی ہے" لہ ۔ ہر تاریخی واقعہ کی تعبیر کی کلید یہی ہے ۔ مثلاً " روما میں طبقۂ امرا اور طبقۂ عوام کے جھگڑے بین طور پر محض اس لئے پیدا ہوتے ۔ کہ وہاں دو الگ الگ اور متصادم نسلیں پہلو بہ پہلو آباد تھیں " ۔ ایک دلچسپ بات یہ کہی جاتی ہے ۔ کہ " نئی دنیا کے اولین فاتح نورڈک نسل سے تھے ۔ لیکن اُن کا خالص خون نئے ماحول کی وجہ سے زیادہ مدت تک باقی نہ رہا ۔ چنانچہ آج وہ کالمعدوم ہو چکے ہیں ۔ ان حقائق پر غور کرنے کے بعد ہمیں ہسپانیہ کے زوال کے اسباب دریافت کرنے کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی" ۔ ٢ٍه سچ ہے ۔ یہ واقعی غیر ضروری بات ہے ۔ یہ عقیدہ وطنی پندار کے لئے تو موجب تقویت ہے ہی ۔ وقت اور محنت بچانے میں بھی بڑا کارآمد ہے ۔ اب ہم "یونانی نابغہ" کو یونان سے منسوب کر سکتے ہیں " رومن نابغہ" کو روما سے " اینگلو سیکسن نسل کے نابغہ" کو انگلستان سے ۔ " سامی نسل کے نابغہ" کو عقیدۂ توحید سے متعلق قرار دے سکتے ہیں ۔ بالکل اُسی طرح جیسے مولیئر کے ڈرامے میں ایک ڈاکٹر افیم کی " خاصیت ہم خوابی" کو واضح کرتا ہے ۔

" نسل" یا " وراثت" حقیقت میں اسلاف کے ان تاثرات کا مجموعہ ہے ۔ جو زمانۂ ماضی کے ماحول سے پیدا ہوتے تھے ۔ لہذا نسل اور وراثت صرف تبدیل شدہ حالات ہی کے ماتحت مستحکم اور مستقل ہوتی ہے ۔ (نسل کے علم بردار جن ناگوار حقایق کو نظر انداز کر دیتے ہیں ۔ انہی سے یہ امر ظاہر ہے) اور ان کے استحکام کا تناسب ابتدائی تاثرات کی گہرائی ۔ اُن کے عمل کی مدت ۔ اور ان نئے تاثرات

لہ Taine, History of English literature

٢ٍه The Passing of the Great Race - Madison Grant صفحات ۱۲۹ - ۱۲۷

کی اضافی قوت اور پائداری پر موقوف ہے۔ جو ان کو ترمیم کر سکتے ہیں عضوی دُنیا میں دوسرے امور کی مانند نسلیں اپنے نشو ونما کے دوران میں ایک دوسرے سے الگ ہو جاتی ہیں۔ اور ذہنی و جسمانی اعتبار سے بالکل متفاوت اور ممیز نوعیتیں اختیار کر لیتی ہیں۔ لیکن انسانی ارتقا نتائج کی خاص نوعیت اور اُن کی ترسیل کے انداز کی وجہ سے نوع انسانی کی بڑی بڑی نسلوں کی چند ہی علیحدگی کے اثبات حیوانی دُنیا کی علیحدگی کی مقدار یا اُس کے استحکام کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

(۲)

برنموی نظریات جغرافیائی اور اقتصادی جبریت

علت و معلول کا حقیقی سلسلہ اس وقت سمجھ میں آتا ہے جب توجہ ذہن اور نسل پر مرتکز ہونے کے بجائے اس ماحول کی طرف مبذول ہوتی ہے جس سے یہ چیزیں متاثر ہو کر نشو و نما حاصل کرتی ہیں۔ Buckle نے کسی قوم کی تاریخ اور اُس کے مسکن کے جغرافیائی حالات کے درمیان رشتے کا ذکر کیا ہے۔ اگرچہ اس کے بعض ثبوت۔ اور بعض مثالیں لامارک کی طرح ابتدائی اور خام معلوم ہوتی ہیں لیکن اس کے برعکس اس کے دعاوی میں اعتدال ہے۔ کیونکہ اس نے اس اثر و ترقی کے ابتدائی مراحل تک ہی محدود رکھا ہے۔ یونان۔ مصر اور ہالینڈ کے جغرافیوں کے درمیان بلاواسطہ اور اولی تر تعلق کا معاملہ تو سرسری نظر ہی سے واضح ہو جاتا ہے۔ یہ چیز ہر ملک پر صادق آتی ہے۔ اور کسی اعتبار سے کسی ایک مرحلہ نشو و نما تک محدود نہیں۔ پہلے سے Whig (وہگ) قدامت پسند نظریہ پسندوں نے مدتوں پیشتر یہ ظاہر کر دیا تھا کہ انگلستان اور اس کے آزادات کی سیاسی نشو و نما اس کی نسلی خصوصیات ہی کا نتیجہ نہ تھی۔ بلکہ انگلستان کے الگ تھلگ موقف کی وجہ سے تھی۔ جس نے مرکزی حکومت کو مستقل اسلحہ بندی اور فوقیت و برتری کے حیلے بہانے سے محروم رکھا تھا۔ لیکن اسی طرح

انگلستان کی نوعیت کے ہر خصوصی خد و خال کا سراغ انہی حالات کے نتائج میں مل سکتا ہے۔ تاریخ (جیسا کہ Ratzel اور Demolins کے پیروؤں نے کسی قدر مبالغہ سے اعلان کیا ہے) جغرافیہ ہی کا وظیفہ ہے۔

لیکن انسانی تعلقات پر عام جغرافیائی حالات سے جو اثرات مترتب ہوتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں ماحول کے موثرات زیادہ گہرے۔ ہمہ گیر اور دُور رس واقع ہوتے ہیں۔ انسان کی زندگی بالآخر اس کی روٹی اور مکھن پر منحصر ہے۔ اور ان کو حاصل کرنے کے طریقے ہی سے سانچے میں ڈھلتی ہے کسی قوم کا کردار اور اس کی نشو و نما کی رفتار بھی اسی طرح مختلف ہے۔ اور اس امر پر منحصر ہے۔ کہ وہ زندہ رہنے کے لئے زراعت یا تجارت یا جنگ پر کس حد تک انحصار رکھتی ہے لیکن صرف یہی نہیں۔ کہ کسی معاشرے کا پورا اسلوب حیات اس کے ذریعۂ معیشت ہی سے معیّن ہوتا ہے۔ بلکہ اس کے حصول میں محنت کے جو مختلف طبقات کارفرما ہوتے ہیں۔ ان سے عوامل کا ایک نیا نظام بھی قائم ہوتا ہے۔ دولت اور طاقت بعض طبقوں کے ہاتھوں میں جمع ہو جاتی ہے اور اس طرح متصادم مقاصد و اغراض وجود میں آجاتے ہیں۔ لہذا یہ انسانی ماحول اثرات کا ایک ایسا نظام قائم کر دیتا ہے۔ جو پورے نظام معاشرہ کو خاص سانچے میں ڈھال دیتا ہے۔ اور ذہنی کائنات کے وہی خد و خال اور ان خیالات و نظریات کے ہوتے ہیں جن کے متعلق مابعد الطبیعیات کے علم برداروں کا خیال ہے۔ کہ وہی پورے عمل پر حکمرانی کرتے ہیں۔ اور پست واسطے کے مادی حالات سے بہت بلند و بالا ہوتے ہیں۔ خود بھی انہی حالات و کیفیات سے متاثر ہوتے ہیں۔ تمام وہ تصورات۔ خیالات۔ عقائد۔ تعصبات۔ بصیرت و کردار کے معیار۔ ادبیات۔ فلسفہ اور اخلاق قومی غرض ہر شئے انہی مقاصد حاکمہ کی نوعیت کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے۔ جن کو مادی حالات قائم و مسلط کر دیتے ہیں۔
ان اصول کو سب سے پہلے مارکس اور اینجلز نے قطعی تشکیل دی۔ اور

ماحول کے متعدد حالات کو فرق و تفاوت کے تعین کا ذمہ دار ہونے کی حیثیت سے تسلیم کیا۔ یہاں سے گویا تاریخی تعبیر کے سائنسی اسلوب کا آغاز ہوا۔ "تاریخ کے مادی یا معاشی نظریے کو اس کے مداح انیسویں صدی کے انکشافات میں سے قرار دیتے ہیں۔ اور سب سے زیادہ قابلِ لحاظ یہ امر ہے۔ کہ اگرچہ اس نظریہ نے نازک سے نازک روایتی جذبات کو اور اس پورے نظامِ افکار کو رجو علمی خوش اطواری کا عزیز ترین سرمایہ تھا) نہایت بیدردی سے رد کر دیا۔ لیکن اس کے باوجود اس کا اثر تازہ تاریخی تحقیقات میں نہایت سرعت کے ساتھ محسوس کیا جانے لگا۔ اور اب تقریباً ہر جگہ اس حقیقت کو تسلیم کیا جا رہا ہے۔ کہ کسی خاص زمانے یا خاص قوم کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے ایسی ضروری اساس اس کے مابعد طبیعی تصورات یا اس کی سیاسی صورتِ حالات پر نہیں۔ بلکہ اس کے اقتصادی حالات پر رکھنی ضروری ہے۔

لیکن جو خاص سوال ہم نے پیش کیا تھا۔ کہ انسانی ترقی کن ذرائع و وسائل سے متاثر ہوتی ہے" یا دوسرے الفاظ میں "ترقی پذیر نشو و ارتقاء کے اسباب کیا تھے"؟ اس سوال کے حل میں تاریخ کا معاشی نظریہ ایک اعتبار سے بہت ناقص ہے یعنی قطعی طور پر غیر متعلق ہے۔ اس سے حقیقتِ ترقی کی کوئی تشریح و تصریح نہیں ہوتی۔ اس امر کی کوئی واضح اور قابلِ فہم وجہ نظر نہیں آتی کہ پیداوار اور تقسیم کے حالات بدل جائیں۔ تو ترقی مسلسل جاری رہتی ہے۔ اس میں شک نہیں۔ کہ اس اصول نے "تاریخ کے پیچیدہ حقائق پر بہت تیز روشنی ڈالی ہے لیکن ایک سب سے بڑی اور سب سے زیادہ بنیادی حقیقت کے متعلق کوئی بصیرت مہیا نہیں کی۔ جہاں تک مجھے علم ہے۔ اس نظریے کے حامیوں نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا۔ کہ انھوں نے مسلسل ترقی و پیش قدمی کی کوئی وجہ موجہ مہیا کی ہے۔ بلکہ مختلف تغیرات جن کو یہ لوگ تبدیل شدہ اقتصادی حالات کے اثرات قرار دیتے ہیں مثلاً ابتدائی اشتراکی تعلقات کی تخریب۔ طبقاتی قوت

کی مختلف شکلوں کا ظہور یعنی جاندار کی نشو و ارتقا۔ اور ذی اقتدار مفادات کے مطابق سیاسی۔ فکری اور اخلاقی معیاروں اور تصوروں کی تشکیل ایسے تغیرات ہیں جن پر وہ بہر حال اظہار تاسف کرتے ہیں جیسں حد تک اقتصادی حالات کی مختلف الاجزا نشو و نما اور انسانی ترقی کی حقیقت عظمٰی کے درمیان کوئی تعلق ظاہر ہوتا ہے۔ اول الذکر کسی وسیلے یا علت صحیحہ کے بجائے رکاوٹ ہی کا کام کرتی ہے۔ ترقی اس نشو و نما کے نتیجے کی حیثیت سے نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کے باوجود ہوتی ہے۔

(۳)

تدریجی عملیات میں تسبیب و علّیت

نشو و ارتقا کی ترقی پسند نوعیت کا سبب تلاش کرنے کے لئے یہ ضروری ہے۔ کہ ہم پہلے قطعیت کے ساتھ یہ سمجھ لیں۔ کہ اس سلسلے میں ہم کس چیز کو سبب یا علت قرار دیں گے۔ انسانی ارتقا بلکہ تمام ارتقائی عملیات میں تسبیب کا مسئلہ بے حد پیچیدہ اور اُلجھا ہوا ہے۔ آخر لفظ "سبب" سے کیا مقصود ہے؟ "اتفاق" کا تصوّر کیا ہے؟ ان الفاظ نے ذہن کے سامنے جو تاریک اور عمیق گڑھے پیش کر دیئے ہیں۔ اُن کا کیا علاج ہے۔

اگر تسبیب و تعلیل کی نوعیت کو علی العموم دیکھا جائے۔ تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے۔ کہ ہم کسی علت اور اس کے معلول کے تعلق کو نہیں جانتے۔ بلکہ ہم صرف تسلسل اور اس کے قرار کو دیکھتے ہیں۔ تسلسل کی برقراری سے ہم اس امر کا اندازہ تو کر سکتے ہیں۔ کہ علت و معلول کے درمیان تعلق موجود ہے۔ لیکن اگر ہم اس تعلق کی نوعیت سے باخبر ہو تے۔ تو گویا کائنات کے اندرونی راز سے واقف ہو جاتے۔

اگر ہم وضاحت اور صفائی سے غور کریں۔ تو "اتفاق" کے تصور کو سمجھنے

میں کوئی خاص دشواری حائل نہیں ہوتی۔

یہ بیا بر کہا جا رہا ہے۔ اور اس کو بڑی دانشمندانہ بات سمجھا جاتا ہے۔ کہ جب کوئی لفظ "اتفاق" استعمال کرتا ہے۔ تو گویا صاف اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ وہ تسلسل واقعات کی علتِ صحیحہ سے بالکل بے خبر ہے۔ یہ دانشمندانہ بات "قطعی طور پر غلط ہے۔ جب ہم کسی سلسلۂ واقعات کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ اُن کا ظہور "اتفاق" سے ہوگیا ہے۔ اور اس کو کسی مخصوص وجہ سے معیّن نہیں کرتے۔ تو ہمارے ذہنوں میں ایک قطعی اور صحیح امتیاز ضرور موجود ہوتا ہے۔ ہمارا مطلب یہ ہوتا ہے۔ کہ حالات و کیفیات کے اُس ہجوم میں جو کسی اتفاقی واقعہ کے وقوع کو ممکن بناتے ہیں۔ کوئی بھی ایسا نہیں۔ جو نتیجے کے ساتھ کوئی مستقل رابطہ رکھتا ہو۔ اگر ہم ایک سکّے کو گھما کر پھینکیں۔ تو "شیر یا زنجیر" کو سامنے لانے والے بے شمار قوا میں سے کوئی ایک حالت یا چند حالات "شیر" کے نتیجے یا "زنجیر" کے نتیجے سے ایسا رابطہ نہیں رکھتے۔ کہ وہ ہمیشہ "شیر یا زنجیر" ہی کو سامنے لائیں۔ ایک نتیجے سے مختلف اور دوسرے نتیجے کے مطابق جو نعیینی حالات ہیں۔ ان کے درمیان کوئی مقررہ اور لازمی رابطہ نہیں۔ کوئی ایسا تعلق نہیں۔ جو علّت و معلول کی طرح قطعی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ ان حالات میں سے کوئی حالت دوسری کیفیتوں کے ساتھ مل کر کبھی "شیر" کے حق میں اور کبھی "زنجیر" کے حق میں فیصلہ کر دے۔ ہر عامل سبب اور ہر نتیجے کے درمیان کوئی بلاواسطہ اور استوار تعلق قائم نہیں۔ بلکہ قطعی طور پر غیر یقینی ہے۔ یہاں تک کہ اگر سکّے کو مدت دراز تک گھما گھما کر پھینکتے رہتے۔ تو وہ غیر یقینی حالات ایک دوسرے کو بے اثر کر دیں گے۔ اور "شیر" بھی اتنی ہی دفعہ آ وپتا ئے گا۔ جتنی دفعہ "زنجیر" آئے گا۔

لیکن اگر ہم سکّے کو بار بار گھما کر پھینکیں۔ اور نتیجہ ہر دفعہ ایک ہی نکلے۔ تو ہمیں فوراً بدگمانی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور شبہ ہوتا ہے کہ حالات خالص "اتفاقی" نہیں

ہیں۔ اگر ہم اس تجربے کو بار بار بے شمار دفعہ دُہراتے چلے جائیں۔ اور سکہ ہمیشہ "شیر" ہی دکھاتا رہے۔ تو ہمارا یہ شبہ یقین میں بدل جاتا ہے۔ کہ کوئی ایسا سبب مصروف عمل ہے۔ جو ہمارے تصور "اتفاق" کے ماتحت نہیں آتا بلکہ ایسا ہے جس کا تعلق براہِ راست مستقل نتیجے سے ہے۔ اگر سکے کو غور سے دیکھنے پر ہمیں معلوم ہو جائے۔ کہ اس کی ساخت میں ایک طرف کوئی بوجھ بھرا ہوا ہے۔ تو ہم نتیجے کے متعلق "اتفاق" کا لفظ استعمال نہ کریں گے۔ گویا بھرے ہوئے سکے اور نتیجے کے درمیان ایک بلاواسطہ اور مستقل تعلق موجود ہے۔ اور دوسرے حالات اور اُن کے نتیجے کے درمیان کوئی ایسا تعلق موجود نہیں۔ اس بلاواسطہ اور مستقل تعلق کا وجود ہی پورے سلسلۂ تجربات کے "مستقل رجحان" کو معین کرتا ہے۔ جہاں کہیں کسی سلسلہ واقعات میں "مستقل رجحان" نظر آئے۔ تو سمجھ لیجئے۔ کہ کوئی نہ کوئی مستقل سبب ہے جس کا براہِ راست اُس رجحان سے تعلق ہے۔ وہ سبب ہمیشہ ایک خاص نتیجے ہی کو پیدا کرنے میں کوشاں ہوگا۔ خواہ دوسرے حالات کا اثر کچھ بھی ہو۔ غیر یقینی حالات یعنی وہ حالات جو مستقل و متواتر نہ ہوں۔ اور کسی خاص نتیجے سے کوئی بلاواسطہ تعلق نہ رکھتے ہوں۔ اور اشتراک و اختلاط کے کسی طریقے کے مطابق غیر یقینی طور پر کبھی ایک نتیجہ پیدا کر دیں یا دوسرا نتیجہ دکھا دیں۔ وہ کسی "مستقل رجحان" کو پیدا نہیں کر سکتے۔ بلکہ کچھ مدت کے بعد ایک دوسرے کو بے اثر ضرور کر سکتے ہیں۔ وہ نتیجے کے لئے سامان پیدا کر دیتے ہیں۔ لیکن مستقل طور پر اسے معین نہیں کر سکتے۔ ایک وقت وہ اس کی تائید کریں گے۔ دوسرے وقت مخالفت کریں گے۔ مستقل اور بلاواسطہ عامل کو ماحول کی ان کیفیات سے مدد بھی مل سکتی ہے۔ اور مزاحمت بھی ہو سکتی ہے۔ وہ اُن سے کام بھی لے سکتا ہے۔ اور اُن کے خلاف بھی ڈٹ سکتا ہے۔ لیکن معین اور مستقل رجحان کسی معین اور مستقل عامل ہی پر منحصر ہے۔ غیر یقینی حالات پر نہیں۔

ہر دریا کا رُخ سمندر کی طرف ہوتا ہے لیکن ملک کی نوعیت اُس کے راستے کو معیّن یا ترمیم کرتی ہے۔ ایک مقام پر یہ دریا ایک تنگنائے میں سے جھاگ اُڑاتا ہوا گزرتا ہے۔ دوسری جگہ کسی پست وادی میں ہرتا پھرتا چلا جاتا ہے۔ کہیں کسی وسیع میدان میں پھیل جاتا ہے۔ پھر سنگِ خارا کی چٹان کے اُوپر سے اُچھلتا چلا جاتا ہے۔ غرض بے شمار حالات و کیفیات اُس کے راستے کو معیّن کرتے ہیں لیکن کششِ ثقل کا جو مستقل رجحان دریا کو سمندر کی طرف مائل رکھتا ہے۔ اُس کی تعیین میں پہاڑیاں، میدان اور خارا کی چٹانیں کوئی اثر نہیں رکھتیں۔

ارتقا کا ہر عمل مظاہر کا ایک سلسلہ ہے۔ جن میں مستقل رجحان موجود ہے۔ مظاہر کے تمام دوسرے سلسلوں کی طرح یہ عمل بھی بے شمار حالات و کیفیات سے تشکیل پذیر ہوتا ہے۔ اور یہ سب اس عمل پر اثر انداز ہوتے ہیں لیکن سلسلے کی ارتقائی نوعیت کی علّت ہی اس کے مستقل رجحان کی علّت ہوتی ہے۔ دوسرے تمام اسباب صرف تشکیلی ہوتے ہیں۔ جن کے درمیان یہ عمل جاری ہوتا ہے۔ اگرچہ اُن کا اثر بہت گہرا ہوتا ہے لیکن وہ اسباب نہیں ہوتے۔ بلکہ محض احوال و شروط ہوتے ہیں۔ انسانی ارتقا کے تقریباً تمام نظریات میں جو بہیم اُلجھن نظر آتی ہے۔ اُس کی وجہ صرف یہی ہے۔ کہ دونوں قسم کے عوامل کے درمیان فرق و امتیاز کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

غیر معیّن اور غیر متعلق حالات کا کوئی ممکن اشتراک (جو ایک طرف عمل کرنے کی قابلیت رکھتا ہو۔ یا دوسری طرف۔ اور کسی خاص سلسلے سے کوئی مستقل یا بلا وجہ تعلق نہ رکھتا ہو) مستقل رجحان رکھنے والے متواتر سلسلہ ہائے واقعات کو معیّن نہیں کر سکتا۔ اور مسلسل حرکت۔ نشو و نما۔ مدۃ العمر کی ترقی اور ارتقا پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔

یہ صحیح ہے۔ کہ انتخابِ طبعی کے نظریہ میں ایک اسلوب ایسا ضرور ہے۔

جس کے متعلق علمائے حیاتیات کی ایک ذی اثر جماعت تسلیم کرتی ہے۔ کہ وہ عضویاتی دنیا میں ارتقائی کامل تصریح مہیا کرتا ہے۔ اور اس جماعت کا دعویٰ یہ ہے۔ کہ وہ بے شمار ناقابلِ اعتماد اور غیر متعلق حالات کے زیرِ اثر مسلسل ومتواتر ترقی کے عمل کو واضح کر سکتی ہے۔ لیکن عام طور پر معلوم ہے۔ کہ یہ دعویٰ سخت متنازعہ فیہ ہے۔ ہمیں اس امر کی ضرورت نہیں۔ کہ اس بحث کے خارزار میں گامزن ہوں۔ اس نظریے کے بہت سے حامی یہ تسلیم کرنے پر تیار ہیں۔ کہ نسلِ انسانی پر اس کے اطلاق کے لئے اس میں معتدبہ ترمیم ضروری ہوگی۔ اس میں کوئی گنجائش کلام نہیں۔ کہ ایک خاص حد تک اس کا اطلاق ضرور ہوتا ہے۔ چنانچہ زیادہ سے زیادہ ترقی پذیر نسلیں انسانی ترقی کے مراحل میں مقام رکھتی ہیں انتخابِ طبعی کے نظریے کو تسلیم کیجئے۔ یا رد کر دیجئے۔ اس سے زیرِ غور مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اگر ہم اس کو تسلیم کر لیں۔ تو ہمارے لئے صرف یہ ضروری ہوگا کہ امرِ تنقیح طلب کو اس نظریے کے مصطلحات میں بیان کریں۔ انسانوں کے کردار میں وہ کونسے امتیازی امور ہیں جو کسی نسل کی کامیابی اور اس کے انتخاب میں معاون ہوتے ہیں۔ یہ واضح ہے کہ یہاں انتخابِ طبعی کے فارمولے کا اطلاق بالکل بے سود اور فضول ہے۔ کیونکہ ہمارے سوال کا تعلق اُن اوصاف کی نوعیت اور اُن ذرائع و وسائل سے ہے جن کی وجہ سے انسان ارتقائی منزل پر فائز ہوا ہے۔

انسانی ارتقائی نقار کے اسباب وہی ہیں جو تمام زندہ اشیاء کے ارتقا کے ہیں۔ ان میں ترقی پذیر نشوو ارتقا کا جذبہ ہو۔ یا اُن قوائے زندگی کی توسیع ہو۔ جو اس کی ترکیب میں مضمر ہیں۔ یا اپنے حالات کے ساتھ باہم تسویہ کے مجموعی اثر کا نتیجہ ہو یا باہم توافق کے تنوع پر ان حالات کے انتخابی عمل کا حاصل ہو۔ یہ امور ہمارے موجودہ دائرہ بحث سے خارج ہیں۔ کیونکہ یہ دراصل ایک ہی حقیقت کے معائنہ و اظہار کے مختلف طریقے ہیں۔ یہ مسئلہ موجودہ حالت میں صرف اس

امر پر محدود ہو جاتا ہے۔ کہ اُن ذرائع و وسائل کو تسلیم کیا جائے۔ جو انسانی ترقی کی رفتار ہیں اس لئے کام میں لائے جاتے ہیں۔ کہ زندگی کے حالات کے ساتھ توافق کی طاقتوں کو وسیع کیا جائے۔ صرف انہی وسائل کے عمل میں کسی خیالی جذبے یا کسی پسندیدہ تنوع کا اظہار ہوتا ہے۔ اور خود جسم نامی جن وسائل اور طریقوں سے کام لیتا ہے۔ اُنہی کو اس عمل کی ترقی پذیر نوعیت کی علت سمجھنا چاہئے۔

لہٰذا عینیت کے نظریات اور نسلی نظریات میں ہمیں اُس ترقی پذیر عامل کا سراغ لگانا چاہئے۔ جو خود انسان کے اندر موجود ہے۔ کوئی جغرافیائی یا اقتصادی وجہ موجبہ رہنمائی کے اس مستقل تواتر کو مہیا نہیں کر سکتی۔ کیونکہ یہ صرف اس عمل کے احوال و شروط ہیں۔ اور اس کی رفتار پر کیسا ہی بنیادی اثر ڈالتے ہوں لیکن اپنے عمل کی نوعیت کے اعتبار سے یہ قابلیت نہیں رکھتے۔ کہ اس کو ترقی پذیری کی استعداد بخش دیں لیکن اس کے ساتھ ہی انسان کی کوئی طاقت ان حالات اور دوسرے محیط احوال کو آمادۂ عمل کرنے اور نشو و نما دینے پر قادر نہیں ہے۔ درحقیقت یہ طاقتیں صرف وہی طاقتیں ہیں۔ جو ان حالات کے تعلق میں مصروف کار ہوتی ہیں۔ زندگی کے مظاہر کی طرح اُن کا وجود کچھ نہیں۔ صرف تاثرات ہیں۔ جن کو "متاثر جسم نامی" محض ایک اصطلاح ہے۔ دوسری اصطلاح سے مُراد اُس محیط و محصور دائرے کی غیر محدود پیچیدگی ہے۔ جس کے ساتھ توافق پیدا کرنا زندگی کے لئے اشد ضروری ہے۔ تاکہ اس کے ساتھ موافق بھی ہو جائے۔ اور اس پر قابو پانے کی خواہش کو بھی پورا کر سکے۔

تیسرا باب

عقلی فکر۔ اُس کا ماخذ اور وظیفہ

(۱)

عملِ انسانی کا مطابقت پذیر تنوع

میرے نزدیک یہ امر واضح ہے۔ کہ اگر ہم سب سے پہلے اس ابتدائی سوال کے حل کی طرف متوجہ ہوں۔ کہ نوعِ انسانی کن ذرائع سے وجود میں آئی۔ تو ہمیں انسانی ترقی کے وسائل کا ایک اہم سراغ مل جائے گا۔ ابتدائی اور توانا بالقوۃ نسلِ انسانی اپنے کن اوصاف کی وجہ سے اپنے حیوانی اسلاف سے ممیّز ہو گئی۔ کیونکر اپنے مدِّ مقابل حریفوں پر واضح سبقت لے گئی۔ دُنیا میں اپنے آپ کو کامیابی کے ساتھ قائم کر سکی۔ اور اُس نے اُس ماحول پر کیونکر تسلّط و اقتدار حاصل کر لیا۔ جو گزشتہ تمام مدارجِ ارتقا میں اپنی نظیر نہ رکھتا تھا۔ کم از کم اس پختہ مفروضے کی گنجائش ضرور ہے۔ کہ جن اوصاف نے پہلے پہل انسان کو دوسرے حیوانات پر فوقیت دی۔ اُنہی کی وجہ سے وہ عدیم المثال سطح پر پہنچا۔ اور انسان بنا۔ یہ اوصاف برابر اُسی سمت میں مصروفِ عمل رہے۔ اور کامیاب ہوتے۔ جن اسباب و علل نے انسان کو ابتدا میں مظفر و منصور بنایا تھا۔ بعد کی نشو و نما میں بھی وہی کارفرما رہے۔

یہ صحیح ہے۔ کہ ہماری یہ خیال آرائی ایک ایسے واقعہ کے متعلق ہے۔ جس کی نسبت ہمیں کوئی بلا واسطہ معلومات حاصل نہیں۔ تاہم مسئلہ سادہ ہے کیونکہ جن اوصاف و خصوصیات کی وجہ سے ابتدائی نسل انسانی کو اس کے حیوانی حریفوں پر ایسی واضح برتری حاصل ہوگئی تھی۔ وہ اس قدر بین ہیں کہ اُن میں کسی شک وشبہ یا اختلاف رائے کی گنجائش نہیں۔

عضویاتی ارتقا کی ترقی اس امر پر مشتمل ہے۔ کہ احساس و عمل کے اعضا میں بہتر طاقت و استعداد پیدا ہو گئی۔ اور انسان نے ماحول کا مقابلہ بہتر طریق پر کیا۔ احساس وسائل عمل کی کارگذاری کی رہنمائی کرتا ہے۔ اور اُن کے دائرے اور اُن کی صلاحیت کو بے انتہا وسیع کر دیتا ہے۔ چنگلوں۔ دانتوں۔ ہاتھ پاؤں اور شہپروں کی طاقت آنکھ اور کان کی ذکاوت حس پر منحصر ہوتی ہے۔ ماحول پر قابو پانے والی ان طاقتوں کو مکمل کر لینے سے زندگی کی بقا۔ اس کی امداد کے سازوسامان۔ مخالف طاقتوں سے اس کے بچاؤ اور تنازع للبقا کے حریفوں پر سبقت حاصل کرنے کے ذرائع و وسائل میں بے حد اضافہ ہو گیا۔ ابتدائی زمانے کے وحشی انسان نے اس مقصد کے لئے جو وسائل دریافت کئے تھے وہ دنیائے حیوانات کے اختیار کردہ ذرائع کے مقابلے میں بے حد کارآمد اور موثر ثابت ہوتے۔ اُن میں سب سے بڑی چیز یہ شامل تھی۔ کہ احساسات کے وظائف کو خاص طور پر وسیع کیا گیا تھا۔ گہرے اور مفصل معائنہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ احساس کے اکثر اعضا کی کامیاب کارگذاری کا انحصار اس پر ہے کہ ماضی کے تاثرات و تجربات کی یاد کو تازہ کرنے اور موجودہ صورتوں پر اُن کا اطلاق کرنے کی طاقت پیدا ہو جاتے۔ اور اس طرح مستقبل قریب کے تعلق میں زمانۂ حال کے تجربات کی اہمیت واضح ہو جاتے۔ مثال کے طور پر بصارت کے حاسہ کی افادیت اس اطلاع کی بہم رسانی پر ہے۔ کہ جس شئے کو آنکھ نے دُور سے دیکھا ہے۔ اُس کو قریب سے دیکھنے پر احساسات کی کیفیت کیا

ہوگی۔ یہ اُسی صورت میں ممکن ہے۔ کہ بصارت کے تاثر کو ماضی کے کسی تجربے کی یاد سے وابستہ کیا جائے۔ جب حیوان کسی خطرناک دشمن کی آمد یا کسی لذیذ کھانے کے ظہور کو دیکھتا ہے۔ تو خطرے یا لذت کے تجربات ماضیہ کو آنکھ کے اسی قسم کے احساسات سے وابستہ کر لیتا ہے۔ دُوسرے حلقے کے تمام احساسات کے متعلق بھی یہی بات صحیح ہے۔ اگر اسی عمل کو زیادہ مفصل اعصابی روابط باہمی سے وسیع تر کر دیا جائے۔ تو یہ سلسلہ اور بھی زیادہ آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔ بے شمار مختلف و متنوع تاثرات جمع کئے جا سکتے ہیں۔ ان کے مختلف مرکبات ترتیب دیئے جا سکتے ہیں۔ گزشتہ تجربات کو زیادہ مکمل اور عمومی صورت دی جا سکتی ہے۔ اور ماضی کے اس تمام تفصیلی تجربے کو موجودہ حالات کے تاثرات پر منطبق کر کے انھیں زیادہ اہم اور وسیع بنایا جا سکتا ہے۔ اس طریقے سے حال کا اثر فرد کے فوری یا دُور رس مفادات پر بہت وسعت اختیار کر لیتا ہے۔ اپنے ماحول کے حالات کا کامیابی سے سامنا کرنے میں اس کی استعداد زیادہ قوی اور وسیع ہو جاتی ہے۔ اور اس کی طاقتیں غیر محدود طور پر روز افزوں ہو جاتی ہیں۔ یہ عمل گویا "عقلی فکر" کا عمل ہے۔

میں یہاں "عقل کے بجائے "عقلی فکر" کی اصطلاح کا استعمال بہتر سمجھتا ہوں۔ کیونکہ عام انسانوں کے ذہن میں "عقل" کی حیثیت ایک "دماغی قوت" کے پرانے تصوّر سے وابستہ ہے۔ ان کے نزدیک "عقل" ایک خاص اور علیحدہ وجود رکھنے والا عضو ہے۔ جو بالکل مخصوص اور پُر اسرار طاقتوں کا مالک ہے۔ اسی خیالی نفسیات کے مطابق لوگ عام طور پر "عقل سے کام لینے" یا "عقل سے کام نہ لینے۔ اور عقل کے بجائے اپنے احساسات۔ اپنے ارادے اور اپنی قوتِ متخیلہ سے کام لینے کی باتیں کرتے ہیں۔ حالانکہ "عقلیت" کوئی عضو نہیں۔ بلکہ فکر کا ایک وصف اور کردار ہے۔ تجربے اور عمل۔ احساس اور ردِّ عمل کے درمیان جو چکّر ہے۔ اُس میں ہمیشہ انسان پر ایک ایسی حالت ہوتی ہے۔ جس کو ذہنی ہاضمہ

سی عمل کہنا چاہئے جس میں وہ احساس و تجربہ کو چبا چبا کر ایک ایسا کیلوس تیار کرتا ہے جس سے عمل پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ تمام مفروضات، عقائد اور یقینیات وجود میں آتے ہیں۔ جن پر عمل آگے بڑھتا ہے۔ یہ درمیانی عمل کم و بیش برابر جاری رہتا ہے۔ اسی کو فکر کہتے ہیں۔ اور یہ "فکر" اپنے اسلوب کار اور اپنے طریق عمل میں کم و بیش "عقلی" ہوتا ہے۔ یہ کاملاً "غیر عقلی" کبھی نہیں ہوتا کیونکہ اس کا وظیفہ (یعنی وہ مقصد جو اس کے وجود کا اصل و ماخذ ہے) یہی ہے کہ عقلی طور پر عمل کرے لیکن یہ وظیفہ عام طور پر ناکمل طریقے سے ادا کیا جاتا ہے یعنی "فکر" کافی حد تک "عقلی" نہیں ہوتا۔ بہرحال انسان عقل کے بجائے کسی اور قوتِ دماغی کو استعمال نہیں کرتا۔ وہ اپنے دماغ کے خلایا کو کم و بیش عقلی انداز ہی سے کام میں لاتا ہے۔

اس طاقت کی صحیح کارگزاری کے احوال و شروط یہ ہیں۔ کہ وہ ماضی وحال کے تجربات سے بھی اور اپنے آپ سے بھی یک رنگ و یک آہنگ رہے۔ یعنی اس کو کافی اور صحیح تجربہ حاصل ہو جس کا وہ وفاداری سے پابند ہو۔ اور اس سے نتائج اخذ کرنے میں متبائن و متضاد رویہ اختیار نہ کرے۔ اس قسم کا عمل ماضی وحال کے واقعات سے مستقبل کے متعلق (یعنی معلوم سے نامعلوم کی نسبت) نتائج اخذ کرنے میں کارآمد ہے۔ لہٰذا فرد کو اس قابل بناتا ہے۔ کہ اپنے عمل کو حال و استقبال کے حالات کے مطابق بنالے۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ فطرت کا راستہ یکساں ہے۔ ایک قسم کے حالات سے اُسی قسم کے نتائج مترتب ہوتے ہیں۔ دُنیا کے تمام اشیا و مظاہر آپس میں گہرا اور شدید رابطہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ ایک پہلو اور دوسرے تمام پہلوؤں کے درمیان ہمیشہ ایک قطعی اور مستقل تعلق قائم رہتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہئے۔ کہ تمام اشیاء نظامِ واحد میں جمع ہیں۔ اور دُنیا اپنی غیر محدود رنگا رنگی کے باوجود ایک بہت بڑی وحدت ہے۔ اگر حالات اس سے مختلف ہوتے۔ اگر دُنیا ابتری اور بے قانونی

کا شکار ہوتی۔ اگر اس کے اجزا اپنے اپنے آزاد وجود رکھتے۔ اور ہر جز دایک دوسرے سے الگ رہ کر عمل کرتا۔ آج ایک طریقے پر اور کل دوسرے طریقے پر۔ اور اگر ناپختہ اور مطلق العنان طاقتیں واقعات کی رفتار میں مداخلت کرسکتیں۔ تو "عقلی فکر" قطعاً بے سود ہو جاتا۔ اس کو بیرونی ماحول سے ایسا کوئی محرک مہیا نہ ہوتا۔ جو اسے ترقی کے راستے پر گامزن کر دے۔ یہ کبھی "منتخب" قرار نہ پاتا۔ بلکہ یہ کبھی وجود ہی میں نہ آسکتا۔ "عقلی فکر" انسان کے خارجی ماحول کی عمومی اور بنیادی نوعیت کے ساتھ وجودی نامی کے تطابق کا نام ہے۔

اس قسم کے توافق و تطابق کا رجحان حیوانی دنیا میں انسان سے مدتوں پہلے موجود تھا۔ ہم اس سے قبل بھی بتا چکے ہیں۔ کہ یہ رجحان اسی عضویاتی اصول پر قائم ہے۔ جو احساس کی بلند تر شکلوں میں موجود ہے۔ لیکن آغاز حیات سے تمام حیوانی عمل اور ردِ عمل کے اسلوب بلکہ پوری زندگی کے ردِ عمل میں اس کی جڑیں بہت دور گہری چلی گئی ہیں۔ یہ اسلوب "تجربے اور غلطی" کا اسلوب ہے۔ آپ نے غذا جمع کرنے والے کیڑے کو دیکھا ہوگا۔ جو اپنا بوجھ اٹھائے ہوئے دفعتہً کسی غیر متوقع رکاوٹ سے دوچار ہوتا ہے۔ بار بار اس پر غالب آنے کی کوشش کرتا ہے۔ کبھی ایک سمت سے گھسنے اور گزرنے کا جتن کرتا ہے۔ کبھی دوسری طرف سے آس پاس کے چکر کاٹتا ہے۔ اور آخر کئی لمحوں کی بیکار کوششوں کے بعد اس رکاوٹ میں سے کوئی نہ کوئی راستہ نکال لیتا ہے۔ ہر عمل میں کوشش کا یہی اصول عالمگیر ہے۔ "تجربے اور غلطی" کے اسلوب اور "عقلی فکر" کے طریقے کے درمیان کوئی خطِ فاصل موجود نہیں۔ بلکہ دونوں ایک دوسرے میں تداخل کرتے ہیں۔ "تجربہ اور غلطی" کا طریقہ نہایت درست عقلی عمل ہے۔ جو طویل اور مشقت آمیز راہ عمل پر چل کر ہی ایسے نتیجے پر پہنچتا ہے۔ جو کارآمد ہو۔ اور حقائق سے پوری مطابقت رکھتا ہو

انبیا اور رندے نے اُس طرزِ عمل کو مسترد کر دیا۔ جو غیر مفید۔ بے سُود اور خطرناک ثابت ہوا تھا۔ یعنی ایک غلط مفروضہ خارج از بحث قرار پا گیا۔ بالکل یہی حال "تقلیدی فکر" کا ہے۔ وہ بھی غیر عملی اور غیر معقول خیال کو ترک کر کے اپنے دائرۂ انتخاب کو تنگ تر کرتا چلا جاتا ہے۔ "عقلی فکر" حقائق کے ساتھ مطابقت حاصل کرنے کا ایک سہل اور مکمل طریقہ ہے جس طرح الجبرائی یا تفریقی احصاء استدلالی عمل کی وہ ترقی یافتہ شکل ہے جس سے محنت بچ جاتی ہے۔ "تجربے اور غلطی" کا ابتدائی اور عالمگیر اسلوب آہستہ آہستہ "عقلی فکر" کے مکمل تر اسلوب میں بدل گیا۔ جس کو بلند تر حیوانات نے عام طور پر اپنا معمول قرار دے لیا۔ دودھ پلانے والے جانوروں کے پورے طبقے کی ارتقائی کامیابی انسان ہی کی طرح دماغی نشوونما کی پیداوار ہے۔ یہ نشوونما پہلے پہل آدم نما نسل میں ایسے مقام پر پہنچی۔ جہاں اُس کے اثرات اور فعالیتوں کا ردِ عمل خود اُس نسل کی نشوونما پر پڑا۔ اور اس طرح اُس توسیع کی محرک ثابت ہوئی۔ جو سلسلۂ ہندسیہ میں اقدام کا باعث ہوئی۔

وحشی انسان نے سب سے پہلے اپنے دماغ کو اپنے اوزاروں اور ہتھیاروں کی مدد کے لئے استعمال کیا۔ یہی وہ قوت تھی۔ یہی وہ تطابق تھا۔ جو صرف "عقلی فکر" کے استعمال پر مبنی تھا۔ اور جس نے انسان کو سب سے بڑی فتح عطا کی۔ اس کی کامیابی کا اس کے سوا اور کوئی باعث نہ تھا۔ اس کو کوئی دوسرا وصف حاصل نہ تھا۔ جو اُسے تمام دودھ پلانے والے جانوروں پر فوقیت کا حق دار بناتا۔ کوئی دوسری برتری نصیب نہ تھی۔ جو اُس کے کارناموں کے ہم سنگ ہوتی۔ انسانی حیوان میں اعضائی اعتبار سے جو ایک دو نمایاں خصوصیتیں ہیں۔ وہ مقابلتاً بالکل بے حقیقت ہیں۔ مزید برآں اگرچہ ابھی پچھلے ہی دنوں تک یہ مسئلہ علم انسانیات کا ایک دلچسپ مبحث تھا۔ کہ آیا انسان کا اپنے پاؤں پر سیدھا کھڑا ہونا اس کی دماغی ترقی سے پیشتر تھا۔ اور اس ترقی میں معاون تھا۔

یا معاملہ اس سے اُلٹ ہے لیکن انسان کے آبا و اجداد کے متعلق پچھلے دنوں ہمارے علم میں جو وسیع اضافے ہوتے ہیں۔ اُن سے یہ مسئلہ بالکل طے ہو چکا ہے دماغی نشو و نما اس فرق و تفاوت کی پہلی اور امتیازی علامت تھی۔ اور انسان کا سیدھا کھڑا ہونا اور اس کی وجہ سے اس کے ہاتھوں کا نشو و ارتقا پانا اس سے بہت بعد کا واقعہ ہے۔ اور یہ گویا ابتدائی علامت کے اثمات ہی کا نتیجہ تھا۔ یہاں تک کہ انسان کی ہیئت جسمانی بھی "عقلی فکر" کی قوت ہی کا اثر ہے۔

صرف یہی طاقت تھی (عقلی فکر) جو تمام دوسرے اوزاروں، عضوی ایجادوں اور ہتھیاروں پر غالب آئی۔ عضوی ارتقا نے حصولِ فوقیت کے دوسرے تمام طریقوں کو متروک قرار دے دیا۔ اور انسان انسان بن گیا۔ اب وہ کرۂ ارضی کا مالک و مختار ہے۔ اور اس کے اور دوسری مخلوقات کے درمیان وہ خلیج حائل ہو گئی۔ جو بظاہر کسی طریقے سے پاٹی نہیں جا سکتی بعض امتیازی علامتیں آج کل کے زمانے میں انسان ہی کے لئے مختص بیان کی جاتی ہیں۔ مثلاً جذبات و احساسات۔ حسِ اخلاقی تنظیمِ معاشری۔ لیکن یہ امر واضح ہے۔ کہ نسلِ انسانی اور اس کے اسلافِ حیوانی کے درمیان جو فرق و تفاوت قائم ہوا۔ وہ ان امتیازی علامتوں کا نتیجہ نہ تھا۔ ابتدائی آدم نما نسل کی فوقیت اخلاقِ عالیہ۔ نفاستِ ذوق تخیلِ شاعرانہ۔ بلند مثالیات یا اقتصادی تنظیمات سے قائم نہیں ہوتی تھی۔ کیونکہ ان حالات میں یہ امتیازی خصوصیتیں قطعی طور پر بیکار و بے مصرف ہوتیں۔ مزید براں اُس وقت ان کا وجود بھی نہ تھا۔ یہ بعد کی پیداوار ہیں۔ ان کے وجود میں آنے کی وجہ وہ صورت حال تھی جو "عقلی فکر" کی قوت نے پیدا کی تھی۔ کیونکہ انسان کے عقلی فکر کے بغیر انسانی اخلاق۔ مذہبی جذبات۔ بلند نصب العین۔ اونچی آرزوؤں معاشری تنظیموں اور احساس فرائض کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ سب سے اول "عقلی فکر" نے انسان کو انسان بنایا۔ پھر تمام آیندہ ترقیات و امکانات کا راستا صاف کر دیا۔

(۲)

"عقلی فکر" ذریعۂ ترقی کی حیثیت سے

چونکہ یہی وہ ذریعہ ہے جس سے نسلِ انسانی نے وہ پہلی ماورائے اوراک ارتقائی فتح حاصل کی جو اس کے وجود کی باعث ہے (اور یہ حقیقت بحث و نزاع سے بالا ہے) لہٰذا یہ مفروضہ واضح طور پر قابل تسلیم ہے۔ کہ نسلِ انسانی نے بعد میں ارتقا کی جو منازل طے کیں۔ اُن میں بھی یہی ذریعہ کارفرما ہے۔ چونکہ یہ ابتدائی عامل پہلے مراحل میں کارآمد ثابت ہو چکا ہے۔ اس لئے (بیشتر اس کے کہ کوئی دوسری توجیہ پیش کی جائے) یہ سمجھ لینا چاہئے کہ بعد کے مراحل میں بھی اس کی کارفرمائی معتدبہ ہے۔ ایسا کوئی قرینہ موجود نہیں جس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکے۔ کہ اس عمل کے کسی مرحلے پر بھی طریقے میں کوئی ایسی بنیادی تبدیلی پیدا ہوئی ہے جس سے کامیابی کا ابتدائی آلہ بعد میں دوسرے آلات پر فوقیت حاصل کر گیا ہو۔ "عقلی فکر" ہی انسان کو حیوانیت سے نکال کر بلند تر سطح پر لے جانے کا واحد مؤثر ذریعہ تھا۔ اسی سے یہ سمجھ لیا جا سکتا ہے۔ کہ پوری نشوونما کا واحد مؤثر ذریعہ بھی یہی ہو گا جس نے ابتدا میں اس کو ممکن الوقوع بنایا تھا۔

راقم الحروف کا خیال یہی ہے۔ اس کے نزدیک فکر کی عقلیت ہی از اول تا آخر نسلِ انسانی کے ارتقا کا ذریعہ اور مؤثر سبب ہے۔ یہ محض بہت سے عوامل میں سے ایک نہیں۔ اور ان میں اہم ترین بھی نہیں۔ بلکہ بلاشبہ و بلا استثنا انسانی ترقی کا واحد اور حقیقی عامل ہے۔ خواہ اس پر کسی پہلو سے بھی غور کیا جائے۔

جس وسطے یا درمیانی عامل کی وساطت سے انسانیت کی نشوونما ہوتی ہے۔ اُس سے زیادہ پیچیدہ چیز کوئی نہیں۔ کیونکہ اس میں صرف نشاۃ کائنات

طبیعی اور زندگی کی مادی ضروریات ہی شامل نہیں۔ بلکہ انسانی دماغ اور انسانی روابط کی وسیع تر اور رنگا رنگ دُنیا بھی شامل ہے۔ جنسیات و خواہشات۔ جذبات و عواطف۔ تعصبات و مرضیات۔ معاشری نظام اور ادارات۔ افکار و عقائد اور روایات اور ان تمام عوامل کا تزاحم و تصادم اور اُن کی غیر محدود ترتیبات کا دخل ہے۔ ان میں سے ہر ایک نے ارتقائے انسانی کی شکل اور رفتار پر نہایت گہرا اور متنوع اثر ڈالا ہے۔ ان وجوہ و اسباب نے اور دوسرے ہزاروں طبیعی جسمانی۔ اقتصادی اور جذباتی عناصر و عوامل نے اس عمل ارتقا کی ہیئت اور اُس کے خد و خال کو خاص سانچے میں ڈھالا۔ اور خاص رنگ میں رنگا ہے لیکن اس کی حقیقی پیش قدمی اور اس کی ترقی پسندانہ نوعیت صرف توافق و تطابق کے اس خاص عنصر کی شرمندۂ احسان ہے جس کی وجہ سے نسل انسانی دوسری حیوانی دُنیا سے علیحدہ اور ممتاز ہوتی ہے۔

دوسرے تمام عوامل عمل ترقی کے وسائل و اسباب نہیں ہیں۔ بلکہ اس کے احوال و شروط ہیں۔ اُنھوں نے "عقلی فلک" کے عمل و ارتقا کے متعلق پسندیدہ۔ ناپسندیدہ راستہ اختیار کر کے رفتارِ ترقی کو بڑھایا بھی ہے اور روکا بھی ہے۔ اسے تیز بھی کیا ہے اور نرم بھی۔ حقیقتِ ترقی کے ساتھ ان کا رابطہ کسی حالت میں مسلسل اور یکساں نہیں رہا۔ ہو سکتا ہے۔ کہ کسی وقت اُن کا اثر مفید مطلب ہوا ہو۔ اور کسی دوسرے موقع پر ناپسندیدہ رہا ہو۔ سیاسی آزادی انسانی نشو و ارتقا کے لئے نہایت مفید و مُساعد چیز ہے۔ تاہم استبداد اور مطلق العنانی کے بغیر تہذیب سر بلند ہو ہی نہ سکتی تھی۔ اس کی پیدائش بھی مطلق العنان قوت و اقتدار کے زیر سایہ ہوئی۔ اس کی ترقی بھی شخصی حکومت اور اشرافی استبداد کی ممنونِ احسان ہے۔ اور نوعِ انسانی کی بڑی بڑی آبادیاں "قبائلی آزادی" کی حالت میں رہ کر لاعلاج طور پر نشو و نما سے محروم رہ گئیں۔ عسکری قوت علی العموم نشو و ارتقا پر نہایت عمیق اور تباہ کن اثر ڈالتی ہے۔ تاہم خالص

جارحیت اور سنیلا کی جنگیں بھی ایسے قوی اور ہنگامہ خیز عوامل میں شامل رہی ہیں۔ جنھوں نے انسانی ترقی کو بڑی تقویت دی ہے۔ تقسیم محنت عمل کی عمدگی اور کارگزاری کا ایک نہایت بہر حاصل سرچشمہ ہے لیکن یہی جبر و تشدد اور نہایت افسوسناک جمود و خمود کا ذریعہ بھی رہی ہے۔ شاید بہت ہی کم اثرات ہوں گے۔ جو ذہنی ترقی اور انسانی نشوونما کے لئے "دینیاتی عقیدہ پرستی" سے زیادہ مہلک ہوں۔ لیکن بعض اوقات اس نے بھی بعض نہایت اہم اور مفید اثرات پیدا کئے ہیں۔ اس کی للکار اکثر نہایت مہیج ثابت ہوئی ہے۔ اور اس نے افکار و عقاید میں اشتراک پیدا کر کے ترقی کو تقویت پہنچائی ہے۔ ذہنی ثقافت کے متعلق اکثر سمجھا جاتا ہے۔ کہ وہ عقلی نشوو ارتقا کے ساتھ ساتھ چلتی ہے لیکن اگر وہ اس نشوو ارتقا سے بیگانہ اور متنفر رہے تو ترقی کا وسیلہ اور مظہر بننے کے بجائے اس کے راستے میں حائل ہو جاتی ہے گویا اس اعتبار سے حمایت و وکالت کا رستہ اتنا صاف ہے۔ کہ ہر حامی شر، ہر فتنہ، شیطنت کی حمایت میں نہایت بیّن استدلال کر سکتا ہے۔ عوام کو جبر و استبداد اور غلامی کی بیش بہا برکات بتا کر ششدر و مبہوت کر سکتا ہے ثابت کر سکتا ہے کہ قتل کے بعض ناگزیر فوائد بھی ہیں۔ جھوٹ بول کر دنیا کی نجات ہو سکتی ہے جعل و دغا کے بعض اثرات نہایت مفید اور بیماریوں کے فوائد لاانتہا ہیں۔ جن صورتوں میں کہا جاتا ہے۔ کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ ان کے ساتھ سیاسی۔ اقتصادی اور معاشری حالات کی یکسانی کو بیان کر کے ایک ہی قسم کے نتائج نکالے جاتے ہیں۔ حالانکہ وہ حالات انسانی ارتقا کے جس مرحلے میں کارفرما تھے۔ اس کے پیش نظر یہ حالات موجودہ قطعی طور پہ مختلف نتائج کا باعث ہونے چاہئیں۔

اگرچہ کوئی شخص اس بیان پر براہ راست اعتراض کرنے کی جرات نہ کرے گا۔ کہ انسان پہلا اور بہترین "حیوان ناطق" ہے۔ اس کی تمام قوتیں اس

عقل و ادراک پر منحصر ہیں۔ جن سے وہ ان قوا سے کام لیتا ہے۔ جب عقلی طور پر سوچتا اور عمل کرتا ہے۔ تو کامیاب ہوتا ہے۔ اور جب غیر عقلی فکر و عمل اختیار کرتا ہے۔ تو ناکام ہو جاتا ہے لیکن ابھی بہت سے لوگ موجود ہیں۔ جو ایسے خیالات کی حمایت پر آمادہ ہیں جن کی رُو سے انسانی قوت کے سرچشموں کا کا ملاً مختلف اندازہ لازم آتا ہے۔ اس امر کا نہایت عمیق اور وسیع میلان ہے۔ کہ "عقلی فکر" کو بے حقیقت ثابت کیا جائے۔ اور اس کو رد کر کے بعض دوسری قوتوں اور دوسرے طریقوں کو ترقی اور صحیح انسانی نشوو ارتقا کا تعویذ قرار دیا جائے۔

(۳)

تطابقی صلاحیت

عقلی فکر انسان کا ذریعۂ تطابق ہے۔ جس سے وہ اپنے آپ کو حالات و ماحول کے مطابق بناتا ہے۔ یہ دُنیا جو انسان نے بنائی ہے۔ اس کے ذہن کی پیداوار ہے۔ اس کے شہروں کے (تعمیری) پتھر اور اس کے انجنوں کا فولاد اس کے افکار و خیالات ہی سے بنا ہے۔ اس کی صنعت کاری اور اس کی جنگ کے لشکروں کی حرکت اور اس کی زندگی کی نبض کی ضربات اس کے خیالات ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔ زندگی کو اور دُنیا کو، حیات اور اس کے تمام مظاہر کی طرح اُن حالات سے تطابق پیدا کرنا ضروری ہے۔ جو بے لوچ فطرت، اشیا اور کائنات کے مستقل حقائق نے عاید کر رکھے ہیں۔ یہ اُن کے وجود کی (ہر وجود کی مانند) اور اُن کی ترقی کی (ہر ترقی کی طرح) شرطِ اولین ہے۔ انسان اپنی قوتوں کو کس حد تک استعمال کر سکتا ہے۔ اور زندگی کو اپنے عزم اور مقصد کے لئے کس حد تک زیرِ تسلط لا سکتا ہے۔ اس کا انحصار اس امر پر ہے۔ کہ وہ موجودہ حقایق کے ساتھ کس حد تک تطابق پیدا کرتا ہے۔ یہ مشاہدہ جس قدر چھوٹا ہو گا۔ اسی قدر ناکام

ہوگا۔ اور جس حد تک صحیح ہوگا۔ اُتنا ہی کامیاب ہوگا۔ کیونکہ ترقی کا انحصار صداقت پر ہے۔

یہی تطابق عقلی فکر کا وظیفہ ہے۔ اور یہی اس کا افادی پہلو ہے۔ فکر کی عقلیت کے معنی صرف یہ ہیں۔ کہ انسانی افکار و خیالات کو اُس حقیقی تعلق کے مطابق کر دیا جائے جو انسان کو اپنے ماحول کے ساتھ ہے۔ اس وظیفے کا عمل جتنا زیادہ صحیح و درست ہوگا۔ اُتنا ہی تطابق بہتر ہوگا۔ عقلی طریق عمل اختیار کرنے میں انسان کا نصب العین یہ ہے۔ کہ اس کے افکار میں اور واقعات کے تسلسل اور حقیقی تعلق میں مطابقت پیدا ہو جائے۔ عقلی فکر کی نشوونما اسی مطابقت کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اور انسان اس طریقے کو اس لئے استعمال کرتا ہے۔ کہ اس کا تجربہ اس کو سکھاتا ہے۔ کہ مطابقت اسی طریقے سے حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ فرض کرنا محض سادہ لوحی ہوگی۔ کہ انسانی ارتقا ترقی پسندانہ مقاصد کے لئے عقلی فکر کے عملی اطلاق سے متاثر ہوا ہے۔ اصلی عمل کسی لحاظ سے بھی اتنا سادہ نہیں جس قدر بعض لوگ تصور کرتے ہیں۔ کہ عقلی فکر نے انسانی دُنیا کی تعمیر میں تدریجی نشوونما حاصل کی ہے۔ لیکن یہ محض زمانہ قدیم کا ایک واہمہ ہے جس کو تاریخ انسانی میں یہ روحانی منظر دکھائی دیتا تھا۔ کہ ایک کھلتا ہوا اور پھیلتا ہوا ذہن غیر تاثر پذیر کائنات کی ناگہانی طرفداریوں کے مطابق آگے بڑھتا ہوا جا رہا ہے۔

انسان نہایت خفیف پیمانے پر ہی "عقلی" دادراکی وجود رہا ہے۔ وہ ہر قسم کے اٹکل پچو طریقوں سے غلطیاں کرتا ہوا آگے بڑھتا رہا ہے۔ اکثر ایسا ہوا ہے۔ کہ اُس نے بالکل غیر عقلی طریقوں سے کام لے کر تطابق اور ترقی کا منشا پورا کیا۔ ہو سکتا ہے۔ کہ بعض اوقات کوئی اتفاقی فیصلہ اور ناسمجھی کا طریق عمل حقیقت سے ہم آہنگ ہو جائے۔ اور سوچا سمجھا ہوا عقلی فکر ہزار غلطیوں کی وجہ سے ناکام رہ جائے۔ لیکن اتفاقی کامیابی بھی اگر تطابق کو تقویت

پہنچاتے۔ تو یقیناً عقلی اعتبار سے جائز و صحیح ہوگی۔ اگر کوئی راہِ عمل یا فکر و خیال کسی شعوری و عقلی غور و فکر سے پیدا ہوا ہو۔ یا کسی اَور طریقے سے نمایاں ہوا ہو۔ اور درحقیقت بیرونی قوانین و واقعات سے مطابق ہو جاتے۔ تو وہ دو معنی میں عقلی تسلیم کیا جائے گا۔ ایک اس اعتبار سے کہ نیت درست تھی۔ دوسرے اس لحاظ سے کہ نتیجہ خاطر خواہ ہے۔

"تجربہ اور غلطی" کا قدیم حیاتیاتی طریقہ ارتقائے حیات کے پورے عرصے میں انسانی ارتقا پر برابر مؤثر رہا ہے۔ یہ زندہ اشیا کی بنیادی فراست ہے۔ یہ تجربے کا طریقہ ہے۔ آپ غلطیاں کر کر کے سیکھتے ہیں۔ آپ ناکام رہ جاتے ہیں۔ اور پھر کوشش کرتے ہیں۔ بعد کی کوششوں کو پیشتر کی ناکامیوں کے سبق سے فائدہ پہنچتا ہے۔ یہاں تک کہ خستگی و ماندگی کے عمل سے اور ناکام یا جزوی کامیاب کوششوں کے بہم پہنچائے ہوئے اسباق سے بالآخر کامیابی حاصل ہو ہی جاتی ہے۔

"تجربہ اور غلطی" کا طریقہ نہایت صحیح اور جائز طریقہ ہے۔ اور کام بھی دیتا ہے۔ لیکن اس میں اسراف اور ضیاع بہت ہوتا ہے۔ اگر ہو سکے۔ تو واقعہ سے پہلے عقل سے کام لینا ارزاں رہتا ہے۔ اور بعد میں تو یقیناً گراں ہوتا ہی ہے۔ "تجربے اور غلطی" کے حیاتیاتی طریقے پر انسان نے "عقلی فکر" کا اضافہ کیا ہے۔ جو اس کی ایک مکمل۔ اقتصادی اور انتہا درجے کی مؤثر شکل ہے۔ اگر ایک طریقِ عمل کامیاب ثابت ہوتا ہے۔ اور دوسرا ناکام رہ جاتا ہے۔ تو اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے۔ اگر کافی علم حاصل کیا جاتا۔ اور فاضل تکلیف و مشقت اٹھائی جاتی۔ تو پہلے ہی سے یہ معلوم کر لینا ممکن تھا۔ کہ کونسا طریقِ عمل عقلی اور کونسا غیر عقلی ہے۔ کامیاب نتیجہ وہ ہے۔ کہ اگر اس کا اطلاق کیا جاتا۔ تو فکرِ صحیح اسی کی طرف رہنمائی کرتا۔ عقلیت کی نشوونما۔ تجربے کی ترقی۔ معلومات کی فراہمی اور عقلی فکر کی عادتیں جتنی زیادہ بڑھتی جاتی ہیں۔ اور روز

ہونا اس کی بقا کو آسان اور اس کے ضیاع کو قلیل و مختصر کرتی چلی جاتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ اُس طریقے کا دائرہ کوتاہ اور "عقلی فکر" کا احاطہ وسیع ہو جاتا ہے۔ اور تطابق کا زیادہ مفید اور کارآمد اسلوب روز بروز غالب آتا جاتا ہے۔

ہر خیال۔ ہر جدید نقطۂ نگاہ اور ہر نیا طریق کار جو پیدا ہوتا ہے۔ مقبولیت حاصل کرتا ہے۔ اہم ثابت ہوتا ہے۔ اور "منتخب" کر لیا جاتا ہے"۔ اس کی وجہ یہی ہوتی ہے۔ کہ وہ زیادہ عقلی ہوتا ہے یعنی جس طریقے کی جگہ خود لینا چاہتا ہے۔ اُس کے مقابلے میں حقائق و تجربات سے زیادہ مطابق اور ہم آہنگ۔ زیادہ معقول اور کارآمد ہوتا ہے۔ مِل نے اپنے ایک مشہور فقرے میں اس قول کی تردید کی ہے کہ "سچائی ہمیشہ فتح پاتی ہے"۔ اُس نے دلائل پیش کر کے ثابت کیا۔ کہ فلاں فلاں معاملے میں سچائی کو کامیابی سے دبا دیا گیا لیکن اُس نے اس دعوے کا ابطال خود ہی یہ کہہ کر کر دیا۔ کہ اگرچہ سچائی کو ایک دفعہ۔ دو دفعہ۔ اور بہت دفعہ مخالفت اور تشدد سے ناکام رکھا جا سکتا ہے لیکن وہ بار بار سر اُٹھاتی ہے۔ اور بالآخر فتح پا جاتی ہے۔ اس کے بار بار سر اُٹھانے اور اُجاگر ہونے کی وجہ یہ ہے۔ کہ عقلی فکر کا عمل معاملاتِ انسانی میں مستقل نشو و نما کا ایک ہی مؤثر عامل ہے۔ اور وہ عمل جن مواقف کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اُن پر بالآخر بار بار پہنچنا ضروری ہے۔ خواہ اس سے قبل اُن مواقف کو کتنی بار ترک کیا جا چکا ہو۔

حقیقت یہ ہے۔ کہ عقلی نشو و ارتقا کی ہمیشہ سختی سے مزاحمت کی جاتی ہے۔ اور عام طور پر اسے مغلوب و ذلیل کر دیا جاتا ہے۔ اور اس کی وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ عقلی ترقی اکثریت کے پختہ و راسخ خیالات اور مقاصد و اغراض کے ہمیشہ منافی ہوتی ہے لیکن اس کے ساتھ اُس کی تقدیر یہی ہوتی ہے۔ کہ اس کو لازماً غلبہ حاصل ہو۔ صداقت کو بیک وقت "شکست" اور بالآخر فتح"

کا یقین ہوتا ہے۔

(۴)

ترقی پذیر صلاحیت

انسانی دُنیا میں صرف عقلی فکر ہی ایک ترقی پسند عنصر ہے۔ انسانی ارتقا کے تمام دوسرے (مبینہ) عوامل کے برعکس عقلی فکر کے عمل میں مسلسل ترقی کے اصلی اور لاینفک اصول مضمر ہیں۔ اس امر کی کوئی واضح علت موجود نہیں۔ کہ ہر قسم کا تغیر خواہ وہ اقتصادی ہو۔ جغرافیائی ہو یا نسلی حالات کا ہو۔ مسلسل ترقی کے ظہور پر ہی منتج ہو۔ لیکن عقلی فکر لازماً ترقی کا باعث ہوتا ہے۔ ہر پیش قدمی علم و تجربہ کی بنیادوں کو وسیع کر کے مزید اور عظیم تر پیش قدمی کا سامان مہیا کر دیتی ہے عقلی فکر کے نتائج سلسلہ ہندسیہ کے طور پر روز افزوں رہتے ہیں۔

لیکن فکر کا ہر عقلی عمل اپنے اثر و فعل کے اعتبار سے لازماً ترقی پسندانہ ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ اپنے آخری منطقی نتائج پر پہنچے بغیر نہیں رہتا۔ ہر نیا خیال یا اصول فی الفور آخری نتیجے تک نہیں پہنچتا۔ کیونکہ وہ صرف جزوی حیثیت سے عقلی ہوتا ہے۔ بلاشبہ وہ اپنے پیشروؤں کے مقابلے میں زیادہ عقلی ہوتا ہے لیکن پھر بھی توافق میں ناکمل۔ ضعیف اور غیر معقول ہوتا ہے۔ اور اُن روایتی غلطیوں اور بدعملیوں سے (جن کی مخالفت اس کا مقصود ہوتی ہے) صرف خفیف سے درجے میں آزاد ہوتا ہے لیکن جب ایک دفعہ نمودار ہو جائے۔ تو پھر یہ قطعی اور ناگزیر بات ہے۔ کہ وہ اپنے آخری نتائج تک پہنچ کر رہے گا۔ یہ ایک منطقی عمل ہے۔ اور منطق کبھی راستے میں ٹھہر نہیں جاتا۔ اس عمل کے آغاز میں ترقی کا پورا پورا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ نئے اصول کے حامی اس کے بیماہِ راست اور یقین منشا و مفہوم سے قطعاً بیگانہ ہوں بلکہ اس سے شدید نفرت کرتے ہوں۔ وہ جس محرک سے متاثر ہوتے ہیں۔ وہ عام طور پر کسی خاص

پہلو سے پیدا ہوتا ہے۔ یا موجودہ عدم عقلیت کی حد سے زیادہ بے اعتدالی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اور اس پہلو کو نظر انداز بھی کر دیجئے۔ تو اس اصول جدید کے حامی بھی اپنے مخالفین ہی کی طرح خیالات و تصورات کے روائتی نظام کے سحر و افسوں میں گرفتار ہوتے ہیں۔ وہ جس اصول کی حمایت کرتے ہیں۔ اس کے نہایت بیّن اور روشن منطقی نتائج کے متعلق اُن کا رویہ بھی بالکل وہی ہوتا ہے۔ جو اُن کے مخالفین خود اُس نئے اصول کے خلاف اختیار کئے ہوتے ہیں۔ پُرانے زمانے کے مصلحین۔ انقلاب پرست۔ بدعتی۔ مُلحِد۔ آزاد خیال اور متعصب لوگ اگر اپنے اعمال کے نتائج کو دیکھیں۔ تو وہ ششدر و مبہوت رہ جائیں۔ اور اُن لوگوں کی صفوں میں جا کھڑے ہوں۔ جو اُن اصولوں کے ثمرات کی شدید مخالفت کر رہے ہیں۔ جن کو قائم کرنے کی خاطر ان قدماء نے اپنی پوری زندگیاں اور قوتیں وقف کر دی تھیں۔ لیکن کوئی طاقت اس عمل کی رفتار کو روک نہیں سکتی۔ جس طرح نتائج منطقی فکر کی ترتیب میں لازمی اور ناگزیر ہوتے ہیں۔ اسی طرح وُہ انسانی نشو و ارتقا کی ترتیب میں بھی لازمی اور ناگزیر ہیں عقلی عمل میں مفاہمت اعتدال اور انتہا پسندی سے بچ کر چلنا قطعی طور پر بے محل اور مہمل الفاظ ہیں عقلی اصول کا غیر مکمل اور معتدل اطلاق صرف مشروط اور عارضی ہو سکتا ہے جس لمحے سے کسی اصول کو تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ اُسی لمحے سے اُس کے دُور دراز کے نتائج و اثرات بھی یقینی تسلیم کرنے پڑتے ہیں۔ خواہ اُن نتائج کا ظہور صدیوں کے بعد ہونے والا ہو۔ کسی عقلی اصول کو اختیار کرتے وقت یہ حد مقرر کرنا ممکن نہیں ہے کہ یہاں تک چلو اور اس کے آگے مت بڑھو۔"

ہم مسلسل و متواتر دیکھ رہے ہیں۔ کہ ایک عقلی اصول آغاز میں شدید مخالفت کے بعد مان لیا جاتا ہے۔ اور جو لوگ آغاز میں اس کے مخالف تھے۔ اُن کا بہت بڑا حصہ نہایت مخلصانہ جوش و خروش کے ساتھ اس کو تسلیم کر کے سینے سے لگا لیتا ہے لیکن جونہی اس کے فوری نتائج سامنے آتے ہیں۔ وہی لوگ اُسی

جوش وخروش سے مخالفت شروع کر دیتے ہیں۔ ایک ایسی جماعت ہر وقت موجود رہتی ہے۔ جو اس بڑھتی ہوئی لہر کے درمیان "ایک مستقل آرام گاہ" قائم کرنے کی فکر میں رہتی ہے۔ وہ لوگ حقیقت ثابتہ کو تسلیم بھی کرتے ہیں۔ اس کے آغاز میں انھوں نے اس کی جو مزاحمت و مخالفت کی تھی۔ اس کی ذمہ داری سے انکار بھی کرتے ہیں۔ صداقت۔ وسیع المشربی اور ترقی کی خوبیاں اور تعصب اور بے بصری کے عیوب بھی بیان کرتے ہیں۔ لیکن اُن کی ابتدائی مخالفت کو مغلوب کرنے کے بعد وہ خیال و اصول جس موقف و مقام پر پہنچ چکا ہے۔ اس کے متعلق اُن کا رویہ بالکل وہی ہے جو انھوں نے آغاز میں اختیار کیا تھا۔ وہ اُس خیال کو تسلیم کر کے (جس کے متعلق اعتراض یا مخالفت کی کوئی گنجائش نہ رہی تھی) اپنی روشن خیالی۔ ترقی پسندی اور فراخ مشربی کی لاف مارتے ہیں۔ لیکن اس خیال کے عروج و ارتقا کے متعلق اُن کا رویہ آج بھی بالکل وہی ہے۔ جو پہلے تھا۔ میانہ روی اور اعتدال پسندی کے الفاظ اُن کی زبان سے ہمیشہ صادر ہوتے ہیں۔ اور جس مقام پر پہنچ کر وہ خود ٹھہر چکے ہیں۔ اُس سے آگے بڑھنا اُن کے نزدیک انتہا پسندی بے اعتدالی اور تجاوز ہے۔ ایک ہی اصول کی ناگزیر نشو و نما کے ہر مرحلے پر اسی صورت حالات کا اعادہ کیا جا رہا ہے۔ ہمیں اس کا تجربہ روزمرہ ہو رہا ہے۔ لیکن اس پیہم اور ناگوار اعادے کے باوجود لوگ اس سے فائدہ نہیں اُٹھاتے۔

اس مقام پر ہمیں اُس قانون پر اعتماد کرنا چاہئے۔ جو ہر جسمانی قانون کی مانند قطعی طور پر انسانی ارتقا پر حکمرانی کرتا ہے۔ اور ہمیں آیندہ کے منازل ارتقا کا یقینی اندازہ اُسی طرح لگا لینا چاہئے جس طرح ایک ماہر فلکیات چاند یا سورج کے گرہن کا حساب لگا لیتا ہے۔ جب تک کسی عقلی عمل یا اصول کے نتائج و عواقب حدِ انتہا تک پہنچ کر ختم نہ ہو جائیں۔ اس کی رفتار کو روکنا اتنا

ہی ناممکن ہے۔ جتنا گرتے ہوئے پتھر کو خلا میں معلق کر دینا محال ہے۔ منطقی عملیات مفاہمت۔ میانہ روی اور اعتدال بالکل نہیں جانتے۔ لہٰذا صرف انتہا پسندانہ تصوّر ہی صحیح ہے۔ اور وہی ہمیشہ زندہ رہے گا۔

چوتھا باب

انسانی و عضویاتی ارتقا میں فرق

(۱)

وراثتِ انسانی کا حامل

انسان نے معرکۂ ارتقا میں جن ذرائع و وسائل سے فتح پائی۔ وہ اگرچہ حیاتی فعالیت کی عمیق تریں شکلوں میں پہلے سے مُضمر تھے۔ اور اُنہی سے ظہور میں آتے تھے لیکن اس کے باوجود اپنی قوت اور اپنے اطلاق میں زندگی کے آلاتِ متقدرہ کی حیثیت سے بالکل انوکھے تھے۔ اب اُن کے پیش نظر صرف جسمانی ساخت ہی کی ترمیم نہ تھی۔ اب حیوانی ارتقا کی طرح اوزار اور ہتیارہ اعضا و جوارح کے سانچے میں نہ ڈھلتے تھے۔ رہنمائی کی زیادہ لچکدار اور پُر اسرار طاقتوں نے انسان کو اس قابل بنا دیا تھا۔ کہ اپنے جسمانی ماحول کو خود حسب منشا بدل لے۔ اسی سے اپنے اوزاروں کی تشکیل کرے۔ اور اپنے دماغ کے چنگلوں کو دُور دُور پھیلا دے۔ اس کے وسائل ارتقا ذہنی تھے۔ اور جہاں تک اس کا تعلق تھا۔ وہ پُرانا حیوانی ارتقا جو صرف جسمانی ساخت ہی پہ اثر انداز ہوتا تھا۔ ختم ہو چکا تھا۔

بہت سے لوگ جن کو ہمارے مصنوعی نظام تعلیم کے ماتحت علم ارتقا

کے متعلق صرف اتفاقاً سُنی سُنائی باتوں ہی پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔ اکثر سوال کرتے ہیں۔ کہ آیا انسان کی موجودہ شکل و صورت میں بعض چونکا دینے والے تغیرات متوقع ہیں؟ آیا ممکن ہے۔ کہ انسان کے کندھوں پر پَر نکل آئیں۔ اور اس کے سر کے پیچھے آنکھیں نکل آئیں؟ اُن کو معلوم ہونا چاہئے۔ کہ اس قسم کے دل چسپ تغیرات کا کوئی بعید سے بعید احتمال بھی موجود نہیں۔ انسان کی ترکیب جسمانی اس کے اسلوبِ زندگی کی تبدیلیوں کی وجہ سے مسلسل بدل رہی ہے۔ لیکن یہ تغیرات نسبتاً بہت ہی خفیف ہیں۔ اور اُن کی اہمیت نظر انداز کی جا سکتی ہے۔ اب انسان کی ہیئت جسمانی اُن اسباب و علل کی اثر اندازی سے باہر ہو چکی ہے۔ جن سے عضویاتی تغیرات پیدا ہوا کرتے تھے

انسانی ارتقا کے حاصلات بھی اس کے ذرائع و وسائل کی طرح ایک مختلف شکل اختیار کرتے ہیں۔ وہ اعضائے جسمانی نہیں۔ بلکہ خیالات۔ اسالیب۔ افکار۔ عادات۔ نظریات۔ اختراعات اور معاشری تنظیمات ہیں۔ اور اعضائی نہیں بلکہ نفسیاتی ہیں۔

یہ حالت اپنے اندر عظیم الشان نتائج کا امکان رکھتی ہے۔ انسانی ارتقا کے وسائل و نتائج کی بے نظیر نوعیت ایک خاص اسلوب کی حامل ہے جس سے یہ وسائل و نتائج ایک نسل سے دوسری نسل کی طرف منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ یہ حاصلات و نتائج عضویاتی توالد کے ذریعے سے منتقل نہیں ہوتے۔ اور نہ ہو سکتے ہیں۔ ہر آنے والی نسل کو اپنے زمانۂ حیات میں انھیں از سرِ نو حاصل کرنا پڑتا ہے۔ اور یہ ان کو صرف اُس انسانی ماحول کی وساطت سے حاصل کرتی ہے جس میں وہ پیدا ہوئی اور پروان چڑھی ہے۔ اس کے خیالات۔ اس کے تصورات۔ اس کے اسالیبِ فکر۔ اس کی عادات۔ اس کے مقاصد اور اس کے اخلاق اُس انسانی دُنیا۔ اُن انسانی احوال و کوائف۔ معاشری کیفیت۔ ادبیات اور اُس معاشرے کی حالت سے جس میں اُس کی نشو و نما

ہوتی ہو۔ بطور ترکہ پہنچتے ہیں۔ نئی نسل کی نشوونما کے ارتقائی مرحلے کا تعین نہ اعضائے جسمانی کے عملیات سے ہوتا ہے۔ نہ نسل کے شجرۂ نسب میں اُس کے مقام سے کیا جاتا ہے۔ بلکہ یہ مرحلہ بحیثیت مجموعی دُنیائے انسانی کی نوعیت سے اور اُن تمام انسانی اثرات سے جو پوری نسل اُس پر ڈالتی ہے متعین کیا جاتا ہے۔

بعض قابلیتیں بعض سہل الحصول صلاحیتیں "تعلیم پذیری" ردّ عمل اور تاثر کی بعض قسموں کا جبلّی طور پر موجود ہونا بلاشبہ یہ ایسی چیزیں ہیں ۔ جو عضویاتی اعتبار سے منتقل ہوجاتی ہیں لیکن ارتقا کے حقیقی نتائج اور وہ اہم ترین حاصلات جو اُس کی پیداوار سمجھے جانے چاہئیں۔ صرف پورے انسانی ماحول ہی کی وساطت سے اخذ کئے جاسکتے ہیں ۔ اگر ایک انگریز بچے کی پرورش وسطی افریقہ کے کسی قبیلے میں کی جاتے ۔ اور ایک حبشی بچے کو پروان چڑھانے کا کام انگلستان میں کیا جائے ۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حبشی بچہ بڑا ہو کر ایک مہذّب انسان بن جائے گا ۔ جو یورپی ارتقا کے ثمرات سے کافی بہرہ ور ہوگا لیکن انگریز بچہ بالکل وحشی ہوگا ۔ بلاشبہ وہ مہذّب حبشی کسی برابر کی تعلیم پاتے ہوئے یورپین کے بالکل مساوی نہ ہوگا ۔ اور انگریز وحشی بھی بعض پہلوؤں سے اپنے افریقی ساتھیوں سے مختلف ہوگا ۔ ان دونوں میں وہ امتیازی خصوصیات جسمانی وراثت کی وجہ سے ہوں گی ۔ انسانی ماحول کے اثر سے نہ ہوں گی لیکن اس قسم کی انتہائی مثال میں بھی جسمانی موروثی خصوصیات کا اثر ماحول اور تعلیمات کے اثرات کے مقابلے میں بالکل بے حقیقت ہوگا جہاں تک انسانی ترقی کے حقیقی ثمرات اور اس کے عمل میں شرکت کا تعلق ہے ۔ اُن دونوں بچوں کی صورت حال بالکل متضاد ہوگی ۔ حبشی تو اس قابل ہوگا ۔ کہ مہذّب زندگی میں حصہ لے سکے لیکن انگریز اس قابل نہ ہوگا ۔

ڈاکٹر ڈبلیو میکڈوگل کا یہ بیان بالکل صحیح ہے ۔ کہ کسی ملک کے لوگوں کی

قومی خصوصیات اصلاً اُن کے مُتضمن کردہ ہوتے ہیں لیکن اس امر کی تردید بھی نہیں کی جا سکتی۔ کہ یہ عام مفروضہ غلط ہے۔ اور قومی خصوصیات ... ... بنیادی طور پر مختلف روایات کی مظہر ہوتی ہیں۔ ہر فرد اپنے ملک کی روایات میں حصہ لینے کی وجہ سے جو قومی خصوصیات حاصل کر لیتا ہے۔ اُن کے مقابلے میں فرد کی اپنی خصوصیتیں بے حد خفیف ہوتی ہیں۔ اور "عائد شدہ اور حاصل کردہ" کرداروں کی وجہ سے کاملاً مخفی اور پوشیدہ ہو جاتی ہیں ... ... فرض کیجئے۔ اگر نصف صدی کی مدت کے دوران میں (کسی جادو کی قوت سے) انگریز والدین کے ہر بچے کا تبادلہ فرانسیسی قوم کے ہر بچے سے ہو جائے۔ تو اُس مدت کے گزر جانے کے بعد انگریز قوم فرانسیسی نسل کے افراد پر اور فرانسیسی قوم انگریزی نسل کے افراد پر مشتمل ہوگی۔ میرے نزدیک یہ امر بالکل واضح ہے۔ کہ دونوں قوموں کے درمیان جبلّی کرداروں کے اس کامل تبادلہ کے باوجود قومی خصوصیات انتہائی ہی میں فوری تغیر بہت ہی کم ہوگا۔ فرانسیسی لوگ برابر فرانسیسی میں گفتگو کریں گے۔ اور انگریز انگریزی بولیں گے۔ اس میں وہ تمام مقامی اختلافات موجود ہوں گے جن کے ہم عادی ہیں۔ اور لہجے اور تلفظ کا تغیر بالکل نامعلوم سا ہوگا۔ فرانسیسیوں کا مذہب اب بھی زیادہ تر رومن کیتھلک ہوگا۔ اور انگریز برابر پراٹسٹنٹ مذہب کے مختلف عقائد کے پابند ہوں گے۔ سیاسی ادارات کی رفتار میں کوئی گہری تبدیلی نمایاں نہ ہوگی۔ دونوں قوموں کے حالات و عادات سے صرف ایسی تبدیلیوں کا اظہار ہوگا۔ جو امتدادِ زمانہ سے منسوب کی جا سکیں گی۔ جہاں تک بیرونی مظاہر کا تعلق ہے فرانس کے باشندے پھر بھی فرانسیسی ہوں گے۔ اور انگلستان کے رہنے والے پھر بھی انگریز ہوں گے۔ سوائے اس کے کہ دونوں قوموں کی جسمانی صورتیں ایک دوسری سے بدل جائیں گی۔"[1]

---

[1] Social Psychology صفحہ ۳۲۹

کسی ایک مہذب قوم کو دوسری سے ممیز کرنے والی جو چھوٹی چھوٹی خصوصیتیں ہیں۔ اُن کے متعلق جو بات صحیح ہے۔ وہی نہایت واضح اور مہتم بالشان طور پر خود تہذیب کے متعلق بھی صحیح ہے۔ جو انسانی نشوونما اور ترقی کے عمل کے حقیقی ثمرات سے عبارت ہے۔

سائینسی "نسل کشی" کے ذریعے سے کسی نسل کو بہتر بنانے کے متعلق بہت سی باتیں کہی جا رہی ہیں۔ "آج کل" نسل" کے متعلق جو نام نہاد اور جعلی سائینسی عقیدہ عام ہے۔ اس کے ماتحت "نسل کشی" کے حامی جو مزے کی حماقتیں کرتے ہیں۔ اُن کو کوئی روک نہیں سکتا۔ "اگر انسان نسل کشی کے انتخاب وانضباط کو اُسی عقلمندی سے کام میں لائے گا جس سے وہ پالتو جانوروں کی نسل کشی کرتا ہے۔ تو وہ اپنی تقدیر پر خود حاوی ہو جائے گا۔ اور اُن اخلاقی "بلندیوں" پر پہنچ جائے گا جن کا اب تک تصور بھی نہیں کیا گیا"[۱] یہ امر محل نظر ہے۔ کہ اگر محققین اصلاح نسل کو پورا اختیار بھی دے دیا جائے۔ تو وہ سوائے بعض امراضی خرابیوں کی استیصال کے (جو بعض دوسرے علاجوں سے بھی دُور کی جا سکتی ہیں) کوئی خاص پسندیدہ نتائج پیدا کر سکیں گے لیکن وہ ارتقائی حاصلات جو عضویاتی وراثت پر منحصر ہیں۔ ان حاصلات کے مقابلے میں جو اس عمل پر منحصر نہیں ہیں قطعی طور پر بے حقیقت ہیں۔ یہ ایک نہایت دردناک اور قابل رحم کیفیت ہے۔ کہ عضویاتی وراثت پر تعاید حاصل کر کے نسل کو بہتر بنانے میں سرگرمی کا اظہار کیا جاتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اُن وسائل کو جن سے انسانی ارتقا کے حاصلات و نتائج در حقیقت منتقل ہوتے ہیں۔ اور جو انسانی پیش بینی اور انتظام سے براہِ راست اور بسہولت متاثر ہوتے ہیں۔ حالات حاضرہ کے ماتحت اور اس تمام "نظام تعلیم" کے ماتحت جو ترتیب قریب غار نشین وحشیوں کی سی خامی کا حامل ہے محض اتفاق پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یا مقاصد ارتقا کو

[۱] M. Grant, The Passing of The Great Race P. 85

ناکام رکھنے کے لئے اُن کی شکل بگاڑ دی جاتی ہے۔

اگر ہم اپنے اُن آبا و اجداد سے جو اپنے جسموں پر نیل کا رنگ ملا کرتے تھے۔ بہتر ہیں۔ تو اس کی وجہ یہ نہیں۔ کہ ہم کوئی اعلیٰ اور برتر اوصاف لے کر پیدا ہوتے تھے۔ بلکہ ہم نے ایک ایسے انسانی ماحول میں جنم لیا ہے جس میں "عقل فکر" کے نتائج حاصلہ نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتے چلے آتے ہیں۔ اور وہی اوصاف جو عضویاتی اور وراثتی ہیں۔ خود اُن حالات سے لازم و ملزوم ہیں۔ جو عقلی قوت اور انسانی اقتدار کے مجموعی حاصلات سے پیدا ہوتے ہیں۔ لہٰذا اگر خفیف سی عضویاتی ترمیمات کو ترقی دی جائے۔ اور غیر عضویاتی ترقی کو نذرِ تغافل کر کے روک دیا جائے۔ تو خود اُن خفیف ترمیمات کی ترقی بھی رُک جائے گی۔ کیونکہ وہ سرچشمہ ہی خشک ہو جائے گا جس سے اُن ترمیموں کے پیدا کرنے والے حالات رونما ہوتے تھے۔

انسانی ارتقا کے حاصلات اُن کرداروں میں شامل نہیں ہیں۔ جن کو عضویاتی وراثت منتقل کرتی ہے۔ بلکہ انسانی ارتقا میں وراثت کے انتقال کا مطلب یہ ہے کہ انسانی دُنیا اپنے تمام پہلوؤں میں ان تمام قوموں اور نسلوں کے ساتھ تعلق رکھتی ہے۔ جو ایک دوسری پر اپنا اثر ڈالتی ہیں۔ خیالات و آرا اور علم کا مبادلہ کرتی ہیں۔ اور فنون و ایجادات میں اضافہ کرتی ہیں۔ عہدِ رواں کے ہر تخمینے اور تصور۔ ہر انقلابی فکر۔ ہر قسم کی رسوم و اطوار اور عادات۔ معاصر معاشرتی تنظیم اور اس سے پیدا ہونے والے تمام احوال و کوائف۔ حکومت کے نظام۔ ادارات۔ عقائد۔ پھر خیالات و افکار کے تمام نمونے اور نظام۔ عزت آبرو اور چال چلن کے معیار۔ نقطۂ نگاہ۔ فہم و بصیرت کے مدارج۔ وہ رجحانات و تعصبات جو ان حالات سے متعلق روابط و مقاصد کے مطابق تشکیل پذیر ہوتے وہ انسانی ماحول جو تمام محتویات و اختیارات مہیا کرتا ہے۔ اور اپنے اندر پیدا ہونے اور پروان چڑھنے والے تمام اذہان کے رجحانات کی تشکیل کرتا ہے۔

یہ وہ تمام عناصر ہیں۔ جو وراثت کو منتقل کرتے ہیں۔

(۲)

انسانیت ایک اجتماعی جسم نامی کی حیثیت سے

لوگوں کی عادت ہے۔ کہ جب "انسانیت" کا لفظ سنتے ہیں۔ تو ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ شائد وہ یہ سمجھتے ہیں۔ کہ یہ کوئی کھوکھلا سا قابلِ اعتراض خطیبانہ کلمہ ہے جس سے مقصود یہ ہے۔ کہ سننے والے کو Anacharsis Kloots کا تصور دلا کر آٹھویں صدی کے عقیدۂ تجسیم و تشبیہ کی طرف دعوت دی جائے۔ آیا "انسانیت" کے نام کی کوئی چیز واقعی موجود ہے؟ کیا نسلِ انسانی کے افراد کے ایک مجموعے کو ایک "جسم نامی" سے تشبیہ دینا محض ایک "اندازِ بیان" نہیں؟ آخر "انسانیت" اپنے افراد کے مجموعے کے سوا اور کیا ہے؟

انتقال کے اہم ترین وظیفے کے پیش نظر انسانیت کا تصور ایک "عضوی کُل" کی حیثیت سے محض استعارہ یا محض "اندازِ بیان" ہی نہیں۔ بلکہ ایک نہایت سنجیدہ اور صحیح سائینسی حقیقت ہے۔ انسانیت بحیثیت مجموعی ایک ہی ہیئت اجتماعی ہے۔ جو انسانی ارتقا کے حاصلات کو منتقل کرتی ہے۔ انسان ان حاصلات کو اپنے والدین سے اخذ نہیں کرتا۔ والدین کا اس امر میں کوئی بھی حصہ نہیں۔ ہر انسان پیدائش کے وقت ایک چھوٹا سا جنگلی حیوان ہوتا ہے جس میں اس امر کے امکانات ہوتے ہیں۔ کہ وہ بعد میں ایک غرانے والا وحشی بن جائے یا پانچویں صدی۔ پندرھویں صدی۔ بیسویں صدی یا پچیسویں صدی کا انسان بن جائے۔ دنیائے انسانی ایک وسیع ہیئت اجتماعی ہے۔ جو انسان کو وہ بناتی ہے۔ جو وہ ہے۔ اور معین کرتی ہے۔ کہ وہ انسانی ارتقا کے کس مرحلے سے تعلق رکھے گا۔

آپ حقیقت میں انسانیت کو ایک طبعی "جسمِ انسانی" کی حیثیت سے نہیں دیکھ سکتے۔ لہٰذا کوشش کیجئے۔ کہ ایک فرد کو انسانیت سے بالکل الگ محض ایک جسمِ نامی کی شکل میں دیکھیں۔ مثلاً تصور کیجئے۔ کہ ایک نومولود بچہ یا ایک درجن نومولود بچے پیدا ہوتے ہی (اس دفعہ کسی وحشی قبیلے میں نہیں) ایک غیر آباد جزیرے میں منتقل کر دیئے جاتے ہیں۔ اور کسی کرامات سے ایسا بندوبست کر دیا جاتا ہے۔ کہ وہاں وہ بڑھنے اور پروان چڑھنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ اُن کے متعلق انسانی ارتقاء کے حاصلات و نتائج کا کیا ہوگا؟ ایک فردِ بشر (جس سے انسانیت الگ کر لی جائے) اور آسٹریلیا کے ایک ادنےٰ ترین Arunta میں فرق و تفاوت کی حیثیت کیا ہوگی؟ چونکہ آپ نے ارتقائے انسانیت کے حاصلات سے انسانیت کو منتقل نہیں کیا (جو ایک استعاری تصورِ مجرد ہے) لہٰذا آپ نے ایک نہایت قابلِ رحم اور ناممکن سے جسمانی تصورِ مجرد کے سوا کچھ نہیں چھوڑا۔ جس کو "فردِ بشر" کہتے ہیں۔ اس ترکیبی فرد کی تخلیق میں خواہ کتنا ہی اعلیٰ درجے کا مادۂ منویہ صرف ہوا ہو۔ اور خواہ اصلاحِ نسل کی کتنی ہی بہتر تدبیر کی گئی ہو۔ وہ انسانی ارتقاء کے اُسی درجے سے متعلق ہوگا۔ جس سے آدم خور تعلق رکھتے ہیں۔

ہم عام طور پر سرسری حیثیت سے یوں استدلال کرنے کے عادی ہیں۔ کہ ہم بعض مادی فوائد اور سہولتوں کے لئے انسانی دُنیا اور اپنے معاشرے کے ممنونِ احسان ہیں۔ اُنھوں نے ہمارے منشا کے مطابق ہمیں خوراک۔ پوشاک۔ مکانات۔ پولیس اور کتابیں مہیا کی ہیں۔ اور یہ ایک ایسا قرض ہے۔ جس کی ادائیگی سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ہمیں چاہئے۔ کہ معاشرے کی تھوڑی بہت خدمت کریں۔ لیکن انسانیت نے ہم پر احسان نہیں کیا۔ کہ ہمیں کپڑے دیئے۔ کھانے کو دیا۔ اور ہمارے سروں پر چھت مہیا کی۔ بلکہ خود ہماری ہستی ہی اُس کی شرمندۂ احسان ہے۔ اگر وہ ذہانت جو انسانیت نے آپ کو عطا کی ہے۔

کسی جادو کے زور سے منسوخ ہو جائے۔ تو چشم زدن میں آپ کا وجود غائب ہو جائے گا۔ اور آپ اسی طرح معدوم ہو جائیں گے جس طرح ناپید رہیگر ڈ کی "شی" اس طلسم کے ٹوٹ جانے سے بے وجود ہو گئی تھی۔ جس نے اُسے لازوال جوانی عطا کر رکھی تھی۔ آپ انسانیت سے گر کر صرف ایک گونگے بہرے حیوان رہ جائیں گے۔ آپ کا وجود ارتقا کے حاصل کی حیثیت رکھتا ہے۔ کسی اجتماعی وحدت یعنی مملکت اور وطن کا محتاج نہیں۔ جو مکان اور پولیس کے لئے آپ سے بل وصول کرتے ہیں۔ وہ آپ سے تشکر کے متوقع ہوتے ہیں۔ بلکہ اس وجود کا ماخذ صرف نسل انسانی ہے۔ بعید ترین ماضی میں زمانۂ قبل تاریخ کی ثقافت سے اور مصر، یونان، اور روما کی تہذیب سے جو فوائد ہمیں پہنچے اُن کو تو چھوڑ دیجئے۔ اور یہ دیکھئے۔ کہ ہماری آج کل کی زندگی کو اور ہمارے وجود کے ہر داخلی و خارجی پہلو کو فرانس۔ اٹلی۔ جرمنی بلکہ خود انگلستان سے کتنی برکات و حسنات حاصل ہوتی ہیں۔ اس میں نہ کوئی شکر گزاری کا سوال ہے۔ نہ ادائے قرضہ" کا مسئلہ ہے (کیونکہ وراثت میں پسندیدہ باتوں کے علاوہ بعض نہایت مکروہ شقیں بھی ہوتی ہیں) کیونکہ محض اپنی ولادت کے لئے والدین کا شکرگزار ہونا بالکل بے بنیاد ہے۔ یہ محض حقیقتِ واقعہ کا مسئلہ ہے۔ انسان کے قوائے حیات انسانیت ہی کے صُلب سے پیدا ہوتے ہیں۔

اور ان قوا کی نشو ونما اور ترقی صرف انسانی عامل ہی کے تعلق میں آگے بڑھ سکتی ہے۔ اگر وہ عمل ارتقا کو ایک قدم آگے لے جاتا ہے۔ اُس حلقۂ تصورات کو جو اُس کے گرد محیط ہے۔ توڑ کر باہر نکل آتا ہے۔ اور قیاس و خرد کے اُن معیاروں کو جو اُس نے ورثہ میں پائے ہیں ترک کر دیتا ہے۔ تو غور کیجئے کہ خود وہ محرک بھی جو اُسے آمادۂ عمل کرتا ہے۔ اس کے ماحول ہی سے ماخوذ ہے۔ اور خود اُس کی وسعت اور اُس کا رُخ بھی زمانے کے احوال و شروط ہی سے معیّن ہوتا ہے۔ اس کی عملی روش کی رسائی بلاواسطہ طور پر اس کے

فکر سے بھی زیادہ محدود ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ انسان، دوسرے انسان کے باہم تعلقات میں جس چیز کو جائز اور صحیح سمجھتا ہے۔ اس کو بھی تنہا رہ کر عمل میں نہیں لا سکتا۔ بلکہ اسے موجودہ دُنیا کے ساتھ اپنے آپ کو مطابق بنانا پڑتا ہے۔ اس کے نصب العین اور اس کے مقاصد اپنی تکمیل کے لئے کل نسل انسانی کے تعاون کے محتاج ہیں۔ احمقوں کی پوری دُنیا میں ایک فردِ بشر کے لئے عقل مند ہونا بالکل ناممکن ہے۔

زمانۂ قبل سائنس کے فلاسفۂ تاریخ ایک غلط اور گمراہ کن تصور میں مبتلا تھے۔ وہ یہ لغو نظریہ تھا۔ کہ "تاریخ بڑے آدمیوں کی سوانح عمری ہے"۔ یہ نظریہ اس لئے لغو تھا کہ بڑے آدمی بھی دوسرے تمام انسانوں کی طرح اپنے انسانی ماحول ہی کی پیداوار ہوتے ہیں۔ اور اگر اُس ماحول کی نوعیت کی برکت سے روشن ضمیری کے باعث کسی قدر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ تو صرف اپنے زمانے کو متاثر کر سکتے ہیں۔ اپنے انسانی ماحول کی ترمیم کر سکتے ہیں۔ اور اُن اوصاف و رجحانات کو اُبھار سکتے ہیں۔ (جو ہر اُس ارتقا سے زیادہ پیچیدہ ہیں جس کو فرد حاصل کر سکتا ہے) جو ان اشخاص کو پیدا کرنے والے حالات میں پہلے ہی موجود اور پختہ ہو چکے ہوتے ہیں۔ آج کل ہم روز بروز اس حقیقت کو محسوس کرتے جاتے ہیں۔ کہ بہت زیادہ اہم سوال یہ نہیں ہے۔ کہ فلاں خیال فلاں نظریئے یا فلاں ایجاد کا موجد و مخترع کون تھا؟ بلکہ زیادہ اہم یہ مسئلہ ہے کہ "فلاں تصور نے نشو و نما کیونکر پائی"؟ اس کی ترقی کی تاریخ کیا ہے؟ وہ کیا مرحلے تھے جن میں سے وہ ایجاد یا اختراع گزرتی ہوئی تکمیل حاصل کر گئی۔ جن انسانوں کے نام تاریخِ انسانی اور تصوراتِ انسانی میں انقلابی تغیرات سے وابستہ ہیں۔ مثلاً گوتم۔ محمدؐ۔ لوتھر۔ کولمبس۔ کوپرنیکس نیوٹن۔ واٹ۔ ڈارون۔ ان پر غور کیجئے۔ تو ابتدائی خیالات کا ذہنی "شجرۂ نسب" اس قدر طویل و وسیع ہے۔ اور ان حضرات نے اپنے اپنے زمانوں

کی ذہنی فضا اور ان حالات میں پختہ ہونے والے رجحانات و خیالات سے ہم آہنگ ہوکر اس قدر وسیع اور مکمل اثر ڈالا ہے۔ کہ اکثر اوقات یقینی طور پر یہ کہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ کہ کونسا اضافہ ان کا انفرادی کارنامہ ہے۔ اور کونسا زمانے کی اجتماعی قوتوں کا پیدا کیا ہوا ہے۔ اور بہت سے حالات میں ہمیں شبہ ہو سکتا ہے۔ کہ اگر یہ حضرات دنیا میں نہ آتے ہوتے۔ تو آیا وہ انقلابات اسی طریقے سے اور اسی زمانے میں واقع ہوتے یا نہ ہوتے بعض "فوق البشر" انسان ایسے بھی ہیں۔ جن کی شخصیتیں روایتی اعتبار سے شدید القویٰ اور مقتدر انفرادیت کی پیکر ہیں۔ یہ لوگ تقدیر پر قابو پا لیتے ہیں۔ اپنے زورِ بازو سے تاریخ کا رخ پلٹ دیتے ہیں۔ نوعِ بشر کو مضبوط گرفت میں لاکر زمانے کو اپنے عزمِ مستحکم کا غلام بنا لیتے ہیں۔ مثلاً سیزر یا نپولین [1] ان کو غور و تعمق سے دیکھا جائے۔ تو معلوم ہوگا۔ کہ ان لوگوں کو بھی احوال و ظروف ہی کے عمل اور انتخابِ طبیعی ہی نے تخلیق کرکے آمادۂ عمل کر دیا تھا۔ ان کو بھی واقعات کی رَو اپنے ریلے میں بہا لے گئی۔ وہ بیم و رجا کی حالت میں اس ریلے کے اندر جدوجہد کرتے رہے۔ اور اپنی شجاعت و جسارت کی انتہائی ساعت میں بھی ماحول کی ضرورت ہی نے ان کو جبراً آگے بڑھایا۔ اور وہ اس کے ہولناک دباؤ کی تاب نہ لا سکے۔

انسانی ارتقا کے حاصلات و نتائج کی مخصوص نوعیت سے اور اس حقیقت سے کہ جو نظامِ تولید ان نتائج کو منتقل کرتا ہے۔ انسان میں نہیں بلکہ انسانیت میں مضمر ہے۔ ایک مخصوص اور مشکل صورتِ حالات پیدا ہوگئی۔ اور نسلِ انسانی کو ایسے مسائل و افعال کا سامنا کرنا پڑا۔ جو اپنی کیفیت کے اعتبار سے بے حد مہیب تھے۔

---

[1] ملاحظہ ہو Ferrero کی کتاب Giulio Casare اور A. Vandal کی L'avénement de Bonaparte

ارتقا کے نئے وسائل کی وجہ سے فرد بشر کے لئے آرزوؤں کے نئے اُفق اور ترقی کے نئے دائرے منکشف ہو گئے۔ وسیع تر اور تیز تر بصیرت کی قوت نے جو تعلقات و روابط کے وسیع دائروں پر حاوی تھی عضبی جد و جہد کی دُنیا پر فتح پانے کے ساتھ ہی ساتھ ایک قطعاً نئی دُنیا کا دروازہ کھول دیا۔ انسان کی خواہشات۔ اُس کے مقاصد۔ اُس کی مسرتیں۔ اس کے تفکرات۔ زندگی کے متعلق اس کا سرو کار اور اس کی اہم ترین ضروریات اس کے وسیع دائرہ ہائے نظر کے ساتھ ہی کشادہ تر ہوتی چلی گئیں ادراک کا دائرہ ہی احساس کے دائرے کو معین کرتا ہے۔ اگرچہ عقل ہی وہ واحد وصف تھا۔ جس نے اس کو وہ بنایا۔ جو وہ تھا۔ لیکن اسی عقل نے تند تر جذبات، بدلے ہوئے مقاصد۔ اغراض اور حسیات کے سیلاب کا بند توڑ دیا۔ زندگی کا چہرہ بُشرہ بالکل بدل گیا۔ اب اس کا نقطۂ نظر صرف یہی نہ رہا۔ کہ روز بروز اور ساعت بہ ساعت اپنی حفاظت ہی کی فکر میں رہے۔ بلکہ اب وہ زمانے کی وسیع تر مُدتوں پر چھا گئی۔ اب اس میں پیدائش، ولادت اور وفات۔ پیہم نسلیں۔ اور عظیم و فعال ماحول سے ان کا تعلق بھی شامل ہو گیا۔ اب انسان صرف روٹی کے لئے زندہ نہ تھا۔ اس کی آرزوؤں اور حسرتوں کا دائرہ اور اس کی اُمنگوں اور تمناؤں کا زاویۂ نظر لا انتہا طور پر وسیع ہو گیا۔

لیکن انفرادی ترقی کے ان وسیع ترین قُوا و امکانات کو ایک نئی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کی نشو و نما کے ساتھ ہی ساتھ اُن پر ایک نئی شرط (یعنی تطابق) بھی عائد کر دی گئی۔ انھیں صرف طبیعی و جسمانی حالات آس پاس کی کائنات اور مختلف ناگہانی ضروریات سے (جو زندگی کو پیش آتی ہیں) اپنے آپ کو مطابق بنانا ہی ضروری نہ تھا۔ بلکہ اس کے ساتھ ہی اُس جدید ماحول، اُس جدید دُنیا کے ساتھ جس کو وہ خود ہی وجود میں لائے تھے یعنی انسانیت کے ماحول سے مطابقت پیدا کرنا بھی لابُدی تھا۔ ظاہر ہے کہ اس عجیب جسم نامی سے علیحدہ ان قوتوں کا

کوئی وجود نہیں۔

لیکن پھر بھی اُس کے اور فرد بشر کے درمیان (جو ترقی و ارتقا کی لاانتہا تمنائیں رکھتا ہے) نہایت شدید تصادم ضروری ہے۔ انسانی ماحول فرد کی فعالیت اور نشوونما پر اپنے شدید حالات و مقتضیات کو اسی بیدردی اور ظالمانہ سختی سے عائد کرتا ہے۔ جو ماحول کی دوسری شکلوں کا شیوہ ہے۔ اس کی شرائط انسان پر مطلق تحکم کا دباؤ ڈالتی ہیں۔ جو اس طبیعی ماحول کے دباؤ سے مختلف نہیں ہوتا۔ جو آندھی، سیلاب، سردی اور قحط کی مصیبتیں زندگی کے نہایت پیچیدہ سے نوموئیدہ پر عاید کرتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ ان سے تغافل نہیں کر سکتا۔ ورنہ خود ختم ہو جائے گا۔

یہ تصادم یعنی تطابق و توافق کا لازمی عمل انسانی ارتقا کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ اس عمل میں درحقیقت دو ارتقا شامل ہوتے ہیں۔ ایک انسان کا ارتقا دوسرے انسانیت کا ارتقا۔ آخرالذکر کا کام اس کے سوا کچھ نہیں۔ کہ ایک نئے اجتماعی جسم نامی اور زندگی کی ایک نئی ہیئت و ترکیب کی تشکیل کرے۔ یہ عمل صد پہلوؤں سے اُس کارنامے کا جواب ہے۔ جو زندگی نے عضوی ارتقا کے دوران میں انجام دیا تھا۔ یعنی الگ الگ جراثیم حیات (پروٹوزوا) رفتہ رفتہ باہم مل کر مرکب الجسم گروہ بن گئے۔ انفرادی خلیوں کے درمیان وظائف کا فرق و تفاوت واضح ہوا۔ اور اس طول و طویل توازن و تعاون سے کثیر الخلایا اجسام پیدا ہوئے۔ جیسا کہ خود انسان ہے۔ لیکن انسانی کام اس سے بہت زیادہ پیچیدہ ہے۔ اس کی مقدار اور اس کی دشواری دوسرے تمام مسائل اور فرائض پر غالب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حیاتِ انسانی میں اخلاقیات کا مقام بہت بلند ہے۔

ہم اس امر پر نظر ڈالیں گے۔ کہ انسان کی اکثر مصیبتیں۔ اس کی تنظیمات کی ناکامیاں۔ اس کی تکلیفیں اور پریشانیاں زیادہ تر اس وجہ سے

واقع ہوئیں۔ کہ انسان واضح شعور کے ساتھ اس تعلق کی واقعیت اور اس فرض کی نوعیت کا ادراک کرنے میں ناکام رہا ہے۔

پانچواں باب

رواجی فکر اور قوّتی فکر

(۱)

رواجی فکر

جب انسان کی ارتقائی قوتوں کی نوعیت، عقلی فکر کے ناگزیر مجموعی عمل اور اس کے راہِ عمل کی فطری ترقی پذیری واضح طور پر سامنے آگئی۔ تو اس کے بعد ان قوتوں کی کامیابی اتنی مختلج تصریح نہیں۔ جتنا یہ امر معرضِ بحث میں آنا چاہیئے۔ کہ وہ مزید فوائد کے حصول میں ناکام کیوں رہ گئیں۔ ہمیں اس امر کی طرف نہ دیکھنا چاہیئے۔ کہ ترقی کس طریقے سے رُونما ہوئی۔ بلکہ وہ اسباب معلوم کرنے چاہئیں۔ جن سے اس میں تاخیر اور رکاوٹ پیدا ہوئی۔ ترقی کی اصلیت کے متعلق جو شک پیدا ہوتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا اور گہرا سرچشمہ یہ ہے۔ کہ عقلی فکر ترقی ممکنہ کا جو واضح تصور پیش کرتا ہے۔ یعنی "کیا ہونا چاہیئے" اس میں اور انسانی احوال میں جو فی الحقیقت ہیں"۔ اتنا تضاد اور تفاوت کیوں ہے۔

انسان کا وجود پچاس ہزار سال یا اس سے بھی زیادہ مدت تک عضوی وجسمانی نشو وارتقا کی ایک ہی حالت میں رہا ہے۔ تاہم اس زمانے کے

زیادہ تر حصے میں اس کی کیفیت صرف ایک مصیبت زدہ وحشی کی رہی ہے پانچ یا چھ ہزار سال کی مدت میں اس نے کسی قدر تہذیب و تنظیم سے بہرہ پایا ہے۔ لیکن اس دوران میں اس کے تمام انتظامات بہت بڑی حد تک قدیمانہ اور غیر مہذب رہے ہیں۔ اس کے افکار و خیالات کا اکثر حصہ مغالطوں پر مشتمل رہا ہے۔ اور وہ آج تک بھی اپنے وجود کے ہر پہلو میں آن خود عائد کردہ حالات کا شکار رہے۔ جن کو اس کا فکر (جہاں کہیں اس کا اطلاق خفیف سے خفیف حد میں عقلی طور پر کیا جاتے) قطعی طور پر نامنظور اور مسترد کر دیتا ہے۔

انسانی ترقی کی عام حیثیت و نوعیت سے ظاہر ہے۔ کہ عقلی فکر نے نسل انسانی کو جو قوت و اختیار و دیعت کر دیا تھا۔ اس کے مقابلے میں انسانی ترقی کی وسعت و رفتار بہت کم رہی ہے۔ حقیقت میں ہم دیکھتے ہیں۔ کہ چند موقعوں پر جب کہ احوال و ظروف کا اجتماع عقلی فکر کے عمل کے لئے ساز گار تھا۔ ترقی کی رفتار نہایت نمایاں اور تیز رہی۔ جس کا عام پیش قدمی کی شرح سے مقابلہ کیجئے۔ تو اس کی قوت اور سیر حاصلی حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے۔ جس چیز کو ہم مشرق قریب میں تہذیب کا آغاز سمجھنے کے عادی ہیں۔ وہ دفعۃً ظاہر ہوئی۔ اور نہایت تیزی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ نشو و نما حاصل کر گئی۔ مصر میں نہایت قدیم اور ابتدائی مرحلوں سے لے کر ترقی کے بلند ترین درجے تک انسانی ثقافت کے ارتقا کا مسلسل سراغ مل سکتا ہے لیکن وہاں بھی شاہی خاندانوں سے قبل کے غیر مہذب زمانے سے لیکر چوتھے اور پانچویں خاندان میں تہذیب نیل کے عروج تک جو عبوری دور گزرا۔ اس کی مدت چند صدیوں سے زیادہ نہیں۔ بابل میں جہاں ہمیں پہلے پہل ہی پوری ترقی یافتہ تہذیب نظر آتی ہے۔ اور کوئی قدیم اور ابتدائی مرحلے نظر نہیں آتے۔ یہ فرض کرنا پڑتا ہے۔ کہ ثقافت کے پہلے مرحلے کسی اور مقام پر طے کئے گئے ہوں گے اور اس کے عناصر یا تو ایران سے یہاں منتقل ہوتے ہوں گے۔ یا زیادہ

غالب امکان یہ ہے۔ کہ قریبی ہمسایہ یعنی ایلام کی وادیوں سے حاصل کئے گئے ہوں گے لیکن اس مفروضہ کے باوجود یہ امر واضح ہے۔ کہ نشو وارتقا کا قدم زیادہ ناگہانی اور زیادہ تیز رفتار رہا ہے۔ ہندوستان کی قدیم آریائی تہذیب بھی زیادہ تر یہی خصوصیت ظاہر کرتی ہے۔ پھر جب ہم ہیلانی (یونانی) ثقافت کے فوقانی ظہور کو دیکھتے ہیں۔ تو اس عظیم الشان ترقی کی تیز رفتاری ہر زمانے ہی میں حیرت و تعجب کا مقام رہی ہے۔ مسلمان عربوں نے چند ہی سال کی مدت میں ایک ایسی ثقافت پیدا کر دی جس نے بعد میں یورپ کی تمام ترقیات پر اثر ڈالا۔ اور اگر ہم یہ فرض کر لیں۔ کہ یہ ثقافتی محرک مسلمانوں نے ایران سے ورثے میں لیا تھا۔ جب بھی اس کی نشو و نما حیرت انگیز تھی۔ ہماری اپنی تہذیب حاضرہ بھی گزشتہ تین چار صدیوں ہی کے اندر تاریک ترین بربریت سے ترقی پا کر موجودہ پیمانے پر پہنچی ہے۔

انسانی ترقی کی پیش قدمی کا پیمانہ ہرگز یکساں نہیں رہا۔ اس میں پے در پے سریع نشو و نما اور توسیع کے مرحلے آتے رہے ہیں۔ جو رفتہ رفتہ نابود و معدوم ہوتے گئے۔ یہ وضع بالکل جانی بوجھی ہوتی ہے۔ اسی سے آج کل کے بہت سے نظریات ماخوذ ہیں۔ اور کہا جاتا ہے۔ کہ تہذیب متنوع ادوار میں ترقی کرتی ہے۔

ہم اس امر کو واضح کریں گے۔ کہ تیز رفتاری اور رکاوٹ دونوں کے قطعی وجوہ و اسباب ہیں۔ جب کبھی ثقافت کے نشو و ارتقا کی رفتار تیز ہوتی ہے تو بعض مخصوص حالات ہوتے ہیں۔ جو ذہنی فعالیت اور آزادی فکر و عمل کے لئے سازگار ہوتے ہیں۔ اور جب کبھی اس رفتار میں نرمی یا رکاوٹ رونما ہوتی ہے۔ تو اس حالت میں بھی بعض ایسے اسباب ہوتے ہیں۔ جو فعالیت کو روک دینے کا رجحان رکھتے ہیں۔

پھر اگر عقلی فکر نے کچھ زیادہ کامیابی حاصل نہیں کی تو اس کی وجہ

یہ نہیں۔ کہ اُس کے عمل کے اسلوب میں کوئی داخلی نقص ہے۔ بلکہ اصل بات یہ ہے۔ کہ اس کی قوت کو بہت ہی محدود پیمانے پر استعمال کیا گیا ہے۔ انسان اس دُنیا میں دفعتہً ظاہر نہیں ہوگیا۔ اور نہ اس کے پاس کوئی پُراسرار طلسم تھا جس کی قوت سے وہ فی الفور اس دُنیا کو فتح کر لیتا بلکہ اس نے رفتہ رفتہ اپنی طاقت کے استعمال کا طریقہ سیکھا۔ اور اُس قوت کا اندازہ کیا جو اس کو دی گئی تھی۔ اس کی نشو و نما اور ترقی کی رفتار اُس آلۂ قوت کی خوفناک ممکنات کے مطابق نہیں ہوئی۔ بلکہ اس امر پر موقوف رہی ہے۔ کہ اُس نے رفتہ رفتہ اُس قوت سے کام لینا کس حد تک سیکھا ہے۔

اگرچہ ہم اب ارتقائی نقطۂ نگاہ سے سوچنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ لیکن وہ جو پُرانا تصور تھا۔ کہ مکمل تخلیق دفعتہً ظہور میں آگئی تھی۔ اس تصور نے انسانی ماخذوں کے متعلق ہمارے تصورات کو اب تک بے حد دھندلا کر رکھا ہے۔ ہم سوال کرتے ہیں۔ انسان اس کرۂ ارضی پر پہلے پہل کب نمودار ہوا؟ گویا انسان دفعتہً نمودار ہوگیا تھا! جس حد تک موجودہ شہادت سے ثابت ہے۔ جس "نسلِ حیوانی" کو آگے چل کر "نسلِ انسانی" کی صورت اختیار کرنی تھی۔ وہ سب انواع سے بلکہ زیادہ گہرا تعلق رکھنے والی حیوانی نسلوں سے علیحدہ کر لی گئی تھی۔ اور یہ واقعہ شائد تیسرے ارضیاتی دَور میں ہوا تھا۔ اگر آپ اس واقعہ کو کسی قطعی زمانے سے منسوب کرنے پر اصرار کریں۔ تو یوں سمجھ لیجئے۔ کہ یہ قصہ بیس لاکھ سال قبل کا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ بیس لاکھ سال بلکہ دس لاکھ سال پہلے بھی ہمارے جو مُورث گزرے ہیں۔ اُنھیں ہم کسی اعتبار سے "انسان" کہہ سکتے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی امتیازی خصوصیت یہ تھی۔ کہ اُن کا دماغ دوسرے تمام غیر انسانی حیوانات کے مقابلے میں بڑا تھا۔ اور موجودہ انسانوں کے مقابلے میں

کسی قدر چھوٹا تھا۔ اگر یہ سوال کیا جائے۔ کہ ابتدائی انسانی "نسل کب" انسانی بن گئی ہے تو یہ سوال مفروضی سا ہے۔ دماغ حجم میں بڑھتا گیا لیکن اس تدریجی اضافے میں وہ مقام کس وقت آیا۔ جب اس کو "انسان" کہنا جائز ہوا۔ اور جہاں یہ قرار دیا گیا۔ کہ "بس یہاں حیوان ختم اور انسان شروع ہوتا ہے"۔ یہ مسئلہ کسی اعتبار سے معروضی حقیقت کی حیثیت نہیں رکھتا۔ بلکہ محض مفروضہ اقدار سے ہے۔ اور جس طرح تمام جسمانی ارتقا میں ہوتا ہے ممکن ہے۔ بہت سے "تجربے اور غلطیاں" بھی ہوں۔ اور بہت سے غیر موثر ارتقا واقع ہوتے ہوں۔ جن کا نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا ہو۔ مثلاً یورپ کی "نیاندرتھال" نسل کو دیکھئے۔ اُن کے دماغ خاصے بڑے تھے۔ وہ چقماق زنی میں بہت ماہر تھے۔ بعض تصوراتی و دینی عقائد بھی رکھتے تھے لیکن شکل صورت کے اعتبار سے ابھی بالکل بوزنہ نما تھے۔ عام خیال یہ ہے۔ کہ اُن کا وجود انسانی ترقی کے راستے پر ایک "بند گلی" کی طرح تھا۔ چنانچہ وہ اسی مرحلے پر کاملاً معدوم ہو گئے۔ انسان کا ابتدائی اور خام ترین دماغ بھی لاکھوں سال کی مدت میں آگے بڑھ سکا۔ اور اس میں بھی بیرونی اثرات اور انسانی ماحول کے نتائج کا کہیں سراغ نہ ملتا تھا۔ اور جو کچھ تھا۔ وہ آزمائشی طور پر۔ رُک رُک کر آہستہ اور تکلیف کے ساتھ اور زیادہ تر غیر موثر معلوم ہوتا تھا۔

جو صورت انسان کے حیاتیاتی پہلو کے متعلق ہے۔ وہی اُس کی قوت امتیازی کے متعلق صحیح ہے۔ کوئی انسانی "استعداد" دفعتہً دنیا میں نمایاں نہیں ہوئی۔ کسی کے دماغ میں یکایک "عقل" کا شعلہ نہیں چمکا۔ ابتدائی آدمی اعضائی اور جسمانی ارتقا کی بلندی پر پہنچ چکا تھا۔ اور اپنی نوع کا کامیاب ترین نمونہ تھا۔ اس کی وجہ یہ نہ تھی۔ کہ اس کو "عقل کی استعداد" حاصل تھی۔ بلکہ اصل بات یہ تھی۔ کہ وہ دوسرے حیوانات کی نسبت کسی قدر (صرف کسی قدر) زیادہ ذہین تھا۔ چونکہ اس کے دُھندلے سے ذہنی عملیات میں عقل کا یہ خفیف سا حاشیہ

موجود تھا۔ اس لئے اس کا مزید ارتقا یقینی اور محفوظ تھا لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ ابتدائی انسان عاقل تھا یا کسی حد تک عقل سے سوچ سکتا تھا۔ صرف انتہائی محدود دائرے میں۔ صرف وقتاً فوقتاً۔ اور شائد ایک پوری نسل میں ایک آدھ دفعہ اس کے فکر کی عقلی خصوصیت کا اظہار ہوتا تھا اور وہ سوچ کر کوئی چھوٹی سی کامیابی حاصل کر لیتا تھا۔ جو بعد میں اس نسل کا مستقل ورثہ بن جاتی تھی۔ گویا انسانی ترقی کی طرف ایک قدم آگے بڑھ جاتا تھا جتنی بھی ترقی حاصل کی جاتی تھی۔ اسی طریقے سے کی جاتی تھی۔ لیکن یہ صورت بھی شاذ و نادر ہی پیدا ہوتی تھی۔ عمومی حیثیت سے یہ کہنا چاہئے۔ کہ سوائے چند خاص حالات کے اور سوائے چند نادر افراد کے، فکر کسی اعتبار سے بھی عقلی نہ ہوتا تھا۔ اور اسے عقلیت کی رہنمائی حاصل نہ ہوتی تھی۔

وحشی انسان اب بھی آسٹریلیا کے اندرونی علاقے میں۔ سیلون کے جنگلوں میں اور جنوبی ہندوستان کی نیلگری کی پہاڑیوں میں موجود ہیں۔ ان میں سے کسی سے پوچھئے۔ کہ تم کھانے پینے مچھلی پکڑنے اور مکھن بنانے میں گنوار طریقے کیوں اختیار کرتے ہو۔ جن میں تمھاری طاقت ضائع ہوتی ہے؟ تو وہ یہی جواب دے گا۔ کہ "یہ ایسے ہی کیا جاتا ہے"۔ گویا وہ آپ کو سمجھائے گا کہ جو رسمیں مدت سے چلی آتی ہیں۔ ان کے سوا اور کوئی طریقہ انسان کو سوجھ ہی نہیں سکتا۔ اگر آپ کوئی اور طریقہ تجویز کریں گے۔ تو اسے وہ بے حد نرالا اور سنکی طریقہ معلوم ہوگا (جیسے مثلاً آپ سے کہا جائے۔ کہ آپ تہمد باندھ کر پھکاڈلی کے بازار کی سیر کیجئے) اور وحشی انسان اس کو قطعی طور پہ خلافِ اخلاق ناقابلِ قبول۔ غیر قدرتی اور مکروہ سمجھیں گے۔

یہ جواب دے کر گویا وحشی انسان آپ پہ تاریخ انسانی اور ذہن انسانی کے ارتقا کے اندرونی رازوں کا انکشاف کر دے گا۔ اس کا سبق دوگونہ ہوگا

ابتدائی انسان کا تعلق عقلیت کے ساتھ نہایت ہی خفیف تھا۔ بعض لوگ سوچتے ہیں۔ کہ وحشی شکاری دن بھر کی بھاگ دوڑ کے بعد ستاروں کے نمودار ہونے پر اپنے غار کے منہ پر بیٹھا ہوا "مسائل عظمیٰ" پر غور کرتا ہوگا۔ وہ آزاد اور نجیب انسان "عمرانی معاہدوں" کی ترتیب، غور و فکر اور اس کے شعوری اطلاق و انطباق میں محو ہو جاتا ہوگا۔ یہ تمام مفروضات نہایت "غلط زمانی" تصورات پر مبنی ہیں یہاں تک کہ آج کل بھی اکثر ممتاز ماہرین انسانیات رسوم کے اُلجھے ہوئے ملغوبے کے پیہم تہ در تہ پیچیدہ انبار سے دھوکا کھا کر وحشی انسان کو پیچ در پیچ ذہنیت اور منطقی استدلال کے عمل کا حامل سمجھتے ہیں۔ لیکن میرے نزدیک یہ نہایت بے معنی اور "غلط زمانی" تصور ہے۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ انسان کے نشوو ارتقا کے دوران میں طویل ترین زمانہ ایسا گزرا ہے۔ جس میں "کیسے"؟ اور "کیوں"؟ کے سوالات قطعی طور پر اس کے ذہن میں پیدا ہی نہیں ہوئے۔ اس کی مصروفیات زندگی کو شعوری عقلیت کی کسی امداد و حمایت کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اس میں شبہ نہیں۔ کہ وقتاً فوقتاً خاص قسم کے بحرانی حالات میں ہجوم کی جبلی فراست یا کسی پیر انے لال بجھکڑ کی خاص دماغی سوجھ بوجھ کے زیر اثر عمل انسانی کی کسی قدر عقلی تراش خراش ہو جاتی تھی۔ اور رواج کی خلاف ورزی بھی لازم آ جاتی تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا۔ تو کوئی ترقی نہ ہو سکتی۔ نہ کوئی تغیر رونما ہو سکتا۔ لیکن عقلی فکر کا یہ عمل انتہا درجے کا اتفاقی ہوتا ہے۔ ابتدائی وحشی انسان اشد ضرورت کی مجبوری کے سوا نہیں سوچتا۔ وہ حقیقی اور فوری ضروریات سے ایک قدم آگے بھی نہیں سوچتا۔ جب تک حقائق ضرور یہ اُس پر پے در پے ضرب نہیں لگاتے۔ اُس کے کاہل دماغ سے فکر کا کوئی شرارہ نہیں پھوٹتا۔

دوسری طرف ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ آغاز کار ہی سے جو چیز عقلی فکر کی ترقی کے سلسلے میں حائل ہوتی تھی۔ وہ نہ تو اس کی اندرونی کمزوری تھی۔

نہ پیش نظر کام کی پیچیدگی تھی۔ بلکہ وہ خوفناک رکاوٹ تھی۔ جو خود اس عقلی فکر کی ابتدائی قوت مشاہدہ نے پیدا کردی تھی۔ روز اوّل ہی سے انسان نے اپنے فکر کی نشوونما کو اس طرح بے اثر کردیا۔ کہ وہ رسم و رواج کا قطعی غلام ہو کر رہ گیا۔ انسانی ذہن پر شدید ترین متعصبانہ دباؤ ڈومینیکی احتساب Dominican Inquisition کی عقائد پرستی نے ڈالا تھا لیکن وہ بھی اُس ظلم عظیم کی گرفت کے مقابلے میں نہایت نرم معلوم ہوتا ہے جس کی غلامی انسان کے ابتدائی ارتقا میں بشکل رسوم اس پر عائد تھی۔ قدرتی حالت میں تمام انسان پیدائشی غلام ہوتے ہیں۔ حیاتِ انسانی کا کوئی فعل۔ کوئی عمل اور انسانی ذہن میں خیالات کی کوئی ترتیب سابقہ مثال (رسم) کے قطعی اقتدار کے سوا کوئی مقصد، کوئی جواز یا کوئی ذہنی بنا نہیں رکھتی۔ اس سے تجاوز یا انحراف کا کوئی امکان ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر کہیں ہو بھی۔ تو وہ ایک ایسا ناجائز خیال ہو گا جس کے ذہن میں آتے ہی کپکپی طاری ہو جاتی گی۔ بلکہ یہ فطرت کے خلاف سخت مکروہ و ناپاک گناہ ہو گا۔

بلاشبہ خود ہمارے سینوں پر رسم اور بھیڑ چال کا جو کا بوس سوار ہے۔ اس سے ہم خود بھی واقف ہیں۔ لیکن اگرچہ یہ چیز ہماری نفسیات میں اب بھی نمایاں ہے لیکن اس سے صرف دھندلا سا تصوّر کیا جا سکتا ہے۔ کہ وحشیوں کے ذہن پر اس کے دباؤ کا کیا حال ہو گا۔ رسم سے ہماری مطابقت عمومی طور پر زیادہ شعوری اور مقصدی ہو گئی ہے۔ ہم رسم کی پابندی زیادہ تر رضاکارانہ کرتے ہیں۔ ہم زیادہ تر بے حقیقت چیزوں میں اس کے آگے سر جھکاتے ہیں۔ ہم اس کی پابندی اس شعوری خواہش کی وجہ سے کرتے ہیں۔ کہ خواہ مخواہ عجیب اور نکّو نہ بن جائیں۔ لوگوں کو ہمارا رویّہ ناگوار نہ ہو۔ اور ہماری خواہش یہی ہوتی ہے کہ اپنے گروہ کے ساتھ ہی رہیں لیکن ابتدائی وحشی انسان کے لئے یہ بندش قطعی تھی۔ ایک غیر شعوری ردّ عمل تھا۔ ایک فطری جمود تھا۔ اور

ہمتِ عمل کا کامل فقدان تھا۔ یہ چیز فکر پر حکومت نہ کرتی تھی۔ بلکہ اس کے قائم مقام کی حیثیت سے موجود رہتی تھی۔ ابتدا میں ہر قسم کا فکر ایک بغاوت ایک توہین اور بے ادبی کا مترادف تھا۔

قدیم نفسیات میں رسم کو جو ظالمانہ تسلط و اقتدار حاصل تھا۔ اس کو اگر ہم موجودہ زبان میں واضح کرنا چاہتے ہیں۔ تو قدرتی طور پر لفظ "مقدس" ہمارے ذہن میں آتا ہے ہم کہتے ہیں۔ کہ فلاں رسم "مقدس" تھی۔ اور اس سے بلا شبہ مذہب کا تصور پیدا ہوتا ہے لیکن حقیقت میں ابتدائی انسان کی نقالیت کا تعلق مذہب کے ساتھ ایسا ہی ہے۔ جیسے کوئی بندر کرتب دکھا دکھا کر نقالیت کا اظہار کرے۔ یا بھیڑیں کسی جھاڑی کے رخنے میں سے کود کر چلی جائیں۔ یہ ایک قسم کا حیاتیاتی جمود ہے۔ یہ صحیح ہے۔ کہ مذہب اور مذہب کے علاوہ بھی اکثر چیزیں بالآخر رسم ہی کے "تقدس" سے منسلک ہو جاتی ہیں۔ اور "تقدس" ہی درحقیقت وہ تخم ہے۔ جس سے مذہب پروان چڑھا لیکن اس سے ہم ترقی کے اس مرحلے پر پہنچ جاتے ہیں۔ جو کافی مدت کے بعد نمایاں ہوا۔ اور جو ارتقائے انسانی کی بہت ترقی یافتہ منزل تھی۔ "تقدس" (اگر ہمیں یہی لفظ استعمال کرنا ہے) کسی قسم کے مذہبی تصور سے بہت پہلے کی چیز ہے۔ ابھی مذہبی حکایات و خیالات سے دور کا تعلق رکھنے والا کوئی خیال بھی دنیا میں نمودار نہیں ہوا تھا۔ کہ زندگی کی رسم نوازی طویل ادوار و ازمنہ میں موجود تھی۔ رسم کو ابھی کوئی معنی بھی نہیں پہناتے گئے تھے۔ کہ وہ موجود تھی۔ اور وہ ہر قسم کے عقائد اور ہر طرح کی دینیات سے زیادہ قدیم ہے۔ رسم بحیثیت رسم ناقابل خلاف ورزی تھی۔ اور بس۔ اس وثوق و حرمت کو نہ شعوری طور پر محسوس کیا جاتا تھا نہ تسلیم کیا جاتا تھا لیکن اس پر عمل لازم تھا۔ اور اس پر اعتراض کی کوئی گنجائش نہ تھی۔

جب شعوری تصریح و تاویل ظاہر ہوتی ہے۔ تو گویا ارتقا کا ایک اور

واضح مرحلہ سامنے آجاتا ہے۔ جب یہ مرحلہ آتا ہے۔ تو رسم اپنے بعض پہلوؤں میں "عجیب سی" معلوم ہونے لگتی ہے۔ دوسرے قبیلوں میں دوسری اور مختلف رسمیں نظر آتی ہیں۔ تو ذہن پر ایک متبادل عملیے کا امکان روشن ہونے لگتا ہے۔ اب رسوم و رواجات کی پابندی کا ملاً خود کارانہ نہیں رہتی۔ ان سے جو تقدس وابستہ ہے۔ وہ شعور بن جاتا ہے۔ توجہ بیدار ہونے لگتی ہے۔ یہاں تک کہ بعض رسوم انسان کو کسی قدر بے معنی اور مہمل معلوم ہونے لگتی ہیں۔ اُن کے لئے کوئی تصریح۔ کوئی تاویل اور کوئی نیا جواز درکار ہوتا ہے۔ لہٰذا رسم کے ساتھ کوئی داستان یا کوئی نظریہ وابستہ کر دیا جاتا ہے۔ جو اس کو حق بجانب بنائے۔ اور اس کے وقار و اعتبار کو بحال کر دے۔ کچھ مدت گزرنے کے بعد رسم کو اُس تاویل سے ایک خاص با معنی تقدس حاصل ہو جاتا ہے۔ اور اس طرح یہ چیز ایک مذہبی عقیدے یا نظریے کی شکل اختیار کر لیتی ہے لیکن سادہ اور خالص حیثیت سے رسم کا تقدس ہر قسم کے مذہبی تصور کے مقابلے میں بہت زیادہ قدیم ہے۔ اور اس کی اطاعت غیر شعوری طور پر ہوتی رہی ہے۔

"رواجی فکر" کے استحکام کو اس معاشرے کی تنظیم محفوظ رکھتی تھی۔ اور معاشرے کی تنظیم رواجی فکر کو قائم رکھتی تھی۔ اگر تمام انسان غلام پیدا ہوتے ہیں۔ تو اس اعتبار سے کم از کم مساوی تو ہوتے ہیں۔ لہٰذا کوئی انسان اُس بھیڑ چال کی مساوات سے اوپر اُٹھنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اور نہ اس امر کی کوئی ترغیب ہی موجود ہوتی ہے۔ ہمیں یہ فرض کر لینے کی عادت ہے۔ کہ انسانی معاشرہ ہمیشہ اور ہر پہلو سے اسی طرح منظم رہا ہے۔ جیسے آج کل ہے۔ یہ مفروضہ بالکل فریب نظر ہے۔ موجودہ نظام اور اس کے تمام خدوخال جن کو ہم اس کے بنیادی خدوخال سمجھتے ہیں۔ نسبتہً ماضی قریب ہی کی پیداوار ہیں قدیم معاشرہ قطعی طور پر مختلف بنیاد پر قائم تھا۔ ہم کہتے ہیں۔ کہ خاندان معاشرے کی بنیاد تھا۔ ہمارا دھندلا سا تصور یہ ہے کہ باپوں۔ ماؤں اور بچوں کے کنبوں

کے جمع ہونے سے پہلی انسانی جماعت وجود میں آئی۔ بعینہٖ جس طرح شجر نشین بوزنوں میں اب بھی رواج ہے۔ یہ تمام غلط اور موہوم تصور ہے۔ نوعِ انسانی کی ابتدا اور افزائش کنبوں کی شکل میں نہیں ہوئی۔ بلکہ تمام شکاری جانوروں کی طرح ریوڑوں اور غولوں کی صورت میں ہوئی ہے۔ انسان اپنے قریبی ہم جنسوں کی طرح ابتدا میں نباتات خوار تھا۔ جانوروں کا شکار کرنا اور اُن کو اپنی خوراک بنانا غالباً اس کی ذہانت کا پہلا ثمرہ تھا۔ اور یہی اس کی عمرانی تنظیم کا سرچشمہ بنا وہ اپنی اعلیٰ عیاری کو کسی امداد کے بغیر استعمال کر کے فائدہ نہیں اُٹھا سکتا تھا۔ اگرچہ اُس نے پتھر کے ہتھیار بھی بنا لئے تھے۔ اور نہایت چالاکی سے چھپے ہوئے گڑھے بھی کھود لئے تھے لیکن پھر بھی تنہا رہ کر وہ کسی خوفناک گینڈے یا ارنے بھینسے یا جنگلی گدھے کو قابو میں نہ لا سکتا تھا۔ اور اگر وہ اس قسم کے شکار کو مارنے میں کامیاب بھی ہو جاتا۔ تو اس کے بھوکے ہم جنس اس کو کہاں اجازت دیتے تھے۔ کہ وہ اکیلا ہی بیٹھ کر اس کو کھا جاتے۔ مزید براں اس کو ہمیشہ کامیابی حاصل ہونے کا تیقن بھی نہ تھا۔ لہٰذا اس کے مقاصد کا تقاضا یہی تھا کہ اپنے شکار میں دوسروں کو حصے دار بنائے۔ اور دوسروں کے شکار سے اپنا حصہ حاصل کرے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انسان گلّے کی صورت اختیار کر گیا۔ اور یہ چیز کسی عمرانی جبلت یا "صحبت پسندی" یا رفاقت کی خواہش سے پیدا نہیں ہوئی۔ بلکہ صرف تلاشِ غذا کے سنگین حقائق اس کے متقاضی ہوتے یہ انسانی معاشرہ جو ارنے بھینسے اور جنگلی گدھے جیسے انسانوں پر مشتمل تھا۔ صرف ایک غذائی گروہ" تھا۔ جو صرف دستیاب ہو سکنے والے شکار (یا "ٹوٹم") اور اس کے وسائل حصول سے متعین ہوتا تھا۔

جس جانور نے انسان کو یہ لذیذ اور قوت بخش غذا مہیا کی۔ وہی اُس کا "خدائے اوّل" قرار پایا۔ انسان نے نئی غذا کے خوشگوار اور مفید اثرات کو اس جانور کے اجزائے لحمیہ سے نہیں۔ بلکہ اُس کی قوتِ زندگی اور روح سے منسوب

کیا۔ کیونکہ اس اشرف المخلوقات کو اپنی خسروی و ملوکی کا کوئی شعور نہ تھا بلکہ اس کے برعکس وہ یہ سمجھتا تھا۔ کہ مجھ کمزور۔ دبلے پتلے۔ ضعیف۔ ننگے۔ نیم برہنہ حیوان کے مقابلے میں وہ نتھنے پھلانے والا۔ طاقتور۔ سریع الحرکات جنگلی جانور بدرجہا بہتر و برتر ہستی ہے۔ اور یہ صحیح بھی تھا۔ اس شجر نشین حیوان کے مقابلے میں جو شکار کے لئے جنگل سے نکل آیا تھا۔ وہ دوسرا جنگل کا رہنے والا جانور یقیناً اپنے ماحول کے ساتھ ہر اعتبار سے مطابقت رکھتا تھا۔ قدیم انسان محض خود پسندی کی وجہ سے ارتقا پر ایمان رکھتا تھا۔ وہ اس عقیدے کا خواہاں تھا کہ وہ ارنے بھینسے یا جنگلی گدھے کی اولاد سے ہے۔ جس کی طاقت اور چستی اور مستعدی کا وہ مداح تھا۔ اور خود بھی ویسا ہی بن جانا چاہتا تھا۔

قدیم حجری عہد کے غاروں میں جانوروں کی جو بے شمار تصویریں ملتی ہیں۔ وہ شکار کی تصویریں نہیں۔ بلکہ مذہبی تصاویر ہیں۔ سب سے پہلی مذہبی رسم یا عبادت جو قبائلی اتحاد کی اولین ضامن تھی۔ یہی تھی۔ کہ ایک دیوتا کو مل جل کر کھایا جاتے تاکہ سب اُسی جیسے بن جائیں۔ اور اُسی کی روح سے فیضیاب ہوں۔ ابتدا میں "قربانی" "دیوتا" کے آگے پیش نہ کی جاتی تھی۔ بلکہ خود دیوتا قربان کیا جاتا تھا۔ اور اپنی زندگی لوگوں کو عطا کرتا تھا۔ لہٰذا مذہب کا پہلا سرچشمہ "مظاہر پرستی" نہیں بلکہ "طعام پرستی" تھا۔ مظاہر پرستی ارتقا کے زیادہ ترقی یافتہ مرحلے پر رونما ہوئی تھی۔ بعض ماہرین انسانیات کا قول ہے۔ کہ قدیم انسان بچے کی طرح خود بخود اور بلا ارادہ مظاہر پرست ہے۔ جو تمام خارجی اشیا کو اپنے جیسی شخصیت سے منسوب کیا کرتا ہے۔ ممکن ہے یہ صحیح ہو۔ لیکن یہ بلا قصد مظاہر پرستی اُس وقت تک حرکت میں نہیں آتی۔ جب تک احوال و کوائف تقاضا نہ کریں۔ اور قدیم انسان پیش نظر معاملے کی فوری تحریک سے آگے کچھ نہیں سوچتا۔ اور خواہ مخواہ نظریات اور پریوں کی کہانیاں بنانے کی تکلیف گوارا نہیں کرتا۔ اس کی سب سے پہلی دل چسپی اس کی خوراک ہے۔ اور وہ پہلی چیز

جس سے وہ شفقت، محبت اور احترام کا اظہار کرتا ہے۔ (یہ تمام نفسیاتی امتیازات ایک ابتدائی ذہنیت کے اندر ایک ہی دھندلے سے جذبے میں جمع ہو جاتے ہیں) وہ "مقدس" شے اس کی خوراک ہے۔ اور وہ جانور ہے جس کو وہ کھاتا ہے جس طرح بعد کے زمانے میں اناج اور روٹی ہوگی۔ جو اس کو زندہ رکھے گی۔ اور اس کا ہتھیار اور اس کی کلہاڑی بھی انہی میں شامل ہے۔ کچھ مدت گزرنے کے بعد "ٹوٹم" حیوان کے ساتھ "تقدس" کا جو تصور وابستہ ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے انسان اس کو ہلاک کرنے اور کھانے سے پرہیز کرنے لگتا ہے (سوائے خاص مواقع پر بطور رسم عبادت) لیکن وہ رسمی کھانا، وہ ضیافت ہم مشربی اس کے حقیقی معنی کو واضح کرنے کے لئے برابر بدستور باقی رہتی ہے۔ پھر جب انسان محسوس کرنے لگتا ہے۔ کہ وہ خود حقیقت میں حیوانات سے برتر ہے۔ اور جب وہ ان کو سدھا کر پالتو بنا لیتا ہے۔ تو پھر مظاہر پرستی کے خیالات اس کے دماغ میں داخل ہوتے ہیں۔ وہ تجسیم و تشبیہ کا مسلک اختیار کر لیتا ہے اور اپنی شکل پر دیوتاؤں کو بنانے لگتا ہے۔

کسی خاص وجہ کی بنا پر جس کی کوئی تسلی بخش تصریح اب تک نہیں کی گئی "ٹوٹمی" قبیلے میں یہ رسم عام ہے۔ کہ اس کے افراد قبیلے سے باہر شادی کرتے ہیں۔ معلوم نہیں اس کا مقصد دوامی تصادمات سے بچنا ہے۔ یا "اجنبی عورت" کی دل فریبی اور کشش اس کا باعث ہے۔ قبیلہ یعنی غذائی گروہ جو اکٹھا رہ کر کھاتا ہے۔ ایک خاندان ہے۔ اس کی عورتیں بہنیں ہیں۔ لہٰذا حرام ہیں۔ اس کے افراد بھائی ہیں۔ اور ایک گوشت سے ہیں (یعنی ٹوٹم کا گوشت) لہٰذا مساوات قطعی ہے۔ اور اسی وجہ سے رواجی فکر کا بندھن مضبوط اور مقدس ہے۔ یہ تقدس خوراک اور زندگی کے مفادات ضروریہ سے منسلک ہے۔ اور زندگی حلال و حرام کی پابندی اور اتحاد عمل پر قائم ہے۔ زندگی پابندیٔ رسوم و عوائد کا ایک سلسلہ ہے۔ مثلاً جیسے

ہمارے زمانے کے بعض اوہام ہیں۔ سیڑھی کے نیچے سے مت گزرو۔ تیرہ کی تعداد میں ایک میز کے گرد نہ بیٹھو۔ مینا نظر آئے۔ یا نیا چاند دکھائی دے تو اپنا ہیٹ اٹھاؤ۔ چھوٹی ڈبل روٹی کو چاقو سے نہ کاٹو وغیرہ۔ قدیم انسان کے ذہن کا اسلوب عمل یہی تھا۔ اور وہ اسی آہنی چکر میں حرکت کرتا تھا۔

بات یہ ہے کہ انسانیت کا قدیم ارتقا تو ہوتا رہا۔ لیکن اسے قدم قدم پر رسم و رواج کے غیر عقلی دباؤ کا مقابلہ کرنا پڑا۔ لہٰذا اگر اس ارتقا کی رفتار سست اور طویل رہی ہے۔ تو یہ کوئی مقامِ تعجب نہیں۔

(۲)

قوّتِ فکر

بہرحال عقلی فکر کے نشو و ارتقا میں صرف رواجی فکر ہی رکاوٹ نہ تھا۔ اور یہ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ کہ سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔

تاریخ انسانی میں عظیم ترین انقلاب جو اپنی کیفیت و کمیت کے اعتبار سے تعمیری متخیلہ کے دُور ساز کارناموں سے بھی زیادہ عظیم تھا۔ آج سے چھ ہزار سال پیشتر رونما ہوا۔ اُس وقت دُنیا کے بعض حصوں میں وہ حالت قائم ہوئی جس کو ہم تہذیب و تمدن کی حالت کہتے ہیں۔ وہ قدیم ترین نظام جس کے ماتحت نوعِ انسانی ہزاروں صدیوں سے زندگی بسر کر رہی تھی۔ کاملاً ٹوٹ پھوٹ گیا۔ اور اس میں بنیادی تغیرات پیدا ہو گئے۔ عمرانی وحدت کی حیثیت سے قبیلے کی جگہ ذاتی خاندان نے لے لی۔ شخصی ملکیت اور شخصی ورثہ کی جگہ اشتراکیت اور حیوانی گلّے کی مساوات کی جگہ طبقات اور افراد کی قوت بروئے کار آ گئی۔

جب یہ انقلاب رونما ہو گیا۔ اور اس کی وجہ سے قوتوں اور مفادوں کا اختلاف پیدا ہوا۔ تو عقلی فکر کے راستے میں ایک نئی رکاوٹ کھڑی ہو گئی

جو "رواجی فکر" سے بھی زیادہ مہیب اور خوفناک تھی۔
انسان اپنے بنی نوع پر جو اختیار رکھتا ہے۔ وہ گویا زندگی پر اقتدار رکھنے کا ذریعہ ہے۔ اور کسی ایک فرد کو جو قوتیں حاصل ہیں۔ اور جتنے بھی آلات و اوزار بنانے کا ملکہ اس میں موجود ہے۔ اُن کے مقابلے میں یہ اختیار و اقتدار زیادہ قوی ہے۔ اپنا کھانا کسی سے کہہ کر اپنے پاس منگا لینا بے حد زیادہ اطمینان بخش ہے بہ نسبت اس امر کے کہ آپ کو اس کھانے (مچھلی وغیرہ) کے پکڑنے کے لئے خود سمندر کے کنارے جانا پڑے۔ بلاشبہ پتھر کی کلہاڑیاں۔ ہڈی کی سوئیاں۔ اسلحہ اور اوزار۔ ہاتھ اور دماغ بڑے کام کی چیزیں ہیں لیکن ان کو خود استعمال کرنے کی نسبت یہ امر بیحد زیادہ آرام دہ ہے۔ کہ آپ لوگوں کو مجبور کر سکیں۔ کہ ان کو آپ کے لئے استعمال کریں۔ صاحبِ اختیار کے آلاتِ کار اسلحہ و اوزار نہیں ہوتے۔ بلکہ خود انسان ہوتے ہیں۔ اس انکشاف اور اس کے عملی اطلاق کے امکان کے ساتھ ہی ارتقائے انسانیت میں ایک عظیم الشان نئی قوت رُونما ہو گئی۔ اور نیا عامل داخل ہو گیا۔ جو دوسرے تمام عوامل پر چھا گیا۔ طاقت کا دیوتا "آیا لدا بوتھ" (Ialdabaoth) دُنیا میں نمودار ہو کر اُس پر قابض ہو گیا۔ "انسانی آلاتِ قوت" کی فوقیت اور کارآمدی اوزار و اسلحہ کے مقابلے میں اس قدر بے اندازہ ہے۔ کہ سب سے اعلیٰ و اَولیٰ مصلحت یہی ہے۔ کہ اس بیش بہا اختیار و اقتدار کو قائم رکھا جائے۔ اور اس میں اضافہ کیا جائے۔ اب پیشِ نظر کام یہ ہے کہ انسان کی ابتدائی استعدادوں اور آلاتِ فتح کو استعمال نہ کیا جائے۔ نہ عقلی فکر سے کام لیا جائے۔ نہ اُس اقتدار سے استفادہ کیا جائے۔ جو انسان کو دُنیا میں زندگی بسر کرنے کے لئے اپنی قوتِ تطابق سے حاصل ہوتا ہے۔ بلکہ خود انسانوں کو استعمال کیا جائے۔

سوال یہ ہے۔ کہ یہ کام کیونکر ہو؟ انسانوں پہ اقتدار کیونکر حاصل کیا جائے۔ اور کس طرح ان کو آلات کار بنا کر ان سے کام لیا جاتے؟ اس اقتدار کے اشکال و مدارج بے شمار ہیں۔ مثلاً قائد کی قدرتی حاکمانہ برتری۔ اس کی دانشمندی۔ اس کی شجاعت۔ اس کا علم۔ اس کی نجابت خاندانی۔ فاتح قوم کی جسمانی قوت۔ خدائی اختیار۔ دیوتاؤں پہ رسوخ و اقتدار۔ جائداد۔ دولت۔ نظامِ عمرانی میں قوت کا مقام یا کسی عہدے کے اختیارات حاصلہ لیکن کوئی بھی شکل ہو۔ اس کی بُنیاد وہی قوت و اختیار کی حقیقت ہے۔ یعنی ایک تصور یا نظامِ تصورات جس پہ وہ اختیار قائم ہے۔ اور جس پہ وہ حق بجانب ٹھہرتا ہے۔ انسانوں پہ مسلمہ اقتدار، انسانی ارتقا کی تمام دوسری پیداواروں کی طرح فکر و خیال کا ایک مجسم اظہار ہے۔

یہاں سے ذہنِ انسانی کے عمل میں ایک نئی ترکیب داخل ہوئی۔ قدیم زمانے کے "گلے" میں بلاشبہ فکر نا قابلِ تصور طور پر پست تھا۔ اور رسم کی غلامی قطعی طور پر مسلط تھی۔ لیکن اس میں یکسانی اور یک جہتی تو ضرور تھی۔ اُس کے مقاصد میں کوئی تصادم یا تناقض نہ تھا۔ اس کی یکسانی جمود کی یکسانی ہی ہوگی۔ لیکن جب بعض احوال و کوائف محرکِ عمل ہونے لگے۔ تو پھر گلے کے ہر فرد کا مقصد و مفاد ایک ہوتا تھا۔ انفرادی مفاد اور گلے کے مفاد میں کوئی فرق موجود نہ تھا۔ مثلاً میرا مقصد یہ ہے۔ کہ ہم کو شکار کی کافی مقدار دستیاب ہو جائے۔ جس میں ہم سب ساجھی اور شریک ہوں گے۔ لیکن جونہی وہ قدیم مساوات ختم ہوتی ہے۔ اور قوت و اختیار کی تفریق رونما ہو جاتی ہے۔ تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مفادات میں بھی اُسی قسم کی تفریق و تقسیم پیدا ہو جاتی ہے۔ اب اربابِ اختیار کے مفادات اور "گلے" کے مفادات یکساں نہیں رہتے۔ اور اسی کے مطابق فکر کی مقصدیت و معروضیت اور اُس کے وظیفے میں بھی اختلاف و انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔

فکر کا افادی وظیفہ یہ ہے۔ کہ انسان کو اُس کی صورتِ حالات اور اُس کے ذرائع و وسائل کے متعلق حتی الامکان صحیح ترین روشنی مہیا کی جائے اس وظیفے کی بجا آوری کے لئے ضروری ہے۔ کہ فکر حقائق کے ساتھ تطابق کی "خواہش" کرے۔ اور اُس تعلق کو معلوم کرنے میں کوشاں ہو۔ جو انسان اور اس کے ماحول کے درمیان واقعتہً موجود ہے۔ یہی عقلی فکر ہے۔ اور یہی اس کا مقصد و وظیفہ ہے۔ لیکن جس لمحے سے مفادات و قُوا کی تفریق و تقسیم رُونما ہوتی ہے۔ اس وظیفے میں بنیادی اعتبار سے خلل پیدا ہو جاتا ہے۔ اب انسان کے اسلحہ وا وزار ماحول کے حقائق نہیں ہوتے۔ جن کو دریافت کرکے استعمال کرنا ضروری ہو۔ بلکہ خود انسان اور انسانوں کے اذہان سے کام لینا ہوتا ہے۔ اب فکر کا مقصد یہ نہیں ہوتا۔ کہ حقائق جیسے بھی ہوں۔ اُن سے ہم آہنگی اور مطابقت پیدا کی جائے۔ بلکہ اُس نظامِ تصورات کے ساتھ ہم آہنگی اور مطابقت پیدا کرنی پڑتی ہے۔ جس پر قوت و اختیار کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ تصورات کا یہ بنیادی نظام ہی ہر قسم کے فکر کا ضروری اصول موضوعہ بن جاتا ہے۔ اب گویا ہر ذہنی عملیہ کا معیار۔ اس کا اصلی و واقعی جواز نہیں ہوتا۔ بلکہ سوال یہ ہوتا ہے۔ کہ اُس تصور کے ساتھ اور قوت و اختیار کی اُس صورتِ حال کے ساتھ اس کا کیا تعلق ہے۔ یہی واحد کسوٹی ہوتی ہے۔ جس پر ہر قیاس، ہر قدر اور ہر فکر کسا جاتا ہے۔ ہر چیز جو اس کو نقصان پہنچانے کا رُجحان رکھتی ہے۔ غلط اور دروغ قرار پاتی ہے۔ اور ہر چیز جو اس کی تحکیم و توثیق کرتی ہے صحیح اور راست سمجھی جاتی ہے۔ فکر کا نصب العین اور معیار بنیادی اعتبار سے بدل جاتا ہے۔ اور اس کا وظیفہ بالکل دوسری شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس کا مقصد و مدعا اب اپنے اصلی وظیفۂ عرفانی کو پورا کرنا نہیں۔ بلکہ اس کو نا کام رکھنا ہے۔ فکر ایک وظائفی بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اب وہ "عقلی فکر" نہیں رہتا۔ بلکہ "قوتی فکر" بن جاتا ہے۔

اس میں شک نہیں۔ کہ ہر انسان کا فکر غیر متعلق جذبے اور پدرانہ خواہش کی آلودگی کا حامل ہے۔ اور اس میں ایک شخصی تعدیل ہوتی ہے۔ جو اس کی قوتِ فیصلہ کو عیارانہ طور پر منحرف اور فاسد بنا دیتی ہے۔ لیکن یہ "غاروں کے بُت" نسبتہً غیر اہم ہیں۔ اور اُس مہیب قوت کے مقابلے میں جس نے فکرِ انسانی کی ترقی کے پُورے دَور میں اس فکر کو بگاڑا اور بدشکل بنایا ہے۔ بالکل غیر اہم اور نظر انداز کر دینے کے قابل ہیں۔ انسانی تصورات انسانی زبان اور انسانی اقدار کی پوری دُنیا کو اسی نے تشکیل و ترتیب دیا ہے۔

یہ دردناک کمزوری نہ ذہن کی کوئی موروثی بیاری ہے۔ نہ جسمانی ضعف کا نتیجہ ہے۔ بلکہ ایک مصنوعی چیز ہے۔ جو نظامِ انسانی اور معاشرۂ انسانی کی پیدا وار ہے۔ جس طرح اس کے بعض دوسرے ادارات مثلاً فوجیں۔ تخت و تاج اور معبد مصنوعی ہیں۔ اس کی حیثیت بھی بالکل انہی اداروں کی ہے۔ جو عمرانی نظام کے مقتدر شعبوں کے گرد قوت اور مفاد کی شکل پذیری سے پیدا ہوتے ہیں۔

یہ مرض قطعی طور پر ناگزیر اور لا علاج ہے۔ قوت کسی شکل میں بھی ہو۔ اور اُس کے حامل کی نیت کتنی ہی نیک ہو۔ وہ اس قوت کے مُہلک اثرات سے نہیں بچ سکتا۔ یہ بدنیتی۔ شرارت یا بے احتیاطی کا سوال نہیں بلکہ بے لوچ نفسیاتی آلیات کا مسئلہ ہے جس طرح دولت مند خدا کی بادشاہت میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح قوت کا مالک اپنے آپ کو "قوتی فکر" سے الگ نہیں رکھ سکتا۔

اگرچہ یہ مسئلہ دلچسپ ہے۔ کہ قوتی فکر کا یہ بطلان کس حد تک ارادی اور شعوری ہے۔ لیکن یہ مسئلہ لازمی اور ناگزیر نہیں۔ اس "قوتی فکر" کا بہت بڑا حصہ صمیمانہ۔ تحت الشعوری۔ نیک نیتی اور خود فریبی پر مبنی ہوتا ہے۔ اور

ذاتی اہمیت اور امتداد کا پتہ دیتا ہے۔ لیکن میرا خیال ہے۔ کہ ہم اپنی
رواداری اور حسنِ تعبیر کی وجہ سے اس عمل میں ارادی مکر و فریب کے جزو
کو کم کر کے دکھانے کی کوشش کرتے ہیں (حالانکہ تنقید کے ادوار میں
حُسنِ تعبیر اور تاریخی رواداری خود بھی "خود دفاعی" قوتِ فکر ہی کی صورتیں ہیں)
جہاں کہیں ہمیں متصل تاریخی شہادت دستیاب ہو جاتی ہے۔ ہمیں ارادی
اور شعوری فریب کاری کا سراغ مل جاتا ہے۔ اور خود ہمارے ماحول کے
اندر اس عمل کے مشاہدے کے بے شمار مواقع ہیں۔ مثلاً اس امر میں کوئی
"تحت الشعوری" عمل نہیں ہے۔ کہ پروشیا (جرمنی) کی حکومت اپنی یونیورسٹیوں
کے پروفیسروں کے ـــــــــ نام ہدایت نامے جاری کرتی ہے۔
یا فلیٹ سٹریٹ کا کوئی ایڈیٹر اپنے افتتاحیہ نگار سے خاص قسم کا مقالہ
لکھواتا ہے۔ یا "مفاداتِ محفوظہ" کی طرف سے "رائے عامہ کی تعلیم" کے
لئے تدابیر اختیار کی جاتی ہیں۔ زمانۂ قدیم کے جادوگروں اور "ٹوٹے پیٹے" کے
پروہتوں کے بلند آہنگ اعلانات سے لے کر آج کل کے زمانے تک
ذہنی فریب کاری کے اتنے وسیع کارنامے نظر آتے ہیں۔ کہ کسی حُسنِ تعبیر سے
ان کا جواز ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ "عیاری" یعنی جھوٹے دعووں کے پُرانے
نظریہ کو ذلیل و رسوا کرنا شاید بجا و مناسب نہ تھا۔ لیکن عمومی حیثیت سے
شعوری اور غیر شعوری بطلانِ فکر کے درمیان کوئی واضح خطِ فاصل کھینچنا
ناممکن ہے۔ "جھوٹے مدّعیوں" کا مقصود ممکن ہے صرف یہی ہو۔ کہ جدید آرا
و عقائد میں مفادِ خصوصی کی تقویت کا رجحان زیادہ ہوتا ہے۔ مذہبی پادریوں
اور پروہتوں کا طبقہ عام طور پر علم الاصنام کی طرف خاص میلان رکھتا ہے
بالکل اسی طرح جیسے بادشاہ علی العموم "شاہ پرست" ہوتے ہیں۔ اور سٹے
باز عام طور پر اصلاحِ معاشرت کے عَلم بردار نہیں ہوتے۔ ہمیں ہر روز اس
قسم کے مناظر نظر آتے ہیں۔ کہ قوت کا دیوتا زبردستی حقایق۔ دلائل اور اقدار

کو اپنے مطلب کے مطابق کاٹتا۔ چھانٹتا۔ دباتا اور اُبھارتا ہے تاکہ انھیں موڑ توڑ کر اپنے مفادات کے مطابق بنالے۔ زیادہ پُرانے اور تقدیما نہ جعل بھی اسی طریقے سے معرض وجود میں آتے ہیں۔ اور اب انھوں نے "ازلی وابدی اصولوں" "صداقتوں" اور نصب العینوں کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ جن کی خاطر انسان اپنی جانیں تک دینے پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔

"قوتی فکر" بجائے خود کامل طور پر حق بجانب ہے۔ یہ ایک فرض ہے ایک نیکی ہے۔ جن کھرے اور خالص اصولوں پر موجودہ نظام قائم ہے۔ ان کا تقدس ظاہر ہے۔ فکر کے خطرناک رجحانات، اور ایسے حقائق پر تنبیہ جو گمراہ کُن ہوں۔ اور جن کو عوام اپنی کمزوری اور جہالت کی وجہ سے صحیح طور پر سمجھ نہ سکتے ہوں۔ واضح طور پر مستلزم سزا ہے۔ یہ امر عوام کی بدخواہی کا مترادف ہوگا۔ بلکہ اپنے انسانی فرض سے غداری ہوگی۔ کہ ہم اس قسم کا زہر پھیلنے کی اجازت دے دیں بلکہ اگر ہم نے اپنے ذہن کو ایسے حقائق اور خیالات سے آلودہ کیا۔ جو ہمارے اصولوں کا خون کرنے والے ہوں۔ تو ہم خود بھی مجرم ہوں گے۔ لہٰذا ہمارا دیانت دارانہ فرض ہے کہ ان کو اپنے اذہان سے خارج کردیں۔ اور اگر حقائق کے ظواہر میں خفیف سی ترمیم خیالات و آرا کی عام صحت مندی اور مُحکمی کا ذریعہ بن سکے۔ تو ایسی ترمیم بھی مناسب ہوگی۔ کیا ہمارے موجودہ نامور فلسفیوں نے انتہائی غور و فکر کے بعد یہ دلیلِ قاطع ہمارے سامنے پیش نہیں کی۔ کہ ہمیں چونکہ موجودہ حالات کے ماتحت زندگی بسر کرنی ہے۔ لہٰذا ہمیں وہی عقیدہ رکھنا چاہئے۔ جو اس معاملے میں ہمارا معاون ہو؟ اس کو "دلیلِ عملی" یا "نظریۂ عملیت" کہتے ہیں۔

بہت سے حیاتیاتی عملیات کی مانند "قوتی فکر" کے جعل آمیز عمل کا آغاز تو شعوری ہوتا ہے۔ لیکن نہایت سرعت کے ساتھ خودکارانہ اور بلا ارادہ صادر ہونے لگتا ہے۔ اگر ابتدا میں شعوری اور ارادی ذہنی خیانت کا دُھندلا سا تصوّر

موجود بھی ہو۔ تو تھوڑی دیر میں بالکل غائب ہوجاتا ہے۔ اور پھر کسی تعصب یا جانبداری کا شعور باقی نہیں رہتا۔ اس کی اخلاقی اور ذہنی صحت پر پورا یقین و اعتقاد پیدا ہوجاتا ہے۔ اور "قوتِ فکر" اور رویا ہ صفت عیاری سے کام لے کر بے داغ دیانت و خلوص کی فضا میں مصروفِ عمل ہوجاتا ہے۔ فریب کاری (کم و بیش ارادی) فی الحقیقت اس عمل کی لازمی یا نمایاں خصوصیت نہیں ہوتی۔ بلکہ فکر خود علیل و معذور ہوجاتا ہے۔ اور اس کی قوتِ حیات مسموم ہوجاتی ہے۔ ہر حقیقت کو ایک منحرف عینک سے دیکھا جاتا ہے۔ ہر قیاس رنگ آمیز۔ ہر نتیجہ ذہن کی کجی کا مظہر۔ ہر نقطۂ نگاہ باطل اور فریب آمیز ہوتا ہے۔ اور ہر امر تنقیح ایک خاص مفہوم کی طرف جھکا ہوا ہوتا ہے۔ ذہن کے عملیات مسخ ہوجاتے ہیں۔ تمام دماغی سکے کھوٹے ہوجاتے ہیں۔ فکر انسانی ایسے تصورات کے ذریعے سے سوچتا ہے جن پر جعل و فریب کے ٹھپے لگے ہوتے ہوتے ہیں۔ اُن کا ذخیرۂ الفاظ ملاحظہ ہو۔ تو ان کے لفظوں کی اہمیت فکر کی اُس چھوٹی دُنیا کا ایک جزو ہے جس میں وہ لوگ زندگی بسر کرتے ہیں۔ اختیار و اقتدار اور مفاد و مقاصد کے ہر دائرے کے گرد ایسی قائم شدہ آراء اور ذہنی رُجحانات کی فضا پیدا ہوجاتی ہے جس کی نوعیت عقلی فکر سے معیّن ہوتی ہے انکار و افکار کی پوری نسلیں وجود میں لائی جاتی ہیں بلکہ ذہنی عوامل پیدا کئے جاتے ہیں۔ جو اپنا اثر صرف انہی مقامات پر نہیں ڈالتے جن کا تعلق ابتدائی مفادات سے ہوتا ہے۔ بلکہ اُن بے شمار انسانوں پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ جن کی ذہنی نشو و نما اس ماحول میں ہوتی ہے۔

کم از کم ایک حلقہ ایسا ضرور ہے جس پر قوتِ فکر کا عمل ہمیشہ نہایت مخلصانہ ہوتا ہے۔ یعنی وہ لوگ جن پر قوت کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس میں

شک نہیں۔ کہ قوتی فکر انہی لوگوں کو مدِ نظر رکھ کر عمل میں آتا ہے۔ صاحب قوت خود قوتی فکر کے جواز کی حمایت کا خواہاں ہے۔ اس کا ابتدائی مقصد یہ ہوتا ہے۔ کہ اُن لوگوں کے ذہن کو متاثر کرے۔ جن کو وُہ آلاتِ قوت کے طور پر استعمال کرنے والا ہے۔ ان کو محسوس کرانا ہوگا۔ کہ جن انتظامات کی مدد سے قوت و اختیار قائم ہوں گے۔ وہ کس قدر مفید۔ منصفانہ معقول اور ضروری ہیں۔ نظامِ کائنات سے اُن کی ہم آہنگی کس قدر کامل ہے۔ اور جو تصوّر اس اختیار و اقتدار سے ہم آہنگ نہ ہوگا۔ وہ کس قدر جھوٹا۔ مُضر اور شر انگیز ہے۔ قوتی فکر کا شاندار جواز اُس خلوص۔ صمیمیت۔ اور جوش و خروش سے ظاہر ہوتا ہے۔ جس سے قوت کے خدام اس کو تسلیم کرتے۔ اور اس کو سر پر اُٹھاتے ہیں۔ اور وہ عقیدت اور جان نثاری بھی ظاہر ہے جس سے وہ قوت کے دفاع کی خاطر جانیں دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ قوتی فکر کی کامیابی اس قدر مکمل ہے۔ کہ جب کبھی اس کے مخالف اور نقاد کہیں نمایاں ہوتے ہیں۔ تو وہ خود اس کے تصوّرات میں اس قدر آلودہ و مستغرق نظر آتے ہیں۔ کہ اُن کے لئے ان تصوّرات سے آزاد ہو کر بات کرنا بالکل ناممکن ہوتا ہے۔ کیونکہ خود اُن کے ذہن کی پوری ترکیب قوّتی فکر کی پیداوار ہوتی ہے۔ اور جو اسلحہ وہ اہلِ قوت و اختیار کے خلاف استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اُلٹ کر خود اُنہی کو مجروح کر دیتے ہیں۔

قوتی فکر کا دائرہ آسمانوں کا نغمہ اور زمین کا سازو سامان ہے انسانی فکر۔ علم اور نقد کی پوری عمارت اسی فکر پر مبنی ہے۔ اہلِ قوت ہی نے انسانوں کو مہذّب بنایا ہے۔ اور اُن کو ہر قسم کی تعلیم سے بہرہ ور کیا ہے۔ انسانوں کے تصوّرات۔ اُن کی زبانیں۔ اُن کے خیالات و افکار زیادہ تر اہلِ قوت ہی کی تخلیقات ہیں۔ ہم نے اپنی ماؤں کے اوٹھوں سے قوتی فکر کی تعلیم پائی ہے۔ اور قوتی فکر ہی نے ہماری جوانی کو بہادروں کی زبانوں سے

ہیجان و اہتزاز سے مالا مال کیا ہے۔

(۳)

تصادم

اس لحاظ سے گویا عقلی فکر کا ارتقا اس قسم کا عمل نہیں۔ کہ اس نے تدریجی طور پر نشو و نما پائی ہو۔ اور اپنے کام کے سلسلے میں قدرتی مسائل کے تدارک کی قوت کا اظہار کیا ہو۔ بلکہ یہ غیر عقلی فکر کے خلاف اور رواجی فکر اور قدرتی فکر کی مجموعی طاقت کے خلاف تصادم و آویزش کا نام ہے۔

عقلی فکر کی قدرتی مشکلات بجائے خود بے حد تھیں۔ یہ "آلہ" جس کا آغاز نہایت ادنےٰ حیثیت سے ہوا۔ اس کا وظیفہ اعضائے جسی کی تکمیل تھا۔ اور یہ حیوانی زندگی کی سادہ مادی ضروریات کا مقابلہ کرنے کا طریقہ تھا لیکن اس کو ایسے وسیع تر اور پیچیدہ تر مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ جو بظاہر کسی اَور نظام سے متعلق معلوم ہوتے تھے۔ اس کو نہ صرف محض جنگل کی عضوی زندگی بلکہ اس زندگی کے تدارک کا ذمہ لینا پڑا جس کی ماہیت اس نظر و بصر کی وجہ سے مبدل ہو چکی تھی۔ جو قبل و بعد پر نگاہ ڈالتی ہے۔ جو "یہاں" اور "اب" کے حدود سے تجاوز کر کے "لامحدود" اور "ابدی" تک جا پہنچتی ہے۔ دنیا میں آنسوؤں اور قہقہوں کو لاتی ہے۔ اور اس کو نئے جذبات سے رنگین کرتی ہے۔ زندگی غیر معمولی طور پر وسیع ہو گئی۔ اور ہزار ہا نئے علائق سے مالا مال ہو گئی۔ ایسے مسائل سامنے آئے۔ جو روز بروز زیادہ پیچیدہ ہوتے گئے۔ نئے تسویہ اور اشتراک عمل کے مسائل نئی مرکب الجسم عضویت کے مسائل جن کو انسانیت کے سانچے میں ڈھالا جا رہا تھا۔ ایسے مسائل جو زیادہ سے زیادہ دُور رس مسئلوں کو اپنے وسیع دائرے میں لپیٹ رہے

تھے۔ جو بالآخر اپنی تاویل و توجیہ میں حیات و کائنات اور فطرت اور معنی کو مفروضات کی حیثیت سے قائم کر رہے تھے۔

سوال یہ ہے۔ کہ آیا یہ "پیادہ پا" سائنس نئی اور حیرت انگیز دنیا کے مسائل کو حل کرنے کی قابلیت رکھتا تھا؟ صحیح جواب یہ ہے۔ کہ ہاں! کوئی ایسی صورت حال موجود نہیں۔ جس میں عقلی فکر ممکن نہ ہو۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ تمام سوالوں کا شافی جواب دے سکے۔ بلکہ وہ اپنے جواب کے جواز و صحت کا شدت سے اندازہ کر سکتا ہے۔ خواہ اس کا جواب یہی ہو (اور اکثر حالات میں یہی ہوگا) کہ "میں نہیں جانتا" وہ دوسرے تمام جوابات کی صحت کو قطعی طور پر رد کر سکتا ہے۔ ان معنوں میں ہر عقلی فیصلے کے اجزائے لاینفک یہ ہیں۔ کہ مفروضہ کے یقین و احتمال اور حقائق حاصلہ کے ساتھ اس کے کم و بیش تطابق کا تخمینہ صحیح لگایا جائے۔ اور جو طرز فکر موجودات سے نہیں۔ بلکہ علائق کے ساتھ غیر منقطع تطابق کی وجہ سے پیدا ہو کر مقبول ہوا ہو۔ اس کا اطلاق مساوی طور پر ہو سکتا ہے۔ خواہ اس کا دائرۂ عمل کچھ بھی ہو۔ انسان کی اصلی اور ابتدائی عقلیت کو مقصد کی یہ کامل صحت صرف طویل اور محنت طلب ارتقاہی سے حاصل ہو سکتی تھی۔ ضرورت اس امر کی تھی۔ کہ مدت العمر کی تجربی معلومات کو آہستہ آہستہ فراہم کیا جائے اسالیب کو تدریجی طور پر مکمل کیا جائے۔ فکر کے راستے میں جو بے شمار گڑھے آتے ہیں۔ ان کو بے نقاب کیا جائے۔ اور مغالطوں کو تنقیدی ضبط و نظم کی پیہم نورفشاں لہروں سے نابود کیا جائے۔ فکر کو اپنے پیچیدہ مفوضہ فرائض سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہونے میں نہایت خوفناک مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑا ہے۔ اپنی سرکشیوں اور بغاوتوں سے سخت کشتی لڑنی پڑی ہے۔ اور نشو و ارتقا کے طویل عمل ہی سے قوت و اعتماد پر فائز ہونا نصیب ہوا ہے۔

لیکن انسانی ارتقا میں جو لازمی خصوصیت ہمارے سامنے آتی ہے۔

وہ نشو ونما کا عمل نہیں۔ یہ وہ لڑائی نہیں جو عقلی فکر کو اپنے کام کی قدرتی مشکلات کے ساتھ لڑنی پڑی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کو یہ خوش قسمتی شاذ ہی نصیب ہوتی ہے۔ کہ اُسے براہِ راست ایسی لڑائی لڑنے کا اتفاق ہوا ہو لیکن جب کبھی اُسے ایسا موقع ملا ہے۔ اُس نے حیرت انگیز سہولت سے مقابلہ کیا ہے۔ اور نتیجہ ہمیشہ اس کی فتح و نصرت کی شکل میں نکلا ہے۔ ارتقائے انسانی فی الحقیقت ایک طویل اور شدید جنگ رہی ہے۔ لیکن اس کا مقابلہ بالکل دوسری قوتوں سے ہوتا رہا ہے۔ انسانی ذہن کو ہمیشہ اُن رکاوٹوں سے جنگ کرنی پڑی ہے۔ جو اُس نے خود اپنے راستے میں کھڑی کرلی تھیں۔ مسائل کی مشکلات اور عقل کی کوتاہیوں نے اس کے قواے فکر کو شل نہیں کیا۔ بلکہ خود انسان کی بنائی ہوئی مصنوعی رکاوٹوں نے اس کا راستہ روکا ہے اور مسلسل و متواتر اس کو ازکار رفتہ بنانے کے لئے پے در پے زخم لگاتے ہیں۔ ارتقائے انسانیت کی کش مکش میں عقلی فکر کا سب سے بڑا مخالف وہ فکر رہا ہے جس کو رسم و رواج نے یا قوت کے مفادات نے جعل و فریب سے ناپاک کر دیا تھا۔

یہی تصادم تاریخ کا موضوع ہے۔ تہذیب انسانی کے طلوع سے لے کر آج کل کے زمانے تک بے شمار پہلوؤں میں بہت سے ناموں سے اور ہر میدان میں یہ مدۃ العمر کی جنگ برابر جاری رہی ہے۔ سیاسیات اور دینیات۔ صنعت اور تجارت۔ سائینس اور آرٹ۔ فلسفہ اور ادب۔ زندگی اور محبت سب کے سب اس مسلسل جنگ و پیکار کے نشیب و فراز اور درد و کرب کا شکار رہے ہیں۔ انسان کو اپنی حیثیت کا اندازہ لگانے اور اپنے عمل کا راستہ تجویز کرنے کی جو قوت عطا ہوتی تھی۔ اُس کے خلاف تمام وہ خیالات و تصورات اور تمام روایتی فیصلے اور تشخیصات صف آرا رہے ہیں۔ جو اُن لوگوں کی خواہشات و مفادات سے تشکیل پذیر ہوتے تھے

جن کے نزدیک فکر کا معیار وہ قوانین نہ تھے۔ جو اس کے جواز اور افادے کے حامل ہیں۔ بلکہ محض اپنے مفادات و تمنّیات تھے۔

دُنیا کی جنگ "غلطی" اور "صداقت" کے درمیان نہیں لڑی جاتی۔ صداقت کیا ہے؟ کون "غلطی" سے اس قدر زیادہ واقف ہے۔ کہ اپنے آپ کو بالکل غلطی سے بری خیال کر سکے؟ یہ وہ تصوراتی طور پر مجرد ہستیاں نہیں ہیں۔ جو ذہن کی دُنیا میں ہمیشہ اور ہر زمانے میں ایک دوسرے کے بالمقابل رہی ہیں۔ بلکہ یہ ذہن کے دو اخلاقی اصول ہیں۔ دو عملی اسلوب ہیں۔ دو ایسے طریقے ہیں جن سے انسان کے آلۂ فکر کو انسان کے استعمال میں لایا جاتا ہے۔ پہلے کا تعلق اس کے وظائف کی بجا آوری سے ہے۔ اور دوسرے کا وظیفہ یہ ہے کہ اس کو اس فرض سے منحرف کرنے کی کوشش کرے: تاکہ اس سے کسی مختلف مقصد کی تکمیل کا کام لیا جا سکے۔

اس میں شک نہیں کہ انسان کو ابھی بہت کچھ سیکھنا ہے لیکن بہت سا سیکھا ہُوا بھلانا بھی ہے۔ فکرِ انسانی کو صرف اُن مُعمّوں ہی کو حل نہیں کرنا ہے۔ جو زندگی کے "ابو الہول" نے اس کے سامنے پیش کر رکھے ہیں۔ بلکہ وہ جوابات اور وہ حل بھی اس کے سامنے ہیں۔ جو اب تک فکر پر قبضہ کر چکے ہیں۔ اور بڑی شدت سے اپنے جواز کا اعلان کر رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ عقلی فکر کا وظیفہ تعمیری نہیں بلکہ تنقیدی رہا ہے۔ انسان کا بڑا کام تعمیر نہیں بلکہ تخریب رہا ہے۔ لیکن ارتقائے انسانی کے احوال و شروط ہی ایسے رہے ہیں۔ کہ انہدام سے انکشاف ہوتا ہے۔ اور تخریب سے آزادی کے راستے کھلتے ہیں۔ فکرِ انسانی کو جب کبھی آزادی ملی ہے۔ اس نے ہمیشہ اس امر کا ثبوت دیا ہے۔ کہ وہ اپنا وظیفہ خوش اسلوبی سے ادا کرنے کا اہل ہے۔ آزادی صرف ایک فرسودہ نعرہ نہیں۔ جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے بلکہ انسانی نشوونما و ارتقا کی شرط ہے۔

چھٹا باب

رواجی فکر اور فوقی فکر کی علیحدگی

۱

مادّی ترقی

میرے علم کے مطابق صرف دو ہی طریقے ہیں جن کے ماتحت رواجی فکر اور فوقی فکر کی دیواریں اور زنجیریں توڑنے کا کوئی عمل اب تک واقع ہوا ہے اوّل۔ ایجاد و اکتشاف کی مادّی پیداواروں سے اور دوم ثقافتوں کے ایک دوسری کو سیر حاصل بنانے سے۔

ایجادات و اکتشافات کا حملہ اُن حملوں میں سے ہے۔ جن سے قدامت پسند طاقتوں کو جلد سے جلد ہار ماننی پڑتی ہے۔ اور اُن کی جدوجہد کمزور پڑ جاتی ہے۔ ہمیں معلوم ہے۔ کہ جدید سائینس کو اُس کی پوری زندگی میں متواتر مطعون کیا گیا ہے۔ پہلے اسے جادوگری اور "کالا علم" قرار دیا گیا۔ پھر اسے بے دینی اور غرورِ ذہنی سے تعبیر کیا گیا۔ پھر اسے حقارت سے بے حقیقت اور بے ربط سی خیال آرائی قرار دیا گیا۔ یہ نہایت یقینی بات ہے۔ کہ طبیعیاتی سائینس اگر اپنا وظیفہ اسی امر تک محدود رکھتی۔ کہ تحقیق و توجیہ کرتی۔ علم میں اضافہ کرتی۔ اور انسان کے لئے اس کائنات میں

اپنی حیثیت اور اپنے موقف کو سمجھنے کے قابل بنانے کے لئے اس کے وسائل فکر کو مکمل کرنے میں مصروف رہتی۔ تو مخالف طاقتوں کے مقابلے میں کبھی کامیاب نہ ہوتی۔ وہ روزِ اوّل سے محض اپنی افادی حیثیت اور مادی ثمرات و نتائج کی وجہ سے محفوظ رہی ہے۔ ریاضیات اور فلکیات کی ترقی جب پہلے پہلے زراعت کے فوائد کی خادم تھی۔ بالآخر تجارتی اور شہنشاہی اقتدار کی توسیع کا باعث ہوگئی۔ الکیمیا کی شکل میں جو تجربی سائینس پیدا ہوئی۔ اُس کے متعلق عام خیال یہی تھا۔ کہ وہ بہت بڑی دولت و ثروت کا باعث ہوگی۔ سائینس کو آخری فتح اُس وقت حاصل ہوئی۔ جب اُس کی قوتوں نے مادی اور اقتصادی دُنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔ اور ہر جگہ نئے طبیعی اور دولت آفرین لطائف پیدا کر دیئے۔ فکر کی حیثیت سے۔ دُنیا کی تعبیر و توجیہ کی حیثیت سے۔ اور ذہن انسانی کے ایک ہتیار کی حیثیت سے کسی نظامِ فکر نے ایسا معاندانہ تنفر پیدا نہ کیا ہوگا۔ اور کوئی مکروہ وملعون چیز ایسی نہ ہوگی جس کے خلاف اتنا غل مچا ہو۔ اور اس کو شدت سے کام لے کرنابود کر دینے کا مطالبہ کیا گیا ہو۔ لیکن سائینس کے مادی عطیوں کو رد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ سونے کے انڈے دیتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ رواجی فکر اور قوتی فکر کے خلاف مکروہ ترین اور قابلِ نفرت جُرم کو بھی مجبوراً گوارا کر لیا گیا۔ کسی حد تک اس کا احترام بھی کیا گیا۔ اور نہایت تکلیف و اذیت کے احساس کے باوجود اس کو قبول کر لیا گیا۔

افادی ایجاد و انکشاف کے وسیلے کی حیثیت سے جدید سائینس کو جو کچھ پیش آیا۔ وہی روزِ اوّل سے مادی ترقی کے ہر مرحلے پہ ہوتا رہا ہے۔ رسم و رواج کا تقدس کتنا ہی زیادہ ہو۔ اور اس کے مستقل اور قائم شدہ اصولوں سے انحراف کتنا ہی ہولناک سمجھا گیا ہو۔ لیکن جب اس انحراف

ہیں واضح مادی فوائد نظر آجاتیں۔ تو رسم کا تقدس بالائے طاق ہو جاتا ہے۔ اور انحراف کو خاموشی سے برداشت کر لیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں۔ کہ بورنیو کے قبیلہ تویاک کے لوگ درختوں کے کاٹنے میں "اُلٹے ریشے" کا طریقہ اختیار کیا کرتے تھے۔ جس کو بھی حیثیت سے انتہائی مقدس سمجھتے تھے۔ اور جو اس رسم سے انحراف کرتا۔ اُس کو شدید سزا دیتے تھے۔ لیکن جب انھوں نے یورپی طریقے کو دیکھا۔ تو اکثر چپکے سے قانون (اور رسیوں) کو کاٹ کر پھینک دیا کرتے تھے۔ کیونکہ اس میں سہولت زیادہ تھی۔ اسی طرح ہر قسم کی "افادی ایجادی بے حرمتی" پھیلتی چلی گئی۔ جب آگ جلانے کا طریقہ ایجاد کیا گیا۔ تو برہمنیں اور آتشکدوں کے محافظوں کی طرف سے خاموش احتجاج ہوتا رہا۔ لیکن بالآخر لوگ آگ جلانے لگے دھاتوں کا استعمال شروع ہو گیا۔ لیکن کچھ مدت تک لوگ بطور احتجاج تمام مذہبی مقاصد و رسوم۔ قربانیوں۔ ختنوں اور حنوط کے کاموں میں پتھر کے اوزار اور ہتھیار استعمال کرتے رہے۔ تیر و کمان کے استعمال کو پہلے پہل بزدلوں اور مکاروں کا ہتھیار قرار دیا گیا۔ لیکن بعد میں یہی استعمال سب نے اختیار کر لیا۔ پھر آتشین اسلحہ ایجاد ہوئے۔ تو اگرچہ اس کو "ابلیس کی ایجاد" اور نجابت و شجاعت کے منافی قرار دیا گیا۔ لیکن بعد میں ساری دنیا نے انھی اسلحہ کو اپنا لیا۔

مادی ایجادات کا افتراق انگیز عمل کسی اعتبار سے بھی اس امر تک محدود نہ رہا۔ کہ ان کو قبول کر لیا گیا۔ بلکہ ان سے ایسے دُور رس نتائج پیدا ہوئے۔ جن کا خواب و خیال بھی نہ تھا۔ جس طرح جدید سائنس کے لائے ہوئے صنعتی انقلاب نے ذہنی و معاشرتی دنیا کے نہ صرف مادی بلکہ ہر پہلو کو متغیر کر دیا ہے۔ تمام قوا و اختیارات کی جدید تقسیم کر دی ہے۔ اور تمام پرانی اقدار اور قدیم نظام ہائے فکر کے خلاف تخریبی تنقید کے مسلسل و متواتر

طوفان برپا کئے ہیں۔ اسی طرح ہر زمانے میں ہر نئی ایجاد نے اسی قسم کے زلزلہ افگن انقلابات برپا کئے ہیں۔ حیوانات کو پالتو بنانے کی وجہ سے "ٹوٹمی" معاشرے پر موت و ہلاکت کی ضرب لگی۔ اور غالباً اسی سے مظاہر پرستانہ تجسیمی مذہب پیدا ہوگیا۔ تیر و کمان اور دھاتوں کی ایجاد نے ہر قسم کے توازن طاقت کو درہم برہم کر دیا۔ کرۂ ارضی پر انسانی تقسیم کے قوانین بدل دیئے۔ اور رب النوع جنگ اور پیشوایانِ دین کے درمیان کئی قسم کے مابہ النزاع مسئلے پیدا ہو گئے۔ فن تحریر کی تکمیل نے بڑی بڑی سلطنتوں کا قیام ممکن بنا دیا۔ جہاز رانی نے ثقافتوں کی تعمیر و تخریب، تخلیق و تشکیل میں حصہ لیا۔ اور زراعت نے کرۂ ارض اور انسانی تعلقات کی شکل صورت کو بھاپ اور بجلی سے بھی زیادہ مکمل طور پر بدل کے رکھ دیا۔

مادی ترقی عقلی فکر اور صرف عقلی فکر کی پیداوار ہے۔

انسانی فعالیت کے تمام دوائر میں سے صرف میکانکی ترقی ایک ایسا دائرہ ہے۔ جس میں عقلیت بالکل کسی دخل در معقولات کی متحمل نہیں ہوتی۔ تم کسی میکانکی ساخت کی چیز میں "سفسطہ اور خود فریبی" کے "فنون لطیفہ" سے کام نہیں لے سکتے۔ "مشین" نفیس نظریات۔ قدیم و مقدس روایات اور بلند و پاکیزہ جذبات سے قطعی طور پر متاثر نہیں ہوتی۔ تمام تاویلات باطلہ۔ سکوت کی سازشیں۔ تعصبات سے خطیبانہ اپیلیں۔ معقول فقرے اور خوشگوار سخن طرازیاں جو فکر انسانی کے ہر دوسرے دائرے میں اعلیٰ درجے کا کام دیتی ہیں۔ "مشین" ان سب کو نہایت سختی اور سنگ دلی سے مسترد کر دیتی ہے۔ کیونکہ وہ نہایت کٹر عقلیت پسند ہے۔ وہ اعلیٰ اور ادنیٰ۔ اخلاقی اور غیر اخلاقی آراء و خیالات کے امتیاز سے بالکل بے پروا ہے۔ وہ فریب میں مبتلا نہیں کی جا سکتی۔ میکانکیات میں قدامت اور تجدد کے کوئی معنی نہیں۔ ضمیر کی کوئی شرط موجود نہیں۔ واجب الاحترام آراء کے

مقدس حقوق کچھ مطلب نہیں رکھتے۔ نہ نازک احساسات کے آبگینوں کی کوئی رعایت مدِ نظر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اذہان مشینری سے شدید نفرت کرتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے "میکانکی" اور "میکانکیات" زبان میں گالی کا حکم رکھتے ہیں۔ اگر تم کسی میکانکی "نتیجے" پر پہنچنا چاہتے ہو۔ تو تمہیں نہایت شدت اور قطعیت کے ساتھ (کسی قسم کے الفاظ تحفظ کے بغیر) صرف حقائق سے تعلق رکھنا ہوگا۔ اگر تم ایسا نہ کرو گے۔ تو نقصان تمہیں ہی ہوگا۔ تمہاری "مشین" کام ہی نہیں کرے گی۔

(۲)

پھیلاؤ اور پیوند

جن حالات کی وجہ سے ترقی کا قدم آگے بڑھا ہے۔ وہ یا تو ارتقائے فکر کے لئے فرصت کے مواقع اور اس کو جامۂ عمل پہنانے کی قوت تھی۔ یا ترقی کے پھیلاؤ اور اس کے حاصلات کا تعامل تھا۔ اول الذکر حالات کے عمل کے متعلق ہم عنقریب بعض مثالیں پیش کریں گے۔ آخرالذکر زیادہ تر اہم اور قوی عامل رہے ہیں۔ جن سے انسانی ترقی کو بڑی مدد پہنچی ہے۔ حقیقت میں انسانی ارتقا کے راستے میں بڑے بڑے مرحلے وہی ہیں۔ جن میں فکر کی ترسیل۔ اس کے اندراج۔ اس کے ایصال اور اس کی نشر و اشاعت کے ذرائع و وسائل کو ترقی حاصل ہوتی ہے۔ وسائل ترقی کی نشو و نما کے راستے پر تین بڑے بڑے سنگ میل ہیں۔ نطق۔ تحریر اور طباعت۔ ہر حالت میں اثرات و نتائج کا مقابلہ نسلِ انسانی کے اجتماعی وجود کے پیشِ نظر دماغ کے ان اعصابی عناصر کے باہمی تعلقات کی نشو و نما سے کیا جا سکتا ہے جنھوں نے ظہورِ انسانی کے عضویاتی پہلو کی تشکیل کی ہے۔ اس

امر کے یقین کرنے کی معقول وجوہ موجود ہیں۔ کہ قدیم انسان کے ارتقا میں قوتِ نطق نسبتہً بعد میں پروان چڑھی۔ اور بلاشبہ اس نے زمانۂ قبل تاریخ میں بہت بڑا انقلاب پیدا کیا۔ اسی طرح جیسے مصر و بابل میں فنِ تحریر کی نشوونما۔ کریٹ اور یونان میں اس کی تسہیل۔ عربوں کی کاغذسازی اور زمانۂ جدید کے یورپ میں فنِ طباعت کی ایجاد سے انقلابات پیدا ہوئے۔ ان میں سے ہر قدم اور ہر مرحلہ اس اعصابی نظام کے قیام میں معاون ہوا۔ جو فکر کو فکر کے قریب تر لایا جس نے انفرادی ذہنوں کے عملیات کو باہم مربوط کیا۔ ذہنی ردّ عمل اور تاثر کے بے شمار حلقے کھول دیتے۔ انسانی فکر و راتے کو تنقید۔ بحث۔ اختلاف اور فہم عامہ کے آفتاب کی روشنی میں لاکر حیاتِ تازہ بخشی اس کو وسیع تر دوائر میں پھیلایا۔ اور انسانیت کے مشترک شعور کی تعمیر کی۔

اسی طرح وسائلِ سفر میں ترقی کے ہر مرحلے پر پیش قدمی کی رفتار تیز تر ہوتی گئی۔ پہلے پہل ترکِ وطن اور نقلِ مکانی کی بڑی بڑی تحریکیں ہوئیں۔ عہدِ حجری کی قومیں آئیں۔ پھر برنجی اور آہنی ہتیاروں کے حاملوں کے حملے ہوتے۔ مِنووا والوں نے سمندر میں سفر اختیار کیا۔ فنیقیوں اور مصریوں نے اس فن کو حاصل کرکے ترقی دی۔ عربوں نے یورپ کی ولادتِ ثانیہ کے وقت جہازرانی کو کہیں کا کہیں پہنچادیا۔ جس طرح مِنووا والوں کی جہازرانی کی وجہ سے یونانیوں کے ساتھ ثقافتی ارتباط اور نشوونما کے دروازے کھل گئے تھے۔ اسی طرح اب پرتگیزی، ہسپانوی اور اطالوی جہازرانی کا نیا عہد شروع ہوا۔ یورپ کے لوگ چار براعظموں میں پھیل گئے اور آج کل کے دور میں تو فاصلے کو بالکل ہی فتح کرلیا گیا۔

ہم بڑی بڑی فاتحانہ جنگوں کو مظلوم و مفتوح دنیا کے لئے ایک بلائے عظیم سمجھنے کے عادی ہوچکے ہیں۔ ہم انھیں شوکت و عظمت اور شان و شکوہ کا حامل نہیں سمجھتے۔ بلکہ اس کے برعکس ہمارا خیال ہے۔ کہ یہ نہایت ہولناک

آفات تھیں۔ جنھوں نے دُنیا میں تباہی اور ہلاکت پھیلادی۔ بربادی۔ آتش زدگی۔ قحط زدگی۔ قتل وخون کی قیامت برپا کی۔ اور انسانوں کی نعشوں کو بیدردی سے روندا۔ لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ یہ جنگیں ترقی کے اعلیٰ درجے کے عوامل میں سے تھیں۔ جنھوں نے علیحدگی اور انقطاع کی رکاوٹوں کو توڑ تاڑ کر عالمِ انسانی کے بکھرے ہوئے افراد کو زبردستی آپس میں ملایا۔ اور فکر کے سرمائے کو پھیلایا۔ سلطنتِ ایران نے ایشیائی ثقافتوں کو مربوط ومضبوط کیا۔ سلطنت اسکندری نے ہیلانی (یونانی) دُنیا تخلیق کی۔ اور اسے ثبوت مند اور سیر حاصل بنایا۔ سلطنتِ روما نے وہ تمام ناگزیر احوال و شروط پیدا کئے۔ جن سے آئندہ ترقی کی رفتار تیز ہوتی۔ اور دُنیا ئے حاضرہ وجود میں آئی۔ نپولین کی جنگوں نے یورپ کو جاگیرداری اور شاہی خاندانوں کے اقتدار کی نیند سے بیدار کیا۔ اس کو حیاتِ تازہ اور نیا شعور بخشا۔ اور اس کی نشو ونما کی رفتار میں ایک نئی تحریک کا آغاز کردیا۔

ہم دُنیا میں ہر جگہ دیکھتے ہیں۔ کہ ترقی ہمیشہ ثقافتوں کے ربط وتعاون اور خیالات وتصورات کے تصادم سے پیدا ہوتی ہے۔ تاریخ کے نسلی تصور کے جنون ہی کے ماتحت یہ عقیدہ رونما ہوا۔ کہ تہذیب کی کامیابی صرف نسلوں سے پیدا ہوتی ہے۔ لیکن اس مفروضے کی بنا اور منطقی دلیل کیا ہے؟ یہ خدا ہی کو معلوم ہے۔ یا پروفیسر پٹیری جانتے ہوں گے۔ میرا خیال ہے۔ کہ اس عقیدے کا سراغ بعض پھول دار پودوں میں کسی عمل تولید کی دُور دراز یاد پر مبنی ہے۔ حقائق ہر اعتبار سے اس کی تردید کرتے ہیں۔ کیونکہ اگرچہ دُنیا میں کوئی نسل بھی "خالص" نہیں۔ لیکن جو نسلیں نسبتہً واضح طور پر "خالص" ہیں۔ انھوں نے بھی ترقی کی رفتار میں واضح طور پر "غیر خالص" نسلوں کے برابر ہی حصہ لیا ہے۔ قدیم یونانی تہذیب کے سب سے بڑے معمار تھے۔ اور اپنے بے شمار قبائلی ناموں کے باوجود نسبتہً "خالص النسل" تھے لیکن از منہ وسطیٰ

اور زمانۂ حاضر کے یونانی جو اپنی آبائی عظمت و نفاست سے افسوسناک طور پر محروم ہیں۔ کاملاً "مخلوط النسل" ہیں۔ مصری۔ کلدانی۔ رومن اور جاپانی سب نسبتہً خالص نسلیں ہیں۔ سسلی، ہسپانیہ اور بلقان کی قومیں جن میں سے کسی نے بھی باعتبار نسل تہذیب کی کوئی گراں قدر خدمت انجام نہیں دی۔ انتہائی طور پر "مخلوط النسل" واقع ہوئی ہیں۔ اس کے مقابلے میں جن لوگوں کے نزدیک نسل کی پاکیزگی ارتقائے انسانی کی شرط اولین ہے۔ ان کے خیال میں شمال کا بلند قامت اور لمبی کھوپڑی۔ ہلکے رنگ کے بالوں اور نیلی آنکھوں والا انسان دُنیا کی بہترین اقدار و امتیازات کا مثالی حامل ہے۔ لیکن اس حقیقت پر سب متفق ہیں۔ کہ یہ بے نظیر انسانی نسل زمانہ قدیم سے لے کر آج تک صرف سکنڈے نیویا ہی کے جزیرہ نما میں انتہائی خالص اور پاکیزہ دستیاب ہوسکتی ہے۔ بلاشبہ یہ نہایت معزز و محترم ملک ہے لیکن اس کو انسانی ترقی و تہذیب کے عظیم علمبرداروں میں شمار کرنے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ لہٰذا یہ درست نہیں۔ کہ نسلوں کے اختلاط کے باعث کسی دَور ارتکار اور ناقابلِ فہم طریقے سے ثقافتی ترقی اور تہذیبی کامیابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ بلکہ اس امر کے واضح اور معقول وجوہ موجود ہیں۔ کہ ترقی کی یہ نشو و نما تہذیبوں، ثقافتوں اور افکار و خیالات کے باہم امتزاج اور پیوندکاری سے حاصل ہوتی ہے۔

(۳)

انقطاعی ارتقا

ارتقائے انسانی کے نتائج و حاصلات کی ترسیل کا طریقہ مخصوص ہے اور اس کا یہ ایک نہایت اہم نتیجہ ہے۔ کہ یہ ارتقا افراد۔ نسلوں سلطنتوں

یا قوموں۔ تہذیبوں اور مختلف طبقات کی مخصوص ثقافتوں سے کسی اتفاقی اور منقطع شکل میں آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اس عمل کے احوال و شروط کی تکمیل صرف اسی طریق پہ ہو سکتی ہے۔ کہ انسانیت بحیثیت مجموعی متحدہ و مشترکہ طور پر نشو و نما پاتے۔

ارتقا کے ہر نقشے میں حقیقی اور فعال ترقی صرف ایک محدود اقلیت ہی میں مصروف کار ہوتی ہے۔ کسی ایک مقام پر نشو و ارتقا کا عمل جاری ہوتا ہے لیکن وہ مقام "کل" کا ایک نہایت ہی بے حقیقت سا "جزو" ہوتا ہے۔ سر ہنری مین کی یہ راتے بالکل صحیح ہے۔ کہ "جمود کلیہ ہے۔ اور ترقی استثنا ہے" لیکن ان معنی میں یہ استثنا بھی بجائے خود کلیہ ہی ہے۔ کیونکہ یہ ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ تمام ارتقا "امیبا" سے لے کر "نیبولا" سے آگے تک مستثنیات یعنی اقلیتوں کا نتیجہ ہے۔ پوری "دنیا" ایک دس لاکھویں "بیج" کی پیداوار ہے۔ یہی استثنا اور اقلیت ہے۔ جو عالمگیر عمل کو معین کرتی ہے۔

ارتقا کی تمام صورتوں میں اور خود انسانی ارتقا میں بھی یہی قاعدہ صحیح ہے۔ یہ ارتقا چند نسلوں کا عمل ہوتا ہے۔ بلکہ ان نسلوں کے بعد بھی چند افراد اس کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ لیکن یہاں ارتقائے انسانی اور اس کے وسائل کی مخصوص نوعیت بروئے کار آتی ہے۔ اس کے حاصلات کو آگے بڑھانے والی پوری انسانی دنیا ہوتی ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ آگے بڑھانے والے وظیفے کے راستے میں جتنی تحدیدات اور رکاوٹیں حائل ہوتی ہیں۔ اُسی قدر مُہلک ضربیں خود نشو و ارتقا کے عمل پر لگتی چلی جاتی ہیں۔

اس قانون کا عمل نہایت سنگدلانہ ہوتا ہے۔ یہ کہنا ہرگز مبالغہ نہ ہوگا کہ انسانی نشو و ارتقا کے عمل میں ہر ناکامی۔ ہر ناکارگی۔ ہر آفت۔ تاریخ کی

ہر لغزش - انسان کی ہر مصیبت - نا اہلی اور حماقت براہ راست اسی قانون سے غفلت برتنے اور اسی کی خلاف ورزی کرنے سے رونما ہوتی ہے - یہ قانون دو صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے - جو اگرچہ ایک ہی ضرورت کے دو پہلو ہیں - لیکن اتفاقی اور انقطاعی ارتقا کے مطابق اپنی تاریخی شکل صورت میں واضح طور پر مختلف ہیں - ان میں سے ایک تو کسی معاشری گروہ کسی مملکت یا کسی قوم سے متعلق ہوتا ہے - اور دوسرا کسی فرقے یا طبقے سے تعلق رکھتا ہے -

قبائلی اقوام کا ارتقا نہایت محدود ہوتا ہے - یہ صرف ایک خاص اور معین پیمانے تک پہنچ سکتا ہے - اور پھر اس حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا - جب تک معاشری تنظیم میں کوئی کامل تغیر واقع نہیں ہوتا - جب تک خانہ بدوش یا نیم خانہ بدوش قبیلے جو شکار - گلہ بانی یا ابتدائی کھیتی باڑی پر زندگی بسر کرتے ہیں - ان حالات سے ترقی پا کر آباد کار قوموں کی شکل اختیار نہیں کر لیتے - اور بڑے گروہوں میں ضم نہیں ہو جاتے - اُن کی ترقی قطعی طور پر ثقافت کے ایک مخصوص پیمانے تک محدود رہتی ہے - جس کے خدوخال اور جس کی خصوصیتیں ہر جگہ بالکل یکساں ہوتی ہیں - اور جس سے تجاوز بالکل نہیں کیا جاتا - اگر وہ برابر اسی حالت میں رہتے ہیں - اگر اس حالت کو بدلنے کے لئے کوئی واقعات پیش نہیں آتے - اور اگر وہ منظم اقوام کے ربط سے بالکل محروم اور منقطع رہتے ہیں - تو یہ قبائلی قومیں برابر وحشی رہتی ہیں - اور اُن کی نشو و نما ہمیشہ مسدود رہتی ہے - بالکل اُن قبائل کی طرح جن کو دُنیا بھر میں یورپی توسیع سے سابقہ پڑا - اور جو کسی ابتدائی اور قدیم زمانے میں اُن علاقوں سے کٹ گئے تھے - جہاں تہذیب نمودار ہو گئی تھی مسٹر سدرلینڈ[1] نے یہ ثابت کیا ہے - کہ قدیم اور ابتدائی ثقافت کا ایک

---

[1] Origin & growth of the moral Instinct

مخصوص درجہ ان قبائلی گروہوں کی تعداد سے بھی تعلق رکھتا ہے۔ اور اگر دوسری باتیں مساوی ہوں۔ تو کسی انسانی گروہ کی نشو و ارتقا اور زندگی کے حالات پر اس کے قابو کا مسئلہ اس کی تعداد پر ثبات انحصار رکھتا ہے۔

لیکن کوئی معاشرہ خواہ کتنا ہی تہذیب یافتہ ہو۔ اس کی نشو و ارتقا کے امکانات دوسرے مہذب معاشروں کے تعاون و اشتراک کے بغیر قطعی طور پر محدود ہوتے ہیں۔ کوئی انسانی تہذیب دوسروں سے منفک اور منقطع رہ کر محض اپنی قوتوں کی بنا پر کبھی ایک خاص حد سے آگے قدم نہیں اٹھا سکی۔ ایسا وقت بہت جلد آجاتا ہے۔ کہ ایسی قوم کی ترقی ایک خاص حد تک پہنچ کر رکا ملاً رک جاتی ہے۔ اور اس پر جمود طاری ہو جاتا ہے۔

اس قسم کی "خلوت نشین" نشو و نما کا واضح نمونہ چین کی تہذیب ہے۔ لیکن یہ کوئی ایسی تہذیب بھی نہیں جس کو ہم نفرت و حقارت سے دیکھ سکیں اس کا انقطاع کبھی ایسا مکمل نہیں ہوا۔ جیسا کہ ہم اپنے مغربی نقطۂ نگاہ سے سمجھنے کے عادی ہیں۔ اس کے ماخذ بلا شبہ نہایت عمیق تاریکی میں ہیں لیکن ہم فرض کر سکتے ہیں۔ کہ اہل چین نے ایک سے زیادہ سرچشموں سے استفادہ کیا ہے۔ اگر ہم صرف اس حد تک ہی اپنی نظر محدود رکھیں۔ جب مشرقی ایشیا کے وسیع علاقے تیسری صدی قبل مسیح میں تسین اور ہانگ خاندانوں کے زیر نگین لائے گئے۔ تو تہذیب کے کم از کم دو ایسے ممتاز گہوارے ہوانگ ہو اور یانگسی کے بالائی کناروں پر صاف نظر آتے ہیں۔ بعض لوگوں نے اس ابتدا کو مغربی ایشیا (مثلاً بابل) سے منسلک کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اس قسم کے قیاسات کی تائید میں کوئی ٹھوس شہادت موجود نہیں۔ قدیم ترین زمانوں میں چین مغرب سے کبھی منقطع نہیں ہوا۔ شلیمان (Schliman n) کو ٹرائے کے دوسرے شہر میں سفید پتھر کا ایک تبر دستیاب ہوا۔ جو یقیناً چین ہی سے آیا ہوگا چینی مال تجارت

مثلاً ریشم۔ لوہے اور سمور کی چیزیں بابل کی منڈیوں میں موجود تھیں۔ ہمیں معلوم ہوا ہے۔ کہ باختریہ کی یونانی سلطنت سے موسیقی۔ آلات ریاضی آبی گھڑیاں اور انگور کی کاشت کے فنون چین میں داخل ہوئے۔ اور ان کے علاوہ بلاشبہ بے شمار اَور چیزیں بھی ہوں گی جن کے کوئی آثار ہمارے پاس موجود نہیں۔ زمانۂ قدیم میں جہاں تک ہم نظر ڈالتے ہیں۔ ہمیں نظر آتا ہے۔ کہ ساحل چین اور ہندوستان کے درمیان تجارت ہو رہی ہے۔ اور وہاں سے تجارت کا مال عرب۔ شام اور مصر تک پہنچ رہا ہے۔ دوسری صدی عیسوی کی چینی روایات شامی تاجروں کا ذکر کرتی ہیں۔ اور ایک بادشاہ "آن توان" کا ذکر بھی پایا جاتا ہے۔ جس نے ۱۶۶ء میں ایک قسم کا وفد بھی شام میں بھیجا تھا۔ اس بادشاہ کے نام کا ترجمہ "آنٹونی اُس" کرنا بھی چنداں مشکل نہیں۔ روما کے ساتھ رابطہ پہلے پہل اُس بری راستے سے ہوا۔ جو پارتھیا سے گزرتا تھا۔ اور چین پر ایرانی تجارت کا انحصار تھا۔ اس کے بعد بحری راستہ مقبول عام ہوگیا۔ اور اسکندریہ کی بندرگاہ منڈی قرار پائی۔ چین کی ترقی اور پیداوار کا زمانہ وہی معلوم ہوتا ہے۔ جب اس کے تعلقات و روابط باختریہ۔ پارتھیا۔ ہندوستان اور مغربی روم سے وابستہ ہوئے۔ چین کا ثقافتی عروج و کمال تیسری صدی کے زما بادشاہوں کے عہد میں ہوا۔ اُسی زمانے سے چین نے سیاسی اصول و عقیدہ کے ماتحت دیدہ و دانستہ انقطاع اختیار کرلیا۔ چنانچہ اس کی نشو و نما کی رفتار رُک گئی۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے۔ کہ ہم نے "انقطاعی ترقی" کی جو واضح ترین مثال پیش کی ہے۔ وہی ثقافتی رکاؤ اور جمود و سکون کی مثال بھی ہے۔

کوئی معاشرہ وحشی اور غیر مہذب نسلوں کے درمیان رہ کر ترقی اور تہذیب کے راستے پر مسلسل گامزن نہیں رہ سکتا۔ اس صورت حال کو ختم کرنے کے لئے ضروری ہے۔ کہ وہ اُن غیر مہذب اقوام کو فتح کر کے

انھیں اپنی تہذیب سکھلائے۔ وحشت و بربریت کے سمندر کے درمیان ثقافت کا محض ایک جزیرہ قطعی طور پر لغو و محال ہے۔ اُسے یا تو اپنے وحشی ہمسایوں کو تباہ کرنا ہوگا۔ یا اُنھیں جذب کرکے اپنی سطح پر لانا ہوگا۔ ورنہ وہ ایک دن خود اس پر غلبہ پاکر اُسے جذب کرلیں گے۔

لیکن کسی مہذب قوم کو اپنے وحشی ہمسایوں پر غالب آنے یا اُن کا کامیابی سے مقابلہ کرنے کے لئے جو قوت حاصل ہوتی ہے۔ اُس سے اس کی ثقافت اور ترقی کی طاقتوں پر ناقابل برداشت بوجھ پڑتا ہے۔ جنگجوئی کی رُوح۔ فوجی محاسن۔ ضبط و نظم اور وہ تمام اوصاف جو استعمال قوت کی کامیابی کے ضامن ہوتے ہیں۔ اُن خوبیوں سے بالکل مختلف و متضاد ہیں۔ جو تہذیبی اور عقلی ترقی میں کام آتی ہیں۔ یہ عضویاتی جد و جہد اور حیوانی مقابلے کا ایک حصہ ہیں۔ تہذیب کا تقاضا یہ ہے۔ کہ اُس نسل کو اس جد و جہد کی سطح سے بلند تر کیا جائے۔ حقیقی انسانی ارتقا کے لئے ضروری ہے۔ کہ محض حیوانی ارتقائی کش مکش کو بالکل الگ رکھا جائے۔ تناسب کے اعتبار سے جتنی کوئی قوم ایک دائرے میں کامیابی کی زیادہ صلاحیت رکھتی ہے اسی قدر وہ دوسرے دائرے کے لئے نااہل ہوتی ہے۔ یہ صحیح ہے۔ کہ تہذیب زیادہ مؤثر اسلحۂ جنگ اور زیادہ کارآمد تنظیم مہیا کرنے کی اہل ہے۔ لیکن اگر کسی قوم کو یہ فوائد حاصل بھی ہوں۔ جب بھی وہ اس ضرورت سے بے نیاز نہیں ہوسکتی۔ کہ اپنی ترقیاتی قوتوں اور وسیلوں کو بھی نشو و نما کے بجائے فوجی صلاحیت کے حصول کے لئے منظم کرے۔ یہ فقرہ زبان زد عام ہے۔ کہ تہذیب اُن "مردانہ" اوصاف کو "نابود" کردیتی ہے۔ جن پر فوجی کامیابی اور توسیع کا انحصار ہے۔ بلاشبہ یہ صحیح ہے۔ تہذیب فطرت انسانی کے تمام وحشیانہ رجحانات کو یقیناً "نابود" کردیتی ہے۔ فوجی اور جنگی روح نہ تہذیب کا جزو ہے۔ نہ اس کے لئے سازگار ہے۔ بلکہ اس سے قطعاً

متصادم اور منافی ہے۔ قدیم تاریخ میں ہم اکثر پڑھتے ہیں۔ کہ فلاں فلاں قومیں "روز افزوں بدعنوانی کی وجہ سے" مغلوب ہوگئیں لیکن یہ "بدعنوانی" بالکل وہی چیز ہے۔ جسے ہم تہذیب کہتے ہیں۔ ہم Sodom مصر یا روما کے کسی زمانے کے مقابلے میں ہزار گنا زیادہ "بدعنوان" ہیں۔ زمانہ قدیم کے مصنف تہذیب کو "بدعنوانی" ہی سے موسوم کرتے تھے۔ کیونکہ یہ چیز قوم کی جنگی قابلیتوں کو "بدعنوان" کر دیتی تھی۔ ان معنی میں ہر تہذیب جسے وحشت و بربریت کی طرف سے خطرہ لاحق ہو "بدعنوان" ہی ہو جاتی ہے۔ جو تہذیبیں وحشت کے حملوں سے مغلوب ہو جاتی ہیں۔ وہ حد سے زیادہ مہذب ہوتی ہیں۔ دوسری طرف بربریت بھی آخر میں شکست کھا جاتی ہے۔ کیونکہ وہ روز بروز بیش از پیش وحشی ہوتی چلی جاتی ہے۔ بابل کو اس لئے زوال ہوا۔ کہ وہ بے حد مہذب ہو گیا تھا۔ اور لڑ نہیں سکتا تھا۔ نینوا اس لئے مغلوب ہو گیا۔ کہ وہ اپنی تمام صنعت و زراعت کو برباد کر کے صرف عسکریت کی پرورش کرتا رہا۔

"سلطنتوں کے زوال و انحطاط" کی ایک علت اسی حقیقت میں مضمر ہے۔ ایشیائے قدیم کی سلطنتوں اور قلمروؤں کو ان کے زیادہ جنگجو اور وحشی ہمسائے اکثر پامال کر کے مغلوب کر لیا کرتے تھے لیکن حملہ آور کی حیثیت عام طور پر ایسی ہوتی تھی۔ کہ وہ مفتوح کی تہذیب کو جذب کر لیتا تھا۔ اور وہ تہذیب دوسرے وجوہ و اسباب کی بنا پر پہلے ہی ساکن و جامد ہو چکی ہوتی تھی۔ یونان و روما کی پوری دُنیا تباہ و برباد ہو گئی۔ حالانکہ وہ بہت بڑی دُنیا معلوم ہوتی تھی لیکن وہ وحشی انسانیت کے درمیان تہذیب کے محض ایک جزیرے کی حیثیت رکھتی تھی۔ ایک زمانے میں یورپ بالکل چین کا ایک صوبہ بننے ہی والا تھا۔ اور بعض لوگ اب بھی یورپ کو "زرد خطرے" کی زد میں سمجھتے ہیں (یہ "زرد خطرے" کی ترکیب ولیم ہوہن زولرن کی اختراع ہے)

لیکن یہ محض ایک وہم ہے کیونکہ ایشیائی نسلیں جب مغربی خیالات کو جذب کرتی ہیں۔ تو انھیں ہمیشہ اُن کی بلند تر اور ترقی یافتہ صورت میں اختیار کرتی ہیں۔ اور اُن فرسودہ تصورات کو چھوڑ دیتی ہیں۔ جن کا اثر ابھی اُن اصلی ملکوں میں باقی ہوتا ہے۔ لہٰذا انھیں اتنی سمجھ ضرور ہوتی ہے۔ کہ محض جنگ سے حاصل کی ہوئی سلطنتیں بالکل بے کار ہوتی ہیں۔ آج کل مغرب کی پوری تہذیب ایک ایسی ہولناک جنگ عظیم کے اثرات سے ڈگمگا رہی ہے۔ جو تاریخ عالم میں نظیر نہیں رکھتی۔ کیونکہ ایک مغربی قوم نے اپنے حکمران طبقے میں ازمنۂ متوسطہ کے تصورات بربریت قائم رکھے۔ اور اس کے ڈاکو سرداروں نے ایک ایسی قوم کو جو اعلیٰ درجے کی تہذیب و ثقافت کی اہل تھی۔ اپنی گرفت میں لاکر زمانہ وحشت کے مقاصد و اغراض کی تربیت دی ہے۔

جس تناسب سے کوئی قوم ان مقاصد کی تکمیل کی ضرورت محسوس کرتی ہو۔ اُسی تناسب سے وہ طبعی طور پر وحشی رہتی ہے۔ اُس کی قسمت میں یہی لکھا ہے۔ کہ ارتقائے انسانی کے دوران میں جلد یا بدیر بزور شمشیر ذلیل و مغلوب ہوگی۔ اور صرف یہی نہیں۔ بلکہ وہ کوئی تہذیب بھی حاصل کرلے اُس کے کج رَو اور باطل ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ کیونکہ اس کی بنیاد اُس ہمہ گیر جھوٹ پر ہے۔ کہ وہ اپنی حُبّ وطن کی بنا پر طاقت و قوت و تقدیس کا عَلَم بلند کرتی ہے۔

جس تناسب سے کوئی تہذیب قومی پندار اور انقطاع کی چار دیواری کے اندر اپنے آپ کو بند کرلے گی۔ اُسی نسبت سے اُس کی نشو و نما مسدود اور ناکارہ ہو جائے گی۔ اور جس قدر وہ اپنے ہمسایوں اور دوسرے اہل عالم کے ساتھ آزادانہ و متواتر ارتباط کی زندگی بسر کرے گی۔ اُسی قدر ترقی و خوشحالی اُس کے قدم چومے گی۔

ارتقاء انسانی صرف ترقی کا نہیں بلکہ توسیع کا بھی متقاضی ہے۔ وہ تہذیب لازماً بلند ترین ہوگی۔ جو دنیا کے نقشے پر وسیع ترین رقبے کے اوپر حاوی ہو۔ ہر عظیم تہذیب خواہ وہ یونانی ہو یا رومی۔ عربی ہو یا یورپی جتنی وسیع ہوتی گئی اُسی قدر زیادہ مفید اور قابل قدر ہو گئی۔ انسانی ارتقا کی نوعیت اور اُس کے اسالیب میں جو ناگزیر ضروریات مضمر ہیں۔ اُن کی بنا پر اگر کوئی انسانی گروہ اپنا یہ نصب العین قرار دے لے۔ کہ وہ خود مختار اور منقطع رہے گا۔ وہ ایک ایسا معاشرہ بنے گا۔ جو "بجائے خود" اور "براستے خود" ترقی کرے گا۔ اور صرف اپنی تہذیب اور اپنی قومی سلطنت یا مملکت قائم کرے گا۔ تو اس قسم کا نصب العین بلاشبہ بہت بڑا جبلی اژدھا اور مصنوعی عفریت ہے۔ اس ہولناک نصب العین کا حصول حیطۂ امکان میں نہیں ہے۔ یہ انسانی نشوو ارتقا کے قوانین کی خلاف ورزی ہے۔ یہ قوانین اس نصب العین کو ناکام نامقبول اور مسترد رکھتے ہیں۔ پورے عالم انسانیت کو بحیثیت مجموعی اپنا وارث اور اپنے ارتقائی حاصلات کا مُرسل قرار دے کر مصروف عمل ہوتے ہیں اور دوسرے تمام گروہوں اور وحدتوں کو نذر تغافل کر دیتے ہیں۔

اتفاقی ارتقا کی دوسری شکل جو کلّی معاشرے کے اندر ایک طبقے تک محدود ہوتی ہے۔ انسانی نشوو ارتقا کی تاریخ میں اَور بھی زیادہ گہری اہمیت رکھتی ہے یہ خصوصیت بیشتر یا کمتر درجے میں اُن تمام معاشروں میں مشترک ہے۔ جو اب تک وجود میں آئے ہیں۔ اور بڑی حد تک اُنؔ جراثیم انحطاط" پر مشتمل ہے جو اس خیالی مغالطہ کی تائید کرتے ہیں۔ کہ تمام معاشروں کو لازماً نشوونما۔ پختگی اور انحطاط کے چکّر میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ ہم آیندہ صفحات میں اس امر پر بحث کریں گے۔ کہ مختلف صورتوں کے ماتحت اس حالت کے اثرات کیا کیا ہوتے ہیں۔ اس سے جو عملیات رونما ہوتے ہیں۔ وہ اس ناگزیر پہلو میں انسانی ترقی کے بنیادی خدوخال ہوتے ہیں جس کو اخلاقی پہلو کیا جاتا ہے۔

یہ مسئلہ موجودہ کتاب کے تیسرے حصّے کا موضوع ہوگا۔

کسی ایک طبقے کے ارتقائی پہلو کا لازمی نتیجہ وہ ہے جس کو میں "قوتی فکر" کے نام سے موسوم کرچکا ہوں۔

کسی حکمران جماعت کی قوّت کسی میثاق پر بھی مبنی ہو۔ خواہ وہ دینی ہو یا سیاسی۔ معاشری ہو یا ذہنی۔ نسلی ہو یا اقتصادی۔ اس کی ناگزیر یا در محدود کُن قوت اپنی متعلقہ ثقافت پر پوری طرح اثر انداز ہوتی ہے۔ لیکن قوتی فکر چونکہ عقلی فکر کا بطلان کر کے اس کی مخالفت کرتا ہے۔ اس لئے نہ صرف معاشری نظام کی عمومی نشو و نما کو پابہ زنجیر کر دیتا ہے۔ بلکہ خود اُس طبقے کی ترقی کو بھی مہلک طور پر عقیم کر دیتا ہے جس کی قوت کو بڑھانا اس کا مقصود ہوتا ہے کوئی ثقافت جو کسی ایک طبقے کی مخصوص پیداوار ہوتی ہے۔ اس شکل میں ہمیشہ نہیں رہ سکتی جس نصب العین کا منشا یہ ہو۔ کہ ایک بلند مرتبہ حکمران طاقت کسی ٹھکراتے ہوئے غلام طبقے کو پامال کر کے انسانی ترقی کا مقصود حاصل کرے (ہمارے زمانے میں نیٹشے نے اسی نصب العین کی تجدید کی ہے) وہ غیر ممکن العمل ہے۔ وہ ایک ایسا تصوّر ہے۔ جو ارتقائے انسانی کے اٹل قوانین کے خلاف ہے۔ اگر آقاؤں کا ایک طبقہ کسی غلام طبقے پر پورا قابو حاصل کر بھی لے۔ جب بھی اُس کا انجام جمود ہوگا۔ کیونکہ اس قسم کے اقتدار کے حالات کا تقاضا یہ ہوتا ہے۔ کہ اس کو قائم رکھنے کی غرض سے ترقی وارتقا کے تمام لمحات کو روز افزوں طور پر اس کا محکوم رکھا جائے۔ چونکہ موجودہ حالات کو برقرار رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا ترقی کی شکل روز اوّل ہی سے کج او مسخ ہو جاتی ہے۔ دُنیائے انسانی کی پوری ساخت کا رنگ و روغن عقلی فکر سے نہیں۔ خالص تلاش صداقت سے نہیں۔ سچ مچ کی ترقی سے نہیں۔ بلکہ جعلی و مصنوعی مفادات سے تیار کیا جاتا ہے۔ جو حکمران طبقے کے حقوق و امتیازات کی موثق بنیادوں پر مبنی ہوتے ہیں۔ اور ان

مقاصد کا غلبہ ترقی پسندانہ جذبے کو اسی طرح بے جان اور مُردہ کر دیتا ہے۔ جس طرح کوئی طفیلی کیڑا کسی شاندار درخت کو اندر ہی اندر کھا جاتا ہے۔ حکمران طبقے کی پوری ثقافت خواہ کسی وقت کتنی ہی قوت اور نجیبانہ اوصاف کی مالک رہی ہو۔ نہایت سرعت سے محض جعلی نظریوں اور فارمولوں کی ایک مُردہ دُنیا بن کر رہ جاتی ہے۔ ہر قسم کا خلوص۔ صدق و عدل کے تمام احساسات اور قوتِ حیات کے تمام عناصر اس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ اگر وہ دُنیا میں باقی بھی رہتی ہے۔ اور کوئی طاقت اسے نابود کرنے کے لئے نہیں اُٹھتی۔ جب بھی اس کا وجود ایک حنوط شدہ نعش سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اگر دوسری طرف محکوم طبقے پر پورا قابو اور اقتدار حاصل نہ ہو سکے۔ اور وہ طبقہ آقاؤں کے طبقے کی ذہنی و دماغی دُنیا سے بالکل خارج نہ کیا جا سکے۔ تو خود اس محکوم و مغلوب طبقے میں بھی ترقی پسندانہ جذبات مصروفِ عمل ہو جاتے ہیں۔ اور یہ عمل قائم شدہ نظام کے خلاف کام کرتا ہے۔ آقاؤں کے طبقے کے ثقافتی عناصر زیادہ سے زیادہ باطل نظر آنے لگتے ہیں۔ اس کے مفادات نے جس شدت کا تعصب پیدا کیا تھا۔ اُتنی ہی شدت اب مخالف قوتوں میں پیدا ہو جاتی ہے۔ آقاؤں کا طبقہ اشیا کو اُس شکل میں دیکھنے کا خواہاں اور عادی ہو جاتا ہے۔ جو اُن کی حقیقی شکل نہیں ہوتی۔ چنانچہ حقیقتِ اشیا سے اس کا ربط و توافق قطعاً ختم ہو جاتا ہے۔ جب یہ کش مکش شروع ہو جاتی ہے۔ تو اس کا نتیجہ صرف یہی ہوتا ہے۔ کہ موجودہ نظام بالکل تلپٹ ہو جاتا ہے۔

یہ وہ "جراثیم انحطاط" ہیں۔ جن کے متعلق بہت سے لوگوں کی رائے یہ ہے۔ کہ ہر ثقافت کے اندر موجود ہوتے ہیں۔ یہ جراثیم ہر اُس جگہ موجود ہوتے ہیں۔ جہاں ثقافت اور اُس کے فوائد پوری معاشرت میں

پھیلے ہوئے نہ ہوں۔ بلکہ صرف بعض افراد کے گروہی مفادات سے تعلق رکھتے ہوں۔ جن کی ترقی کی خاطر اکثریت کی زندگیوں کو مغلوب و محکوم رکھا جاتا ہو۔ یہ ظاہر ہے۔ کہ جو صدمہ معاشرے کے ایک حصّے کو پہنچے گا وہ پورے معاشرے پہ اثر انداز ہوگا۔ اجتماعی نظام ہرگز صحت مند نہیں رہ سکتا۔ جب کہ ایک حصہ دوسرے حصے کو تباہ کر کے اپنی خوش حالی چاہتا ہو۔ اس سے دونوں کو یکساں نقصان پہنچتا ہے۔ گویا جس کو غلبہ و اقتدار حاصل ہوتا ہے۔ وہ اس غلبہ و اقتدار کو خود اپنے ہی تنزّل و انحطاط کے لئے خریدتا ہے۔ اس قسم کا نظام، اجتماعی وجود کے احوال و شروط کی بھی خلاف ورزی کرتا ہے۔ اور اس کا انجام یہ ہے۔ کہ اُسے انسانی ترقی و تطابق کے احوال و شروط کی بھی خلاف ورزی کرنی پڑتی ہے۔ یہ عقلی فکر کی قوت سے ترقی نہیں کر سکتا۔ بلکہ اس قوت کے عمل کا گلا گھونٹ کر زندہ رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے حالات ہی ایسے ہوتے ہیں۔ کہ فنا اُس کے مقدر میں ہوتی ہے۔

ایک ضرب المثل ہے "دیانت بہترین حکمت عملی ہے۔" اس کو ایک غیر یقینی سے عقیدے کے طور پہ ٹھہرایا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ بہترین حکمت عملی انسانی نشو و ارتقا کا ایک قانون ہے۔ جو دُنیا میں انسان کی صورت حال کا لازمی نتیجہ ہے۔ ہر وہ چیز جو اس صداقت کی مؤید ہوگی۔ دُنیا میں انسان کی کامیاب مطابقت کو تقویت دے گی۔ لیکن ہر وہ چیز جو اس کی عقل کو فاسد بنائے گی۔ اور اس کے ذہن کو اُس کے مخصوص وظائف سے منحرف کرے گی۔ اُس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ اُن حقائق سے جن کے درمیان انسان زندگی بسر کر رہا ہے۔ اس کا رابطہ اور توافق قائم نہ رہے گا۔ اور اس کی نوبت ابتقا

کا عمل رُک جائے گا۔ ثقافتِ انسانی کی پوری رفتار کے دوران میں کسی تہذیب کی جان داری۔ قوت توانائی۔ وقعت اور کامیابی اس کے خلوص اور اس کی دیانت فکر کا پتہ دیتی ہے۔ اور جس تہذیب میں کھولت۔ انحطاط بدعنوانی اور زوال و تباہی کا میلان پایا جائے۔ اس کا مطلب یہی ہے۔ کہ اس میں دروغ گوئی اور بد دیانتی راہ پا گئی ہے۔

حصّۂ دوم

تہذیبِ یورپ کا ''شجرۂ نسب''

پہلا باب

مشرق کا راز

جب خانہ بدوش انسان چراگاہوں کی تلاش میں ایشیا کے بڑے بڑے دریاؤں کی ترائیوں میں پہنچے۔ اور اُنھیں معلوم ہُوا۔ کہ یہاں تھوڑی سی محنت سے فطرت کی فیاضی مویشیوں اور انسانوں کے لئے موسم سرما کی خوراک بافراط مہیا کر سکتی ہے۔ تو اُنھوں نے آوارہ گردی چھوڑ کر زراعتی زندگی اختیار کر لی۔ اور مستقل مساکن میں آباد ہو گئے۔ گویا سیحون۔ گنگا۔ یانگسی۔ فرات اور نیل کے دریاؤں کی کیچڑ سے تہذیب پیدا ہوئی۔ فطرت نے انسانوں کو حصول غذا کی مسلسل اور روزانہ جد و جہد سے نجات دلا کر فرصت مہیا کی۔ اور فرصت نے فکر و ایجاد کا موقع دیا۔

لیکن جن حالات نے مستقل مساکن اور محفوظ ذریعۂ معاش مہیا کیا تھا انہی سے جد و جہد اور کش مکش کے نئے راستے بھی پیدا ہوئے۔ جو قبیلہ صرف مچھلی اور شکار پر گزران کر رہا ہو۔ اُس کے کسی فرد یا گروہ کو دوسروں پر اقتدار حاصل کرنے سے کوئی قطعی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ خالص چراگاہی زندگی کے حالات میں مواشی قبیلے کی مشترکہ جائداد ہوتے ہیں۔ ایک قبیلہ تو دوسرے قبیلے کے گلّے کو چُرا سکتا ہے لیکن مشترک گلّے میں کسی ایک

فرد کو نہ چھڑانے کی ترغیب ہوتی ہے نہ سہولت ہی حاصل ہوتی ہے لیکن جہاں خود زمین پر مستقل قبضہ ہو جاتے ۔ جو غذا اور دولت کا ذریعہ ہو ۔ جہاں مالک ضروری کام خود بھی کرے ۔ اور اپنی مدد کے لئے مزدور بھی رکھ سکے ۔ اور جہاں فرصت کی وجہ سے زاید پیداوار بھی ممکن ہو ۔ وہاں انفرادی ملکیت اور انسانوں پر غلبہ و اقتدار سے جو فوائد حاصل ہو سکتے ہیں ۔ وہ واضح اور معندبہ ہیں ۔ جب کوئی شخص زمین کی ملکیت پر اپنا حق حاصل اور قائم کرے ۔ تو اُسے انسانوں اور اُن کی محنت پر بھی حق ملکیت حاصل ہو جاتا ہے ۔

طبیبوں ۔ معالجوں ۔ مذہبی پیشواؤں اور دیوتا کے متعلقین اور نائبین کا اثر و نفوذ بھی زرعی قوموں پر بے انتہا ہوتا ہے ۔ کیونکہ یہ لوگ یقین کرتے ہیں ۔ کہ زمین کی زرخیزی انسانی محنت و مشقت سے بھی زیادہ ان بزرگوں کی دعاؤں اور عبادتوں پر منحصر ہے ۔ یہی وجہ ہے ۔ کہ ایشیا اور وادی نیل کی ترائیاں (کسی نسلی مذہبی ذوق کی وجہ سے نہیں) مذہبی جوش و خروش کا مرکز رہی ہیں اور ایشیا اور شمالی افریقہ کے زرخیز سیلابی میدان ہی دنیا کے تمام اہم مذاہب (سوائے ایک کے) کا گہوارہ رہے ہیں ۔ کیا انسان غلہ اور سبزیاں اُگانے کے لئے نلائی ۔ بوائی اور کٹائی کے مقابلے میں جھاڑ پھونک اور جادو ٹونے پر طبعاً اور لا علاج طور پر اعتقاد رکھتا ہے ۔ جیسا کہ علمائے انسانیات ہمیں یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں ؟ ہمیں تو یہ امر کسی قدر ناقابل یقین معلوم ہوتا ہے لیکن اگر اس قسم کے تصور کا کوئی رجحان ہو بھی ۔ تو ظاہر ہے کہ اناج دیوتا کے نمائندے اس کی مخالفت تو کرنے سے رہے ۔ وہ تو بلکہ زیادہ اقتدار اور زیادہ چالاکی ذہن سے کام لے کر رسمیات و ضمنیات کی تفصیلات معین کرتے ہوں گے ۔

اس پرانی اور ابتدائی تہذیب کے کھنڈر کھودنے والوں اور اس کے نقوش کا سراغ لگانے والوں کو پچھلے دنوں عراق کے اونچے اونچے ٹیلوں

کی کھدائی سے جو حقائق معلوم ہوئے ہیں۔ اور جنھوں نے ان کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے۔ اُن میں سب سے نمایاں حقیقت یہ ہے۔ کہ اس تہذیبِ قدیم میں تقویٰ اور پارسائی مقتدر اور ہمہ گیر تھی۔ ہمیں معلوم ہے کہ تمام ابتدائی اور قدیم ثقافتوں میں مذہب اور زندگی متحد تھی لیکن قدیم بابل کی مثال ان سب پر فوقیت رکھتی ہے۔ کیونکہ وہ لوگ تو کبھی ایک لمحے کے لئے بھی مذہبی فکر کے محور سے تجاوز نہ کر سکتے تھے۔ اس جادو کے چکر میں کوئی شخص ایک قدم نہ اُٹھا سکتا تھا۔ مٹی کا ایک بیلچہ نہ بھر سکتا تھا۔ اینٹ نہ بنا سکتا تھا۔ غذا کا ایک لقمہ نہ کھا سکتا تھا۔ سانس نہ لے سکتا تھا۔ چھینک نہ مار سکتا تھا تاآنکہ اس کا براہِ راست تعلق فوق الفطرت طاقتوں سے نہ ہو۔ یہی وہ فضا ہے جس میں مشرقی ذہن کی تشکیل و تربیت ہوتی ہے۔

زرخیز زمین دیوتا کا عطیہ ہے" زمین خدا کی ہے۔ اور خدا ہی سب سے بڑا زمیندار ہے" لہٰذا لازم آیا۔ کہ زمین کا عُشر اور اس کے پہلے پھل خدا ہی کی خدمت میں پیش کئے جائیں۔ لگان کی ادائیگی اُن ضروری رسوم میں سب سے زیادہ ضروری تھی ۔۔ جو خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے ادا کی جاتی تھیں پروہت۔ پجاری جو خدا کا کُنبہ کہلاتے تھے۔ اپنا لگان اپنے آپ ہی کو ادا کرتے تھے۔ یہ گویا ملکیتِ اراضی کی ناگزیر ابتدا تھی۔

دیوتا کا نمائندہ اپنی اس حیثیت سے پورا پورا فائدہ اُٹھاتا تھا۔ اور لوگوں کو لُوٹ کر کھوکھلا کر دیتا تھا۔ مثال کے طور پر سُنئے۔ ایک سُمیری پجاری نے اپنے گلّے کے ایک فرد کو زمین میں دفن کرتے وقت اس "مرحوم" پر چند منتر پڑھے۔ اور اس تلاوت کی جو فیس وصول کی۔ اُس کی ایک یادداشت دستیاب ہوئی ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

"سات مٹکے شراب۔ چار سو بیس روٹیاں۔ ایک سو بیس پیمانے غلّے کے ایک ملبوس۔ ایک بُزغالہ۔ ایک پلنگ اور ایک کُرسی"

جو زراعتی قبیلے بڑے بڑے دریاؤں کی نمائیوں میں بکھرے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان جھگڑے پیدا ہونا ناگزیر تھا۔ خصوصاً چراگاہوں کے متعلق جو ہمیشہ "شاملات" کی حیثیت رکھتی تھیں۔ اور جتنی زیادہ زمین زیر کاشت آتی جاتی تھی۔ وہ چراگاہیں اُسی قدر آگے بڑھتی جاتی تھیں حفاظت اور پناہ کا انتظام بھی ضروری تھا۔ اس کے لئے ایک تو دیوتا کی "پناہ" طلب کی جاتی لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ گاؤں کے گرد ایک مستحکم فصیل بھی تعمیر کی جاتی۔ اور قبیلے کا مسکن ایک محفوظ شہر پناہ میں آجاتا۔

ایشیائی ممالک میں طلوع تہذیب کے وقت اس قسم کی آبادیاں ہر جگہ ملتی ہیں۔ مثال کے طور پر عراق کے میدانوں میں اکثر نمایاں ہیں۔ جب کبھی قبائلی جنگیں برپا ہوتیں متصل شہروں کی سلطنتیں کسی قوی تر یں سلطنت میں ضم ہو جاتیں۔ اور متقدر سردار کو جو دیوتا کا نمایندہ ہوتا۔ اور "پتیسی" کہلاتا تھا۔ خراج ادا کرتیں۔ کِش۔ لگاش۔ ایریڈو اور کارانیوں کے "اُور" کے گرد اگرد مختلف حیثیت کی چھوٹی چھوٹی سلطنتیں پیدا ہو گئیں۔ میدانوں میں جن شہروں کے گرد کوئی قدرتی سرحدیں نہ ہوتی تھیں۔ ان کی تقدیر یہی تھی۔ کہ وہ بڑی بڑی طاقتور سلطنتوں میں شامل ہو جاتیں۔ جو مشرق سے مغرب تک پھیلی ہوتی تھیں اور اُونچے دیوتاؤں کے فرزند "اور پجاری بادشاہ" کی شوکت و عظمت کا اعلان کرتی تھیں۔ یوں گویا لگاش کا "آیاناتوم" اور اگادے کا "سارگون" دنیا بھر پر اپنے جاہ و جلال کی شعاعیں بکھیر رہے تھے۔ اور سموآبو اور حمورابی نے سُمیر اور عکاد کو ملا کر پہلی سلطنت "بابل" کی بنیاد رکھی۔ اسی طرح مصر میں ابیدوس کے "ہورس" خداوندوں نے آس پاس کے قبائل کو جذب کر کے اپنی سلطنت کو فایوم تک وسیع کر لیا۔ تا آنکہ "نرمیر" نے ڈیلٹا کی قوم کو مغلوب کیا جس کی ثقافت بابلی اثرات کے قرب کی وجہ سے زیادہ ترقی یافتہ تھی۔ اور بالآخر پوری وادئ نیل کو زیر نگیں کر لیا۔ پہاڑی اور صحرائی جنگجو قبیلے بھی

جب دریائی علاقوں کی خوشحالی دیکھتے ہیں۔ تو اُن میں لازماً لالچ پیدا ہوتا ہے چنانچہ ایلام کی بلندیوں کے ساکنین۔ صحرا کے وحشی بدوی۔ عکادی کنعانی۔ ارامی و سامی۔ کاسی گھڑ سوار اور کپاڈوشیا کے وہشت ناک جتّی ارض موعود یعنی مادرِ تہذیب پر حملہ آور ہو کر چھا گئے۔ لیکن ان تمام تاختوں اور یورشوں کا صرف یہی اثر ہوا۔ کہ مادرِ تہذیب کی فیض رسانی وسیع تر ہو گئی۔ حالات میں کسی قسم کی تبدیلی پیدا نہ ہوئی۔ بابل کے دیوتا اُٹھا کر پہاڑیوں پر پہنچا دیئے گئے۔ لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ ان کی قوت دریاؤں اور اُن کے پجاریوں کے قبضے میں رہی۔ سامیوں نے سمیریوں کی بیخ کنی کر کے اُن کی جگہ لے لی۔ لیکن پجاری اور اُن کی تہذیب برابر قائم رہی۔ بلکہ انھوں نے وحشی فاتحوں کو جذب کر لیا۔

جب جنگجوؤں نے اس طلسم کو توڑ دینے کی جد و جہد کی۔ قوت و اختیار پر خود قبضہ کرنا چاہا۔ جب کلاح اور نینوا کے خداوندوں یعنی شلمانیسروں آشور نسر پالوں اور سناخریوں نے ازمنۂ وسطیٰ کے شہنشاہوں کی طرح یہ کوشش کی۔ کہ آشوریا اور بابل کے مغرور پجاریوں کے اقتدار سے نجات حاصل کریں۔ اُن کے حقوق خصوصی کی مخالفت کریں۔ محصولات کی معافی کا جو حق زمانۂ قدیم سے انھیں حاصل ہے۔ اُسے ماننے سے انکار کر دیں۔ اور مندروں کی اراضی پر قبضہ کر لیں۔ تو اس جد و جہد میں آخر کار انھیں زک ہی اُٹھانی پڑی۔ تا آنکہ آشوری سلطنت کو سب نے مردود و متروک قرار دے دیا۔ اور وہ اقوامِ عالم کی لعنتوں کی بوچھاڑ میں تبدیلیوں کے ہاتھوں مغلوب ہو گئی۔ یہاں تک کہ ایک دوسرے زمانے میں جب یونان کا زینوفون حیرت و استعجاب کے عالم میں نینوا کے کھنڈروں میں سے گزر رہا تھا۔ تو اس کے رہبر اُن مقامات کے نام بتلانے سے بھی قاصر رہے تھے۔

علاقہ جتنا وسیع ہوتا جاتا ہے مطلق العنان قوت و اقتدار کی نوعیت اُسی قدر وسیع ہوتی جاتی ہے پٹیسی (یعنی دیوتا کے نائب) کی قدیم مذہبی حکمرانی بڑی بے پناہ تھی۔ مرعوب اور بے بس عوام کی زندگیاں اس کے رحم پر موقوف تھیں۔ لیکن جب اُس کی حکومت زیادہ وسیع علاقوں پر پھیل گئی۔ تو اُور بھی زیادہ فوق الانسانی حیثیت اختیار کر گئی۔ چنانچہ بابل اور ممفس کے بادشاہ جب کبھی کوئی عالیشان مندر یا "ہرم" تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ اپنی قلمرو کے ہر حصّے سے لاکھوں انسانوں کو بآسانی جمع کر لیتے تھے

ایک ناگوار سا اعتراف کرنا ضروری ہے۔ واقعات کے یہ ناگزیر سلسلے۔ مشرقی سرزمینوں کی بڑی بڑی سلطنتوں کی مطلق العنانی۔ انسانی گلّوں کی کامل مغلوبی و محکومی۔ وہ خاموش مظلومی جو غلاموں کے قلوب کے اندر جاگزیں ہو چکی تھی۔ خدائی طاقت کے سامنے ذہنی تسلیم و رضا۔ خوف۔ رضا مندی۔ جاں نثاری اور ذلت۔ دریائی سرزمینوں کی وہ تقدیر جو مشرق کا ایک مہیب راز تھی۔ یہ سب چیزیں تہذیب و تمدن کی ناگزیر بنیاد تھیں۔ اگر یہ نہ ہوتیں تو یونان بلکہ یورپ کا وجود بھی ناممکن تھا۔ میں نے اس کو "ناگوار سا اعتراف" اس لئے کہا ہے۔ کہ کاش ہم فخریہ یہ کہنے کے قابل ہوتے۔ کہ تہذیب انسانی کی بنیاد آزادی پر ہے۔ جس کو ظلم و جبر اور غلامی سے کوئی واسطہ نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے۔ کہ جب تک انسانوں نے وہ عظیم الشان محل اور مندر نہیں دیکھے۔ جو ہزارہا انسانوں کے آنسوؤں اور خون کے قطرات سے تعمیر ہوئے تھے۔ انھیں اپنے لئے اچھے مکانات بنانے کا خیال نہ آیا تھا۔ جب تک اُنھوں نے بڑے بڑے حاکموں اور بادشاہوں کی دولت مندی اور اُن کی عیش و عشرت کو نہ دیکھا تھا۔ اُنھیں خود آرام و آسائش کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی سوجھی ہی نہ تھی۔ جب تک اُنھوں نے یہ نہیں دیکھا۔ کہ غلام انسانوں نے اپنے کا۔ فریادوں کی چابکوں کے ماتحت نہریں کھود دی ہیں۔ اور

مصنوعی جھیلیں تیار کی ہیں - دریاؤں کے کناروں کو خوشنما بنایا ہے - اور پہاڑوں سے پتھر ڈھوتے ہیں - انھیں قدرت کی طاقتوں پر قابو پانے کا کبھی خیال نہ آیا تھا - اور جب تک مفت خورے پجاریوں نے فرصت سے فائدہ اُٹھا کر تہذیب و ثقافت پیدا نہیں کی - لوگوں کو سائنسی دریافتوں - ذہن کی قوتوں علم کی عظمت و قدرت اور دماغی کارناموں کی شوکت کا احساس بھی نہ ہوا تھا - جس وقت سمیر اور بابل اور مصر کے پجاریوں اور پروہتوں نے مادی عضوی جد وجہد سے پہلی دفعہ آزادی حاصل کی - تو انھوں نے ملک کے ذرائع و وسائل اور بیگاری مزدوروں کی لاانتہا افراط پر جو اُن کے احکام کی تعمیل کے لیے ہر دم حاضر تھی - قابو پاکر غور و فکر - اور ایجاد و اختراع کے مشاغل اختیار کئے - تعمیری اور تصویری فنون و صنائع کو رواج دیا - لوگوں کو سنگتراشی - دھاتوں کی کوفت گری - ظروف سازی - کاشی کاری - شیشہ سازی - اعلیٰ درجے کے پارچات کی بافت اور انھیں خوشنما رنگوں میں رنگنے کے فنون سکھائے - اُنھوں نے ریاضیاتی اور میکانکی علوم کی بنیاد رکھی - زمین کی مساحت کی - سال کو مہینوں اور دنوں میں تقسیم کیا - آسمانوں کے نقشے تیار کئے - دائرۂ بروج میں آفتاب اور ستاروں کی گردش کا سراغ لگایا - اُنھوں نے فنِ تحریر ایجاد کیا - علم اور تجربے کے بڑے بڑے ذخائر کو بے شمار مٹی کی تختیوں اور بھوج پتر (پیپیرس) کی لپٹی ہوئی پٹیوں پر محفوظ کیا - قوانین وضع کئے - اور ہر قسم کی تہذیب و ثقافت کی بنیادیں استوار کیں -

تہذیب و ثقافت کے یہ پہلے ہیجانات ہر شیفتہ انسانیت کے نزدیک شاندار اور واجب الاحترام ہیں - لیکن جس سرعت کے ساتھ یہ وحشت و بربریت کی حالت سے معرضِ ظہور میں آئے - اس سے بھی زیادہ عجیب بات ایک اور ہے - وہ اپنے عہدِ طفولیت ہی سے ایک پوشیدہ مرض میں مبتلا تھے وہ ایک قدیم و بعید زمانے میں حیرت انگیز سرعت کے ساتھ برپا ہوئے - اور

اُن کا یہ ظہور روشنی اور امید سے مالا مال تھا لیکن اس کے فوراً بعد ہی اُن پر کسی افسون کا طلسم غالب آ گیا۔ ان کی نشو و نما رک گئی۔ اُن کا تخلیقی جذبہ سرد پڑ گیا۔ وہ مفلوج ہو گئے۔ اور اُن پر سکون و جمود طاری ہو گیا۔ وہ مُردہ نہیں ہوئے۔ بلکہ کئی صدیوں تک برابر زندہ رہے۔ لیکن اُن کی زندگی سحر زدہ۔ ہیبت ناک اور پُر اسرار رہی۔ وہ سکتہ کی حالت میں رہے۔ اُن میں کوئی تغیر پیدا نہ ہوا۔ جیسے وہ کسی بد دُعا کا شکار ہو گئے ہوں۔

بابل کی داخلی اور دیسی ثقافت کے بہترین نتائج و ثمرات (سوائے اُن کے جن کو کسی آشور بنی پال کی قوت نے تمول کی وجہ سے پیدا کیا) اس وقت معرض ظہور میں آئے۔ جب حمورابی کی اولیں بابلی سلطنت کا ابتدائی زمانہ بھی سامنے نہ آیا تھا" بابل کے فنون کا بہترین زمانہ بابل کی بادشاہت تمام ہونے سے صدیوں پیشتر گزر چکا تھا"[۵۱] اس میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا بابل کی سائنس جس نے دُنیا بھر کی سائنس کے لئے جز تومۂ حیات مہیا کیا سُمیر کی شہری سلطنتوں کے قدیم اور ابتدائی زمانے میں جس قدر ترقی کر چکی تھی۔ "تقریباً چار ہزار سال بعد بھی وہیں کی وہیں تھی۔ جہاں یونانیوں نے اُس کے دستر خوان سے ریزہ چینی کی تھی۔ Berossus نے اپنی قدیم داستان میں لکھا ہے۔ کہ Omnes (مچھلی دیوی) نے جو بحیرۂ عرب سے نکلی تھی۔ لوگوں کو وہ تمام چیزیں سکھائیں۔ جو تہذیب و تمدن کے لازمی اجزا تھیں۔ اور اس کے بعد کوئی نئی چیز ایجاد نہیں ہو سکی"

مصر کی تنہائی اور علیحدگی میں بھی یہ منظر نہایت تعجب انگیز معلوم ہوتا ہے "ثقافت نے جتنی ترقی خاندان چہارم کے آہرام سازوں کے ماتحت کی۔ اس کے مقابلے میں وہ ترقی ہیچ ہے۔ جو اس خاندان کے بعد چھبیس خاندانوں نے ساڑھے تین ہزار سال میں پیدا کی۔ نہ بدیق فرعون آخناتون کے ماتحت

---

۵۱ L. W. King: Sumer & Akkad صفحہ ۸۳

نشوونما تھا کی جو مختصر آزادی نصیب ہوئی۔ اور جس ثقافتی ربط و ضبط نے بارھویں خاندان کے ماتحت بنی حسّان اور اس زمانے کے زیورات اور بھونسے (ایک مصری زیور) پیدا کئے۔ اس کے نتائج بھی قدیم سلطنت کے فنون لطیفہ کی نزاکت و نفاست کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ سلطنت تھیبس کی تہذیب اپنے اوج کمال پر سب سے انتہا ثروتمند اور نہایت وسیع وسائل کی مالک تھی۔ لیکن اس کے باوجود سلطنت ممفس کی اس تہذیب سے بے حد گھٹیا تھی۔ جو دو ہزار سال قبل گزر چکی تھی۔ مثال کے طور پر شہزادی نیفرت یا شیخ البلاد کے مجسمے کا مقابلہ رعمسیس کے مجسمے سے کرو۔ جو الاقصر میں موجود ہے۔ ہرم کبیر میں شہنشاہ کا ایوان دیکھو جس کے پتھر عظیم سلیں کسی سیمنٹ کے بغیر اس طرح پیوست ہیں۔ کہ ان کے جوڑوں میں چاقو کا پھل داخل کرنا ناممکن ہے (فلنڈرز پیٹری کے قول کے مطابق اس معماری کا مقابلہ صرف گھڑی ساز کی کاریگری ہی سے کیا جا سکتا ہے) اس کا مقابلہ کرناک کی اس بھونڈی اور بھدی عمارت سے کرو جس کے بارہ دو ستون استرکاری کے کسی مسالے سے استوار کئے گئے ہیں۔ اگر تھیبس کے فنکار ممفس کے کاریگروں کی حقیقت پسندی کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور خود بھی آج عجیب طریقے سے اشکال کھینچتے ہیں جن میں دھڑ اور آنکھیں سامنے نظر آتی ہیں۔ اور ہاتھ پاؤں اور سر یکرخی ہیئت میں ہیں۔ تو اس کا مطلب یہ نہیں۔ کہ وہ زیادہ ہنر علم نہیں رکھتے۔ یا اناڑی اور پھوہڑ ہیں۔ بلکہ بات اصل میں یہ ہے۔ کہ روایت مقدس ہونے کی وجہ سے توڑی نہیں جا سکتی۔ حالانکہ جس فن کار نے ایبی دوس کے مقام پر سیتی کے مندر کو اور تھیبس میں اس کے مقبرے کو آراستہ کیا ہے۔ وہ نہایت باکمال نقشہ نویس معلوم ہوتا ہے۔

ہمیں انجنیئری اور میکانکیات میں جو کمال حاصل ہے۔ وہ مصر کے

فنون کا ورثہ ہے۔ لیکن مصری فلاحین اور کُردی کسان زمانۂ قدیم سے زمین میں وُہی پرانا چوبی ہل چلا رہے ہیں۔ دریائے نیل کی فضا میں اُسی شادوف (ڈھینکلی) اور اُسی ساقیہ (رہٹ) کی چیں چیں سُنائی دیتی ہے۔ جو آج سے پانچ ہزار برس پیشتر موجود تھی۔ اور آج کل کا سیاح جب فوٹو لیتا ہے۔ تو وہی منعکس ہوتا ہے۔ جو سقارہ کے مصطبوں میں نظر آیا کرتا تھا۔ وادیٔ دجلہ کے کسان اب تک انھی پُرانی اور گول سی چمڑے کی کشتیوں میں بہاؤ کے رُخ چلے جاتے ہیں۔ جن میں صرف دو آدمیوں اور ایک گدھے کی گنجائش ہوتی ہے۔ اور پھر اسی چرمی کشتی کو تہ کر کے گدھے کی پیٹھ پر رکھ دیتے ہیں اور گھر واپس آجاتے ہیں۔ ہیروڈوٹس نے ان کاشتکاروں کو اسی صورت میں دیکھا تھا۔ اور یہ لوگ "تخلیق عالم" (کے مسلّمہ زمانے) سے بھی بہت پہلے اپنے اس شعار کے پابند تھے۔

"غیر متغیر مشرق"! "مشرقی ذہن"! یہ عارضہ کسی نسل سے مخصوص نہیں سُمیری۔ سامی۔ مصری۔ ایرانی۔ ہندوستانی آریہ۔ مغول۔ تاتاری سب کے سب یکساں طور پر اس عارضے کا شکار ہوئے ہیں۔ تمام وہ تہذیبیں جنھوں نے ایشیائی دریاؤں کی کیچڑ سے جنم لیا ہے۔ اور جن کو اناج کے "مُہلک عطیے" اور دریائی دیوتاؤں نے پالا ہے۔ ان کی قسمت میں یہی انجام لکھا ہے۔ ان تمام ملکوں میں تہذیب و ثقافت اُس غلبہ و اقتدار کا نتیجہ ہے۔ جو قدرت نے اپنے غیر متبرقبہ اور معجز نما عطیات کی وجہ سے اُن عطایا کے مقدس امینوں اور حاملوں کو عطا کیا۔ اور اُن سے جو نظام ہائے فکر پیدا ہوئے۔ اُن سے قطعی ذہنی غلبہ بھی قائم ہوا۔ مشرق کے "غیر متغیر" ہونے کی وجہ صرف یہ ہے۔ کہ وہاں جو کچھ بھی ہے۔ مقدس ہے۔ لہٰذا اس کو چھونا بھی بے ادبی اور کفر کا مترادف ہے۔

کلدانی تہذیب ہماری معلومات کے مطابق قدیم ترین تہذیب ہے

یہ مشرق کے تمام ثقافتی پہلوؤں کے نشو و ارتقا کا صرف ایک نمونہ ہی نہیں بلکہ وہ نقطۂ ماسکہ بھی ہے جس سے اس نمونے نے دنیائے مشرق پر غلبہ حاصل کیا۔ سُمیر کی شہری سلطنتوں کی ثقافت ہی بابل اور آشوریا کی ثقافت بن گئی۔ یہ امر ابھی موضوع بحث ہے کہ اس نے مصری ثقافت پر کس حد تک اثر ڈالا۔ اسیریا کی فوجی سلطنت نے اس کو شام اور ایشیائے کوچک کی گوناگوں آبادیوں کے طول و عرض میں پھیلا دیا۔ اس کے علاوہ یہ تہذیب فلسطینیوں اور فنیقیوں کی وساطت سے قبرص اور کریٹ میں اور بابل کے تاجروں کی معرفت کپاڈوشیا کی سطوح مرتفعہ اور ایران تک پہنچ گئی۔ اور جب انشان کے بادشاہ سائرس نے نینوا کے بعد ایرانی سلطنت قائم کی۔ تو یہ پہلی عالمگیر سلطنت چین اور ہندوستان کی حدود سے یونان تک پھیلی ہوتی تھی۔ اور دنیائے قدیم کی بہت بڑی سیاسی حقیقت تھی۔ اس کی ثقافت بابل کی تہذیب کا واضح تر اور جلی نمونہ تھی۔ ہندوستان کے ایرانی صوبیداروں نے جو سونے کے بُرادے کی شکل میں اتنی دولت بھیجتے تھے۔ جو اکبتانہ کے خزانے کی موجودات کا ایک تہائی حصہ تھی۔ اور جن کے تیر انداز پلاطیہ میں مصروف جنگ بھی ہوتے تھے۔ ایران کی بابلی تہذیب کو بالائی گنگا کے مگدھ دیش میں رائج کر دیا۔ اور جب سکندر اعظم کے حملے کے بعد چندر گپت نے نندا راجاؤں کو شکست دی۔ تو موریا کی پہلی عظیم ہندوستانی سلطنت جو اشوک کے عہد میں اوج کمال کو پہنچی۔ ایرانی تہذیب ہی کے سانچے میں ڈھالی گئی تھی۔ اور اس کا پایۂ تخت پاٹلی پتر (آج کل کا پٹنہ) بالکل پرسی پولس کی ایک نقل تھا۔

کلدانی ثقافت کے بعض حاصلات میں یہودیوں کی کتاب مقدس بھی تھی جس کے اشعار اور ضمنیات کو سائرس کے رہا کردہ قیدی بابل سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ اور اس کے ساتھ کلدانیوں کا گہرا مذہبی جوش بھی تھا۔

ہمیں یقین ہے۔ کہ سرزمین شینار کی واجب الاحترام بنیادی ثقافت کے قدیم فکر میں بنی اسرائیل کے قبائل کے ہاتھوں جو بلند ترقیات ہوئیں۔ وہ بنیادی طور پر ایرانی تصورات ہی کے رفعت آموز اثرات کا نتیجہ تھیں۔ اور اُن اسباب کی شرمندۂ احسان نہ تھیں۔ جو پروفیسر فالٹا واگریشیا نے تجویز کئے ہیں۔ پروفیسر مذکور کا یہ خیال بالکل لغو ہے۔ کہ :-

"نرم مزاج کلدانیوں میں یہ رواج تھا۔ کہ ہر قبائلی دیوتا اپنے ہمسایہ قبائل کے دیوتاؤں کی تکریم کرتا تھا۔ نئے مندروں کے افتتاح کے موقع پر اُن کو دعوت دیتا تھا۔ اور اُنھیں بغلی مندر تک دیا کر دیتا تھا۔ لیکن اسرائیلی بدویوں کی یہ کیفیت تھی کہ جب اُن کی قائم کی ہوئی چھوٹی سی نمائشی سلطنت ختم ہوگئی۔ تو وہ اپنے مجروح پندار اور غیظ و غضب کی وجہ سے دیوانے ہو گئے۔ اور اُنھوں نے اپنے انبیا سے یہ اعلان کرا دیا۔ کہ یہوا کے سوا اور کسی خدا کی پرستش نہیں کرنی چاہئے۔ اس کے بعد اُنھیں اندیشہ تھا۔ کہ شاید ہمسائے غصے میں آکر یہوا کا مجسمہ اُٹھا کر لے جائیں گے۔ چنانچہ اُنھوں نے سات سینگوں والے مجسمے اور دوسرے مقدس پتھروں کو اپنے معبدوں سے خارج کر دیا۔ اور فیصلہ کر دیا۔ کہ ہر قسم کے تصویری و تجسیمی فنون ناجائز ہیں۔ یہی وجہ تھی۔ کہ یہودیہ کے شعرا و انبیا نے وہ نفرت آموز گیت گائے۔ جو دشنام و بدگوئی کے عین الکمال کو پہنچ گئے۔ اور اس مصیبت زدہ دنیا میں عدم رواداری کا دور دورہ ہو گیا۔"

ہمارے نزدیک فاضل پروفیسر اس تحریر میں خود بھی غلط فہمی کے اس "عین الکمال" کو پہنچ گئے ہیں۔ جسے کسی اعتبار سے حق بجانب قرار نہیں دیا جا سکتا۔

قدیم بابل نے مشرقی ذہن اور مشرقی دُنیا کا ایک مستقل سانچا ہمیشہ کے لئے تیار کر دیا تھا۔ اور وہ سانچا یہ تھا۔ کہ حکومت مذہبی ہو۔ پجاری اور پروہت کا ذہنی اقتدار قطعی طور پر مُسلّم ہو۔ کیونکہ وہ دیوتا کا نمایندہ۔ اور ساحر و کاہن ہے حکمرانی اور قوت کی تمام شکلیں اسی ابتدائی نمونے کے مطابق وضع کی جائیں۔

مشرق میں مذہبی حکومت ذہنی اعتبار سے جابرانہ یا متشدد انہ کبھی نہیں ہوئی۔ نہیں اس میں وہ ظلمت پسندی۔ رجعت پرستی۔ فکری استبداد اور ذہنی بغاوت کے خلاف دائمی جنگ کہیں نظر نہیں آتی۔ جو یورپی دُنیا کی عام خصوصیت ہے۔ اور جس کی پُشت پر یونان و روما ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے۔ کہ ذہنی بغاوت کبھی ہوئی ہی نہیں۔ صحیح ذہنی ہیجان کبھی رونما ہی نہیں ہوا۔ کیونکہ مذہبی "قوتِ فکر" کی پُرانی عادت پورے نظام کی گہرائی میں جڑ پکڑ چکی تھی۔ مشرق میں صرف ان تغیرات اور ان دماغی کشمکشوں کا وجود پایا جاتا ہے۔ جو "مذہبی تغیرات" سے تعلق رکھتی ہیں۔ گویا یہاں مذہبی فکر کی جگہ صرف "مذہبی فکر" ہی لے سکتا ہے۔ یونان میں ذہنی بیداری پیدا ہوئی اُس زمانے کے مذہبی خیالات پر تنقید کی گئی۔ اور اس تنقید نے ایسے "فلسفہ ہائے فکر" کی صورت اختیار کی۔ جو خالص غیر مذہبی اور ذہنی تھے۔ اس کے برعکس مشرق میں مروّجہ مذاہب کی تنقید نے (خواہ وہ کتنی ہی ذہنی اور دماغی حیثیت رکھتی ہو) ہمیشہ "نئے مذاہب" کی شکل اختیار کر لی ہے۔

جب زردشت نے قدیم مُغوں کے مذہب پر تنقید کی۔ تو زردشتیت پیدا ہو گئی۔ گوتم اور مہابیر نے برہمنیت کے خلاف انتقاد کا علم بلند کیا۔ تو بُدھ مت اور جین مت وجود میں آ گئے۔ لاؤ زو نے خالص غیر مذہبی خیالات ظاہر کئے۔ لیکن وہ "تاؤ مذہب" بن گئے۔ یہاں تک کہ قطعی طور پر غیر روحانی اور خالص اخلاقی خیالات جن کی تبلیغ "کانفوزسے" نے کی۔ وہ بھی کنفیوشنزم قرار پا گئے۔

مشرقی ذہن خالص غیر مذہبی ۔ صریح وواضح اور مستقل فکر کے ناقابل ہے ۔ اس کی زبانیں بھی موزوں اور صحیح فکر کے اظہار کی قابلیت نہیں رکھتیں ان میں ذہنی حقائق کے لئے اصطلاحات ہی موجود نہیں ۔ بلکہ وہ ہمیشہ مادّی تصورات ہی سے ظاہر کئے جاتے ہیں ۔ مشرقی کے نزدیک یونانی شاعری ناقابل فہم طور پر جامد ہے ۔ کیونکہ وہاں ذہن کے حرکات وحالات کا اظہار (سلسلۂ استعارات کے بجائے) الفاظ سے کیا جاتا ہے ۔ مشرقی تقلیب کا استعمال نہیں جانتے ۔ بلکہ جس چیز پر زور دینا مقصود ہو ۔ اُس کو بین دفعہ دُہراتے ہیں ۔ ان کے پاس علم نحو نہیں ۔ افکار وخیالات کے درمیان مختلف تعلقات وروابط کے اظہار کا کوئی ذریعہ نہیں ۔ دعاوی وتضایا بالکل تسبیح کے دانوں کی طرح منسلک کر دیئے جاتے ہیں ۔ اور ان کے درمیان صرف ایک عطف ۔ اور، اور، اور ۔ تا دمِ آخر چلا جاتا ہے ۔ ذہنِ انسانی کو اپنے موجودہ مقام اور آیندہ تقدیر کے بلند تر مسائل پر عقلی فکر کا اطلاق کرنے سے پہلے اس قسم کی دماغی ترکیب کی بیڑیاں کاٹنی پڑی ہیں ۔ یہ دماغی ترکیب اور یہ ناقابلیت مشرقی ثقافت کی مرکزی حقیقت ہے ، دراس ثقافت کے طریق ولادت کی ناگزیر پیداوار ہے ۔ یہ ثقافت اس صورت حال کا نتیجہ ہے ۔ کہ ایک قلیل التعداد طبقہ اپنی قوت کی مذہبی پشت پناہی کے طفیل سے غیر محدود غلبہ واقتدار اور بیشمار فرصت کا مالک بن گیا ۔ اور اُس نے ہمیشہ لاکھوں انسانوں کو ذہنی اعتبار سے اپنا محکوم ومغلوب بنائے رکھا ۔ چونکہ حکمران پُجاریوں کا طبقہ مادّی کشمکشوں سے بالاتر تھا ۔ لہٰذا اُنھوں نے عقل وفکر کی عمارت عوام کی سطح سے بہت اونچی بنالی لیکن جونہی وہ اس عمارت میں متمکن ہو گئے ۔ اُنھوں نے اس عمارت کو متبرک قرار دیا ۔ اور مزے سے پڑ کے سو گئے ۔ جو ذہنی دنیا اُنھوں نے پیدا کی تھی ۔ وہ اُن کے مرتبہ ومقام کے مقابلے میں قطعی طور پر مغلوب ہو چکی تھی ۔ اُن کی قوت ۔ اُن کی ثروت ۔ اُن کی

فرصت اور ذہنی کامیابیوں کے مواقع بلکہ اُن کی زندگی اور ہستی کا انحصار اُس تقدس پر (جو اس ذہنی دُنیا سے وابستہ تھا) اور قائم شدہ ضوابط و روایات اور اس کی خدائی اور متبرک نوعیت کے روحانی نفوذ پہ تھا۔ یہ زندہ دل پجاری نہ بدنیت تھے۔ نہ غبی الذہن واقع ہوئے تھے۔ بلکہ اپنے زمانے کے نہایت قابل تعریف اور دل فریب انسان تھے۔ انھیں اپنے مقصدِ زندگی کے تقدس اور اس کی قدر و قیمت کا نہایت گہرا احساس تھا۔ وہ سمجھتے تھے اور صحیح سمجھتے تھے کہ وہ نوعِ انسانی کے تہذیب آموز معلم ہیں۔ وہ اپنے ذہنی اور دماغی مشاغل میں مخلصانہ سرگرمی سے مصروف رہتے تھے۔ اپنے مندروں کے بلند برجوں میں بیٹھ کر افلاک کا مطالعہ کرتے تھے۔ اور زراعت اماضی کی درستی اور آبپاشی کے کاموں میں مدد دیا کرتے تھے۔ مزید براں ذمہ داری اور اخلاقی فرض کے احساس نے اُن کو عام سطح سے بلند کر رکھا تھا۔ وہ حقیقت میں عوام کی رفاہ کے خواہاں تھے۔ انھوں نے جو مفصل اور جامع قوانین وضع کئے ہیں۔ اُن سے بالکل واضح ہے۔ کہ وہ راستبازی پھیلانے کے بے حد خواہشمند تھے۔ آج کل کا کوئی عیسائی پادری یا مبلغ اپنے وظائف کے بلند نصب العین اور بلند اخلاقی جد و جہد کا اتنا احساس نہیں رکھتا جس سے بابل کے پجاری (پیٹیسی) مالا مال تھے۔

لیکن اس کے باوجود یہ تمام مساعی اور خواہشات (دانستہ طور پر) نہایت مہلک حد تک غلط اور مفلوج تھیں۔ فکر کی تمام تر حرکت اور مفکر کا تمام تر شغف صرف ایک روایت کی حفاظت کے لئے وقف تھا۔ اور علم و دانش کا جتنا ذخیرہ وہ لوگ فراہم کرتے تھے۔ وہ صرف اسی روایت اور رواج کی خدمت پر صرف کیا جاتا تھا۔ اُن کا بہترین فکر ان حالات کے دباؤ کے تحت محدود۔ بدنما اور افسردہ و نیم مُردہ ہو جاتا تھا۔ اُن کی سائینس جادو اور اُن کا علم ہیئت "جوتش" بن جاتا تھا۔ اُن کا فن روایت پرستی کے بوجھ تلے دبا

ہوا تھا۔ اُن کے ذہن کے تمام تر حاصلات و نتائج مشرق کے وہمی و خیالی استعاروں اور بے ہنگم اور بدشکل خوابوں کے جال میں بُری طرح گرفتار تھے۔ اور بے تکے ضمنیاتی اوہام سے متاثر تھے۔ اُن کی اخلاقی خواہشات صرف ایک ایسی دُنیا کو جنم دیتی تھیں جس میں صرف ایک ہی رابطہ نمایاں ہوتا تھا۔ اور وہ آقا و غلام کا باہمی رابطہ تھا۔ اُن کی فوق الانسانی دُنیا میں بھی اسی رابطہ کا دور دورہ تھا۔ ان کی تمام کامیابیوں میں فلسفہ صحیح کی ایک کرن بھی ایسی نظر نہیں آتی۔ جو ہمارے قلوب کو متاثر کر سکے۔ اور ہم ایک لمحے کے لئے زمان و مکان کے وقفے اور مشرق و مغرب کے فرق کو بھول کر اس کی قدر کر سکیں۔ یہ سُوکھی سکڑی اور کچی سی دُنیا صدیوں تک بھی حنوط شدہ زندگی بسر کرتی رہی۔ اور اس پر ایک "قسم کی سال خوردہ طفولیت" کا عالم طاری رہا جس میں نشوونما کی قابلیت کبھی پیدا ہو ہی نہ سکتی تھی۔

دوسرا باب

یونانیوں کی مخلصی

ایک زمانہ ایسا آیا۔ کہ مشرقی ثقافت کے عجیب و غریب اور کہنہ و فرسودہ ثمرات جو بہت سی مختلف آبادیوں میں پھیل کر جاگزیں ہو چکے تھے۔ بحری قزاقوں کے بعض نہایت فعال اور طبّاع قبیلوں تک پہنچ گئے۔ یہ لوگ غلاموں اور مذہبی حکمرانوں کی بڑی بڑی سلطنتوں کے طور پر منظم نہ تھے۔ بلکہ چھوٹے چھوٹے قبیلوں کی شکل میں بعض جزیروں اور چٹانی ساحلوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اور ہر فرد پورے قبیلے کے تفکرات۔ فتوحات اور خطرات میں کمتر یا بیشتر حد تک حصہ لینے کا ذمہ دار تھا۔ لہذا وہ روایاتی طور طریقوں کے تقدّس کی ضرورت پر مکلّف نہ تھے۔ یہاں سے یونانی فکر نمودار ہوا۔ اور دنیائے جدید کی بنیادیں استوار ہوئیں۔

اس دنیائے مشرق کے درمیان جو سکتہ زدہ تھی۔ خیالی پلاؤ پکانے کی عادی تھی۔ بیک وقت طفولیت اور کہنہ سالی کا شکار تھی۔ اور جو مغربی ذہن سے قطعاً اجنبی اور بیگانہ رہنے پر مجبور تھی۔ یونان اپنی دیوی اثینہ (Athene) کی مانند زرہ بکتر پہنے ہوئے ایک نوجوان کی طرح اٹھا۔ اور کسی عبوری دور کے بغیر اس نے ہمیں گویا جادو کے زور سے عہد حاضر کی فضا میں پہنچا دیا۔
ایک زمانہ دھندلی سی داستانوں کا زمانہ تھا۔ اور دوسرا ایتھنز کی بلند ترین

ذہنی شان و شوکت کا عہد تھا۔ اور ان دونوں کے درمیان صرف دو صدیوں کا فاصلہ تھا۔ گو درحقیقت یونان کے نشو و ارتقا کا عمل خاموشی کے ساتھ کوئی آٹھ صدیوں سے جاری تھا۔

ہم مصر۔ اسیریا۔ بابل۔ ایران اور یہودیہ سے ہوتے ہوئے یونان تک پہنچتے ہیں۔ تو گویا ایک ایسی دُنیا میں داخل ہو جاتے ہیں (جو حقیقت میں اُن دس صدیوں سے زیادہ قریب ہے۔ جو یونان کے زوال اور یورپ کی حیاتِ تازہ کے درمیان حائل ہیں) جو مغربی اور جدید ہے یعنی اُن موضوعات و مسائل۔ رجحانات۔ مباحث اور تنقیدات سے معمور ہے جن میں ہمارا فکر مصروفِ کار ہے۔ اس کی وجہ صرف یہی نہیں۔ کہ ہمارا ذہنی و دماغی ورثہ یونانی ہے۔ اور ہم اس کی فضا میں بے تکلف ہیں۔ اس کی وجہ یہ بھی نہیں۔ کہ ہمارے افکار و تصورات کی ساخت۔ ہمارے اسالیب اظہار اور ہماری ادبیات کے اوضاع یونانی فکر کی پیداوار ہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ یونان بھی ہماری طرح اپنی زندگی کے لئے اس امر کا شرمندۂ احسان ہے۔ کہ اُس نے ذہن انسانی کو اُن ہتکڑیوں اور بیڑیوں سے خلاصی دلا دی۔ جو مشرق کی مذہبی حکومت نے اُسے پہنا رکھی تھیں حقیقت یہ ہے۔ کہ یورپ کی دُنیا کو یونان نے بنایا۔ یہ کہنا صحیح نہیں۔ کہ یونان نے یورپ کو مشرق کی مداخلت سے بچایا۔ یورپی دُنیا کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔ تہذیب کی صرف ایک ہی شکل تھی۔ اور وہ مشرقی تہذیب تھی۔ اور یونان کسی جغرافیائی ضابطہ کے ماتحت مشرق سے علیحدہ نہ تھا لیکن بالکل اُسی طرح مشرق کا ایک جزو تھا جس طرح قسطنطنیہ مشرق کا حصہ ہے۔ یونان نے یورپ کی حفاظت نہیں کی۔ بلکہ اس کو پیدا کیا ہے۔ یونان سے پہلے یورپ کا وجود نہ تھا۔ یونان نے اُس طلسم کو توڑا جس نے انسانی ارتقا کو سحر زدہ کر رکھا تھا۔ اور اس طرح یورپ کی تخلیق کی۔

جب ہم یونان کی تاریخ کی طرف توجہ مبذول کرتے ہیں۔ تو اس کا مقصد صرف یہی نہیں ہوتا۔ کہ ہم مشرق قریب کی بعض چھوٹی چھوٹی شہری سلطنتوں کی تاریخ کے متعلق تجسس و تحقیق کرنا چاہتے ہیں۔ بلکہ یہ تاریخ ارتقائے انسانی کے نہایت اہم انقلابی دور کی داستان ہے۔ یونان کی تاریخ صرف کتابِ تاریخ کا ایک باب ہی نہیں۔ بلکہ ارتقا کا ایک اہم موڑ ہے۔

ڈاکٹر میرٹ ایک خالص ماہر علم الانسان کی حیثیت سے لکھتے ہیں:۔

"صرف غور و فکر کی قوت سے رسوم کے طلسم کو توڑنا اور فطری ترقی کو ممکن بنانا صرف ایک ہی قوم کا ذہنی کارنامہ ہے۔ اور وہ قوم قدیم یونانی ہیں۔ اور یہ انتہا درجے کی غیر یقینی بات ہے۔ کہ اگر قدیم یونانی رہنمائی نہ کرتے۔ تو آج کوئی ترقی پذیر تہذیب وجود میں آ سکتی تھی" ۵۱

یونان کی مخلصی کو عام طور پر "معجزہ" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اور حقیقت میں یہ اتنا حیرت انگیز ہے۔ کہ بجائے خود نقد و نظر کے مستقل معموں میں شامل ہے۔ یونانیوں نے ارتقائے انسانی کی رفتار میں دو تین صدیوں کی سرگرمی سے نشو و نما کے سست رفتار عمل کے بجائے لمبی لمبی زقندیں بھری ہیں۔ اس قلیل مدت کے اندر یونان کی ذہنی قوت نے فکرِ انسانی کے تمام راستوں کو منور کر دیا۔ اس کے بعد ادب۔ فن۔ فلسفہ۔ تنقید۔ منطق اور سیاسیات میں تخلیق کا دور دورہ ہو گیا۔ گویا ذہن انسانی جس راستے پر بھی گامزن ہوا۔ اس کی ابتدا کا سراغ یونانیوں ہی کے فکر میں ملتا ہے۔

ہم علی العموم یہ کہہ کر قصہ مختصر کر دیتے ہیں۔ کہ یونانیوں کو حیرت انگیز قابلیت و استعداد ودیعت ہوئی تھی۔ چنانچہ پروفیسر بری (Bury) لکھتے ہیں۔ کہ "اس کردار و استعداد کو تو بہرحال بلا ثبوت ہی مان لینا چاہئے"

---

۵۱ Anthropology P. 185

آج کل یہ عام فیشن ہو گیا ہے۔ کہ اس امر کی تصریح کے وقت "آرین" اور شمالی نسلوں" کے خصائص پہ زور دیا جاتے۔ یہ امر تو تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ کہ یونانیوں کی استعداد ایسی تھی۔ اور ان ازمنہ میں جو یونانیوں کے فضائے تاریخ میں نمودار ہونے سے پہلے گزرے تھے۔ اُن کی ترقی کے حالات ایسے تھے۔ جنھوں نے ان کے ارتقائے مابعد میں بڑا حصّہ لیا۔ لیکن وہ ارتقا جن حالات و کیفیات میں واقع ہوا۔ وہ اُنہی حالات کا قطعی نتیجہ تھا۔

جس زمانے میں یونانی قبائل ایجیہ کے علاقے میں نمودار ہوئے۔ اُن پہ مشرقی ثقافت کے استفادے اور تشکیل کا راستہ صاف ہو چکا تھا۔ اگرچہ یورپی تہذیب کا وجود نہ تھا۔ مگر یورپ بہرحال غرّاتے ہوئے وحشیوں کی سرزمین بھی نہ تھا۔ آثار قدیمہ کی روز افزوں تحقیق سے یہ معلوم ہو چکا ہے۔ کہ یورپ مادی ثقافت میں اُتنا درجہ تو ضرور حاصل کر چکا تھا۔ جو بکھرے ہوئے قبائل اور چھوٹی چھوٹی قدیم بہ ادریوں کی صورت میں حاصل ہو سکتا تھا۔ فرانس ہسپانیہ اور اٹلی میں برنجی اشیا بنانے والے ماہر فن اور ظروف ساز مدت دراز سے موجود تھے۔ تجارت کی بڑی بڑی دریائی گزرگاہیں جو آج کل کے زمانے میں بھی موجود ہیں۔ اُن دنوں کھُل چکی تھیں۔ بحیرہ روم کے علاقوں کے تانبے۔ برنجی مصنوعات۔ اور مٹی کے برتنوں کا تبادلہ۔ برطانیہ کی قلعی اور بالٹک کے کہربا سے ہو رہا تھا۔ بحر ایجیہ کے علاقے میں بھی ان مصنوعات کی ترقی یافتہ صُورتیں نمودار ہو چکی تھیں۔ جہاز رانی کے شغف کے باعث اور کریٹ کے طاقتور حکمرانوں کے اُن دُور رس بیڑوں سے ربط ضبط رکھنے کی وجہ سے جو بحیرۂ روم کے ساحل پہ پہنچتے تھے۔ وہ درخشاں مادی ثقافت پیدا ہوئی۔ جس کے بھول بھلیاں والے محل۔ اُن محلوں کے عظیم الشان تخت گاہی ایوان شاندار زینے۔ بیلوں کی لڑائی کے اکھاڑے۔ اُن کی آسنرکاریاں سنگین خاتم کاریاں۔ دیواری تصویریں اور اُن میں جھالر دار فرغلوں والی خواتین اور

پُرداربَاس والے غلام چھوکرے ہمیں محوِ حیرت کر دیتے ہیں۔ ان ثقافتی مظاہر نے یونانی قبائل کے حیات افروز مستقبل کے لئے درمیانی منزل کا کام دیا۔ اور انھیں زیادہ اہم عناصر کے جذب کرنے کے قابل بنا دیا۔ اس انکشاف کے جوش میں ممکن ہے۔ کہ مِنووا کے ثقافتی اثرات کی اہمیت میں مبالغہ کیا جاتے۔ یہ ایک درباری ثقافت تھی جس نے طاقتور مطلق العنان بادشاہوں کی خوشنودی کی خاطر مشرقی تہذیب کے وسائل اور بحیرۂ روم کی مقامی صنعتوں سے استفادہ کیا تھا۔ اس ثقافت نے بحری قوت کی اہم ترین خصوصیت کے علاوہ بہت سی مادّی اور فنی نتائج ویزہ کو اور کسی قدر اپنی عیش پرستانہ لذتیت اور بے فکری اور بے پروائی کو بھی یونان کی طرف منتقل کیا لیکن Tyrrhenian ثقافت کی طرح جو اسی کی مانند معرضِ وجود میں آئی تھی۔ اور جس کے باقیات اثرہ دربا کی قوت و عظمت کے ساتھ ہی ختم ہو گئے تھے۔ اس میں نہ تو نئی ترقی کے کوئی عظیم داخلی عناصر موجود تھے۔ اور نہ کوئی ایسی بات تھی جس سے یونان کے امتیازی اوصاف و محاسن کا پتہ چل سکتا۔ یونان کو تاریخ انسانیت میں جو مقام حاصل ہے۔ وہ اس کی ظروف سازی اور آرائشی اسالیب کا ممنونِ احسان نہیں۔ مِنووا کی تہذیب ایسی خوبیاں منتقل ہی نہ کر سکتی تھی۔ جو خود اُس میں بھی موجود نہ تھیں۔

مِنووا کی تہذیب نے یونان کو جو سب سے بڑا عطیہ دیا۔ وہ اُس کے جہاز تھے۔ چونکہ یونان ایک ایسے بحری راستے پر واقع تھا جس میں بے شمار درمیانی منزلیں بھی موجود تھیں۔ اور جس نے اس مُلک کو ہر جانب سے موجودہ تہذیب کے ساتھ ربط ضبط پیدا کرنے کے قابل بنا دیا تھا لہٰذا یونان ایک بحری پیما مُلک بن گیا۔ اور اپنے قومی ہیرو "اوڈی سی ایس" - (Odysseus -) کی طرح "اُس نے بہت سی قوموں کے شہر دیکھے۔ اور اُن کے

خیالات معلوم کئے"۔ یونانیوں نے طائر اور سیدون سے تاجروں کے اختلاط اور مسابقت کی۔ انھوں نے لیڈیا اور سائیپنوپ کے بازاروں میں بابلی کاروانوں سے ملاقات کی۔ وہ تاجروں یا بھاڑے کے سپاہیوں کی حیثیت سے شام اور مصر گئے۔ انھوں نے بخت نصر کی فوجوں میں شامل ہوکر یوشلم کو تاخت و تاراج کیا۔ فراعنہ کی فوجوں میں لڑتے رہے۔ اور ابوسمبل کے سنگین ستونوں پہ اپنے نام کندہ کرآئے۔ پھر فریجیا۔ لیڈیا اور اسیریا کے لوگوں سے رلے۔ اور جب ایرانیوں کی قوت نے مشرق کی تمام پرانی تہذیبوں کو یکجا کیا۔ تو یونانیوں نے اس آفاق گیر حکومت کے ساتھ گہرے اور اکثر دوستانہ تعلقات قائم رکھے۔ انھوں نے دنیائے مشرق کی ہر ثقافت کو جذب کرلیا۔ یونان میں تاریخ کی جو پہلی کتاب لکھی گئی۔ وہ یونان کی تاریخ نہ تھی۔ بلکہ ان تمام "وحشیوں" کی داستان تھی۔ جو یونانیوں کے نزدیک نہایت دلچسپ تھے۔ اور بعد کے زمانے میں پلوٹارک نے ایک رسالہ لکھا جس میں ہیروڈوٹس کے خلاف غیظ و غضب کا اظہار کیا۔ اور لکھا کہ وہ "وحشیوں" کی حمایت میں اس حد تک بے شرم تھا۔ کہ ایسی حمایت کسی محبِ وطن کی شان کے شایاں نہیں۔

لیکن یونانیوں کو جتنے گوناگوں ثقافتی روابط حاصل ہوتے (وہ فینیقیوں اور منوا والوں کے روابط سے زیادہ نہ تھے) اگر وہ ان روابط کے بعد ایک نئی قسم کے مواد پہ کام نہ کرتے۔ تو شاید انھیں کچھ بھی فائدہ نہ پہنچتا۔ یونانی اس معاملے میں سب قوموں سے مختلف تھے۔ کہ وہ روایاتِ قدیمہ اور ہر قسم کے فوقی فکر سے کاملاً محفوظ رہے تھے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ ان کے ردعمل کی نوعیت بالکل انیا زی تھی۔ انھوں نے جو ثقافت اہل کریٹ یا اخیانیوں (Mycenaean) سے حاصل کی تھی۔ اس کا کوئی تقدس اور ان کی نظروں میں نہ تھا۔ اور ایرانیوں۔ فینیقیوں اور بابلیوں کے ساتھ اختلاط کی وجہ

سے انھیں جن نئی ثقافتوں سے سابقہ پڑا۔ اُن کے متعلق بھی یونانیوں کا رویّہ صرف تحقیق و تجسّس تک محدود تھا۔ تقدس و احترام کا کوئی سوال نہ تھا۔

جس زمانے میں یونانی ان اثرات سے متاثر ہونے لگے۔ وہ معاشرے کے اُسی قدیم اور قبائلی مرحلے میں تھے۔ جو ہر جگہ ایک ہی قسم کی ثقافت اور تنظیم کا سرمایہ دار ہوتا ہے۔ خواہ وہ جرمن قبائل ہوں یا امریکہ کے انڈین۔ وسط افریقہ کے باشندے ہوں یا پولی نیشیا کی قبائلی برادریاں ہوں۔ اس مرحلے کا تعلق نسل سے نہیں۔ بلکہ یہ صرف ثقافت کا مرحلہ ہے۔ جو بڑی بڑی مقررہ برادریوں اور زراعتی گروہوں کے قیام سے پہلے ہر قوم پر لازماً آیا ہی کرتا ہے۔ رابرٹسن اور گوئیٹے ([illegible]) جیسے پُرانے مصنّفین یہ دیکھ بے حد متعجب ہوتے تھے۔ کہ قدیم جرمنوں اور ریڈ انڈین قبیلوں کے معاشری احوال و کردار میں مشابہت پائی جاتی ہے۔ ان مصنّفین کے زمانے میں صرف یہی قبائلی قومیں باقی تھیں، بلکہ ایک شخص نے ایک کتاب لکھ کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی۔ کہ ریڈ انڈین حقیقت میں جرمن ہیں۔ اگر ہمیں جعلی کلاسیکیت کی خیرہ کُن روایات حائل نہ ہو جاتیں۔ تو شاید یہی مشابہت ہومر کے زمانے میں بھی نظر آجاتی۔ اور ایلیئڈ کی تصاویر کے متعلق یہ فتوے دے دیا جاتا۔ کہ وہ فینیمور کوپر کے ناولوں سے ماخوذ ہیں، Grote اور maine کا یہ خیال صحیح نہیں۔ کہ ان لوگوں کے خاندان اور قبائل" خاندانوں کے گروہ" تھے۔ بلکہ حقیقت میں وہ" خاندانی گروہ" تھے اور مادری رشتہ داری۔ گروہی ازدواج۔ ازدواج خارجی اور قبائلی اشتمالیت کی منزل اور پدری اقتدار کے درمیان عبوری دَور میں زندگی بسر کر رہے تھے بڑے بڑے محفوظ مفادات۔ طبقاتی حقوق و حکومت اور روایاتِ مُطلقیت سے وہ بالکل ناآشنا تھے۔ اُن کے سردار اُس زمانے میں اور بعد میں بھی "بادشاہ" نہیں سمجھے جاتے تھے۔ بلکہ وہ" جنگی سردار" تھے۔ اور پورے قبیلے

کی کونسلوں کے قدرتی اختیار و اقتدار کے ماتحت ہوتے تھے۔ ان کونسلوں میں عوام اختیار اور طاقت سے مرعوب ہو کر نہیں۔ بلکہ اپنے خطیبوں اور لیڈروں کی فصاحت سے متاثر ہو کر فیصلے کرتے تھے۔ اور اپنی منظوری یا نامنظوری کے اظہار کے لئے کبھی شور مچاتے تھے۔ کبھی نعرے لگاتے تھے۔ اور کبھی اپنے بھالے اپنی ڈھالوں پر کھڑکھڑاتے تھے۔ یونان کی تاریخ کے متعلق ہماری جتنی کتابیں ہیں۔ وہ صرف اس تصور کی وجہ سے ناقابل فہم ہو گئی ہیں۔ کہ یونان کی ابتدا "پادشاہوں" سے ہوئی تھی۔ حالانکہ اُن کے سرداروں کو جو قوت و اختیار حاصل تھا۔ وہ بالکل اُسی قسم کا تھا۔ جو بحری ڈاکوؤں کے سرداروں کو اپنے ساتھیوں کے اختیار تمیزی کی بنا پر حاصل ہوتا ہے۔ ہومر کی نظموں میں جو لفظ "basileus" آتا ہے۔ اُس کا مطلب "بادشاہ" نہیں بلکہ نواب یا شہزادہ ہے۔ ہر قبیلے میں بعض خاندان نوابوں کے خاندان سمجھے جاتے تھے۔ یہ اختیار روز بروز کم ہوتا چلا گیا basileus آہستہ آہستہ archon کہلانے لگے۔ "آرکون" پہلے دس سال کی مدت کے لئے منتخب کئے جاتے تھے۔ بعد میں اُن کا انتخاب سالانہ ہونے لگا۔ اور یہ ایک نہایت عجیب امتیازی خصوصیت ہے۔ کہ مشرق کی دریائی تہذیبوں میں تو پجاری کی اور یہ وہ ہت کی بالادستی بڑھتے بڑھتے مطلق العنان بادشاہ کے اقتدار خسروانہ تک پہنچ گئی۔ لیکن یونانی قبائل میں فوجی سردار شاہی شان و شوکت سے گر کر حقیر سا پجاری بن گیا۔ جسے دوسرا "آرکون" کہتے تھے۔ اور روما میں یہی "رئیس قربانی" کہلاتا تھا۔

یونان میں روح جمہوریت کے بجائے روح بادشاہی۔ درباری کورنش و آداب۔ رعب خسروانہ۔ شاہوں کے خدائی حق اور وفاداری و جاں نثاری کے جذبات کبھی رائج نہیں ہوئے۔ یونانیوں نے جمہوریت ایجاد نہیں کی (جیسا کہ ہمارے سکولوں کی تاریخوں میں لکھا ہے) بلکہ انھیں اس امر کی ضرورت

ہی محسوس نہیں ہوئی۔ کہ اپنی قبائلی جمہوریت کی اصلی حالت کو ترک کر دیں۔ اُن کا کارنامہ یہ ہے۔ کہ اُنھوں نے تہذیب کے دور میں بھی اپنی ابتدائی جمہوریت کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی۔ حالانکہ دولت و ثقافت کی افراط ہمیشہ طبقاتی مراعات اور غصب و استبداد کا موجب ہوا کرتی ہے۔

یونان میں خاص حقوق و مراعات اور ظلم و جبر کی حکومت قائم کرنے کی بے شمار کوششیں کی گئیں۔ Eupatrids "ظلم و استبداد" کا مدعی ہے۔ ابتدائی دور میں اور اکثر بعد میں بھی یونانی شہروں کی تاریخ اُن کشمکشوں سے بھری پڑی ہے۔ جو مختلف اقتدار خواہ طاقتوں کے خلاف برپا کی گئیں۔ اور غصب و جبر کی کوششوں کو ناکام بنایا گیا۔ لیکن انہی کشمکشوں سے اس امر کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ کہ قدیم اور ابتدائی روحِ مساوات مُردہ نہیں ہونے پائی تھی سولن کے آئین کی ضرورت ہی اس لئے داعی ہوئی تھی۔ کہ دولت مندوں کے برسرِ اقتدار آجانے سے حالات بے حد ہولناک ہو گئے تھے۔ ایتھنز کے تاجروں نے مشرقی تجارت سے بے اندازہ دولت فراہم کر لینے کے بعد تمام تر اراضی مزروعہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ اور کاشت کاروں کو رہن و گرو کی گرفت میں لے لیا تھا۔ لیکن قدیم جمہوریت کی قوت اس قدر مؤثر ثابت ہوئی۔ کہ تمام قرضے منسوخ کرنے پڑے (ذرا تصوّر کرو۔ کیا آج یہ ممکن ہے کہ سرمایہ اور محنت عہدِ حاضر میں کسی پریذیڈنٹ سولن کے آگے سرِ تسلیم خم کر دینے پر آمادہ ہو جائیں۔ اور سرمایہ چُپ چاپ بے دخل ہو جانا منظور کر لیں) یونانی قوم نے جن حالات کے ماتحت ترقی کی تھی۔ وہ اس کی اجازت ہی نہ دیتے تھے۔ کہ غصب و جبر کی کوشش زیادہ دیر تک کامیاب رہ سکے۔ حقیقت میں غصب کی پشت پر کسی روایت کی طاقت نہ تھی۔ وہ "خدائی" اور مقدس چیز نہ تھی۔ اُسے متبرک و محترم بننے کا کوئی وسیلہ کبھی حاصل نہ ہوا تھا۔ اسے تو اپنا کھیل اپنے ہی مخصوص جھنڈے تلے کھیلنا پڑا تھا۔ یونانی قبائل کو کبھی "اناج دیوتا" کے کسی نائب کے سامنے سرِ سجدہ

ہونے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ ہومر نے جن لوگوں کو "ظالم" بتایا ہے۔ وہ اتنے ہی ظالم تھے۔ جتنے Basileus اور آرکون "بادشاہ" تھے۔ انھوں نے انتظامی اور حکومتی اختیارات عوام کی تائید اور اسلحہ کی قوت سے چھین تو لئے تھے لیکن اُن میں سے کسی کو یہ جرأت نہ ہوئی تھی۔ کہ اصلی دستور کو بدل دے۔ اور اپنے آپ کو جائز حکمران اور بادشاہ قرار دے۔ Peisistratos نے سولن کے قوانین کو نافذ العمل کیا۔ بلکہ انھیں زیادہ فیاضانہ بھی بنا دیا۔ اُن غاصبوں کے پاس حصولِ قوت کا وسیلہ صرف یہی تھا۔ کہ عوام کی مرضی و خوشنودی حاصل کریں۔ یونانیوں نے وحشیانہ اشتمالیت سے لے کر تہذیب تک مراحل طے کئے۔ لیکن اپنی روایاتِ مساوات کو کبھی فراموش نہ کیا۔ ایتھنز کی ذہنی و دماغی نشو و نما کے کمال کے ساتھ ہی ساتھ خالص جمہوریت کی ایک ایسی شکل برابر قائم رہی۔ جو بے مثال تھی۔ اور غالباً ہمیشہ بے مثال رہے گی۔ Kleisthenean آئین میں جس "جمہوری عصبیت" کی شدت نظر آتی ہے۔ اُس کا مقصد یہی تھا۔ کہ کسی فرد یا طبقے کو غلبہ حاصل ہونے کا بعید سے بعید موقع بھی پیدا نہ ہونے پائے۔

یہ صحیح ہے کہ اس انتہائی جمہوریت کی عمارت غلامی کے سہارے کھڑی تھی۔ اور جب ایتھنز کی ملوکیت عین الکمال کو پہنچی ہوئی تھی۔ تو ایک ایک لاکھ شہریوں کے گرد تین لاکھ پینسٹھ ہزار غلام دست بستہ کھڑے رہتے تھے۔ لیکن ایک ایسے زمانے میں جب غلامی کا ادارہ عالمگیر حیثیت سے تسلیم کیا جاتا تھا۔ ایتھنز کے غلاموں کی حالت اس قدر قابل برداشت تھی کہ انھوں نے کبھی بغاوت کا عَلَم بلند نہ کیا تھا (سوائے چاندی کی کانوں کے۔ اور کانوں میں کام کرنے والوں کی حالت ہمیشہ ہی خراب رہتی تھی) زرعی غلام حقیقت میں غلام نہ تھا۔ بلکہ کاشتکار رہتا تھا۔ اور اُس کو حق حاصل تھا۔ کہ بٹائی کے ماتحت پیداوار کی ایک مقررہ شرح مالکِ اراضی کو دینے کے بعد باقی غلّہ

اپنی مرضی کے مطابق صرف کرے۔ صنعتی غلام اپنے مالک کی مدد کرتا تھا۔ اور مالک بھی اُس کے برابر ہی محنت مشقت کرتا تھا۔ اور ڈیماستھنیز کا یہ دعویٰ صحیح ہے۔ کہ ایتھنز کے غلاموں کو بہت سے دیگر ممالک کے مقابلے زیادہ آزادی حاصل ہے۔ لہٰذا ایتھنز کی ذہنی ترقی پر غلامی کبھی اثر انداز نہیں ہوئی۔ اور بقائے قوت کے سوال نے اس کو کبھی فکر مند نہ کیا تھا۔ غلامی کی وجہ سے فرصت اور بے شغلی بھی پیدا نہ ہوئی۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ پیریکلیس کے زمانے میں جیوری پر کام کرنے کے لئے شہری دستیاب نہ ہوتے تھے۔ کیونکہ وہ اپنے روزانہ ذریعہ معاش سے دست بردار نہ ہو سکتے تھے۔ چنانچہ پیریکلیس نے جیوری کے ممبروں کو معاوضہ ادا کرنے کی رسم کا آغاز کر دیا۔ درحقیقت ایتھنز کی صنعت و حرفت زیادہ تر غلاموں کے ہاتھوں میں نہیں۔ بلکہ آزاد مزدوروں کے سپرد تھی۔ جن کا کام ارزاں بھی تھا اور بہتر بھی۔ ایکروپولس کے مندروں کی عمارتوں میں غلام مزدور بالکل کام پر نہ لگائے جاتے تھے۔ اس میں شک نہیں۔ کہ غلامی نے یونانی ثقافت پر نہایت گہرا اور مضر اثر ڈالا۔ اور بالآخر یہی اُس کے زوال کا باعث ہوئی لیکن غلامی نے یونان یا روما میں معاشری اور سیاسی فکر کے انداز پر کبھی کوئی سنگین اثر نہیں ڈالا اور (مشرق کی مانند) اس فکر کو ظلم و جبر کے مفادات سے ہم آہنگ ہونے پر مجبور نہیں کیا۔ کیونکہ غلام بیرونی ملکوں سے درآمد کئے گئے تھے۔ اور عام معاشری نظام سے باہر گھٹتی بڑھتی آبادی تھے۔ نہ وہ مظلوم شہری تھے۔ نہ وہ ایسے لوگ تھے۔ جنھوں نے اپنے آپ کو غلام و محکوم بنالیا تھا۔ یونان میں ذہنی اور معاشری مسائل شہریوں کے درمیان پیدا ہوتے تھے۔ آقاؤں اور غلاموں کے درمیان اُن کا کوئی سوال نہ تھا۔

قدیم یونانیوں میں بھی دوسری قوموں کی طرح اپنے مذہبی رسوم و رسنایات اور عبادات و ضنمیات موجود تھے۔ اور بہت سے مشرقی عقائد و مسالک

بھی اُن میں لازماً رچ بس گئے تھے۔ لیکن نارس۔ جرمن اور لاطینی آبادیوں کی طرح یونانی قبائل میں بھی مذہب کی نوعیت اور انسانی زندگی میں اس کا مقام مشرق کے دریائی علاقوں کے مذاہب سے قطعاً مختلف تھا۔ اور یہ فرق و تفاوت اس کیفیت پر منحصر تھا۔ کہ مشرق میں مذہبی فکر کا پورا دائرہ پہلے ہی دن سے طبقاتی اختیارات و مراعات سے وابستہ تھا۔ یہ ایک ایسی دینی حکومت کا مذہب تھا جس کے اختیار و اقتدار کی بُنیاد مذہبی تصوّرات پر تھی۔ اور جس کی ثقافت صرف مذہب کے دائرے کے اندر حرکت کرتی تھی۔ یہ صورت دوسرے ملکوں میں کہیں بھی نہ تھی۔ مذہب جس معنی میں آج کل سمجھا جاتا ہے۔ وہ بالکل مشرق کی پیداوار ہے۔ یعنی مشرقیوں کا عقیدہ یہ ہے۔ کہ مذہب ہی حیاتِ انسانی کا پورا سرمایہ ہے۔ انسانی افکار و اعمال پر پوری طرح حاوی ہے۔ ہر دائرے میں اسی کا غلبہ و اقتدار ہے۔ اور دوسرے تمام خیالات و تصوّرات متروک و مردود ہیں۔ مذہب یہ ہمہ گیر اور ممتد صورت وہیں اختیار کر سکتا ہے۔ جہاں انسانوں کی زندگی زمین کی فوق الفطرت زرخیزی پر منحصر ہو۔ اور جہاں پجاری یعنی فوق الفطرت قوت کا نمائندہ انسانی ہستی کے ہر سرچشمے پر قابض و متسلط ہو۔ یونانیوں کے مذہبی رسوم و عقائد بھی دُوسری قوموں ہی کے مانند تھے جن کا زیادہ تر تعلق زمین کی زرخیزی۔ زراعت کے عملیات۔ تخم ریزی اور فصل کی فراہمی سے تھا لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہئے۔ کہ یونانی زراعتی قوم نہ تھے۔ تھسلی۔ بوشیا اور میسینیا کے سوا یونان بھر میں کہیں بھی اچھی اراضی مزروعہ موجود نہ تھی۔ اور ان اضلاع کی کیفیت یہ تھی۔ کہ تھسلی جادوگرنیوں کی سرزمین تھی۔ بوشیا کاہنوں کا علاقہ تھا۔ چنانچہ یہ اضلاع یونانی تہذیب کے زمانے میں بھی نہایت پس ماندہ رہے۔ Thucydides کا ایک اہم بیان یہ ہے۔ کہ اراضی کی زرخیزی بعض خاص افراد کو دولت مند بنا دیتی ہے۔ اور اس طرح افتراق پیدا ہوتا ہے۔ جو بالآخر تباہی کا سامان بن جاتا ہے" اس کے

برعکس ایتھنز" زمین کی ناداری کی وجہ سے" بڑا برفشو ونما کے راستے پہ گامزن رہا۔ یونانیوں کے نزدیک فوق الفطرت طاقتوں کا تذکرہ محض بعض امور کی تصریح و تعبیر کی کوشش تھی۔ اور یہ ایک ایسا طرز فکر تھا۔ جو عوامی ذہن ہی میں پیدا ہوتا تھا۔ اور جمہوری تھا۔ اُس کی پُشت پر کوئی محفوظ مفاد نہ تھے اور کوئی مقدس پروہت یا پجاری خود حفاظتی کی جبلتوں کی پوری قوت کے ساتھ اس کے تقدس کے تحفظ کے لئے پاسبانی پر مامور نہ تھا۔ شاعروں کو اس امر کی آزادی حاصل تھی۔ کہ روایاتِ قدیمہ کو نئے سانچوں میں ڈھالیں۔ اور عوامی ضمنیات کو جس طرح چاہیں۔ اپنے تخیل کا آلہ کار بنائیں۔ اخلاق اور مذہب کے درمیان کوئی ناگزیر تعلق تسلیم بھی نہ کیا جاتا تھا۔ دیوتاؤں کے لئے اور مُردوں کیلئے رسُوم و عوائد موجود تھے۔ لیکن جہاں تک زندوں کا تعلق تھا طبعی و قدرتی عدل کے تقاضوں کی رعایت کرنی پڑتی تھی۔ ظاہر ہے کہ کلدانی یا مصری مفکرین روحانی کے لئے یہ بالکل ناممکن تھا۔ کہ فطرت اور زندگی کے مسائل کو خالص غیر مذہبی نقطہ نگاہ سے دیکھیں۔ یہ سوال کریں۔ کہ دُنیا کس چیز کی بنی ہوئی ہے۔ آیا مادّہ کی کسی ایک قسم نے بہت سی شکلیں اختیار کر لی ہیں۔ یا چند ابتدائی مادّوں یا ذرّوں کے اجتماع سے یہ دُنیا پیدا ہوگئی ہے۔ دُنیا میں جو مسلسل تغیرات رونما ہو رہے ہیں۔ اُن کی اصل نوعیت کیا ہے۔ آیا یہ حقیقی ہیں۔ یا محض نظر ہی آتے ہیں۔ اس قسم کے تفکّرات (جو دیوتاؤں کے تسلط کے کسی ذکر سے قطعی طور پر آزاد ہوں) مذہبی حکومت کے کسی حامی کے ذہن میں بھی نہیں آسکتے۔ چہ جائے کہ وہ انھیں مفروضہ کی حیثیت سے پیش کر کے غور و بحث کی دعوت دے سکے۔ ذرا مقابلہ کرو۔ ایک طرف مشرقی پجاری اور مصری کا مُوت سے پہلے اساطیری شاعری میں ڈوبا ہوا رویہ ہے۔ اور دوسری طرف قریب الموت سقراط کی رفیع و برتر لاادریت ہے۔ جس کا قول یہ تھا "حیات

اور موت میں سے کون سی چیز بہتر ہے۔ یہ خدا اور صرف خدا کو معلوم ہے"
مشرق کا مذہبی آدمی اس قسم کے رویۂ فکر سے بالکل محروم ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں۔ کہ یونانی زیادہ ایجاد پسند اور ہوشیار تھے۔ بلکہ وہ اشیا کا مشاہدہ غیر مذہبی نقطۂ نظر سے کر سکتے تھے۔ یعنی اُن کا ذہن مذہبی روایات وخیالات کے تسلط سے آزاد تھا۔ مذہب پرست مشرقی کی طرف سے اس رویّہ کا امکان ہی نہ تھا۔ مشرقی پجاریوں نے مشاہدہ کے صبر وتحمل اور تفصیلات سے شغف کی بنا پر سائینس کی بُنیادیں رکھیں۔ لیکن یونانیوں میں اتنا صبر وتحمل نہ تھا۔ کہ محض مشاہدے اور فراہمی حقائق اور تفصیلات کی یادداشت پر وقت صرف کر سکتے لیکن جب حقائق وواقعات کے استعمال اور تعبیر کا وقت آتا۔ تو یونانیوں کا رویہ علمی تحقیق کے مطابق ہوتا۔ اور مشرقی اس سے قاصر رہ جاتے۔ کوئی شخص پریکلیس کے پاس مینڈھے کا ایک ایسا سر لایا جس کے ماتھے کے عین درمیان صرف ایک سینگ اُگا ہوا تھا۔ اس کاہن نے فوراً اس کی توجیہ کر دی۔ اور اُس سے شگون اور پیشگوئیاں اخذ کرنی شروع کر دیں۔ لیکن اتفاق سے اُس وقت Anaxagoras بھی موجود تھا۔ اُس نے اُٹھ کر اُس کھوپری کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ اور ثابت کیا۔ کہ اس کی ہڈیوں کی نشو ونما غلط طریقے پر ہوئی تھی۔ جس کے قدرتی اثر سے یہ عجیب الخلقت صورت پیدا ہو گئی۔ پہلے پہل یونان ہی میں یہ کیفیت رونما ہوئی۔ کہ ذہنِ انسانی ممنوعات وقیودِ روحانی کے طلسم بند حلقے سے باہر آ کر آزادی سے حرکت کرنے لگا۔

یہ اُسی کا نتیجہ ہے۔ کہ جب یونانی قبائل کا پرانی مشرقی تہذیبوں سے واسطہ پڑا۔ اور اُنھوں نے ان تہذیبوں کے ثمرات اخذ کئے۔ تو اُنھیں ایک نئی قوت اور ارتقائے انسانی کی ایک نئی منزل بنا دیا۔

یونانیوں کے ذہن کی تشکیل یونان میں نہیں ہوئی۔ یہ معجزہ ایشیا

واقع ہوا یہیں آخائی (Achaen) قبائل کے بہادروں کے افسانہ ہائے شجاعت اور تھسلی اور Cadmean تھیبس کے آس پاس کی لڑائیوں کے کارنامے جنگ ٹرائے کی داستان کے لئے جمع کئے گئے تھے۔ جو بعد کے زمانے میں یورپ اور ایشیا کی باہم مخالفت کا علامتی نشان بن گئے (ہومر نے لیڈیا کے ایک چراگاہی علاقے کو ایشیا کے نام سے موسوم کیا ہے) یہاں یونانی قبائل اناطولیا کے ساحل پر۔ اور ملحقہ جزائر میں Rhodes اور Knidos اور Halicarnassos کی راسوں تک آباد ہو گئے تھے۔ اور سلیشیا میں اُن کی رفتار کو سنحرب کے اسیریائی لشکروں نے روک دیا تھا۔ جب ڈورس والوں کی ایک یلغار نے اٹیکا کے لوگوں کو نقل مکانی پر مجبور کیا۔ تو اُس وقت یونان کی روحیت بیدار ہوئی۔ اور پورے عروج کو پہنچی۔ لیڈیا کی ثروت مند مشرقی بادشاہت کے کنارے پر جہاں سے کولوفون کے جوان واپس آتے تھے۔ زینوفینس نے مشرقی لباس کی شان دکھاتے ہوئے جو خوشبوؤں سے معطر تھا۔ اُن کی شکایت کی تھی۔ وہیں ایتھنز کے سولن نے جب سردیس کے دربار میں شاندار درباریوں اور اُن کے خدم وحشم کو دیکھا۔ تو بالکل ایک دیہاتی گنوار کی طرح اُن پر بادشاہ ہونے کا دھوکا کھایا۔ اور جب بادشاہ اُس کو اپنے خزانوں میں لے گیا۔ اور اس کو اپنے بے نظیر گلدان۔ طلائی تپائیاں۔ جواہرات۔ سونے کے بکسوے اور زنجیریں اور چار آئینے اور تھولوس کی طلائی رنگ دکھائی۔ نئے اسلوب سے ڈھالے ہوئے سکے جو حکم شاہی سے آیونیا کے فنکاروں نے تیار کئے تھے۔ بابل کے قالین۔ اور کندہ نقش والے دیوار کے تختے دکھائے جن پر نہایت پُر تکلف کڑھے ہوئے ملبوسات لپٹے ہوئے تھے۔ تو یونانی ان چیزوں سے بالکل متاثر نہ ہوئے۔ اور بادشاہ بے حد برافروختہ ہوا۔ کیونکہ وہ تو حسب معمول مبالغہ آمیز مشرقی تحسین وتعریف کا متوقع تھا۔ یہ پوری

کہانی یونانیوں کے رویے کی امتیازی تصویر ہے۔ وہ نیم ایشیائی آیونیا ہی تھا جو یونانی ثقافت کا گہوارہ بنا۔ وہیں سے یہ ثقافت ایتھنز کی سرزمین میں بسلسلہ تجارت پہنچی۔ اور یہیں سے سمندری محبت اور سمندری طاقت کی بنیاد پڑی جس زمانے میں Alcaeos اور Anacreon کے Teos اور Lesbos کی جلتی ہوئی سیفو، عشق و نغمہ کی دنیا کو آباد کئے ہوئے تھے۔ یونانی فکر و ذہن آیونیا کی بندرگاہوں اور جزیروں میں اپنی اوّلین تخلیقی شان و شوکت سے جلوہ گر ہوا۔ اور یہ فکر و ذہن حقیقت میں بہترین اور رجائیت ترین تھا۔ Menander کے دہانے پر بحری ملکہ Miletos واقع تھی۔ جس کے بیڑے مصر کے Naukaritis۔ ایبیدوس، بازنطیم اور کریمیا اور دوسری ساٹھ نوآبادیوں کے درمیان باقاعدہ سفر کر رہے تھے اور جہاں سوسا اور بابل کے قافلے اپنا سفر ختم کرتے تھے۔ وہاں سے تھیلز مصر اور کالڈیا کی داستانیں لے کر آیا۔ اور پہلے پہل یونانی سرزمینوں میں ریاضیات۔ فلکیات اور فلسفیانہ غور و فکر کی ترویج کا باعث بنا۔ Anaximanes آیا جس کا خیال یہ تھا۔ کہ خشکی کے تمام حیوانات۔ جن میں انسان بھی شامل ہے۔ مچھلیوں سے ترقی پا کر بنے ہیں۔ پھر Hecataeos نمودار ہوا۔ جس نے مشرقی ملکوں کی سیاحت کر کے دنیا کے حالات لکھے۔ اور ان کی اہمیت اس سے ظاہر ہے۔ کہ اس کے نصف صدی بعد Halicarnassos کے ہیروڈوٹوس نے اسی کے نقش قدم پر چل کر اپنی دریافتیں قلمبند کیں۔ اس کے بعد Anaximander پیدا ہوا جس نے پہلے پہل نقشے تیار کئے۔ مثلاً وہ پیتل کی میز بناتی جس کی مدد سے اس کے ہموطن Aristagoras نے سپارٹا والوں کو مجبور کر دیا۔ اور انھیں لیڈیا پر حملہ آور ہونے کی ترغیب دی۔ "اس میز پر تمام سمندروں اور تمام دریاؤں کا نقشہ کھچا ہوا تھا" کہا جاتا ہے۔ کہ اسی

نے "دھوپ گھڑی" بھی ایجاد کی تھی۔ لیکن حقیقت میں "دھوپ گھڑی" مدتوں سے بابل میں زیرِ استعمال چلی آتی تھی۔ یہ عام معمول تھا کہ جو یونانی کسی مصری یا بابلی ایجاد کو رواج دیتا تھا۔ وہی اُس کا موجد سمجھا جاتا تھا۔ جیسے ازمنۂ متوسطہ میں عربوں کی ہر ایجاد کا سہرا اُس شخص کے سر باندھ دیا جاتا تھا۔ جو سب سے پہلے یورپ میں اُس کا تذکرہ کرتا یا اُس کو رواج دے دیتا۔ کولوفون کے کے صنوبرستان سے زینوفینس آیا جس نے اُن تمام دیوتاؤں کی تضحیک کی۔ جن کو ہومر اور ہیسیوڈ نے خلافِ اخلاق بتایا تھا۔ اور جن کے نزدیک بیل اور گھوڑے کی تصویر بیل اور گھوڑے ہی کی مانند تھی۔ اُس نے ایلیا کے Parmenides کو تعلیم دی جس سے افلاطون نے سیکھا۔ کلازومینائی Clazomenae سے Anaxagoras آیا۔ جس نے "آیونیا کے علوم کو ایتھنز میں رواج دیا" اور اپنے دوست Euripedes کو "دہریت" سکھائی۔ Ephesos سے ہرقلیتوس آیا۔ یہ گویا آیونیا کا "نیٹشے" تھا۔ جس نے "ریوڑ" کی پست جبلتوں کو نہایت نخوت و حقارت سے رد کیا۔ اور کہا کہ لوگ گدھوں کی طرح بھوسے کو سونے پر ترجیح دیتے ہیں۔ اور انسانوں کی بنائی ہوئی اقدار کو غلطی سے حقائق جاودانی سمجھ لیتے ہیں۔ حالانکہ فطرت اور اُس کی وہ غیر متزلزل قوتیں جو دائمی تغیر و ارتقا کی ذمہ دار ہیں، نیکی اور بدی سے وراء الورا ہیں۔ Abdera میں جو ملیشا کی ایک نو آبادی تھی۔ دیمقراطوس پیدا ہوا۔ جس نے یہ تصور قائم کیا کہ مادہ ذرات سے مرکب ہے۔ سموس سے فیثاغورث اُٹھا۔ یہ شخص آدھا علمی نابغہ اور آدھا دیوانہ تھا۔ روایت نے تو اسے معمولی سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ اور اسے نہ صرف کلدانی اور مصری پجاریوں بلکہ ایرانی و ہندوستانی معلمین کا شاگرد بنا دیا۔ یہ گویا مشرق کی پرانی شراب تھی۔ جو یونانی تنقید و عقلیت کی نئی بوتلوں میں ڈال دی گئی تھی۔ یہی خاص طور پر سازگار حالات کا اجتماع

تھا۔ جس نے یونانی ذہن کے اوصاف کو ایک ایسے سانچے میں ڈھال دیا۔ جس کی وجہ سے اس قوم کی تمام ارتقائی قوتیں آزاد ہوگئیں۔ اور دُنیا کی جدید تشکیل عمل میں آگئی۔ وہ طاقت جس نے یونان میں انسانی ارتقا کو لمبی زقند لگانے کے قابل بنا دیا۔ وہی طاقت تھی۔ جس نے دُنیائے حاضر کی گزشتہ تین صدیوں کے دَوران میں ایک اَور زقند کا سامان مہیا کیا۔ وہ طاقت غیر مقید تنقید اور عقلی فکر کی طاقت تھی۔

بلاشبہ یونان نے یورپ کی دُنیا کو بنایا۔ لیکن اس کا کام تعمیری بھی تھا۔ اور تخریبی بھی۔ یونان نے صرف ماراتھون۔ سلامیس۔ پلاطیہ اور مائیکیل ہی میں مشرق پر غلبہ حاصل نہیں کیا۔ بلکہ مشرق پر اس کی سب سے بڑی فتح اس کی ذہنی نشو و نما کے عمل میں واقع ہوئی۔ پیشتر اس کے کہ "شاہِ اعظم" کا ایک غلام سپاہی بھی Thermopylae کے آگے قدم رکھے۔ مشرق کو شکست فاش ہو چکی تھی۔

یونان کے لئے سب سے بڑا خطرہ صرف یہی نہ تھا۔ کہ اس کا مقابلہ ایران کے کثیر الاقوام لشکروں اور طاقتور بیڑوں سے تھا۔ جس زمانے میں زرکسیز قدیم ایکروپولس کے بھڑکتے اور سلگتے ہوئے کھنڈروں سے آگے بڑھ کر اُس چٹان پر کھڑا تھا "جو سمندر کے کنارے سلامیس کے اُوپر واقع تھی"۔ وہ یقیناً بہت بڑا خطرہ تھا۔ لیکن ایک زمانے میں یورپ کی تقدیر اور انسانی ارتقا کے انجام کو اس سے بھی بڑا خطرہ لاحق تھا۔ ایک صدی قبل دُنیا کی تقدیر ایک دھاگے کے لئے نہایت خوفناک طور پر معلق اور لرزاں تھی۔ لیکن اس وقت اسے یونان کے سپاہیوں اور ناخداؤں نے نہیں بلکہ آیونیا کے مُٹھی بھر سن رسیدہ بزرگوں نے بچایا تھا۔ جو عالم تنہائی میں غور و فکر کر رہے تھے۔ اور اپنے ذہنوں میں غیر عملی امور کے تصورات لئے بیٹھے تھے۔

جس زمانے میں وحشی Achaean قبیلے بیرحاصل روابط کے ماتحت ترقی کرکے "یونانی" بن رہے تھے۔ اُن کے دیوتا اور اُن کی قدیم داستانیں ساتھ ہی ساتھ فوق الفطرت مذہبیت کی سنجیدگی سے محروم ہو کر بالکل گنواروں کے قصے کہانیوں کی حیثیت اختیار کرتی جاتی تھیں۔ ہیسیوڈ نے مقبول عام کہانیوں کو بابلی اثر و نفوذ کے ماتحت مذہبیات کی شکل دینے کی کوشش کی تو معاملات اَور بھی زیادہ خراب ہو گئے۔ اور ہومری شعرا کے لئے اولمپس کا دربار صرف ایک خوشباش سردار کا جاگیردارانہ دربار تھا جس میں وہ اپنے دوستوں کی ملاقات سے خوش وقت ہوا کرتا تھا۔ ایجیہ کے ملکی دیوتاؤں کو فاتح کے مندر میں محض بنظرِ رعایت جگہ دی گئی۔ لیکن ان کو محض ننگے بدھوں اور مسخروں کا مقام دے کر ذلیل کیا گیا۔ دیانت دار لُہار Hephaestos کو زیوس سے ٹھڈوں کے سوا کچھ نہ ملتا تھا۔ اور ایک حسین بیوی اس کو سرمایۂ تضحیک بنایا کرتی تھی۔ عظیم دیوتا پَین کو نوجوان Dionysos کے دامن بردار کی حیثیت دی گئی۔ اور ہرمیز کو ایک ایسے سنگِ راہ کی طرح نصب کر دیا گیا "تاکہ مسافروں کو رستہ دکھایا کرے" یونانیوں کے ذہن کے نزدیک پرانی قبائلی صنمیات مذہبی حیثیت سے بالکل ناقابل اعتبار قرار پا گئی تھی۔

یونان سے پیشتر کی دنیا میں جو حالات تھے۔ اُن میں دنیائے مشرق کے اندر صرف ایک صورت پیدا ہو سکتی تھی۔ ایک نیا "بلند تر" اور زیادہ روحانی مذہب پیدا ہو کر قوم کے ذہن و فکر پر مسلط ہو جاتا۔ اگر ایسا ہو جاتا تو کوئی یونانی ذہن نمایاں نہ ہوتا۔ اور کوئی مغربی تہذیب وجود میں نہ آتی۔ جو غیر مذہبی نشو و ارتقا کی بنیادوں پر تعمیر کی جاتی۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ یونان اس آفت سے بال بال بچ گیا۔ اور یورپ کا وجود میں آنا ممکن ہو گیا۔ مشرق کے مذہبی تصورات ہر طرف اس تاک میں تھے۔ کہ کب انھیں موقع

ملتا ہے "مادرِ ارض" کی تاریک چھاتی میں سے یعنی اس غیر مرئی زیریں دُنیا سے جو زرخیزی اور نسل افزائی اور حیات و مُوت اور حیاتِ نو کے دائمی تسلسل کے عظیم راز کی امین ہے۔ Demeter - Persephone - Hades - Hecate اور Hermes جیسے دیوتاؤں کی نقاب پوش اور وہی اشکال نمودار ہوتیں ہیں۔ جو احیائے موتیٰ اور حیاتِ جاودان کے خداوند سمجھے گئے۔ Eleusis کے مقام پہ آتے ہوتے تاجر سرزمین او سبزرس سے نئی روشنی لے کر آتے۔ اور ان میں سے ایک منتخب جماعت جو اصطباغ کے پانی سے تمام کثافتوں سے پاک ہو چکی تھی Telesterion کے مصری ستون دار ہال کے اندر اسرارِ مذہبی سے روشناس کرائی گئی۔ اور اس روحانی ضیافت میں شریک کی گئی۔ جس میں سب سے بڑے پُجاری نے جو Tryptolemos کا جانشین اور نمایندہ تھا۔ گندم کے خوشے کا علامتی نشان بلند کیا۔ جو "زندگی کی روٹی" اور ہمیشہ مرنے والا اور ہمیشہ پھر زندہ ہو جانے والا دیوتا ہے۔ یہ معلوم ہے۔ کہ Eleusis کا مذہب یونانی زندگی میں خاصی جڑ پکڑ چکا تھا۔ اور سارا ایتھنز اس الجدی کی رات کو عیدِ میلاد منانے کے لئے مشعلوں کا جلوس نکالتا تھا۔

شمال کے غیر متمدن علاقے میں "دُنیائے زیریں" کے ایک اَور دیوتا Orpheus کو چھٹی صدی میں بڑے وجد آمیز مذہبی ساز و سامان سے قبول کیا گیا جس کے ساتھ تھریس کے قدیم دیوتا Dionysos کو بھی شامل کر لیا گیا۔ یہ ایتھنز کا خوشباش Dionysos نہ تھا۔ جو یونانی رنگ اختیار کر چکا تھا۔ بلکہ ایک بالکل بدلا ہوا اسرار Dionysos تھا۔ جس کا تعلق ہندوستان سے بتایا جاتا ہے۔ اس کے مُنڈے ہوئے سر پہ کلاہ تاج نما تھی۔ ساحرانہ لباس میں ملبّس۔ ایک عصا یا صلیب تھامے ہوتے جس پر علامتی شاخ انگور لپٹی ہوئی تھی۔ جس نے دُنیا کو اپنا خون

عطا کیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی صنمیات کے اشتراک کی وجہ سے فریجیا اور شام کے دوسرے مرتے ہوئے دیوتا Adonis, Attis، Zagreus اور Bacchus کا Elusinia بھی شامل کر لئے گئے تھے۔
دیہاتی آبادی پُرشور مذہبی جوش میں سرشار ہو گئی جس سے کشف و رؤیا کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اور وجد و رقص کا جنون پوری یونانی دُنیا میں وبا کی طرح پھیل گیا۔

احیائے مذہب کے اس جوش و خروش کے عالم میں مندروں کے پُجاری خلوت اور کس مپرسی کے گوشوں سے باہر نکل آتے۔ اور اختیار و اقتدار کے لہجے میں گفتگو کرنے لگے۔ مذہبیات کے نئے مشرح نظام قائم کئے گئے۔ مذہب کی مناسب تنظیم اور مختلف عقائد و مسالک کے اتحاد کا چرچا ہونے لگا۔ پُرانے مذہب بھی مطابقت اور ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے فکر مند نظر آنے لگے۔ ایک عورت جوش و مستی کی حالت میں غیب کی باتیں بتانے لگی۔ اور واعظین مبلغین اور روحانی موسیقار اور رقاص بازاروں میں تبلیغ و تعلیم کے لئے نکل جاتے۔ دیوتا کے ظہور کا پیغام سُناتے۔ بیماروں کو تندرست کرتے۔ دعوے کرتے۔ کہ انھیں آسمان کی طرف سے ایک ایسی طاقت حاصل ہے۔ کہ وہ ٹونے ٹوٹکے اور جھاڑ پھونک کرنے اور کھانے پینے میں شریک ہونے سے ہر فرد اور اُس کے آبا و اجداد کے جرائم کا کفارہ مہیا کر سکتے ہیں۔ یہ لوگ بہت سی کتابیں دکھاتے ہیں۔ جن میں اُن کی عبادات و رسوم درج ہیں۔ اور صرف افراد کو نہیں۔ بلکہ حکومتوں کو بھی ترغیب دیتے ہیں۔ کہ وہ بعض رسوم و وظائف اختیار کر کے (جنھیں "اسرار" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے) جو جہنم کی اذیتوں سے بچاتی ہیں اس زندگی میں اور موت کے بعد گناہوں سے پاک ہو جائیں۔ اگر انھوں نے اس امر میں غفلت کی۔ تو اُن کا انجام نہایت خوفناک ہوگا۔ (Plato, Resp. II 364 -365)

ان مبلغین میں سے ایک Onomacritos بھی تھا جس نے Peisistratos کے دربار واقع ایتھنز میں کافی رسوخ و اقتدار حاصل کر لیا تھا۔ اور ہومر کی نظموں کا ایک نیا نسخہ مرتب کرنے کے کام پر مامور کیا گیا تھا۔ جس میں اُس نے کسی نہ کسی طرح Orpheus کی تعریف میں بعض پُر اسرار بند بھی شامل کر دیئے تھے۔ لیکن بدقسمتی سے وہ اس قسم کی جعل سازی کرتے ہوئے پکڑا گیا۔ جب وہ بعض نظمیں Musaeos سے منسوب کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چاہیئے تو یہ تھا۔ کہ اس "پارسایانہ جعل" کو نہایت فراخ دلی اور ہمدردی سے نظر انداز کر دیا جاتا۔ بلکہ اس کو بھی ایک نہایت واجب الاحترام "روحانی تجربہ" قرار دیا جاتا۔ لیکن ایتھنز والوں نے نہایت "بدتمیزی" سے اُس کو جھوٹا اور بدمعاش قرار دے کر بہت ذلیل و رسوا کیا۔ کسی قدر مختصر التوا و تعطل کے بعد آنی "مذہبی تحریک کی یہی کیفیت تھی۔ درحقیقت محسوس یہ ہو رہا تھا۔ جیسے یونان بالکل تباہی کے کنارے پر پہنچ چکا ہے۔ مذہبی اقتدار کا دباؤ فکرِ انسانی کے گہوارے کا گلا گھونٹنے والا ہے۔ اور دُنیا کی آزادی مخلصی یا ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گی۔ یا غیر معیّن وقت تک معرضِ التوا میں پڑ جائے گی۔ لیکن خوش قسمتی سے اُس وقت یونانی فکر بیدار ہو چکا تھا۔ جن عظیم انسانوں نے دُنیا کو بچایا۔ وہ Miltiades، Themistocles اور Pausanias نہ تھے۔ بلکہ تھیلز۔ زینوفینس اور ہرقلیطوس تھے۔ یونیا کے مفکّرین کا فکر اور اُن کی خطابت لاحاصل اور بے نتیجہ نہ تھی۔ اُنھوں نے انسان پر اُس کے ایک نئے وقار اور نئی طاقت کا انکشاف کیا تھا۔ اس نئے جنون کے خلاف اور لوگوں کی جہالت سے فائدہ اُٹھانے والے ان جاہلوں کے خلاف اور دیوتاؤں کو سر پر اُٹھا کر تبلیغ کرنے والوں کے خلاف پرانی کتابوں کے متن تلاش کرنے والے Athenaeus نے لکھا ہے۔ کہ "میں نے

اُن لوگوں سے زیادہ اخلاق سوز اور مضرت رساں کوئی گروہ نہیں دیکھا جو Demeter دیوتا کے لئے چندہ جمع کرنے کی غرض سے چکر لگایا کرتے ہیں۔" ایتھنز کے ہوشمند لوگوں نے بے عقلی اور جہالت کے ان عَلَم برداروں کے خلاف انتہائی غیظ و احتجاج کی آوازیں بلند کیں۔

یونان کے بہتر جبلت رکھنے والے باشندوں نے اس آواز کو سُنا۔ اور اپنے مفکرین کے گرد جوق در جوق جمع ہو گئے۔ جس زمانے میں کروٹون کے لوگوں نے فیثاغورث کے سلسلۂ "تصوف" کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا تھا۔ اس سے بھی پہلے آرفیس کا طلسم نابود ہو چکا تھا۔ اور یونان نے ان تمام اسرار فروش اور روحانیت فروز لوگوں کو بتا دیا تھا۔ کہ وہ بھاگ جائیں۔ اور یونانیوں کو احمق بنانا چھوڑ دیں۔" اس عجیب اور بھرپور زندگی میں غیر یقینی اور پُر اسرار امور پہلے ہی بہت زیادہ ہیں لیکن کوئی وحشی پجاری اپنی خرافات و روایات سے ان میں نہ کوئی اضافہ کر سکتا ہے نہ تخفیف۔ جو کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔ اُس کو ہم "دیانت دارانہ علم" کے وسیلے سے معلوم کرنے کی کوشش کریں گے اور جو معلوم نہ ہو سکے گا۔ اُس کا بھی "دیانت دارانہ جہالت" سے بے باکی کے ساتھ سامنا کریں گے۔ اور جب تک یونان کے ذہن میں قوت باقی ہے۔ وہ کم از کم فکر انسانی کو آزاد ضرور کرتے رہے گا۔ اور آیندہ نسلوں کو جب تک وہ یونانی فکر کی آواز سُنتی رہیں گی۔ یونان آزادی کی وراثت برابر پہنچاتا رہے گا۔"

جب ہم اُن نیچے کھچے اور مسخ شدہ آثار و باقیات کو جو Diels کی کتاب میں جمع کئے گئے ہیں۔ ایک قسم کے شفیقانہ تجسس سے دیکھتے ہیں۔ اور اُن سے آیونیا کے قدیم مفکرین کے اُن خیالات و تصورات کا پتہ چلانے کی کوشش کرتے ہیں (جو ہمارے نزدیک اکثر سیدھے سادے اور نا پختہ معلوم ہوتے ہیں) تو آخر ہم میں سے کتنے ہیں جن کو اس امر کا واضح احساس

ہے۔ کہ آج ہمیں دُنیا اور مسائل دُنیا کا سامنا کرنے میں واضح فکر کا جو کم و بیش پیمانہ حاصل ہے۔ اور مجموعی علم و فہم کے جو اسلحہ ہمارے پاس موجود ہیں ۔ یہ سب انہی انسانوں کی طفیل سے ہے۔ (جو اکثر لوگوں کے نزدیک ناموں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے) اس صورت حال کا سہرا سب سے پہلے اُن کے سر ہے۔ اور اس کے بعد اُن تمام لوگوں کے سر ہے۔ جنھوں نے اُن کی حاصل کردہ آزادی سے استفادہ کیا۔

اہلِ یونان دُنیا کی سب سے زیادہ عقلیت پسند قوم تھی۔ وہ ہمارے مقابلے میں بہت بڑی حد تک عقلیت پسند تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ ہمارا فکرِ جدید صرف اُس صورت میں مصروفِ عمل ہوا۔ کہ اُس نے مجموعی روایات و تعصبات کے بوجھ کو بڑی محنت کے ساتھ (اور وہ بھی جزوی طور پر) اپنے کندھوں سے اُتار پھینکا۔ لیکن یونانیوں کو اس قسم کے کسی بوجھ سے نجات حاصل کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ یہی وہ بے نظیر اور سدا بہار افسوں ہے۔ جو پورے یونانی فکر و ادب میں جاری و ساری ہے۔ اس کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں بہت سی ناپختہ باتیں اور بعض مہمل تصوّرات نظر آتے ہیں۔ اور ایسے خیالات سے بھی واسطہ پڑتا ہے۔ جو ہمارے موجودہ علم کی برتری کے سامنے نہایت غلط اور بے حقیقت معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن شدید اور لاعلاج تعصّب کہیں نظر نہیں آتا۔ ہمیں ہر وقت یہ محسوس ہوتا ہے۔ کہ ہمارا سابقہ کھُلے اور روشن اذہان سے ہے۔ جن میں فکر اور تحقیق کی نشو و نما کا گلا کبھی گھونٹا نہیں جاتا۔ اور مُردہ اور سنگین اصولوں اور جامد و غیر متحرک اور بے بصرانہ مفروضات کی رعایت نہیں کی جاتی۔ قدیم ہیروڈوٹس کو دیکھو۔ وہ ہرگز زندیق فونی متشککین میں سے نہ تھا۔ بلکہ اس کے برعکس نہایت متقی اور پرہیزگار شخص تھا۔ اس کا مقابلہ ہندوستان۔ اسیریا۔ مصر یا یہودیہ کے لفاظ۔ عبارت آرا۔ اور وفادار وقائع نگاروں سے کرو۔ جو ہمیشہ سیکڑوں کو "ہزاروں" اور ہزاروں کو "لاکھوں"

لکھتے ہیں۔ اور اُن کی تحریروں میں سے حقایق اخذ کرنے کے لئے معجزہ کاری اور گھناؤنے مبالغے کے ناقابل نفوذ انبار کو کھودنا پڑتا ہے۔ ہیروڈوٹس کی حالت یہ ہے کہ جب کبھی اُس کے سامنے معجزہ وکرامت اور فوق الفطرت یا وطن پرستانہ مبالغہ کے امور آتے ہیں۔ تو وہ اُن پر ہرگز یقین نہیں کرتا۔ اور ایک قطعی تشکک سے معمور ہو جاتا ہے۔ جب اُس کو Dodona کی پجارن کی روایت سُنائی گئی۔ تو اُس نے کہا "فاختہ انسان کی بولی کیونکر بول سکتی ہے" جب اُس کو بتایا گیا۔ کہ "Peneios کا نالا یوں پیدا ہوا تھا۔ کہ Poseidon نے اپنا ترسول زمین پر مارا تھا" تو اُس نے کہا "لیکن میرے نزدیک تو یہ کسی زلزلے کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے" کہا گیا۔ کہ "ایرانی بیڑا تین دن تک سمندر کے طوفان میں ڈگمگاتا رہا۔ آخر مُغوں نے دُعائیں مانگ کر اور قربانیاں پیش کر کے طوفان کو فرو کیا" اس پر ہیروڈوٹس نے لکھا "یا طوفان اپنے آپ ہی تھم گیا" یہاں تک کہ جب وہ اپنی قوم کی عظمت کے درخشاں واقعات کا ذکر بھی کرتا ہے۔ تو ہر غیر اغلب واقعہ پر متامّل ہو جاتا ہے۔ مثلاً جہاں اُس نے مشہور غوّاص Scyllias of Scione کی کہانی لکھی ہے جس کے متعلق کہتے ہیں۔ کہ اُس نے Artemisium کے مقام پر ایتھنز کے بیڑے کو ایرانی جہازوں کی آمد سے آگاہ کرنے کے لئے دس میل کا سمندر تیر کر طے کیا تھا۔ وہاں یہ مؤرّخ لکھتا ہے "میری رائے میں وہ کشتی میں آیا ہوگا" اس تشکک کی وجہ یہ نہ تھی۔ کہ اس کی ذہانت غیر معمولی طور پر تیز تھی۔ (جن متین و سنجیدہ اور عالم فاضل مصری اور بابلی پجاریوں سے اس کو گفتگو کرنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ کیا اُن کے مقابلے میں بھی ہیروڈوٹس زیادہ ذہین تھا؟) ——— بلکہ اصل بات یہ تھی۔ کہ یونان کی دُنیا میں اس قسم کے اثرات بالکل مفقود تھے۔ جو معجزات اور مبالغات سے انکار کو کفر و الحاد قرار دیتے ہیں۔ یونانی ذہن کی نشو ونما کا راز اس میں نہیں۔ کہ

اس میں لازماً زیادہ قوت تھی۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ وہ قوت اپاہج نہیں کردی گئی تھی۔

عقلیت پسندی کے متعلق اُن کا جذبہ اُن کی سب بڑی امتیازی خصوصیت بن گیا تھا بحث و استدلال کا مشغلہ اُن کے لئے باعث مسرت تھا۔ سیاسیات اور حکومت اُن کے نزدیک احکام و ضوابط کا نام نہ تھا۔ بلکہ ہمیشہ بحث و مباحثہ اور اختلاف آرا کا موضوع تھا۔ اور اُن کا یہی معمول زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی تھا۔ یہ پہلی قوم تھی جس نے (مذہبیات کے معنی میں) سب سے پہلے عقلیت کا استعمال کیا۔ خود اپنی مذہبی روایات پر تنقید کی۔ اور انھیں مسترد کر دیا۔ انھوں نے رسمی منطق کی بنیادیں استوار کیں۔ اور بحث و کلام کو ایک علم بنا دیا۔ فصاحت اُن کے نزدیک استدلال کا نام تھا۔ اور وہ فصاحت کو سب چیزوں سے زیادہ قابل پرستش سمجھتے تھے۔ اُن کا ڈراما ہمیشہ المیہ و طربیہ کے درمیان حرکت کرتا تھا۔ اُن کا آرٹ، وہ آرٹ جس نے پارتھینان کو پیدا کیا (جس کو Boutmy "مرمریں منطق" قرار دیتا ہے) اور یونان کی سنگ تراشی قوانین تناسبات اور معیارات کی سخت پابند تھی۔ اُن کی خواہش یہ تھی۔ کہ فنی اثر کی علتِ غائی تک پہنچیں۔ Ictinus نے جس نے ایتھنز کی چٹان پر "حجرۂ دوشیزہ" کے خالص اور سدا بہار حسن کو تخلیق کیا تھا۔ ایک رسالہ لکھا ہے۔ جس میں اُن منطقی اصول کو واضح کیا ہے۔ جن کی بنا پر اُس نے یہ پارۂ فن وضع کیا۔ اُن کے آرٹ کی روح کا اظہار اسی باضابطگی، تشاکل و تناسب میں ہوتا ہے۔ جو منطقی فکر کے توازن و ترتیب میں پایا جاتا ہے۔ اور اولمپیا کے سکون میں بے لوث بصیرت کی مطمئن متانت کا مظہر ہے۔

یونانی قوم شعوری اور ارادی استنباط و استدلال (خواہ یہ کتنی ہی متناقض بات ہو) میں حد سے بڑھ گئے۔ اُن کے نزدیک استدلال کی صورت ہی

بے انتہا دلفریب اور مسحور کُن تھی۔ عام آبادی کو کوئی تفریح بھی اتنا متاثر نہ کر سکتی تھی۔ جتنا وہ منطق و استدلال کی مہارت سے مسرور ہوتے تھے۔ وہ خطابت و کلامیات سے بے انتہا خوش ہوتے تھے۔ اُن کے خطیبوں کا ایک پسندیدہ شعار یہ تھا۔ کہ ایک دن وہ دلائل و براہین سے ایک دعویٰ ثابت کرتے۔ اور دوسرے دن دلائل ہی سے اُس کو توڑ کر رکھ دیتے۔ وہ استدلال کے اتنے عاشق تھے۔ کہ اُس کی خاطر عقلی فکر، تحقیق، تجربہ، اور آزمائش و غلطی کے عملی طریقوں سے بھی تغافل کر جاتے تھے۔ اس اعتبار سے (جیسا کہ ہم آیندہ بحث کریں گے) وہ سائینس سے استفادہ نہ کر سکے۔ اور "قبل سائینس" کے مرحلے ہی میں رہے۔ یہ امر پیش نظر رکھنا مفید ہوگا۔ کہ یونانیوں میں وہ چیز نہایت اعلیٰ پیمانے پر موجود نہ تھی۔ جسے ہم تلاش صداقت کا شوق کہتے ہیں۔ اُنھیں حقائق کی جڑ تک پہنچنے کا جوش اور صداقت کے اعلیٰ تقدس کے نصب العین کی تصریح کا ذوق نہ تھا۔ وہ محض صداقت کے انکشافات کا جذبہ نہ رکھتے تھے۔ بلکہ بعض ایسی مہمل اور جعلی تصریحات کے شوقین تھے۔ جو عقل و ذہانت کی توہین تھیں — وہ صداقت سے بھی زیادہ نیز فہمی، حُسن و جمال اور اخلاقی حُسن کے مداح تھے۔ اگر اُن سے کوئی بظاہر معقول بات سلیقے سے کہی جاتی۔ تو وہ مطمئن ہو جاتے۔ اور یہ تحقیق نہ کرتے۔ کہ وہ بات صحیح بھی ہے یا نہیں۔

یہ کہنا ہرگز یونانیوں کی توہین نہیں۔ کہ اُس زمانے کے حالات کے ماتحت یونانی فکر نے ایک دم اسلوب و نتائج کا پورا کمال حاصل نہ کیا تھا۔ وہ کیفیت جو کچھ بھی تھی۔ اس میں شک نہیں۔ کہ نسلِ انسانی کے ارتقا میں پھول کھلنے کا حیرت انگیز منظا ہرہ تھا۔ یونان ہی نے ذہن انسانی کو قوت بہ دوام دی۔ نوع انسانی کو از سرِنو تخلیق کیا۔ اور بعد کی تمام منازلِ ارتقا کو ممکن بنایا۔

اس میں تعجب کا کوئی مقام نہیں۔ کہ یونان کا زمانہ ترقی اس قدر مختصر تھا،

تعجب اس پر نہیں۔ کہ یونان کی عظمت زیادہ مدت تک قائم نہ رہ سکی۔ بلکہ اس پر ہے۔ کہ وہ اتنی دیر قائم رہنے میں بھی کیونکر کامیاب ہوئی۔ یہ ایک "قبل از وقت ولادت" تھی۔ جو مخصوص اور ساز گار حالات کی وجہ سے واقع ہو گئی تھی۔ دُنیا کی حالت کسی عقلی معاشرے کے وجود کی روادار نہ تھی انسانی تجربہ بھی قطعی طور پر ناکافی تھا۔ لہذا اس قسم کے غیر مفاہمانہ عقلی رویے کی جیسا کہ یونانیوں نے اختیار کیا معقول بنیاد نہ بن سکتا تھا۔ ترقی یافتہ تہذیب کے بدلے ہوتے حالات میں بھی انھوں نے سیاسی اعتبار سے اپنی قدیم قبائلی جمہوریت کی روح اصلی کو محفوظ رکھنے کا بندوبست کر لیا تھا۔ حالانکہ بیشمار ایسے عوامل موجود تھے۔ جو انسانی احوال کی عام رفتار میں اسے لازماً ختم کر دیتے۔ انھوں نے جنگی سرداروں کی مداخلت۔ اُمرا کے جیلوں بہانوں دولت کی طاقت کی بے پناہ مطلق العنانی۔ غیر ملکی روپے کی حرص اور ایرانیوں کی مسلح طاقت کا مقابلہ کر کے اُن پر قابو پا لیا تھا۔ انھوں نے معقول اور مناسب اختراعوں اور منصوبوں سے کام لے کر بدلے ہوتے حالات میں جمہوریت کی بحالی کی کوشش کی۔ لیکن اس کوشش کا نتیجہ تقریباً تناقض کی صورت میں رونما ہوا۔ یعنی ایک متزلزل سے توازن کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ جو حالات کی نوعیت میں غیر محدود مدت تک قائم نہ رہ سکتی تھی۔

بعض قوموں میں اُن کے بعض اندرونی اسقام کے عمل کی وجہ سے انحطاط در د ہو جاتا ہے۔ جو چپ چاپ اندر ہی اندر اُن کو دیمک کی طرح چاٹ جاتے ہیں۔ بعض قومیں اپنی کامیابی کے اوج پر پہنچ کر انہی اوصاف و محاسن کی وجہ سے جنھوں نے اُن کو کمال تک پہنچایا تھا۔ اپنا توازن کھو بیٹھتی ہیں۔ آخر الذکر صورت یونان اور ایتھنز میں پیش آئی۔ ایتھنز والوں نے جب ایرانیوں کو شکست دے دی۔ تو وہ اپنی عظمت و شوکت کے شدید احساس سے اس قدر سرشار ہو گئے۔ کہ اُن میں جنگی وطن پرستی کا زہر

سرایت کرگیا۔ حُبِّ وطن ایثار کا دوسرا نام ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ فرد کے ذاتی مفاد پر پوری قوم کے مفاد کو ترجیح دی جائے۔ لیکن یہ امر اس فہم پر موقوف ہے۔ کہ "قوم" سے کیا مراد ہے۔ اگر مثلاً کوئی شخص مانچسٹر کے حق میں "محبِّ وطن" ہو۔ تو اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ وہ انگلستان کے حق میں محبِّ وطن نہ ہو۔ ایتھنز کی یہی حالت تھی۔ اس کے لوگ بحیثیت وطن ایتھنز سے تو محبت کرتے تھے۔ لیکن یونان کو اپنا وطنِ عزیز نہ سمجھتے تھے۔ یہ لا علاج انقطاع پسندی اور نصف درجن گھٹیا سے دیہات کے مہلک لڑائی جھگڑے ہمارے نزدیک انتہائی احمقانہ اور مہمل تھے۔ جن کی تعبیر یونانی کردار کی کسی خاص "انفرادی" افتادِ طبع ہی سے کی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ انقطاع پسندی اور بین الملکی بدامنی بالکل ایسی ہی لغو و بیہودہ تھی۔ جیسے یورپ کی سلطنتوں میں ہے۔ نہ کم نہ زیادہ۔ جسامت محض ایک اعتباری چیز ہے۔ اور اس کا تعلق مادہ سے کچھ نہیں "شہری ریاست" یونان میں اسی طرح "سیاسی وحدت" تھی جس طرح آج کل یورپ میں "قومی ریاست" سیاسی وحدت ہے۔ یہاں تک کہ افلاطون نے بھی "یوٹوپیا" میں کسی اَور قسم کی سیاسی وحدت کا تصور پیش نہیں کیا۔ سائینا اور سرینیکا کے فلسفیوں نے "یونانی اقوام کی لیگ" کا جو نقشہ پیش کیا تھا۔ وہ ایرانی حملے کے فوری خطرے سے پہلے تو ٹھیک تھا۔ لیکن ایک مستقل نظام کی حیثیت سے محض ایک غیر عملی خواب تھا۔ جو سیاسی حقائق کے دائرے سے باہر تھا۔ اس انتظام کا ایک مطلب یہ ہوتا۔ کہ ایتھنز کو سمندر کے قبضے اور اقتدار سے دست بردار ہونا پڑتا۔ لیکن اس کا تصور بھی نہ کیا جا سکتا تھا۔ لہٰذا ایتھنز والے "سلطنت" کے تصور سے چمٹے رہے۔ اور انھوں نے ایتھنز کو سب پر ترجیح دی۔ (خواہ وہ حق پر ہو یا ناحق پر) اس طرزِ عمل کا انجام بہت جلد Aegospotami کی پہاڑی کانوں اور Syracuse

کے ریگستان پر نظر آگیا۔ اور جب غدار الکیابیڈس نے نہایت ڈھٹائی کے ساتھ ایتھنز والوں سے پوچھا۔ کہ آیا تم جمہوریت کو ایرانی روپے کے بدلے میں بیچ دینے پر آمادہ ہو۔ یا کامل تباہی قبول کرتے ہو۔ تو وہ سر جھکا کر خاموش ہو گئے۔ اور جب سپارٹا کا Agesilaos ایران کے خلاف ایک آخری حملہ کرنے کے لئے نکلا۔ تو اس کو "تیس ہزار تیر اندازوں" نے مار کر پیچھے ہٹا دیا جس کا مطلب یہ تھا۔ کہ تیس ہزار طلائی دینار جن پر "شاہ اعظم" کی تصویر "تیر انداز" کی شکل میں کندہ تھی۔ یونانیوں کو ایتھنز میں بطور رشوت دیئے جا چکے تھے۔ اور سپارٹا کے لیڈر کو واپس بلایا جا چکا تھا۔

یونان لاعلاج صوبہ پرستی۔ رشک و حسد۔ تصادم و کشمکش۔ طرح طرح کی بدعنوانیوں۔ نفرت انگیز خود غرضیوں اور ان سے پیدا ہونے والی دروغ بیانیوں سے پارہ پارہ ہو کر بے طاقت ہو رہا تھا۔ اور ہر شخص پر واضح تھا۔ کہ ملک برابر غرق ہوا جا رہا ہے۔ آخر Antalkidas کے "معاہدۂ صلح" نے اس کو "شاہ اعظم" کی ماتحت ریاست بنا دیا۔ اور یونانی ریاستیں نہایت ذلت کے ساتھ شاہ مذکور کے احکام کی تعمیل کرنے لگیں۔ شگوفہ اپنی شاخ پر مرجھایا اور جھکا ہوا تھا۔ اب سوال صرف یہی تھا۔ کہ یہ جو بربریت کی لہریں امنڈ رہی ہیں جنھوں نے اٹلی میں یونانی نو آبادیوں کا گلا گھونٹ رکھا ہے۔ اور ایران کی بے پناہ طاقت کے سامنے یونان اس طرح بے بس ہو رہا ہے۔ جیسے کسی لرزاں پرندے کو کسی سانپ نے مسحور کر رکھا ہو۔ یونان کی تہذیب ان سب کے مقابلے میں کب عاجز ہو کر ختم ہوتی ہے۔ اور اس میں سے کچھ حصہ باقی بھی رہتا ہے یا نہیں لیکن ان حالات میں دفعتہً ایک عجیب واقعہ ہوا کہ یونانی تہذیب مرجانے کے بجائے دنیا بھر کی فاتح بن گئی۔

اس وقت بعض ایسے یونانی قبائل موجود تھے (جو Peonian اور

Macedonians کی نسلی آمیزش کے باوجود ایتھنز اور ہیلیشیا والوں ہی کی طرح خالص یونانی تھے) جو جنوبی بلقان کے گوشوں میں رہ کر اُن اثرات سے غیر متاثر اور منقطع رہے تھے جنھوں نے آیونیا اور ہیلاس کو پیدا کیا تھا۔ اب پھر نسل اور ماحول کی صحیح اضافی اقدار کو دیکھو۔ یہ لوگ بالکل اسی حالت میں غیر اہم سے بستی رہے جس طرح قدیم یونانی قبائل رہے تھے۔ اُن کی ایک چھوٹی سی معمولی بادشاہت بالکل بے حقیقت تھی حتیٰ کہ اُن کے ایک بادشاہ نے یونانی ثقافت کی ترویج کی کوشش کی۔ اور جنوب سے فن کاروں اور شاعروں کو اپنے دربار میں جمع کیا۔ مشہور مصور زیوکسز۔ مشہور طبیب بقراط (غالباً) تھیوسی ڈیڈیز مؤرخ۔ ملیطوس کا شاعر اور موسیقار تیموتھیوس۔ المیہ نگار شاعر اگاتھون۔ اور ایک اَور عظیم تر المیہ نگار شاعر یُوری پیڈیز جو نہایت غمزدہ اور تھکا ہوا اَسّی سال بزرگ تھا۔ اور جس کا انسانیت پر یقین و اعتقاد بُری طرح مجروح و متزلزل ہو چکا تھا محض مرنے کے لئے اس دربار میں پہنچ گیا۔ اور مرنے سے پہلے اُس نے ققنس کے گیت کی طرح اپنی آخری نظم Bacchae لکھی۔ شاہ آرچیلاؤس کے جانشین نے جو تھیبس میں پروان چڑھا تھا۔ اُن امکانات کو محسوس کر لیا۔ جو یونان کی شہری ریاستوں کے انحطاط و تشتت نے پیش کر دیئے تھے۔ چنانچہ اُس نے باضابطہ ایک فوج کی تربیت کی۔ اور کیرونیا کے مقام پر ایتھنز اور تھیبس کو شکست دے کر پورے یونان کو اپنا "منطقۂ نفوذ" قرار دیا۔ اور اپنے آپ کو یونانیوں کا "حاکمِ اعلیٰ" بنا لیا۔ اُس کے بیٹے نے جس کی تعلیم اَور بھی زیادہ اہتمام و احتیاط سے ہوئی تھی (اس کا اتالیق اعلیٰ ارسطو تھا) ایک نہایت قواعد دان اور کیل کانٹے سے لیس فوج (جو آج کل کے چار ڈویژنوں کے برابر تھی) لڑائی کے میدان میں ہیلیس کے قریب اُتار دی۔ Granicos کے مقام پر صوبائی سرداروں کی فوجوں

کو منتشر کیا۔ آیونیا کے شہروں کو طوعاً یا کرہاً آزاد کرایا۔ اور دو گھمسان کی لڑائیوں کے بعد ایران کی "کمزور" قلمرو، مشرق قریب کی پوری دُنیائے معلوم، ایشیائے کوچک فنیقیہ۔ بابل فلسطین اور مصر اُس کے قدموں میں آن گرے۔ لے وہ دُنیائے معلوم کی حدود سے بھی آگے نکل گیا۔ باختریہ میں چینیوں سے بھڑ گیا۔ افغانی سطح مرتفع پہ قندھار کی بُنیاد رکھی۔ اور پھر لاہور اور حیدر آباد میں داخل ہو کر ہی رُکا۔ جب وہ واپس ہوا۔ اور اُس نے ارادہ کیا۔ کہ کچھ مدت بابل میں آرام کرے۔ اور پھر مغرب کی طرف اپنی فتوحات کا پھریرا اُڑائے تو پوری دُنیا کی طرف سے اس نوجوان فاتح کی خدمت میں اظہار اطاعت کے لئے سفارتیں آنے لگیں۔ عرب۔ حبشی۔ سنفین۔ کارتھیجی۔ آئی بیریا والے گال ایٹروسکن اور برٹیم سمنٹیز کے اطالوی اس کے مطیع و منقاد ہو گئے۔ تاریخ میں اس کا کہیں ذکر نہیں۔ کہ ایک چھوٹے سے گاؤں روما نے بھی اپنا کوئی سفیر بھیجا یا نہیں۔ مختصر یہ کہ اس واقعہ سے پوری دُنیا یونان کے رنگ میں رنگی گئی۔

ہیلاس کی میر حاصل روحیت پُورے کرۂ ارض پر سب قوموں اور سب زمانوں میں پھیل گئی لیکن یہ روحیت خالص یونانی نہ تھی۔ مشرق نے آخر کار انتقام لیا۔ خوفناک اور مُہلک انتقام۔ یونان کے نوجوان فاتح ہیرو نے ایفیسوس میں ارتمیس کو۔ طائیر میں میلکارتھ کو۔ اکبتانہ میں آہورمزدا کو۔ ممفس میں تباہ کو۔ سیوا میں آمون کو اور یروشلم میں یہوا کو قربانیاں پیش کیں اور مشرق کے دیوتا مُسکرانے لگے۔

اسکندر سے پیشتر یونان سیاسی اور ذہنی دونوں پہلوؤں سے آہستہ آہستہ ایران اور اپنے پندار کے سامنے مغلوب ہو رہا تھا۔ یونان نے ہر مُتکلم کی شاگردی ذوق شوق سے اختیار کی تھی۔ اور تمام ذرائع و وسائل

لے یہ اسکندر اعظم کا ذکر ہے۔

سے جتنا علم حاصل ہو سکتا تھا۔ اُس کو حاصل کرنے کے بعد ذہن و فکر کی قوت کا بدرجۂ اتم مالک بن گیا تھا۔ لیکن اسے اپنی عظمت و افضلیت کا حد سے زیادہ گہرا شعور ہو گیا۔ اور وہ اپنے غرور و پندار میں یہ سمجھنے لگا۔ کہ اسے بربریوں سے کوئی چیز سیکھنے کی ضرورت نہیں "ہمارے شہر نے فکری و لسانی اعتبار سے تمام دوسروں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ اور اس کے شاگرد دُنیا بھر کے اُستاد بن گئے ہیں۔ ہمارے شہر نے یونان کے نام کو نسل و خون کا نہیں بلکہ ذہن و فکر کی علامت بنا دیا ہے۔ لوگ زیادہ تر اس لئے یونانی کہلاتے ہیں۔ کہ وہ ہماری ثقافت کے حصے دار ہیں۔ یونانی نسل ہونا چنداں ضروری نہیں رہا۔"

یونان جس قوت سے نفرت کرتا تھا۔ اُسی سے مغلوب ہو گیا۔ اس کے قدیم اکابر نے کوشش کی تھی۔ کہ تمام روایات و مفروضات کو الگ پھینک دیں اور ذہن انسانی کو صرف عقلی فکر کی بُنیاد پر تعمیر کریں۔ یہ کوشش ایک ایسے زمانے میں کی گئی۔ جب وحشیانہ جہالت و لاعلمی سے ابھی بمشکل نجات ملی تھی۔ اس میں شک نہیں۔ کہ یہ کوشش بے سود نہ رہی لیکن اس کی خیرہ چشمی بالکل لاعلاج تھی۔ ان لوگوں کے پاس کوئی بنیاد۔ کوئی حقایق اور کوئی باضابطہ تجربہ موجود نہ تھا جس پر تعمیر کی بنیادیں اُٹھائی جا سکتیں۔ اور اُن کے جانشینوں نے خالص پندار عقل کے جوش میں روز بروز محض مشاہدہ و تحقیق کو حقارت سے مسترد کرنا شروع کر دیا۔ اور علمی تجسس کے اُن جراثیم کو بالائے طاق رکھ دیا جن کی بنیادوں پر (خواہ وہ کتنی ہی کم حیثیت ہوں) اوّلین مفکروں نے فکر کا قصر تعمیر کیا تھا۔ تمام صوفیانہ خوش اعتقادیاں اور لطیف حسّیات اُسی طرح دروازے توڑ کر اندر گھسنا چاہ رہی تھیں۔ جس طرح ایرانی لشکر قصر موبلی کے گرد مداخلت کی کوشش کر رہا تھا۔ عقلی فکر نے جتنی زمین پر قبضہ کیا تھا۔ اُس پر

مشرق کے ڈھندلے اور ابہامی خواب آہستہ آہستہ دوبارہ چھا رہے تھے۔
اور وہ فکر جو صحیح حقائق و اعداد سے مسلح نہ تھا۔ اُن کا مقابلہ کرنے سے قطعاً
قاصر تھا۔ افلاطون کی چمک دمک شاندار تھی لیکن وہ اب تک بہت
حد تک "فاسفورسی" تھی۔ افلاطونیت سے جدید افلاطونیت تک صرف ایک
قدم کا فاصلہ ہے۔ یونان نے تو مشرق کے وحشیانہ جھوٹے گڑنے کو طلائے
خالص بنا دیا تھا لیکن مشرق نے یونان کے زیوروں پر قبضہ کر کے انھیں
پھر صوفیانہ اور باطنی جالوں میں تن کر اپنی لاادریتوں اور مذہبیانی علم کا سرمایہ
بنا دیا تھا۔

تیسرا باب

امنِ رُومی

بادی النظر میں دیکھا جائے۔ تو روما کی ابتدا یونان سے کسی قدر مشابہت رکھتی ہے۔ یعنی چھوٹے چھوٹے قبائل تھے۔ جن میں خود مختاری کی روح نہایت شدید چلی آ رہی تھی۔ یہاں قبائل کے جنگی سردار نہیں بلکہ خاندانوں کے سردار قدرتی حکمران تھے۔ اور خاندانوں پر کامل اختیار و اقتدار رکھتے تھے۔ یہی آیندہ چل کر مجلسِ اعیان کے ارکان اور حکمران اُمرا بن جاتے تھے۔ یونان کی طرح یہاں بھی قبائلی جمہوریت کی سرکش قوتوں نے "شاہی" کے تصورات کو بالکل محو کر دیا تھا۔ یونان کی طرح یہاں بھی اُمرا و عوام کے درمیان شدید تصادم و تزاحم ہو جاتا تھا۔ اور بالآخر خود عامی طاقتیں اتنی قوی ثابت ہوتی تھیں۔ کہ اُن کے حقوق پر چھاپا مارنے والوں کو پوری کامیابی نہ ہو سکتی تھی۔ جس طرح ایتھنز میں سلونیا اور کلیستھینیا کے انقلابات رونما ہوتے۔ اُسی طرح روما میں بھی "مقدس پہاڑی کی وراثتوں" اور اُن کے لیسینی قوانین کا قصہ پیش آیا تھا۔

لیکن بادی النظر میں جو مشابہت نظر آتی ہے۔ اُس کے اندر ایسے فرق و تفاوت بھی تھے۔ جو خاصے گہرے تھے۔ افلاس زدہ ہیلاس کے یونانی بحر پیما۔ سمندری قزاق اور طالع آزما تھے۔ اور مشرقی دُنیا کے

تمام ثمرات سے بہرہ اندوز ہوتے تھے۔ ان کے مقابلے میں رومی خانہ نشین کاشتکار تھے۔ اور کاشتکاروں کی محدود نظر۔ قدامت پسندی۔ شدید پرہیز گاری۔ محنت و جفاکشی۔ کنجوسی اور موقع شناسی اُن کی خصوصیتیں تھیں۔ چونکہ انھیں اپنی فصلوں کی حفاظت اور اپنے ہمسایہ قبائل سے سرحدی منافشات کے تصفیہ کی خاطر جد و جہد کرنی پڑتی تھی۔ اس لئے اُن کی زندگی کا ایک معمول بن گیا تھا۔ کہ وقتاً فوقتاً جمعیت فراہم کر کے لڑنے کو نکلیں لیکن وہ نہ طبیعت کے جھگڑالو تھے۔ نہ خاص طور پر جنگ کو پسند کرتے تھے۔ وہ جنگ بھی نہایت کاروباری طور پر سوچ کر کرتے تھے۔ اور ابتدا ہی سے یہ فن سیکھ چکے تھے۔ کہ گفت و شنید۔ اتحادات اور شدید سودے بازی سے مقاصد کیونکر پورے کئے جا سکتے ہیں۔ وہ اندھا دھند طالع آزمائی پر ہرگز بھروسا نہ کرتے تھے۔ بلکہ اس کو ناپسند کرتے تھے۔

یہ تقدیر کا ایک عجیب و غریب کرشمہ ہے۔ کہ ان محتاط اور بے تخیل اطالوی "بوڑھوں" پر فاتحین عالم بننے کا منصب تھوپ دیا گیا۔ جب انھیں پہلی پیونک جنگ کے بعد وسیع غیر ملکی تصادمات سے سابقہ پڑا۔ تو انھوں نے اس حکمت عملی کا اعلان کیا۔ کہ علاقوں کا الحاق نہ کیا جائے گا (تاوان جنگ البتہ کثیر وصول کیا جائے گا) جب سیپیو نے (آج کل کے منرو عقیدے کی مانند) اعلان کیا۔ کہ ٹسکن ایپی نائن اور جزیرہ نما سے آگے کے علاقے پر قبضہ نہ کیا جائے گا۔ تو گویا اُس نے رومیوں کے ایک عام اور گہرے روایتی احساس کا اظہار کیا۔ پھر یہی احتیاط خاصا زمانہ گزرنے کے بعد ہمیں آگسٹس کے سیاسی معاہدہ میں بھی نظر آتی ہے۔ اور ہیڈرین نے ٹراجن کی فتوحات سے دست بردار ہو کر اسی قناعت و احتیاط کا اظہار کیا تھا۔ لیکن یہ صورت حالات اُس وقت بدلی۔ جب نکولس اور پاپیے پونٹس اور شام سے ناقابل تصور دولت سمیٹ کر لائے۔ تو اس کو

دیکھ کر اُن رومی کاشتکاروں کی آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ گئیں۔ اُن کے دماغ مختل ہو گئے۔ اور اُنھیں بھی جلد از جلد دولت مند ہو جانے کا بخار چڑھ آیا۔ اُنھیں جہانگیری اور کشور کشائی کا شوق محض اس لئے نہیں ہوا کہ اُنھیں عظمت و جلال کے حصول کی خواہش تھی۔ یا وہ مشرقی مطلق العنانوں کی طرح نشۂ پندار سے سرشار تھے۔ یا سلطنت قائم کرنا اور حکمرانی کا ڈنکا بجانا اُن کا نصب العین تھا۔ بلکہ بات صرف اتنی تھی۔ کہ وہ روپیہ جمع کرنا اور جلد سے جلد دولت مند بننا چاہتے تھے۔ اُنھیں جلد ہی معلوم ہو گیا۔ کہ فتوحات کے ساتھ بے شمار مواقع اور گنجائشیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ محاصل کے اجارے۔ فوجی ٹھیکے۔ سیاسی ترقی کے خواہشمندوں کی مالی امداد۔ انتہائی شرح سود پر ساہوکارا اور سب سے بڑا انعام کسی صوبے کی حکومت جس میں لگان کی فراہمی پر کونسل پر چھوڑ دی جاتی تھی۔ اور پھر اس کو کوئی نہ پوچھتا تھا۔ کہ تم کیا کر رہے ہو۔ یہ گویا کثیر دولت جمع کرنے کے بڑے بڑے ذرائع تھے۔ اُس زمانے میں نہ صنعتی کارخانے تھے۔ نہ تیل کے چشمے نہ ریلیں اور نہ بڑی بڑی تجارتی تنظیمات تھیں۔ روپے کی سرمایہ کاری ضروری تھی۔ اور چونکہ اُس کے لئے نہ صنعتی و تجارتی کمپنیوں کے حصے تھے۔ نہ سرکاری تمسکات تھے۔ لہٰذا مستقل سرمایہ کاری کا صرف ایک ہی ممکن ذریعہ تھا۔ اور وہ اراضی تھی۔ چنانچہ یہ لوگ اپنا سرمایہ اراضی میں لگاتے تھے۔ چونکہ ابتدائی چھوٹا کاشتکار فوج کی نوکری کی وجہ سے عام طور پر غیر حاضر ہوتا تھا۔ اس لئے اُس کے کھیت جو بعض بوڑھے رشتہ داروں یا چند غلاموں کے سپرد ہوتے تھے۔ بالکل تباہ و برباد ہو جاتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا۔ کہ اُس کی اراضی بآسانی رہن یا بیع کرائی جا سکتی تھی۔ چنانچہ اٹلی بہت بڑی بڑی جاگیروں میں تقسیم ہو گیا جن کو اُن غلام مزدوروں کی مدد سے جو جنگوں کی وجہ سے بافراط دستیاب ہو رہے تھے کفایت کے ساتھ کاشت کیا جاتا تھا۔ اور اُن سے زیادہ سے زیادہ پیداوا

حاصل کی جاتی تھی۔ اٹلی کے بعد غیر ملکی صوبجات بھی اسی راستے پر گامزن ہو گئے۔ Verres کے خلاف مشہور مقدمے میں سسرو نے اس حقیقت کا اظہار کیا۔ کہ سسلی کے ایک ضلع میں جہاں Verres مالک کل کی حیثیت سے گیا تھا ۷۷ مالکان اراضی تھے۔ جو تین سال کے بعد صرف ۳۱۸ باقی رہ گئے۔ ابتدائی سیزروں کے عہد میں افریقہ کا آدھا صوبہ صرف چھ بڑے زمینداروں کی ملکیت تھا۔

روپیہ جمع کرنے اور سرمایہ کاری کرنے میں کوئی مضائقہ نہ تھا لیکن سوال یہ تھا۔ کہ زمین سے محروم ہو جانے والے کاشتکار کا کیا حشر ہوگا۔ کوئی کارخانہ یا روزگار کی کوئی دوسری سبیل نہ تھی۔ جس سے وہ معاش حاصل کر سکتا۔ چنانچہ یا تو اُسے پھر فوج میں جانا پڑتا۔ یا سلطنت کے خرچ پر روما میں بیکار رہنا پڑتا۔ اُس کے پاس کوئی اثاثہ باقی نہ رہا تھا۔ Tiberius Gracchus نے کہا: "تمھارے جرنیل اپنے آدمیوں کو جنگ میں جانے کی ترغیب دیتے ہیں۔ اور اُن سے کہتے ہیں۔ کہ تمھیں اپنے گھروں اور اپنے عزیزوں کی قبروں کی حفاظت کے لئے لڑنا ہے۔ حالانکہ یہ بالکل جھوٹ ہے۔ ان تمام رومیوں میں ایک بھی ایسا نہیں جس کا کوئی گھر گھاٹ ہو۔ یا خاندان کا کوئی قبرستان ہو۔ وہ محض اس لئے جنگ کرتے اور مرتے ہیں۔ تاکہ دوسرے عیش و عشرت اور دولت سے بہرہ اندوز ہوں۔ ان رومیوں کو "دنیا کے مالک" کہا جاتا ہے۔ حالانکہ اُن کے پاس زمین کا ایک ٹکڑا بھی نہیں جسے وہ اپنا کہہ سکیں۔ لکڈس۔ پامپے اور سیزر نے جو لڑائیاں لڑیں۔ اُن میں لاکھوں غلام پکڑے ہوئے آئے۔ جو بڑی جاگیروں پہ محنت مشقت کرتے تھے۔ لیکن بعد میں دفعتہً غلاموں کی فراہمی کا یہ سلسلہ کم ہو گیا۔ غلاموں کے ہاں اولاد نہ ہوتی تھی۔ اُن کے کوئی خاندان نہ تھے۔ اور عورتیں بہت ہی کم تھیں۔ وہ لوگ ارزاں ہونے کے بجائے

خاصے گراں ہو گئے۔ اور مزدوروں کی بہم رسانی ختم ہو گئی۔ چنانچہ اُن کی جگہ آزاد لوگ آباد کاروں کی حیثیت سے رکھے گئے۔ یہ لوگ زمین کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وابستہ ہو گئے۔ پہلے وہ لگان ادا کرتے تھے۔ اس کے بعد پیداوار میں بٹائی دیتے تھے۔ اور دوسرے بے شمار بوا جب اُن پر متزاد تھے۔ پھر اُنہیں زمیندار کے محل میں کام کرنے کے لئے محنت کرنی پڑتی تھی۔ اور نقل و حمل کے سامان مہیا کرنے پڑتے تھے۔ اور آخر Dioc letion کے ماتحت وہ کاملاً اراضی سے وابستہ کر دیئے گئے۔ اور اُن کی نقل و حرکت ممنوع قرار دی گئی۔ وہ ہر اعتبار سے غلام بن گئے۔ وہ محض نام کے کاشتکار تھے۔ پھر اُن کی تعداد بھی کم ہو گئی۔ پوری آبادی کی تعداد میں تخفیف ہو گئی۔ یہاں تک کہ ایک نہایت شدید اور سنگین مسئلہ پیدا ہو گیا۔ کہ محض دفاعی مقاصد کے لئے افواج کی تعداد کو کیونکہ برقرار رکھا جائے۔ ابتدائی سلطنت کی سرحدیں بے حد وسیع تھیں۔ اتنی وسیع کہ گزشتہ جنگ میں تمام محاذات جنگ پر ہمارا "خطِ حرب" بھی اتنا وسیع نہ ہو گا لیکن ان سرحدوں کی حفاظت کے لئے جو فوج متعین تھی۔ وہ صرف تین لاکھ کی نفری پر مشتمل تھی۔

یونانی ثقافت جس کی آنھوں نے پہلے پہل شدید مزاحمت کی تھی۔ وہ لئیمند کسانوں کی زندگی میں کوئی خاص تغیر پیدا نہ کر سکی۔ وہ لوگ نہ اس کو جاری رکھ سکے۔ اور نہ اسے ابتدائی نشو و ارتقا کا نقطۂ آغاز بنا سکے۔ تہذیب کے درو بست نے اُن میں عام بھونڈا پن پیدا کیا۔ اور وہ اسی ابتذال اور بٹائی کے خبط کا شکار ہو گئے۔ جو تو دو لتے لوگوں کا خاصہ ہوتا ہے۔ ان کے تصویری فنون روکھے پھیکے اور عقیم رہے۔ وہ صرف جسم کی ہو بہو شبیہیں تیار کر سکتے تھے۔ حالانکہ مثالیت پرست یونانیوں نے کبھی ہو بہو شبیہ کھینچنے کی کوشش نہ کی تھی۔ فن تعمیر میں اگرچہ اُنھوں نے صنعت معماری کو بڑی ترقی دی۔ مثلاً محراب اور گنبد کو کمال تک پہنچایا لیکن خالص فنکارانہ اور آرائشی پہلو

سے بداخلاقی کا ہولناک مظاہرہ نہیں کیا۔ بلکہ اُس کو دائمی بنا دیا۔ مثلاً پشتیبانوں اور مرکب ترتیبات کو رواج دے دیا۔ وہ یونانی ڈراما کو سُننے سے بیزار ہوتے تھے۔ اور مسخروں۔ بھانڈوں اور بازی گروں کے کھیل تماشوں کو ترجیح دیتے تھے۔

یہی شخص سی پیادہ پائی" آخر تک اُن کی ذہنیت کی خصوصیت رہی۔ وہ "آتش مقدس" یا اسی قسم کی دیوتائی حماقتوں سے کبھی کوئی تعلق نہ رکھتے تھے ادبیات میں اُن پر عروج و کمال کا جو مختصر اور عارضی دور آیا۔ اس میں بھی وہ نہ دنیا کے تخلیقی ادیبوں کی صف میں کسی ایک کا اضافہ کر سکے۔ اور نہ حقیقی اور طبعزاد اور جوش و احساس پیدا کرنے والی تصانیف ہی دُنیا کو دے سکے۔ مستثنیات میں ایپی کیورس کے مفسر اور شارح لُکریشیئس اور کلاڈیا مٹیلا کے عاشق کیٹولس کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ پہلے پہل تو نقالانہ تصنیفات کی بھرمار ہوئی۔ اور وہ بھی مختصر زمانے تک لیکن اس کے بعد "بانجھ پن" مدت دراز تک جاری رہا۔ اس کے بعد رومن فکر ثقافتی روایت پرستی کی "لکیر" پر پڑ لیا۔ اس فکر پر اُن "عظیم نمونوں" کا ناقابل برداشت بوجھ مسلط تھا۔ جنھوں نے قابل حصول عمدگی اور نفاست کے معیار قائم کر دیئے تھے۔ ادب کا نصب العین صرف یہ تھا۔ کہ اُن "مقدس" اور باکمال ادیبوں کی ہیئت اور زبان کی تقلید حتی الامکان مدنظر رہے جنھوں نے ہمیشہ کے لئے مثالی نمونے قائم کر رکھے ہیں۔ جس زمانے کو "عہد سیمیں" کہا جاتا ہے یعنی کیونیٹیلین اور پلائنی کے دقیانوسی عہد احیائے علوم میں فن ادب محض سسرو کی نقالی پر مشتمل تھا۔ جس کی زبان اسی طرح "مُردہ" تھی جس طرح اٹلی کے احیائے علوم کے دوران میں بے جان تھی۔ دوسرے انشا پرداز مثلاً فرانٹو اور اپولئیس اس سے بھی زیادہ قدیم زبان اور اسلوب کے پابند تھے۔

سلطنت کے آخری ایام میں جو ثقافتی عناصر باقی رہ گئے تھے۔ اُن میں

بالکل وہی انداز و رجحان ظاہر تھا۔ جو صدیوں بعد احیائے علوم کے صرفی نحوی ادبی مؤرخوں اور قدامت پرست انسانوں میں نظر آتا ہے۔ یہ اُنہی کی طرح ماضی میں زندگی بسر کرتے تھے۔ Ausonius، Symmachus اور اُن کے معاصر ادیب کسی ذہنی تغیر کے بغیر چوتھی صدی سے اُٹھا کر پندرھویں صدی میں منتقل کئے جا سکتے ہیں۔ لطیف و شائستہ ثقافت کا نصب العین ان زمانوں میں بالکل یکساں تھا۔ بلکہ قدیم علوم کی تحقیق کی روایت کے طور پر خود ہمارے زمانے تک برابر چلا آ رہا ہے۔ مثلاً سِسرو کے زمانے کی تصانیف کو صحیح طور پر نقل کرنا۔ ورجل کے خوش اسلوب شش رُکنی بحروں میں اشعارِ آبدار کہنا۔ یا ہوریشیو کے اشعار کی نقل کرنا جو نہایت عفونت آمیز صنمیاتی زبان میں آلودہ ہوتے تھے۔ شائستہ ادب پر پاکیزہ گفتگو میں کسی پیش پا اُفتادہ موضوع کی مکمل تشریح کرنا۔ اور بے شمار اقتباسات پیش کر کر کے اُن مصنفین سے اپنی واقفیت کا ثبوت دینے میں طفلانہ مسرت محسوس کرنا بعض مقدس جملوں کو روحانی بے مغزی کے ساتھ دُہرانا اور "علم و فضل کی بلندیوں سے عامۃ الناس پر حقارت کی نظریں ڈالنا"۔ ادب۔ فلکہ بلکہ خود زندگی ایک قسم کی رسمی عبادت بن کر رہ گئی اور مقررہ اصول و فرائض کا ایک چکر چلا۔ جو دُنیا کے دھڑکتے ہوئے حقائق سے بالکل منقطع تھا۔ غرض ایک کتاب مقدس تھی جس میں جائز باتوں کو جائز طور پر کہنے۔ سوچنے اور کرنے کی ہدایات درج تھیں۔

لیکن ایک نقالانہ ذہنی ثقافت کے اس تحجر کے پہلو بہ پہلو حقیقی نشو و نما کا عمل بھی جاری رہا۔ جو روما کے سیاسی ورثے سے علیحدہ (بلکہ اس سے بھی کاملاً منقطع نہیں) دُنیا کی تہذیب کو اس کا عظیم بالشان عطیہ ہے۔ اور اس کے ذہنی نشو و ارتقا کی نہایت بنیادی و امتیازی خصوصیت ہے۔ یہ مسلسل عمل خود ثقافت کی پہلی ترویج سے لے کر اس کے آخری بقیہ آثار

تک رہا ہے اور متواتر جاری رہا۔ اخلاقی نشو وارتقا کا عمل ہے۔ یونان میں جب مابعد الطبیعی سعی وجہد میں پہلی دفعہ تکان کے آثار پیدا ہوئے۔ تو فلسفیانہ فکر کا رجحان یہ نظر آیا۔ کہ وہ زندگی اور کردار کے خالص انسانی مسائل پر اپنی توجہ مرتکز کر رہا ہے لیکن یہ رجحان زیادہ تر روما میں نشو ونما پا کر پختگی کی منزل کو پہنچا۔ حقیقت میں فلسفہ کا صرف اخلاقی پہلو ہی تھا۔ جو اہل روما کے نزدیک بے حد پسندیدہ تھا۔ مابعد الطبیعیات سے انھیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ یونانیوں جیسی بلاغت وجامعیت کے ساتھ اخلاقی وعظ کہنا ان کی کاشتکارانہ نفسیات کا ہمیشہ سے ایک جزو چلا آتا تھا۔ رواقیت کا مسلک جو قدیم لاطینی زہد و تقویٰ سے مشابہ ہونے کی وجہ سے ان کے عوام کا مذہب بن گیا۔ اور رومن فکر کا ممتاز رجحان قرار پایا۔ چونکہ یہ چیز مہذب طبقات کی سب سے بڑی ذہنی مصروفیت تھی۔ قانون کے دائرے اور اصول قانون کے نشو وارتقا سے مطابقت رکھتی تھی۔ لہٰذا یہ روما کی عظیم ترین اور مستقل ترین حقیقی کامیابی کا باعث ہوئی۔ تمام رومن مفکر قانون دان تھے۔ ان کی آخری منزل مقصود۔ ان کی تعلیم کے عملی اطلاق کا میدان اور ان کی ادبی۔ خطابتی اور فلسفیانہ تربیت کی جولانگاہ صرف قانونی عدالتیں تھیں۔ چونکہ سلطنت توسیع پذیر تھی۔ اور بہت سے انتظامی امور و مسائل انھیں درپیش تھے۔ اس لئے ان حالات کا طبعی نتیجہ یہی ہونا تھا۔ ان کے محتاط اور عملی ذہنوں نے یہ عظیم حقیقت معلوم کر لی تھی۔ کہ انسانوں پر حکومت کرنے کا صرف ایک ہی مؤثر طریقہ ہے۔ کہ عدل و انصاف سے کام لیا جائے۔ دیانت کاروبار میں بہت بڑا اثاثہ ہے۔ خواہ وہ کاروبار یہی ہو۔ کہ انتہائی حد تک خلاف اخلاق طور پر عوام کو استحصال کا شکار بنایا جائے۔ ان پر مدت سے یہ امر روشن ہو چکا تھا۔ کہ مفتوح آبادیوں پر آزادی اور انصاف کے اصول کے ماتحت حکومت

کرنا عملاً کارآمد ہے۔ اور مالی اعتبار سے بھی نہایت نفع بخش ہے۔ ان حالات میں ضرورت اس امر کی تھی۔ کہ "بارہ تختوں" کے قدیم ضابطہ کو مسلسل اختیار کیا جائے۔ بلکہ ان میں مقدمات کے فیصلوں کے ذریعے سے اضافہ کیا جائے۔ مختلف النسل آبادیوں کے ساتھ اصولِ عدل کے مطابق سلوک ضروری تھا۔ یعنی ان قانونی معمولات کے مطابق جو تمام قوموں میں مشترک ہیں۔ کچھ مدت کے بعد اس اصول نے اصول مساوات قانونی کی شکل اختیار کر لی۔ یعنی قدرتی اصولِ مساوات جس کا وجود اگرچہ کسی مثالی "حالتِ فطری" سے متعلق فرض کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کا اصل مطلب یہ تھا۔ کہ تمام معاشری مراعات و امتیازات اور تمام خودمختارانہ روائتی معمولات محض مصنوعی رسوم سمجھے جائیں۔ اور انصاف کو صرف سادہ مساوات کے لازمی اصول موضوعہ پر مبنی قرار دیا جائے۔ روسو اور Droits de l'homme سے پندرہ صدیاں پیشتر Ulpian نے یہ اصول قائم کیا۔ کہ "تمام انسان آزاد اور مساوی پیدا ہوئے ہیں"۔ رومن قانون کی روح عدل و انسانیت مسلسل و متواتر رومن سلطنت کے آخری سانس تک برابر وسیع ہوتی گئی۔ اس نے پدری اقتدار کی ظالمانہ روایت کو منسوخ کیا۔ بیواؤں اور یتیموں کی حفاظت کی۔ غلامی کے شدائد کو اس قدر کم کیا۔ کہ تنسیخ کے قریب پہنچا دیا۔ یہ گویا رومن ذہن کا بلند ترین کارنامہ تھا۔ رومن قانون کی اس عظیم نشوونما سے اُن کے فلسفیانہ فکر اور زندگی کے عقلی نظریے کو پہلے ہی دن سے جدا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ روما کے فلسفی ہی اس کے وکلا اور واضعین قوانین تھے۔ عدالتی اور فلسفیانہ فکر بالکل ایک تھا۔

رومن قانون حقیقت میں صرف ایک اخلاقی ارتقا کا مظہر اور ایک خاص اخلاقی نصب العین کا اقدام تھا۔ جو رومیوں کے ذہن کی پوری

تاریخ پر پھیلا ہوا ہے۔ اور (اگرچہ میں فی الحال اس کے قطعی جواز کے متعلق رائے دینے کو تیار نہیں) جو اخلاقی برتری کے اعلیٰ معیار کا نمایندہ تھا اور آج تک بھی عام طور پر ایسا ہی سمجھا جاتا ہے۔ اخلاقی نشو و ارتقا کے اس سلسلے کے مظاہر یہ ہیں۔ مثلاً Talmud Tasion کی ہجو قبیح اور شمالی جرمنوں اور ایگریکولا لوگوں کے متعلق واعظانہ رسالے۔ طنز نگاروں کے خلاف شدید ملامت و دشنام جس سے اُس دور کے رومانی افسانے کا مواد مہیا ہوتا ہے۔ کہ "اخلاقی خرابیاں روز افزوں ہو رہی ہیں" زیادہ بلا واسطہ طور پر اخلاقی اور عبادتی کتابوں کے سلسلۂ طویل کو دیکھنا چاہیے۔ اور اُن "پیغامات تسکین" کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ جو سسرو نے سنیکا۔ ایپک ٹیٹس۔ مارکس اور یلیئس اور پلوٹارک کو بھیجے تھے۔ اس "غیر مذہبی اخلاقی مذہب" کے قیام کو غیر رسمی اداروں کا ایک پورا گروہ تقویت دے رہا تھا۔ اخلاقی وعظوں کی مجلسیں زندگی کے باقاعدہ معمولات میں شامل ہو گئی تھیں۔ اور مقبول عام واعظوں کے خطبات کو سننے کے لئے بڑے بڑے ہجوم جمع ہو جاتے تھے۔ پولس ایمیلیئس کے زمانے کے شرفا کے گھروں میں اپنے اپنے نجی واعظوں اور فلسفیوں کو مستقل طور پر رکھنے کا رواج ہو گیا تھا۔ تکلیف و مصیبت کے ہر زمانے کے بعد مشہور ترین روحانی ہادیوں سے نصیحت اور تشفی حاصل کرنے کا شوق عام تھا۔ چپکے سے اعترافِ گناہ کر لینے کی ہدایت ہمیشہ دی جاتی تھی۔ اور اس پر عمل بھی کیا جاتا تھا۔ اور یہ تحریک فقط مہذب لوگوں اور اشراف ہی تک محدود نہ تھی۔ دارالخلافے میں اور آس پاس کے دیہات میں سفری واعظین بھرے پڑے تھے۔ اور "بھکاری بھائی" (جن کے قواعد و احکام ایپک ٹیٹس نے ہمارے لئے مدون کر دیتے ہیں) عام آبادیوں کو اُن کی اپنی زبان میں وعظ کہتے تھے۔ کہ اسفع زندگی اختیار کریں۔ ان لوگوں نے مفلس اور مجرد رہنے کا عہد کر

رکھا تھا۔ وہ سب کے باپ تھے۔ مرد اُن کے روحانی بیٹے تھے۔ اور عورتیں اُن کی روحانی بیٹیاں تھیں۔ وہ خدا کے پیغامبروں کی حیثیت سے توبہ و انابت کی تلقین کرتے تھے۔ وہ تضحیک و استہزا بلکہ زدوکوب کو بھی سکون سے برداشت کرتے تھے۔ اور بدسلوکی اور اذیت پہنچانے والوں سے بھی محبت کرتے تھے۔

مغربی سلطنت کی آخری صدیوں میں اخلاق آموز چرچا ایک پرانے مذہبی جذبے کی طرح کسی قدر متعفن اور روائتی ہونے لگا۔ زمانۂ انحطاط کے رومی شرفا خصوصاً وہ جو صوبجات میں رہتے تھے۔ (بڑے بڑے اور دولتمند شہروں کی زندگی ہمیشہ منافی اخلاق ہوتی ہے) نہایت پرہیزگار تھے یعنی متوسط طبقے کی نیکیوں کا مجسمہ تھے۔ اور اُن کا رویہ جذبات میں کیا اور ادبی ذوق میں کیا۔ باعتبار اخلاق نہایت مناسب و مستحسن تھا۔ وہ اور اُن کی عورتیں بالکل ایسی تھیں۔ جیسے ملکہ وکٹوریا کے ابتدائی عہد میں تھیں۔ وہی جوانی وصحت کا بھاری بھرکم احساس۔ وہی احتیاط اور رکھ رکھاؤ۔ اور اخلاقی اصول کے بیان میں وہی سنجیدہ شغف اُن میں بھی پایا جاتا تھا۔ یہ شرفا خیرات بھی دیتے تھے۔ اور اپنے خدام کو خاندانی دعائیں پڑھ کر بھی سُنایا کرتے تھے۔ اگر انھوں نے مسیحیت کو قبول نہ کیا تھا۔ تو اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ اُن کی جمی ہوئی قدامت پسندی نئی نویلی نسبتوں سے بہت گھبراتی تھی۔ انھیں اس امر کا یقین نہ تھا کہ گرجا کے لوگ حقیقت میں پسندیدہ ہیں۔ اور وہ اپنے اُن دوستوں کی بے وقارانہ بےاعتدالیوں کو درست نہ سمجھتے تھے۔ جو تارک الدنیا ہو کر بالوں کے بنے ہوئے کُرتے پہن لیتے تھے۔ لیکن جذبۂ اخلاق کے اعتبار سے وہ خالص اور عالی پایہ مسیحی تھے۔ بلکہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ کہ اُن کے مسیحی ہمسایوں کے اخلاقی جذبات بالکل وہی تھے۔ جو اِن رومیوں نے اپنی "کافرانہ" راستبازی میں حاصل کر لئے تھے۔ اور جن میں خارجی صوفیانہ اور

اذعانی عناصر بھی شامل تھے۔

دُنیائے قدیم کی ذہنی ثقافت اپنے نقطۂ عروج پر بھی ایک بنیادی کوتاہی اور کمزوری کا شکار تھی۔ اس کو حقیقی اور ٹھوس علم کی پشت پناہی حاصل نہ تھی۔ یہ سائینس سے قبل کی ثقافت تھی۔ عقلی فکر کی قوت کا انحصار دو عنصروں پر ہے۔ ایک اسلوب اور دوسرے حقایق و معلومات۔ جب تک کافی معلومات حاصل نہ ہوں۔ اور کافی تجربہ نہ ہو۔ تطابق اور عقلیت بالکل بے سُود ہیں۔ ایک طرف تفصیلات کا صابرانہ تفحص۔ تحقیق و تجسس کی مشقت اور حقائق کی آہستہ فراہمی ہے۔ اور دوسری طرف عمومیت قائم کرنے والے فکر کے وسیع فیصلے ہیں۔ اور بدقسمتی سے یہ دونوں چیزیں دو مختلف قسم کے ذہنوں کی صفات ہیں۔ کسی ایک امر کا مخصص جو چھوٹی چھوٹی تفصیلات کی چھوٹی سی دُنیا میں رہتا ہے۔ ان چھوٹی باتوں پر مطمئن ہوجاتا ہے۔ اور مسرت محسوس کرتا ہے۔ جب ایک چھوٹی سی حقیقت بالکل صحیح طور پر ثابت ہوجاتی ہے۔ تو وہ سمجھتا ہے کہ اُس کی ذہنی فعالیتوں کا انعام مل گیا۔ اُس کو یہی انعام کافی ہوتا ہے۔ وسیع اور نئے افق اُس کے لئے باعث کشش نہیں ہوتے۔ اور وہ عمومی اطلاقات کی ہلکی فضا میں بے تکلف زندگی بسر نہیں کرسکتا۔ اس کے برعکس مفکر بے حقیقت امور اور تفصیلات سے نفرت کرتا ہے۔ وہ فکر کے شہپروں سے پرواز کرنے کا عادی ہوتا ہے۔ اس لئے چھوٹے چھوٹے منقطع حقائق کے گرد و غبار میں رینگنا برداشت نہیں کرسکتا۔ جھینگا مچھلی کی ایک نئی قسم کے دُم چھلوں پر کتنے بال ہوتے ہیں۔ اس کو معلوم کرنا جس قسم کے اذہان کا کام ہے۔ وہ اُن دماغوں سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ جو حیات و کائنات کے بڑے بڑے مسائل پر غور و فکر کرتے ہیں۔ اور یہ اذہان نہایت پیش پا افتادہ۔ کوتاہ بین اور ادنےٰ قسم کے ہوتے ہیں۔ بلند تر

ذہن و دماغ رکھنے والوں کے نزدیک حقائق صرف اُسی حالت میں وقیع اور قابلِ توجہ ہوتے ہیں جب حقائق و تفصیلات کی افراط کسی عمومی اطلاق کے نظریہ سے روشن و مبرہن ہو جاتی ہے۔ اور ہر چھوٹی سے چھوٹی تفصیل کسی عظیم اور عالمگیر اہمیت کی شہادت کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔

چونکہ یونانیوں کو اپنی استدلالی آزادی اور لچک پر بڑا پندار و اعتماد تھا۔ اس لئے یونانی ذہن میں مشاہدے کے حقایق کے تقدس کا شعور کبھی پیدا نہ ہوا۔ یہ ذہن بالکل نظری اور مجرّد تھا۔ اس کے نزدیک صحتِ فکر کا مطلب صرف منطق و استدلال کی صحت تھی۔ لیکن اُس نے استدلالی عمل کی بنیادیں، فکر کے مواد و حقائق میں اور حاصل شدہ تجربے میں صحت کا کوئی تصوّر کبھی قائم ہی نہ کیا تھا۔ یونانی مفکرین ہر مضمون پر اور ہر صغرے کبرے پر منطق و استدلال کے جوہر دکھا سکتے تھے۔ اور جب تک یہ صغرے کبرے منطقی اعتبار سے معیّن رہتے۔ وہ لوگ اُن کی فی نفسہٖ معقولیت کے متعلق زیادہ پروا نہ کرتے تھے۔ انھیں تجسّس کا شوق ضرور تھا لیکن علم کے سکّوں کو جمع کرنے کی پیاس یا ان سکّوں کو کسوٹی پر کس کر اُن کی قدر و قیمت معلوم کرنے کا شغف نہ تھا۔ یونانیوں کا پورا ذہن خود ذہنی روش ہی پر مرتکز تھا۔ لیکن جس مواد پر وہ روش عمل کرتی ہے۔ اس سے وہ قریب قریب پوری غفلت کرتے تھے۔ وہ غور و فکر کے سمندروں میں طالع آزمایانہ جہاز رانی تو کرتے تھے۔ لیکن نہ اُن کے پاس کمپاس ہوتا تھا نہ مقناطیس۔ وہ اجنبی سرزمینوں کی تلاش میں روانہ تو ہو جاتے تھے لیکن اُن کے پاس سمتِ سفر معیّن کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔

یونانیوں کی قدیم کتابوں میں دو سے زیادہ ایسی چیزوں کا ذکر نہیں

ملتا جن کو سائنسی تجربہ کہا جا سکے۔ ایک تو فیثاغورث نے تانت کی تھرتھراہٹ معلوم کی۔ دوسرے بطلیموس نے انعطاف کا پتہ چلایا۔ پلائنی نے اپنے زمانے کے علم فطرت کا جو دائرۃ المعارف مرتب کیا ہے۔ اُس میں بہت سی عجیب و غریب سُنی سنائی باتوں کو تو جمع کر دیا ہے۔ لیکن لفظ "تجربہ" کا ایک دفعہ بھی ذکر نہیں کیا (یعنی اُن معنوں میں جن سے ہم تجربہ مراد لیتے ہیں) یونان کے نہایت باقاعدہ مفکرین میں (مثلاً ارسطو) ہمیں ایسے معاملات میں بھی حیرت انگیز بے پروائی نظر آتی ہے جن کی توثیق و تصدیق نہایت آسانی سے کی جا سکتی تھی۔ مثلاً ارسطو لکھتا ہے۔ کہ شیر کی گردن میں صرف ایک ہڈی ہوتی ہے۔ انسان کی آٹھ پسلیاں ہوتی ہیں۔ مردوں کے دانت عورتوں سے زیادہ ہوتے ہیں۔ دھڑکتا ہوا دل صرف مردوں ہی کے سینے میں ہوتا ہے۔ مادینوں کی کھوپڑیوں میں (نروں سے بالکل مختلف) ایک گول درز ہوتی ہے۔ انڈے سمندر کے پانی پر تیرتے رہتے ہیں۔ اور اگر سمندر کا پانی لاکھ کے برتن میں رکھا جائے۔ تو وہ پینے کے قابل ہو جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ یونانیوں کے پاس نہ کوئی سائنس تھی نہ سائنسی ذوق تھا۔ اور ظاہر ہے کہ قدیم اور جدید دُنیاؤں میں مابہ الامتیاز صرف سائنس اور سائنسی ذوق ہی ہے۔

حقیقت یہ ہے۔ کہ یونانی فکر پہلے پہل جن بُنیادوں پر تعمیر ہُوا۔ وہ کالڈیا اور مصر کی سائنس کے چند فراہم کردہ حقایق و اسالیب تھے۔ قدیم آئیونین مفکرین سائنسی ذوق کے زیادہ قریب پہنچ چکے تھے۔ اور بعد کے یونانیوں کو اُن کے برابر توفیق نہیں ہوئی۔ لیکن اُن کے نزدیک بھی زیادہ پسندیدہ مشغلہ مفروضہ قطعی اور اطلاق عمومی ہی تھا۔ وہ قیاس صحیح کی خداداد ودیعت کو جو سائنس کے بیش بہا آلات میں سے ہے۔ اور اس کی فتح عظیم ہے۔ نہایت معجز نما طور پر کام میں لاتے تھے۔ لیکن ظاہر

ہے۔ کہ سائینس کے آغاز میں اس بدعت کا دخل نہیں ہوا کرتا۔ لہٰذا یونانیوں نے ایک ہی سائینس میں کمال پیدا کیا۔ یعنی ریاضیات میں جو منطق ہی کی ایک قسم ہے۔ لیکن اس سے بھی اُن کی دل چسپی آلۂ تحقیق کی حیثیت سے نہیں۔ بلکہ منطق اور "موسیقی" کے سلسلے میں تھی۔ افلاطون صرف ریاضی کے طلبہ کو اپنا شاگرد بناتا تھا۔ لیکن اُس کے نزدیک اس لفظ کے کیا معنی تھے۔ وہ اس سے ظاہر ہیں۔ کہ جب Archytas نے Menaechmus ریاضیات ہی کے مطالعہ کے لئے چند سرکنے والے پیمانے اور پرکاریں اختراع کر لیں۔ تو پلوٹارک لکھتا ہے "کہ افلاطون نے نہایت ناراض ہو کر بار بار انھیں لعنت ملامت کی۔ اور کہا۔ کہ انھوں نے علم ہندسہ کے تمام حسن کو تباہ کر دیا ہے۔ کیونکہ اس طریقے سے یہ علم غیر جسمانی اور خالص ذہنی بلندی سے گر کر محسوس اشیا پر اُتر آیا ہے۔ اور علاوہ بریں یہ طریقہ ایسے اجسام کو کام میں لاتا ہے۔ جو پست و مبتذل آلات کے متقاضی ہوتے ہیں۔ یوں گویا میکانکیات علم ہندسہ سے خارج و مردود کر دیئے گئے۔ اور چونکہ فلسفہ مدت دراز تک ان کو حقارت کی نظر سے دیکھتا رہا۔ اس لئے میکانکیات فنونِ جنگ میں شامل ہو گئے"۔ جس شخص کی تصنیفات کے اثر سے ہم بھی متاثر ہیں۔ اور جسے ہم زمانۂ قدیم کا بہت بڑا سائینسی نابغہ سمجھنے کے عادی ہیں۔ یعنی ارشمیدس۔ وہ بھی بالکل افلاطون کا ہم خیال تھا۔ اور جب اُس سے کہا گیا۔ کہ وہ اپنے علم کا اطلاق عملی طور پر کرے۔ تو وہ نہایت بادل نخواستہ اور بڑے احتجاج کے بعد ریاضیات کو "ذلیل" کرنے پر آمادہ ہوا۔ اہل یونان نے صرف یہی نہیں کیا۔ کہ سائینس کی حقیقی اساس و بنیاد یعنی تجربی تحقیق اور مشاہدے سے تغافل اختیار کیا۔ بلکہ انھوں نے باصرار اس کو ذلیل و حقیر قرار دیا۔ اور اس کی اشد شدید مخالفت کی۔

Aristophanes نے فلکیات اور ہندسہ کی تضحیک کی۔ سیراکیوز میں ایتھنز کے Nicias کو چاند گرہن کے موقع پر کاہن اور پیشگویاں نے اس طرح اپنا شکار بنایا۔ جیسے وہ کوئی وحشی جانگلو ہے۔ حالانکہ تھیلز اور انیکسا غورث کو بابلیوں کا وہ طریقہ معلوم تھا۔ جس سے وہ گرہن کی پیشگوئیاں کیا کرتے تھے۔

یہ بات حقیقت ثابتہ کے طور پر کہی جاتی تھی۔ کہ "سقراط فلسفہ کو آسمان سے زمین پر لایا۔ اُس نے کہا (اور ہم بھی اپنے آس پاس اس دلیل کو اکثر سنتے ہیں) کہ آخر ہمیں کیا ضرورت ہے۔ کہ ہم اپنا وقت اور اپنا فکر آسمانوں کے مطالعہ میں صرف کریں۔ ستاروں کے فاصلوں کو ناپیں۔ مادہ کی ماہیت اور کائنات کی ترکیب کے متعلق جھگڑتے رہیں۔ اور پرندوں۔ چرندوں اور درختوں کی تحقیق میں مین میکھ نکالا کریں۔ ہمارے لئے جو بات اہم ترین ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ ہم زندگی کا مطالعہ کریں۔ اس انسانی زندگی کا جس سے ہمارا ہردم کا سابقہ ہے۔ نہ کہ جانوروں، کیڑوں اور پودوں کا۔ ہمیں صرف انسانوں کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ ستاروں اور گھونگھوں اور درختوں کے متعلق تحقیق کرنے سے پیشتر ہم اس موضوع کا علم حاصل کرنے کی کیوں کوشش نہ کریں۔ جو ہمارے قریب تر ہے۔ یعنی خود اپنے متعلق! نوعِ انسانی کا مناسب موضوعِ مطالعہ صرف انسان ہے"۔ بظاہر یہ کس قدر معقول اور دانشمندانہ بات معلوم ہوتی ہے۔ اور اس معقول بات کو عام انسانوں نے ہمیشہ کس قدر پسندیدہ سمجھا ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ ایک نہایت مہلک اور مضرت رساں مغالطہ ہے۔ یہ صرف ستاروں کو گھورنے ہی کا نتیجہ ہے۔ کہ انسان اپنی حیثیت اور کائنات میں اپنے تناسب اور اہمیت کا اندازہ لگانے کے قابل ہوا ہے۔ وہ چیز جسے "تاریخ فطرت"

کہتے تھے۔ یعنی پتنگوں کو جمع کرنے کا طفلانہ شغل اور پرندوں اور درختوں کے معمولات اور آشیاں سازی کا مطالعہ کرنے کا بے سُود اور بے حقیقت مشغلہ آہستہ آہستہ "علم الحیات" بن گیا۔ اور انسان۔ اس کی زندگی۔ اس کے وجود اور اس کی دنیا کا پورا تصوّر اور اس کی پوری اہمیت کاملاً متغیّر ہوگئی۔ انسان صدیوں تک اپنی انگشتری کے نگینے پر "عرفانِ نفس" کے الفاظ نقش کر کے اپنا اور انسانیت کا مطالعہ کرتا رہا۔ اور پُرانے دائروں میں ہر پھیر کر وہی پُرانی باتیں کرتا رہا۔ جن کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ لیکن دیکھو کہ اس کو اپنے متعلق جو حقیقی علم۔ جو روشنی اور جو انکشاف حاصل ہوا۔ وہ ستاروں کو گھورنے اور حیوانات و نباتات کے مطالعہ ہی سے حاصل ہوا۔ اُس نے سوچا تھا۔ کہ وہ اپنی قریب ترین شئے یعنی اپنے نفس کے مطالعہ سے آغاز کر رہا ہے۔ حالانکہ حقیقت میں وہ نیچے کی بجائے اُوپر سے ابتدا کرنے کی بے سُود اور بیکار سعی کر رہا تھا۔ وہ جب تک پہلے اُس دُنیا کے سمجھنے کی کوشش نہ کرتا جس میں وہ زندگی بسر کر رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو صحیح طور پر قطعاً نہ سمجھ سکتا تھا۔ حقیقت میں اسی دُور دست اور غیر متعلق تحقیق میں عرفانِ نفس کا راستا پوشیدہ تھا۔

چونکہ یونان کے تمام سائینسی تصوّرات وہی تھے۔ جو جہاں گشت آئیونیئن لوگوں نے مصر اور کالڈیا سے اخذ کئے تھے۔ اس لئے زمانہ قدیم میں اسکندریہ کی جامعہ بطلیموسی کی واحد منظم سائینسی تحریک مصر ہی کی سرزمین پر۔ اسی کے زیر اثر اور اسی کی بنیادوں پر واقع ہوئی تھی۔ صرف ایک یا دو قابل ذکر مستثنیات کو الگ کر دیا جائے۔ تو اسکندریہ کی سائینس نے اسلوب کے ابتدائی انکشاف و ارتقا کے بجائے اس کی ترتیب و تالیف کی طرف زیادہ توجہ کی۔ ریاضیات کے پہلے معلّم اُقلیدس نے اس سے زیادہ کچھ نہ کیا۔ کہ اپنے آئیونیئن

پیشروؤں خصوصاً Chios کے بقراط اور Cnidos کے Eudoxos کے بکھرے ہوئے ہندسی کلیات و اشکال کو مرتب و منظم کر دیا۔ آخرالذکر ہیلیوپولس کے پجاریوں کا دوست تھا۔ اور اس کے لبادے کو Apis کے سانڈ نے شکست دے دی تھی۔ اُقلیدس کے جانشین کولون کا شاگرد ارشمیدس تھا۔ اور اُس نے ایک ہی آلہ استعمال کیا تھا جسے "ارشمیدس کا پیچ" کہتے ہیں۔ اور جو یونان کے وجود میں آنے سے بھی پہلے دریائے نیل پر کام میں لایا جاتا تھا۔ علم ہیئت کا سب سے بڑا مرتب کرنے والا Hipparchos تھا جس کے کام کے متعلق صرف Chandius Ptolemaeus کی ایک بھدی سی کتاب سے سُراغ ملتا ہے۔ یہ کتاب فلکیاتی اوہام سے لبریز ہے۔ جنہوں نے پرندوبیری دو اثر کے دشوار اسالیب و عقائد کو صدیوں تک کے لئے جاری رکھا۔ Samos کے Aristarchos نے سب سے پہلے ایک مرکزی آفتاب اور گھومنے والی زمین کے نظریہ کی بنا پر علم ہیئت کو سادہ کر دیا۔ لیکن اُس کی کسی نے نہ سُنی۔

یہ قابل غور اور حیرت انگیز حقیقت ہے۔ کہ یونان اور روما جنھوں نے دُنیا کی ہیئت کاملاً بدل کے رکھ دی۔ اور تہذیب کی ایک نئی کائنات تخلیق کی۔ ایک بھی اہم عملی ایجاد یا صنعتی اکتشاف نہ کر سکے دُنیائے قدیم کی تمام تر صنعتیں اور حرفتیں مثلاً پارچہ بافی۔ رنگسازی۔ پیپیرس۔ شیشہ سازی۔ روغنی چینی مشرقی اکتشافات کا نتیجہ تھیں۔ اور ہمیشہ خالص مشرقی پیداوار رہی رہیں۔ بابل و مصر کے اوّلین ایام سے لے کر کسی اہم اور نئے مادّی اکتشاف کا سراغ نہیں ملتا۔ تا آنکہ عربوں نے یوروپ میں کاغذسازی۔ بارودسازی اور ناخداؤں کی قطب نما کو رواج دیا۔ جس دانش و بصیرت نے فکر و ذہن کی ایک ایسی نئی

دُنیا پیدا کر دی ہے جو مشرق کے مقابلے میں ایسی ہی تھی۔ جیسے آدھی رات کے مقابلے میں دوپہر۔ وہ زندگی کے مادّی قوا و وسائل کو وسیع کرنے میں بالکل قاصر و عاری رہی۔ جہاں تک مادّی عملیات کا تعلق ہے۔ روما والے یونانیوں سے بہتر تھے۔ اور انجنیرنگ۔ فنونِ عمارت۔ شارع سازی، معدنیات اور پانی کے نکاس کے طریقوں میں کمال رکھتے تھے۔ اور یونانیوں کو کبھی کوئی سڑک یا کاریز بنانے کی توفیق نہیں ہوئی۔ رومیوں کا عملی اور حقیقت پسند ذہن در اصل یونانیوں کے مقابلے میں مشاہدہ اور تحقیق کی طرف زیادہ مائل تھا۔ لیکن اس پر تسلط و اقتدار قطعاً یونانی روایات کا تھا۔ چنانچہ جب سیزر نے تقویم (کیلنڈر) کی اصلاح کا ارادہ کیا۔ تو ریاضی اور علمِ ہیئت کے ماہرین مصر سے بُلانے پڑے۔ یونان اور روما کی تہذیب "قبل سائینس" ہی کی تہذیب رہی۔

اس ضروری جزو کے فقدان کی حالت میں ذہن انسانی کی طاقتیں ایک خاص حد سے آگے حقیقی ترقی نہ کر سکتی تھیں۔ اگر ایتھنز بارہ دفعہ بھی بار بار پیدا ہوتا۔ تو یونان کا قدم اس سے آگے نہ بڑھ سکتا تھا۔ وہ اِدھر سے اُدھر ٹکریں مارتا پھرتا۔ اور گھوم پھر کر اپنے نقطۂ آغاز تک پہنچ جاتا۔ لیکن کسی مفتوحہ علاقے پر مستقل قبضہ جما کر اپنی پیش قدمی کا اہتمام نہ کر سکتا تھا۔ چنانچہ یونان و روما کی شاندار تعقل پسندی کے باوجود یہ غیر منطقی قوتوں کی امنڈتی ہوئی موجوں کے خلاف حفظ و دفاع کی ٹھوس دیواروں سے بالکل محروم رہا۔ زمانۂ حال کے تجربے سے بار بار یہ ظاہر ہوا ہے۔ کہ نہایت درخشاں مجرد ذہنی کامیابی بھی اُس وقت تک غیر محفوظ اور بے قوت رہتی ہے۔ جب تک اس کی بنیاد کو ناقابلِ تردید شہادت اور استدلال سے ٹھوس نہ بنایا جائے۔ سائینس کا یہ عام مسلمہ ہے۔ کہ حقیقی اکتشاف کا سہرا اُس شخص کے سر نہیں جو کسی چیز کی تشکیل کرتا ہے۔ بلکہ اُس کے سر ہے۔ جو اثبات و استدلال

سے اُس کا امکان قائم کرتا ہے۔ اصل قابلِ تعریف وہ فاضل مفکر نہیں۔ جس کو حقیقت کی پہلی کرنیں نظر آتی ہیں۔ بلکہ وہ مشقت کرنے والا مزدور ہے جو حقائق کو فراہم کر کے ایسی بنیاد مہیا کر دیتا ہے جس کو پوری دنیا ہل کر جنبش نہیں دے سکتی۔

قدیم ثقافت میں اس بنیادی مجبوری کے علاوہ ایک بات یہ بھی تھی کہ اُس کی اشاعت ناکافی تھی۔ اگرچہ اس میں "سینہ بہ سینہ اسرار" کی کوئی بات نہ تھی (حکمران طبقے کی طاقت کا مدار روایت پر نہیں۔ بلکہ دولت پر تھا) اس کے نشرو ترویج پر کوئی پابندی نہ تھی لیکن سلطنت روما میں ایسے لوگوں کا حلقہ درحقیقت بے حد محدود تھا۔ جو اُس زمانے کے ذہنی و فکری وسائل کے پہلو بہ پہلو چل رہے تھے۔ دولت مند لوگوں میں بھی بہت بڑی تعداد تو وہ تھے۔ مبتذل بیکار۔ بے شغل۔ خود ساختہ انسانوں کی تھی۔ جو ان چیزوں کی پروا نہ کرتے تھے۔ عام تعلیم کے لئے کوئی منظم انتظام موجود نہ تھا۔ اور اس کمی کو پورا کرنے کے لئے کوئی دوسری صورت (مثلاً چھاپے خانے) بھی نہ تھی۔ ایتھنز جیسی چھوٹی سی اور مربوط آبادی میں تو ہر شہری کم و بیش موجودہ ثقافت سے متاثر ہوتا تھا لیکن ایک وسیع سلطنت کی بے شمار مختلف النسل اور تغیر پذیر آبادی کا معاملہ بالکل مختلف تھا۔ انسانیت کے یہ عظیم ہجوم محض کچلے ہوئے مشرقی غلاموں کے گلّے نہ تھے۔ جن کے طفلانہ ذہن روایت کے دھندلکے میں چین کی نیند سو رہے تھے۔ بلکہ (جس طرح ہماری موجودہ تہذیب میں جن کے مواقع لامحدود ہیں) بہت سے "بے چین وحشی" بھی تھے۔ وہ بظاہر ثقافتی روابط کے ہلکے سے نقاب ڈالے ہوئے تھے۔ جو خود اُن کی نظروں سے بھی صرف اُن کی جہالت اور وحشت و بربریت کو چھپانے ہی کے لئے کافی تھے۔ اُن کی محروم انضباط ذہنیت اوہام و اسرار کے سیلاب میں غرق تھی۔ اور

یہ آن اذہان کی عام بیماری ہے۔ جن کو تہذیب کے خارجی اثرات نے تحریک تو دے دی ہو۔ لیکن وہ ابھی قطعی طور پر بے سروسامان اور غیر محفوظ ہوں۔ اُس زمانے میں انسانی زندگی پیچیدہ۔ تیز رفتار اور بے چین تھی۔ اور ناگہانی تغیرات سے لبریز، آلام اور کشمکشوں۔ کامیاب اور ناکام خواہشوں۔ مایوسیوں اور ناامیدیوں سے بھری ہوتی تھی۔ اس مصیبت زدہ انسانیت کو خواب پرست مشرق کے مذاہب نے فکر کا قائم مقام مہیا کیا۔ اور اپنے نور اور الہام سے اسے وہ کچھ دے دیا جس کی اُسے آرزو تھی۔ گویا مشرق ایک نجات دہندہ کی حیثیت سے اُن کو بچانے کے لئے آیا۔

روما نے اپنی ہستی کی خاطر مشرق کے خلاف موت و حیات کی جنگ کی۔ اور یونان کی طرح بالآخر اُسے مغلوب کر لیا۔ لیکن مشرق نے اپنا انتقام لے لیا۔ اور یہ انتقام یونان کے معاملے کی نسبت بہت زیادہ خیرہ کُن اور مکمل تھا۔ جس سال میں روما کو ھنی بال پر فتح مبین حاصل ہوئی۔ عین اُسی سال مشرق کی مذہبی حکومت کا ہراول روما کی دیواروں کے اندر داخل ہو کر جاگزیں ہو گیا۔ اس کو خود سینیٹ نے بُلایا تھا۔ کیونکہ کسی کاہن نے اُن کو ایک دُھندلی سی خوشخبری دی تھی۔ کہ اگر یہ اقدام کرلو گے۔ تو ایک عالمگیر سلطنت قائم ہو جائے گی۔ جس وقت سیپیو کا عظیم الشان جلوس جس کی مثال اس سے قبل نہ دیکھی گئی تھی۔ جھمجھماتی جھولوں والے ہاتھیوں اور سامی اسیروں کی عجیب سی شکلوں کے ساتھ شہر کے بازاروں سے گزرا۔ اور عام لوگوں نے جواب دُنیا کے مالک سمجھے گئے تھے۔ اُس کے خیر مقدم میں فلک شگاف نعرے لگائے۔ تو پُرانے اور حقیر سے Roma Quadrata کے محلِ وقوع پر Palatine کے معبد سے غیر مُلکی مناجاتوں کے عجیب اور اُکتا دینے والے نغمے سنائی دیتے ہونگے۔ یہ مشرقی پجاری جو یہ مناجاتیں گا رہے تھے۔ ایک نوع کے افراد بھی تھے۔ جو رومی

فوج کی طرح اُسی مقام سے دُنیا کو فتح کرنے کے لئے کوچ کرنے والی تھی۔

اُس دن سے کالڈیا کے ایشیائی منجموں۔ مصر کے ساحروں۔ عبرانی سازشیوں۔ ایرانی جادوگروں۔ شامی جھاڑ پھونک کرنے والوں اور ہندوستانی سادھوؤں کے ہجوم کے ہجوم آنے لگے۔ اور مشرق نے متین و سنجیدہ۔ چُپ چاپ مُنڈے ہوئے سروالے اور کلاہ پوش پجاریوں کو ہر مذہب کے ساتھ انبوہ در انبوہ بھیجنا شروع کر دیا تاکہ شہر پر قبضہ کرلیں۔

روما کے فلسفی اخلاق پرستوں کے نزدیک (جو مابعدالطبیعیات سے پرہیز کرتے تھے) اُن کے اخلاقی یقینیات۔ خواہشات اور مساعی کو کسی خارجی اذعانی یا جذباتی اعانت کی ضرورت نہ تھی۔ اور وہ "اپنے سینے کے اندر پیدا ہونے والی الوہیت" کے سوا اَور کسی مذہب کے جویا نہ تھے۔ خدا کی بادشاہت خود اُن کے اندر تھی۔ وہ اُن بربری اور نسوانی اوہام کو نہایت نفرت و استکراہ سے دیکھتے تھے۔ اور اُنھیں ناکام اور خارج کر دینے کے لئے مدت دراز تک کوشاں رہے۔ لیکن جاہل اور تکلیف زدہ عوام اور زیادہ تر عورتوں کے اذہان کو اُن مشرقی مسلکوں کی بہتری روحانیت میں وہ سب کچھ مل گیا جس کی اُنھیں پیاس تھی۔ جب نیم تاریک مقدس معبدوں کی غیر دُنیاوی فضا میں سنجیدہ موسیقی کی لہریں اُٹھتیں۔ تو کبھی ایسا معلوم ہوتا۔ کہ وہ آوازیں کسی دُور دراز حلقے سے بلند ہو رہی ہیں۔ کبھی انسانی غم و الم پر رونے اور فریاد کرنے کی صورت اختیار کر رہی ہیں۔ اور کبھی فتح مند اُمید کے تواجد و تراقص سے بے اختیار پھوٹ پڑتیں۔ اُس وقت عوام کو امن و سکون کا ایک حیرت انگیز احساس ہو جاتا۔ جب عبادت کی پُر رُعب رسوم ادا کی جاتیں۔ دعائیں اور بھجن گائے جاتے۔ اور بتھراتی یا دری گمبھیر سُروں میں ذکر کرتے۔ کہ "خدا کا برہ دُنیا بھر کے گناہوں کو لے جاتا ہے" تو یہ سب کچھ اُن غریب عوام کے زخمی جذبات کے لئے تسکین کے مرہم کا کام

دیتا۔ اورجب کلیسا کا ملازم گھنٹی بجا کر اعلان کرتا۔ کہ عبادت آخری نقطۂ عروج کو پہنچ گئی ہے۔ اور پادری عود و بخور کے دھوئیں کے درمیان گھٹنوں کے بل بیٹھے ہوئے گروہ کی طرف مُڑتا۔ اور زندگی کی شراب سے بھرے ہوئے مقدس پیالے کو اپنے سینے تک بلند کرتا۔ تو لوگ ایک خاص روحانی جوش کی سنسنی سے سرشار ہو جاتے۔ جب اصطباغ کا آب مصفّا مصیبت اور گناہ کے دھبوں کو دھو کر صاف کر دیتا۔ تو وہ محسوس کرتے گویا انھوں نے نئی زندگی پائی ہے۔ اور اُن کے جذبات کا تصوّر کرو۔ جب روزہ داری اور عقوبت نفس کی شدید ریاضت کے بعد انھیں مُتبرک عشائے ربّانی میں شامل ہونے کی اجازت جاتی تھی۔ اور اس مقدّس روٹی میں سے کھانے کو کہا جاتا تھا۔ جو خود "خدا کا جسم" ہوتی تھی! جب آسمانوں کی ملکہ اپنے خداوند بیٹے کو گود میں لئے نظر آتی تھی۔ اور عورتیں اُس کے سامنے اپنے آلام و مصائب بیان کرتی تھیں۔ تو معلوم ہوتا تھا۔ کہ اُن کے آنسو ملکہ کے اُن آنسوؤں کے ساتھ مل رہے ہیں۔ جو وُہ "مُردہ خدا" کے غم میں بہا رہی ہے۔ اس سے عورتوں کو ناقابل بیان تسلّی و تشفّی حاصل ہوتی تھی۔ ایمان لانے والوں کے لئے موت کا خیال بھی خوفناک نہ رہا تھا۔ کیونکہ جس مسیحی اور شفیع نے خود قبر پر فتح پائی تھی۔ اُسی نے اُن کو حیات جاوید کا یقین دلا دیا تھا۔

مشرق اور مغرب نہ صرف ایک دوسرے سے بار بار ملے تھے۔ بلکہ اب تو ان میں ناقابل شکست اختلاط پیدا ہو گیا تھا۔ جب سلطنت مقدونیہ کے "یونانی مشرق" میں مشرق کے "طلوعی افسانے" اور پجاریوں کی رسوم، یونان کی منطق اور مابعد الطبیعیات کے ساتھ یکجا ہوئیں۔ تو اُن کے اختلاط سے بعض عجیب الخلقت اور مخلوط النسل خیالی ہیولے پیدا ہوئے بے شمار نئے مذاہب بمتعدد روشن ضمیر اور زاہد فرقے (Essenic ۔
(Therapeutrid اور Nagarene ، Ebiomtic

قدامت کے "عوض خمیر" سے برآمد ہوگئے۔ انطاکیہ اور اسکندریہ میں تصوف، کرامت، فلسفہ، تثلیث ربانی، یہود کے ٹونے ٹوٹکے، مصر کا جادو اور آرفی کی جعلی یونانیت سب مل ملا کر "غیر معقولیت کا سبت" منا رہے تھے افلاطونیت فلاطینیت بن گئی تھی۔ فلسفہ تھیوسوفی کی شکل اختیار کر گیا تھا اور مابعد الطبیعیات نے تشکک کا روپ دھار لیا تھا۔ کلام خدا بن گیا تھا
جس طرح روما کے Isiac اور Serapic مسلک اب قدیم مصر کا مذہب نہ رہے تھے۔ مِتھرائیت اب ایران کی زرتشتیت نہ تھی اسی طرح عیسائیت بھی یہودیت نہ رہی تھی۔ مذاہب کے درمیان رسوم و علامات کا باہم تبادلہ ہو گیا۔ اور وہ ایک نئی ہم زمان یکسانیت اختیار کر گئے۔ جو اُن قدیم موسمی رسوم کی نسبت جن سے اُن کی تخلیق ہوئی تھی۔ زیادہ ہم آہنگ تھے۔ اور عبادت گزار ایک معبد سے دوسرے معبد میں یوں چلا جاتا تھا۔ جیسے کوئی ایک ولی کے گرجے کو چھوڑ کر پاس ہی کے کسی دوسرے گرجے میں جا پہنچے۔

یونانی فکر کے بگڑے ہوئے اجزا و نقوش اور روما کی روحِ اخلاقی، دونوں تصوف کے مقبول عام جوش میں جذب ہو گئے۔ اور مشرق کے زاہدانہ و متقیانہ ذوق و شوق کے ساتھ مخلوط ہو گئے۔ جو ادارے اور برادریاں ہر مسلک کے ساتھ وابستہ تھیں۔ وہ انسانی رفاقت اور امداد باہمی کے جذبات اور احساسات کی پرورش کر رہی تھیں۔ خصوصاً مِتھرائیت (کیونکہ اس کا ماخذ اوستا تھا) سادہ ترین مسلک تھا۔ اور اس لئے مقبول عام مسالک میں پاکیزہ ترین بھی تھا۔ یہ مسلک غریب۔ پست و درماندہ اور محروم الارث طبقوں کی طرف زیادہ متوجہ تھا۔ آقا پیر اسرار عبادت میں اپنے غلام کے پہلو بہ پہلو جھکتا تھا۔ اور اس سے اکثر مطالبہ کیا جاتا تھا۔ کہ وہ اپنے غلام کو روحانی اعتبار سے اپنی نسبت رفیع و برتر سمجھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ مسلک

دوسرے تمام مسالک کو جذب کرکے اُن پر غالب آجائے گا۔ اور اُویلین کی خسروانہ سرپرستی کے ماتحت رومی دُنیا کا سرکاری مذہب تسلیم کرلیا جائیگا لیکن یہ حیثیت بالآخر ایک ایسے مسلک کو حاصل ہوئی۔ جو یونانی مشرق کی ایک نہایت پُرتکلف پیداوار بن گیا۔ اور اُس نے اپنی ہمہ گیر کنایہ آمیزی کی پُراسرار چھاؤں میں ہر اُس مذہبی تصور اور صوفیانہ فکر کو پناہ دے دی۔ جو دُنیا کے اندر معرضِ وجود میں آیا تھا۔ یہ مسلک متھرائیت کی طرح انطاکیہ سے آیا تھا۔ لیکن اس مشرقی شہر کے ایرانی عناصر سے نہیں۔ بلکہ یہودی عُنصر کی طرف سے (یا جیسا بعض لوگوں کا خیال ہے۔ خود یہودیا سے ماخوذ تھا) جہاں اس کے بعض تصورات نے مدت دراز سے Nazarenes اور Essenes کے خانقاہی سلسلوں میں نشوو ارتقا حاصل کیا تھا۔ لہٰذا جس طرح سابق میں یہودیوں نے روحانیت میں بابل اور ایران کا ممنون احسان ہونے سے نہایت سختی کے ساتھ انکار کردیا تھا۔ اسی طرح اس مسلک نے اپنی آزاد خصوصیت پر اصرار کیا۔ اور اپنے محسنوں کو نہ صرف تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ بلکہ اُن کو نشانہ ملامت بھی بنایا۔ بلاشبہ یہ مسلک دوسرے مسالک کے مقابلے میں مرّوجہ رُدح اخلاقیت کا ترجمان اور پُرزور حامی تھا۔ اور اُنہی کی طرح جذبۂ مواخات اور مذہبِ محبت کا علمبردار بھی تھا۔ لیکن اس پر اُن کے مقابلے میں ایک سیاہ دھبّہ یہ تھا۔ کہ وہ شدید طریقے سے نارواداری تھا۔ اس میں شک نہیں۔ کہ پروفیسر فالثادی گریشیا کا یہ کہنا زیادتی ہے۔ کہ "یہ نفرت کا مذہب تھا" لیکن وہ انسانی مصائب کی عمیق بے اطمینانی کا اظہار کرتا تھا۔ دُنیا کے ناقابلِ برداشت نظام کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اور حکومت روما کی مخالف لیکن بے زبان قوتوں کی ترجمانی کرتا تھا۔ یہی عوام الناس کی حمایت وہمدردی تھی جس نے اس مذہب کو

دوسرے تمام مذاہب پر لامحدود فوقیت اور برتری عطا کر دی تھی۔

رومن سلطنت کا زوال ہمیشہ سے فلسفۂ تاریخ کا بہت بڑا موضوع رہا ہے۔ عام طور پر اس زوال کی وجہ بیان کرتے وقت لفظ "بداطواری" کا استعمال کافی سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ جہاں تک سیاسی "بداطواری" کا تعلق ہے۔ رومن حکومت marino کے زمانے میں بھی اتنی ہی "بداطوار" تھی۔ جب ایک ادنٰے افریقی سردار جوگرتھا نے اُن تمام سفیروں اور جرنیلوں کو جو اُس کی سرکوبی پر متعین کئے گئے تھے۔ پیسہ دے کر خرید لیا تھا۔ بعد میں بھی یہی بداطواری جاری رہی۔ اور چوتھی اور پانچویں صدیاں بھی اس سے مستثنےٰ نہیں تھیں۔ اور جہاں تک "اخلاقی بداطواری" کا تعلق ہے۔ جب دوسری Punic جنگ کے بعد زمانۂ قدیم کی شدید سادگی پسندی بہت بڑی حد تک غائب ہوگئی۔ اور رومن سلطنت کا معاشرہ (جیسا ہم ابھی بیان کر چکے ہیں) زاہدانہ اخلاق کے مسلسل نشوونما کا نمونہ تھا۔ رومن سلطنت کو زوال کیوں ہؤا۔ اس کی واضح اور ظاہر وجہ عام طور پر یہ بیان کی جاتی ہے۔ کہ وہ سلطنت حد سے زیادہ وسیع تھی۔ حالانکہ اصل وجہ یہ ہے کہ وہ بہت چھوٹی تھی۔ اُس کے زوال کا باعث یہ ہؤا۔ کہ بے شمار وحشی اور بربری اس سے باہر رہ گئے تھے۔ اگر وہ جرمن لشکر موجود نہ ہوتے۔ جو دُنیا میں اپنے لئے خاص جگہ حاصل کرنے کے خواہاں تھے۔ تو رومن سلطنت اپنے تمام نقائص اور بدانتظامیوں کے باوجود غیر محدود وقت تک قائم رہتی۔ جو حقیقت میں بہت بڑی مصیبت ہوتی۔ اگر یہ سلطنت حکومت خود اختیاری رکھنے والی بلدیات کا ایک نہایت آزاد مجموعہ ہونے کے بجائے ایک عظیم و مہیب فوجی تنظیم ہی رہتی۔ اور شمشیر زنوں کا فوجی ضبط و نظم قائم رہتا۔ تو ممکن ہے وہ بربریوں کی سرکوبی میں کامیاب ہوتی۔ لیکن اس کا باقی رہنا اس سے بھی زیادہ بڑی مصیبت ہوتا۔ جو حقیقی علت

رومن سلطنت کے زوال و نامقبولیت کا باعث ہوئی ۔ وہ کوئی روز افزوں "بداطواری" نہ تھی ۔ بلکہ اس کی ابتدا اور اس کے دوران میں خرابی اور حقیقت سے عدم مطابقت کا جو عیب موجود تھا ۔ وہ اُس کو لے ڈوبا ۔ انسانی تنظیم کا کوئی نظام جو اپنے ہی اصول اور اپنی ہی بُنیاد کا سچا وفادار نہ ہو ۔ خواہ اس جھوٹ پر عمل کرنے اور اس کو جاری رکھنے کے ذرائع میں کتنی ہی چالاکی اور چابکدستی سے کام لے ۔ اور کتنی ہی اوپری مرمت اور دفع الوقتی کی تدابیر اختیار کرے ۔ اپنے آپ کو بچا نہیں سکتا ۔ جب تک اس کی جڑ ایسی رہے گی ۔ اس کی قسمت میں جڑ سے لے کر شاخوں تک تباہی ہی تباہی ہے ۔ ہم ذکر کر چکے ہیں ۔ کہ رومن سلطنت ایک تدبیر تھی ۔ جس سے انسانوں کا ایک چھوٹا سا طبقہ نسل انسانی کی کمزوریوں سے فائدہ اُٹھا کر دولتمند بننا چاہتا تھا ۔ بلاشبہ کاروبار تجارت کو پوری دیانت اور پورے عدل و انصاف سے (جو اس کی نوعیت کے مطابق تھا) قابلِ تعریف دانشمندی اور قابلیت کے ساتھ انجام دیا جاتا تھا ۔ لیکن یہ تمام اس بنیادی جھوٹ اور بنیادی ظلم کو اس کے نتائج سے بچا نہ سکتے تھے ۔ اُن کے اثرات نہایت شدت اور سنگدلی سے مصروف کار رہے ۔ غلاموں کی بھرسانی ۔ سپاہیوں کی بھرسانی اور مزدوروں کی بھرسانی سب کی سب ناکام رہ گئیں ۔ اور ایک ناگزیر حقیقت یہ تھی ۔ کہ جو آبادیاں استحصال کا شکار ہو رہی تھیں ۔ وہ روز بروز محسوس کرنے لگیں ۔ کہ اس پورے نظام کو قائم اور جاری رکھنا "اُن کا کام نہیں" ۔ اُن پر روشن ہو گیا ۔ یا اُنھیں اس امر کا دھندلا سا شعور حاصل ہو گیا ۔ کہ وہ اس معاشری مشین سے کسی قسم کا تعلق نہیں رکھتے ۔ جو اُن کی خاطر نہیں چلائی جا رہی ہے ۔ بلکہ اس کا مقصد صرف آقاؤں کے قلیل التعداد طبقے کو نفع پہنچانا ہے ۔ حکومت کی طرف سے آوازیں بلند کی گئیں ۔ عوام سے کہا گیا ۔ کہ تم "حُبِّ وطن" اختیار کرو ۔ "سلطنت" کو مدد

دنیا اور اس کو بچانا تمہارا فرض ہے لیکن وہ اس قسم کی اپیلوں سے بھی غیر متاثر اور بے پرواہ رہتے۔ اور صاف جواب دیتے۔ کہ ہم حُبّ وطن کے جذبے کو بالکل محسوس نہیں کرتے۔ اور یہ "بے رحم عفریت" جس کو "سلطنت" کہتے ہیں۔ اپنی حفاظت آپ کر سکتا ہے۔ وہ مسیحی ہو گئے۔ انھوں نے باہمی امداد و حفاظت اور "سلطنت" کے خلاف مزاحمت کی غرض سے اپنی چھوٹی چھوٹی جماعتیں منظم کر لیں۔ انھوں نے صاف کہا کہ "سلطنت" نہایت ناپسندیدہ چیز ہے۔ ہمارا اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ ہم اس کی خدمت سے انکار کرتے ہیں۔ یہ ہماری طرف سے جہنم میں جائے۔ نہ یہ ہمارا مُلک ہے۔ نہ ہمارا "پدر وطن" ہے۔ بلکہ ہماری بادشاہت اس دُنیا ہی کی نہیں۔ "گال کے اندر تیسری صدی میں کسانوں نے عَلَم بغاوت کر کے اندھا دھند بدنظمی اور لُوٹ مار شروع کر دی۔ بالکل اسی طرح جیسے بعد میں Jacqueries کے زمانے میں اور انقلاب فرانس میں ہوا۔ اگرچہ Maximian نے جُزوی طور پر کچھ مدت کے لئے امن قائم کر دیا تھا۔ لیکن Bagaudae کی بغاوت آخر تک جاری رہی۔ جب حالات بالکل ہی بے قابو ہو گئے۔ تو حکومتِ روما کی خوش قسمتی سے ایک قوی انسان Diocletian دستیاب ہو گیا۔ جو غیر معمولی قابلیت اور ہمّت و جرأت کا آدمی تھا۔ اُس نے ہر شعبے کو مضبوط بنانے کے لئے نہایت شدت سے کام شروع کر دیا۔ فوج کی تعداد چوگنی کر کے اُس کو از سرِ نو منظم کیا۔ نظم و نسق کے پورے نظام کو استوار کیا۔ اور مرکزی حکومت کو کامل اختیارات کا حامل بنا دیا۔ اس کا مقصد یہ تھا۔ کہ ہر چیز کو موجودہ سلطنت کے ساتھ آہنی بندھنوں میں جکڑ دے۔ تاکہ مزید انحطاط کی رفتار رُک جائے۔ جب کسی معاشرے کی عمارت واضح طور پر گرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ تو حکمران اُس کے انہدام کو روکنے کے لئے اُس کو حرکت

ہی سے روک دیتے ہیں۔ چنانچہ پورا رومن معاشرہ ذات پات کے ایک نظام میں جکڑ دیا گیا۔ کوئی شخص اپنا پیشہ بدلنے کا حق نہ رکھتا تھا۔ بیٹے کا فرض تھا۔ کہ باپ کے پیشے کو جاری رکھے۔ بغاوت۔ سرکشی۔ اور غیر وفاداری کی نہایت قوت کے ساتھ سرکوبی کی جاتی تھی۔ اگرچہ یہ شخص مسیحیوں کے بہت سے مذہبی خیالات کا حامی تھا۔ اور بہت سے مسیحیوں سے ذاتی دوستی رکھتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس نے مسیحیت کی سرکوبی کا فیصلہ بھی کر لیا۔ اُس کے جانشین قسطنطین نے اس کے بالکل برعکس پالیسی اختیار کی۔ یہ مصالحت و مراعات کی پالیسی تھی۔ اُس نے مسیحی جماعتوں۔ اور مسیحی ٹریڈ یونینوں کی قابلِ تعریف تنظیم سے فائدہ اُٹھایا۔ اور اُنھیں حکومت کی حمایت و تقویت پر آمادہ کر لیا۔

لیکن جو خرابیاں غیر مذہبی طور پر نشو و نما پاتی ہیں۔ اور نظامِ معاشرت کی جڑ بنیاد پر مسلط ہو جاتی ہیں۔ وہ سیاسی مُدبّرین کی قوت یا قابلیت سے بیک جنبشِ قلم اصلاح پذیر نہیں ہُوا کرتیں۔ خواہ قوت سے سرکوبی کی جائے۔ اور خواہ مصالحت و مفاہمت سے رام کرنے کی کوشش کی جائے۔ جو عوام اور رعایا استحصال کا شکار رہتے ہیں۔ وہ بدستور بے توجہ اور مخالف رہتے ہیں۔ جب بربریوں کا سیلاب آ گیا۔ تو لوگوں نے نہ صرف اُس کا مقابلہ نہ کیا بلکہ اُن کی آؤ بھگت کی۔ اور اُن کے ساتھ شامل ہو گئے۔ پانچویں صدی میں Salvianus لکھتا ہے۔ "طاقتور اس امر کا فیصلہ کرتے ہیں۔ کہ غریبوں کو کیا ادا کرنا چاہئے۔ غریب لوگ آزادی کے پیاسے ہوتے ہیں لیکن اُنھیں انتہائی غلامی کی مصیبت برداشت کرنی پڑتی ہے۔ مجھے تعجب ہے۔ کہ تمام غریب اور محتاج لوگ بھاگ کیوں نہیں جاتے۔ سوائے اس کے اور کوئی وجہ نہیں۔ کہ وہ اپنی زمینوں اور اپنے کنبوں کو چھوڑنے سے گھبراتے ہیں۔ کیا ہمیں اس بات پر متعجب ہونا

چاہیئے۔ کہ ہم گاتھوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے جس حالت میں رومن شہری ہمارے بجائے اُن کے ساتھ زندگی بسر کرنے کو ترجیح دیتے ہیں ؟ گاتھک سلطنت میں رہنے والے رومی حکومت روما سے اس قدر مانوس ہیں۔ کہ وہ گاتھوں کے ماتحت غریب رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ بہ نسبت اس کے۔ کہ رومیوں میں دولتمند بن کر رہیں۔ اور ٹکسوں کا ناقابل برداشت بوجھ اُٹھائیں" پادریوں نے اپنی جبلّی فراست سے محسوس کر لیا۔ کہ وحشی بربریوں سے کلیسا کے اثر و نفوذ اور طاقت و قوت کو بڑھانے کی زیادہ امید وابستہ کی جا سکتی ہے لیکن سرکاری طور پر مسیحی رومی سلطنت سے وہ امید نہیں ہو سکتی۔ جس میں قسطنطین اور تھیوڈوسیئس کے باوجود کلیسا کو "درندہ" اور "دشمن" کہا جاتا رہا۔ چناں چہ اُن پادریوں نے مسکراتے ہوئے اُن حملہ آوروں کا استقبال کیا۔ اُن کی حوصلہ افزائی کی۔ بلکہ اُن کی خوشامد بھی کی۔ رومن پادری واضح اور ظاہر طور پر جرمنوں کے حامی تھے۔ جب وہ جبر و تشدد کے واقعات کو سُنتے۔ تو اُن سے چشم پوشی کرتے۔ بلکہ اُن کو کم کر کے بیان کرتے "کیا کوئی قتل عام ہوا ہے؟ تو پھر کیا ہوا۔ انسانوں کو جلد یا بدیر آخر مرنا ہی ہے"۔ اور جب الارک نے روما کو تاخت تاراج کیا۔ لوٹا۔ جلایا۔ اور عورتوں کو بے حرمت کیا۔ تو سینٹ آگسٹائن اس مسئلے پر ایک مقالہ مرتب کر رہے تھے۔ کہ جن کنواریوں کی عصمت دری کی گئی ہے۔ آیا اُنھیں اگلے جہان میں "تاج دوشیزگی" کا مستحق قرار دیا جائے گا یا نہیں۔

چوتھا باب

بربریت اور بازنطینیت

اب تک ہم نے تین امتیازی مرحلوں کا ذکر کیا ہے۔ جو انسانی ارتقا کی رفتار میں پیش آتے۔ پہلا وہ طویل اور قدیم قبائلی مرحلہ جس میں رواجی فکر کی قطعی حکومت تھی۔ جو صرف وقتاً فوقتاً ٹوٹ جاتا تھا۔ اور مادی انکشافات اور ثقافتوں کے تصادم کی وجہ سے اس کی تجدید تو ہو جاتی تھی۔ لیکن اس کی قوت میں پہلے کی نسبت خفیف سی کمزوری رونما ہو جاتی تھی۔ اس ابتدائی مرحلے کے بعد وہ عظیم مشرقی تہذیبیں نمودار ہوئیں جن پر مذہب کے قوتی فکر کا پورا تسلط تھا۔ اور اس فکر کی مطلقیت کو کبھی کبھی اور غیر مؤثر طور پر فوجی قوت کے چیلنج کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اور چونکہ اس کی ہدایت بہت لطیف و نازک اور اس کی تاویل و توجیہ لچکدار تھی۔ اس لئے خیالات و اقوام کے پیوند سے جو افتراق انگیز اثرات مترتب ہوتے ان کو عملاً کالعدم کر دیتی تھی۔ تیسرے مرحلے پر یونان کا حیرت انگیز اور مبارک واقعہ پیش آیا جس نے بیک ضرب ذہن انسانی کو رواجی اور قوتی فکر سے تقریباً کامل آزادی دلا دی۔ اور قوت واختیار اور حسن عمل کی ان بلندیوں تک پہنچا دیا۔ جو اب تک تصور میں بھی نہ آئی تھیں۔ یونان نے اگرچہ

ا اس کتاب میں بربریت Barbarism کا ترجمہ ہے۔ اس کو شمالی افریقہ کی بربر قوموں سے کوئی تعلق نہیں (مترجم)

عقلی فکر کے تمام حقایق و معلومات سے استفادہ کیا۔ لیکن ان میں کوئی اضافہ نہ کیا۔ اور اس پہلو میں اُس کے انفاس نے اُس قوت کو معطل اور اپاہج کر دیا۔ جو اُس نے آزادی سے اخذ کی تھی۔ دُنیا میں اب تک بربریت اور مشرقیت خاصی مقدار میں موجود تھیں۔ چنانچہ اِن عناصر کی موجِ بلاخیز نے تہذیب کے رومی و یونانی مرحلے پر غالب آ کر اس کو غرقاب کر دیا۔ بالآخر ایک چوتھا مرحلہ سامنے آیا جس میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں۔

یہ مرحلہ اپنے پیشرو مرحلے سے کاملاً علیحدہ ہے۔ کیونکہ یہ جس طغیانِ عظیم کی وجہ سے معرضِ وجود میں آیا تھا۔ اُس نے اس کو ماضی سے منقطع کر دیا تھا۔ بہ زیادہ تر اسی کیفیت کا نتیجہ ہے کہ انسانی ترقی کی رفتار کو جب ہم اپنی معمولی تاریخی بصیرت کے اختلافِ منظر سے جانچتے ہیں تو وہ واضح اور بیّن طور پر پہچانی نہیں جاتی۔ اس مختصر وقفۂ زمانی کو اُس طغیان و طوفان نے بیچ میں سے تقسیم کر دیا جس نے پیشتر کی تمام کامرانیوں پر پانی پھیر دیا۔ لہٰذا وہ پورا "خم" ٹوٹ پھوٹ کر ناقابلِ شناخت ہو گیا۔ اس کے بعد بالکل نئے حالات کے ماتحت اور نئے ساز و سامان کے ساتھ ایک نیا نشو و ارتقا وقوع ہُوا۔ اس کے زیادہ تر حصے میں یہ تفاوت نظر آیا۔ کہ ایک طرف بربریت میں ڈوبی ہوئی دُنیا کی تعمیر کے سلسلے میں تکلیف دہ کشمکشیں پیش آئیں۔ اور ہزار قسم کے وحشی اور ظالم عناصر نے غلبہ و تسلط حاصل کیا۔ اور دوسری طرف اس تہذیب کی درخشاں شان و شوکت تھی۔ جو مٹی میں مل رہی تھی۔ انسان مدد کے لئے ۔ مثال کے لئے اور تخلیقی تحریک کے لئے ماضی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ اپنے آپ کو صحیح طور پر "قدما" کا شاگرد سمجھتے تھے۔ اور بالکل جائز طریقے سے اُنھیں اپنے سے بہتر و برتر خیال کرتے تھے۔

تاہم بالآخر انسان نے پیشتر کے تمام تہذیبی مرحلوں پر کامل فوقیت حاصل کر لی۔ اور جس تہذیب نے تباہی۔ بربادی کی اُس کڑھائی سے جنم لیا تھا۔

جس میں انسانی قوت کی ہر شکل اور بد شکلی پختہ ہو کر نیا رہو تی تھی۔ اُس نے انسان کی اصلی اور امکانی قوتوں کو بے اندازہ حد تک بڑھا دیا۔ جب تک تاریخ کے منظر میں ہماری جدید تہذیب کے صحیح مقام پر نظر نہ ڈالی جائے۔ اور جب تک ہم اُن قوتوں کے آغاز و ترقی کی نوعیت معلوم نہ کر لیں۔ جو تہذیب کے اس مرحلے میں یکجا جمع ہوتی ہیں۔ اور جن کی وجہ سے موجودہ تہذیب آج کل اپنے نشو و ارتقا کے بحران میں ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔ یہ بالکل ناممکن ہے کہ اُن قوتوں کا صحیح اندازہ لگایا جا سکے۔ جن کی جدو جہد اور جن کے تعامل کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ لیکن اگرچہ عہدِ حاضر کے یورپین کے نزدیک تاریخی ارتقا کے تمام مرحلوں میں موجودہ تہذیب کی پیدائش سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہو۔ لیکن روائتی غلط فہمیوں اور پیہم غلط بیانیوں نے اس مسئلے پر اس کے تصورات کو اس قدر کامل جھٹلا دیا ہے۔ کہ وہ اُن دُھندلے اور افسانوی تصورات سے صرف چند ہی درجے مختلف ہے۔ جن کو یونانی اور رومی اپنے ماخذوں کے متعلق اختیار کئے ہوتے تھے۔

اگرچہ یونان و روما کی دُنیا کسی ایسے حادثہ عظیم کی ضرب سے غرقاب نہ ہوئی تھی۔ جیسے حوادث نے بابل یا سوسہ آشوریا اکبتانہ کو موت کی نیند سُلا دیا تھا۔ اور اُن کی قبروں پر صحرا کی ریت کے انبار لگا دیئے تھے۔ اگرچہ یونان و روما کا زوال کسی ناگہانی اور شدید طغیان عظیم کا نہیں۔ بلکہ عبوری (گو تیز رفتار) انتشار کے عمل کا نتیجہ تھا۔ اور اگرچہ آلارک اور رومولس آگستولوس کے معاصرین کو یہ احساس ہی نہ تھا۔ کہ کیا ہو رہا ہے۔ اور دُنیا نیستی کے کس گڑھے میں غرق ہوئی جا رہی ہے۔ تاہم یہ تہذیب اس بُری طرح بے نشان ہوئی۔ کہ اس سے قبل اس کی کوئی مثال نہ تھی۔ اس تہذیب کا معدوم ہو جانا تاریخ عالم کا ایک ہولناک حادثہ تھا۔ انسانی تہذیب جو بظاہر طاقتور اور محفوظ تھی۔ اور دُنیا نے معلوم کو ایک بڑے منظم۔ پُرامن اور

خوشحال معاشرے کے زیر سایہ لیئے ہوئے تھی۔ کامل طور پر صفحہ ہستی سے محو ہو گئی۔ معلوم ہوتا تھا۔ کہ انسانیت نے اب تک جو کچھ حاصل کیا تھا۔ وہ خاک میں مل کر نسیاً منسیاً ہو گیا۔ ایتھنز اور روما نے انسان کو بلند کر کے ایک نئی سطح پر پہنچا دیا تھا۔ اُنھوں نے انسان کو مشرق کی قدیم تہذیبوں سے اُٹھا کر اتنا اونچا کر دیا تھا۔ کہ جتنا قبل تاریخ کا غار نشین انسان بوزنہ سے بلند تر تھا۔ اُنھوں نے ایک صحیح۔ پختہ اور با شعور انسانی دُنیا تخلیق کی تھی۔ لیکن اب اس تمام نشو و نما۔ اس تمام شاندار ارتقا میں سے کوئی چیز باقی نہ رہی تھی۔ زمانہ ایک دفعہ پھر تاریکی اور وحشت کی گہرائیوں میں ڈوب گیا تھا

اس تباہی و بربادی کی گہرائی اور ہولناکی کا عام طور پر پورا اندازہ نہیں کیا جاتا۔ اُس زمانے کی تاریخی یادداشتوں میں بڑی بڑی سرداروں کے نام اور اُن کی جنگوں کے قصے تو بے شمار موجود ہیں لیکن اُس زمانے کی دُنیا کے حالات مندرج نہیں ہیں۔ جو روشنی پہلے اور بعد میں چمکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ ایک نظری دھوکے کی وجہ سے درمیانی تاریک خلا پر پھیلی ہوئی معلوم ہوتی ہے —— پانچویں سے دسویں صدی تک یورپ بربریت کی رات کے دامن میں مدہوش تھا جس کا اندھیرا دم بدم زیادہ گہرا ہوتا جا رہا تھا یہ بربریت زمانہ قدیم کے وحشی کی وحشت کے مقابلے میں بے انتہا زیادہ خوفناک اور ہیبت انگیز تھی۔ کیونکہ اس میں ایک عظیم الشان تہذیب کی سڑی ہوئی نعش کا تعفن بھی تھا۔ اس تہذیب کے خد و خال اور نقوش کاملاً محو کر دیئے گئے تھے۔ اٹلی اور گال میں اس تہذیب کی ترقی کمال کو پہنچ چکی تھی لیکن اب اُن علاقوں میں تباہی۔ ناداری اور بربادی کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ زمین کاشت سے محروم ہو چکی تھی۔ اراضی مزروعہ درختوں اور جھاڑیوں کا جنگل بنتی جاتی تھی۔ دریا اپنے ٹوٹے پھوٹے کناروں سے اُچھل کر بہہ رہے تھے جنگل اور ملیریا پھیلانے والی دلدلیں مُلک کے اُن وسیع علاقوں پر چھا ہی

ہوگئی تھیں جن میں کسی وقت خوشحال مزرعے اور لہلہاتے ہوئے کھیت نظر آتے تھے۔ "بنجر اور ویرانہ" کے الفاظ ازمنۂ متوسطہ کے زمینی خسروں میں اکثر و بیشتر نظر آتے ہیں۔ شہر عملاً غائب اور معدوم ہو چکے تھے۔ کیونکہ جہاں تجارت نہ ہو۔ وہاں شہر بھی نہیں ہوتے۔ شہر منہدم کر دیئے گئے تھے اور اُن کے کھنڈر ملبہ مہیا کرتے تھے۔ صرف شہر کے درمیانی حصے کو فصیل کے اندر لے لیا جاتا تھا۔ خصوصاً جب کوئی پادری یا کوئی نواب وہاں قبضہ کر کے کسی قدر حفاظت کا بندوبست کر دیتا تھا۔ مثال کے طور پر Nimes میں آبادی کے بقیہ انسان اُن جھونپڑیوں میں رہتے تھے۔ جو ایمفی تھیٹر ز تماشا گھر کے کھنڈروں میں بنائی گئی تھیں۔ دوسری عمارتیں بالکل ترک کر دی گئی تھیں۔ مینڈواسٹرے ہوتے پانی میں غرقاب ہوجانے کی وجہ سے چھوڑ دیا گیا تھا۔ جرمنوں نے فصیل دار شہروں کو جنہیں وہ غلامی کی علامت سمجھتے تھے۔ جلد از جلد منہدم کر دیا۔ رومیوں نے جتنے آباد و خوشحال شہر دریائے رہائن کے کناروں پر تعمیر کئے تھے۔ اُن میں سے ایک بھی نویں صدی میں باقی نہ بچا تھا۔ کھنڈروں اور بکھری ہوئی بستیوں میں بھیڑیوں۔ سُوروں بلکہ ریچھوں تک کے گلّے گھومتے پھرتے تھے۔ رومیوں کے بنگلوں کے صحن اگر حجروں میں تبدیل نہ ہوتے تھے۔ تو تنگ اور تاریک کوٹھڑیوں اور مزبلوں سے معمور تھے۔ اور آس پاس کے کمرے ملبے کے گڑھوں اور مورچوں کا کام دیتے تھے۔ جو قلیل سی آبادی باقی رہ گئی تھی۔ وہ جانوروں کی کھالوں کو اوڑھے اور نہایت کھُردرے بوریا نما اونی کپڑے پہنے چھپروں والی چوبی جھونپڑیوں میں رہتے تھے۔ اور حفاظت کی خاطر نوابوں کے آرام گھروں یا گول خانقاہوں کے دامن میں ہاتھ پیر سمیٹے پڑے تھے۔ اس قسم کی ہر ٹولی اپنی ضروری چیزیں اور اپنے پوشیدنی کپڑے خود ہی تیار کرتی تھی۔ اور اپنے تاریک گھروں کے ارد گرد کی زمین کے چھوٹے چھوٹے قطعات پر تھوڑی سی کاشت کر کے

اپنی مصیبت ناک زندگی کے دن پورے کرتی تھی۔ یہ لوگ جنگلی درندوں اور قاتلوں اور ڈاکوؤں کے خوف سے اپنی حدود سے آگے بڑھنے کی جرأت نہ کرتے تھے۔ قحطوں اور وباؤں کا دَور دورہ تھا۔ صرف دسویں صدی کے دوران میں دس تباہ کن قحط اور تیرہ وبائیں پھیلیں۔ آدم خوری بھی عام تھی۔ انسانوں کا تعاقب لُوٹ کی خاطر نہیں۔ بلکہ خوراک کی غرض سے اکثر کیا جاتا تھا۔ کتابوں میں درج ہے۔ کہ دریائے ساؤن کے کنارے تورنوس کے مقام پر انسانی گوشت بر سرِ عام فروخت کیا گیا۔ چونکہ ڈاکوؤں کی ٹولیاں ہر جگہ گھومتی پھرتی تھیں۔ اس لئے طاقتور مسلح پہرے کے بغیر باہر نکلنا ناممکن ہوگیا تھا۔ آبی راستے تباہ کاری کی وجہ سے رُک گئے تھے۔ اور خاص احکام سے اس تباہ کاری کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ بدنظمی اور ابتری قطعی تھی۔ اور اُس کو کوئی روک نہ سکتا تھا۔ نوابوں اور اُن کے مسلح سپاہیوں کی مطلق العنانی کے سوا کوئی قانون موجود نہ تھا۔ اُن کے افعال میں کوئی حائل نہ ہو سکتا تھا۔ وہ اپنے بُرجوں کے اندر بڑے بڑے ہالوں میں رہتے تھے۔ جن کے فرشوں پر سرکنڈے بچھے ہوئے ہوتے تھے۔ اور وہی عام طور پر اُن کے گھوڑوں کے لئے اصطبل کا کام بھی دیتے تھے۔ قزاقی۔ خانہ جنگی اور بلادہ و فساد کے سوا اُن کو کوئی اَور کام نہ تھا۔

چونکہ اس تاریکی اور ویرانی کے گہرے غار سے تہذیب بالآخر از سرِ نو نمودار ہوگئی۔ اس لئے اس حقیقت کو عموماً نہایت بے پروائی سے تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ گویا ایسا ہونا بالکل طبعی اور ناگزیر تھا۔ تاریخ کے عام تصور میں بھی یہی سمجھا جاتا تھا۔ کہ یہ "نشاۃ الثانیہ" کا نتیجہ تھا۔ اور زوال قسطنطنیہ کے بعد ادب القدما کی بحالی اس حیاتِ تازہ کا باعث ہوئی تھی۔ لیکن ظاہر ہے۔ کہ یہ بالکل بے بنیاد سی بات ہے۔ کیونکہ یہ حقیقت محتاج تصریح نہیں۔ کہ جو یورپ دانتے کو پیدا کر چکا تھا۔ اُسے *messer Petrarca*

اور ایک اطالوی "نشاۃ الثانیہ" کی تحریک پیدا کرنے کی کیا ضرورت پیش آتی تھی۔ بعد میں آہستہ آہستہ یہ واضح طور پر تسلیم کر لیا گیا۔ کہ یورپ نے دسویں صدی کے اواخر اور بارھویں صدی اواخر کے درمیان اس شبِ تاریک سے نجات پائی۔ اس غلط فہمی اور الجھن کو موجودہ تاریخ کے عنوان طرازوں نے دوام بخش دیا۔ جو زمانہ مذکورہ بالا اور ازمنۂ مظلمہ دونوں کو ازمنۂ متوسطہ سے موسوم کرتے ہیں۔ اور "نشاۃ الثانیہ" کا نام چودھویں اور پندرھویں صدیوں کو دیتے ہیں جس کی ثقافت سابقہ نشو ونما کا صرف ایک پکا ہوا پھل تھی۔ اور "پکا ہوا پھل" ہی نہیں۔ بلکہ اکثر اعتبار سے اسے "سڑا ہوا پھل" کہنا چاہئے۔ نویں صدی کے غار نشین یورپ سے تہذیب کا نشو ونما پاجانا "بالکل طبعی اور ناگزیر" نہیں۔ بلکہ ایک نہایت عجیب و نادر واقعہ ہے۔

جو مختلف جرمن جتھے اور لشکر قدیم تہذیب کو بے دردی سے پامال کرتے ہوئے آتے۔ وہ اپنے ساتھ کوئی ایسے اوصاف نہ لاتے تھے جن کی بنا پر وہ ایک تہذیب نو کی تعمیر کر سکتے۔ ہماری تمام تاریخیں اس قسم کی مدح سرایانہ بکواس سے بھری پڑی ہیں۔ کہ "تازہ دم۔ پُر قوت ٹیوٹن قوموں نے فرسودہ و ناکارہ رومی دنیا کو نئی زندگی بخش دی"۔ یہ نسلی و تاریخی بے حیائی اسی قسم کی دیدہ دلیری اور ڈھٹائی کی مظہر ہے۔ جیسے گزشتہ جنگ عظیم میں پروشیا کے جنگ جوؤں نے یورپ کو "ٹیوٹن کلچر" سے مستفید کرنے کا ارادہ کیا تھا۔

ہم اس سے قبل لکھ چکے ہیں۔ کہ قدیم قبائلی کیفیت کی ثقافتی رفتار ایک خاص حد سے آگے کسی صورت میں قدم بڑھا ہی نہ سکتی تھی۔ قبائلی معاشرہ صرف بعض مخصوص سازگار حالات ہی میں ترقی کا آلہ بن سکتا ہے جیسے مثلاً یونان میں ہوا۔ جس نے بہت سی مشرقی ثقافتوں کی چھاتیوں سے دودھ پیا تھا۔

یورپ کے بربری قبائل (سوائے اس خصوصیت کے کہ اُن کے پاس دھاتیں تھیں) بالکل اُن ماوری قبیلوں کی حالت میں تھے جن کو سب سے پہلے کیپٹن کُک نے دیکھا تھا۔ وہ دلدلوں اور جنگلی راستوں پر لکڑی کی جھونپڑیوں میں رہتے تھے۔ اُن کے پاس صرف چند گھریلو صنعتیں تھیں۔ بہت قلیل کھیتی باڑی تھی۔ اور دیسی شاعری بھی تھی۔ جو وحشیوں میں ہمیشہ بہت بڑی خوبی سمجھی جاتی ہے پس ان چیزوں کے سوا وہ پرلے درجے کے نشہ باز قاتل۔ غدار اور شہوت پرست وحشی تھے۔ اُن کی وحشت بھی ایک خاص قسم کی کمینہ اور بہیمانہ وحشت تھی۔ اُن کے لئے کتنے ہی توہین آمیز اشارے کئے جائیں۔ کم ہیں۔ اور اُن کی بے حیائی کا پورا حال بیان کرنا ناممکن اور ہولناک ہے۔ اُن کی عیش و عشرت کی انتہا یہ تھی۔ کہ ڈٹ کر کھائیں۔ بلوہ و فساد کریں۔ تیز شرابیں پی کر حیوانوں کی طرح غل مچائیں اور چنگھاڑیں۔ اُن کی قوتیں طبعی طور پر قتل و خون۔ ظلم و تشدد اور شدید فحش کاری میں صرف ہوتی تھیں۔ ذہنی اعتبار سے وہ بالکل جامد اور سست تھے۔ جب اُنھیں خونریزی اور خور و نوش سے فرصت ملتی۔ تو وہ کئی کئی دن آگ تاپتے رہتے۔ اور عورتیں اُن کے لئے ہر قسم کا کام کرتی رہتیں۔

ان وحشیوں کی کچہریاں دائمی قتل و خون۔ قتلِ پدر۔ قتلِ برادر۔ زہر خورانی جعل سازی فحش کاری اور عصمت فروشی کے مناظر سے بھرپور ہوتی تھیں۔ گبن کی رائے یہ ہے کہ "اتنی مدت کے کسی تاریخی زمانے کے اندر اتنی زیادہ بدی اور اتنی کم نیکی کا سراغ نہیں ملتا"۔ اور یاد رہے۔ کہ گبن بربری قوموں کی بعض نیکیوں کے تصور سے بالکل بیگانہ نہ تھا یعنی مانتا تھا۔ کہ ان میں بعض محاسن بھی ہیں۔ درحقیقت تاریخ انسانی میں ان سے زیادہ نفرت خیز اور امتلا انگیز صفحات موجود نہیں ہیں۔ جن پر ان لوگوں کی شناعتیں اور Clothaire، Chilpéric اور Frédé

کے کارنامے لکھے ہوئے ہیں۔ اور جن کو تورس کے سینٹ gonde
گریگوری نے نہایت بے مثال جوش و خروش سے قلمبند کیا ہے۔
گوتھوں کے بازنطینی مورخ پروکوپیس نے زیادہ نفاست کا ثبوت
دیا ہے۔ اُس نے لکھا ہے۔ کہ میں ان وحشیوں کی ہولناک حرکتوں کے
ذکر سے اپنے صفحات کو آلودہ نہیں کرنا چاہتا۔ تاکہ آئندہ نسلوں کے لئے
خلافِ انسانیت افعال کی مثال اور یادگار قائم کرنے کی ذمہ داری مجھ پر
عائد نہ ہو۔"

کلووِس نے Ripuarian کی بادشاہی حاصل کرنے کی خاطر
بادشاہ کے بیٹے کو اس بات پر آمادہ کیا۔ کہ اپنے باپ کو قتل کر دے۔
اس کے بعد اس کی کھوپڑی کو خود پھوڑ دیا۔ اس کے اس کام کی رفتار
بلاشبہ اکتا دینے والی تھی۔ کیونکہ اسے عام طور پر کھوپڑیاں پھوڑنے کی
عادت تھی۔ اگر بحث و گفتگو۔ بلکہ ظرافت و خوش طبعی کے دوران میں بھی کھوپڑیاں
پھوڑ دی جائیں۔ اور عام طور پر اپنے حریفوں سے یہ سلوک کیا جاتا۔ جو
فریب کار محافظین کی وساطت سے دربار میں لائے جاتے تھے۔ سینٹ
گریگوری نہایت لطیف انداز میں لکھتا ہے۔ کہ "اس طرح خدا ہر روز بادشاہ
کے ہاتھ سے اُس کے کسی دشمن کو مار گراتا تھا۔ اور اس کی قلمرو کی حدود کو
وسیع کرتا جاتا تھا۔ کیونکہ وہ بادشاہ خداوند خدا کے سامنے راستبازدل لے کر
چلتا تھا۔ اور وہی کام کرتا تھا۔ جو اُس کے نزدیک پسندیدہ ہو۔" شارلمین
کے بیٹے لوئی پارسا نے اپنے بھائی پیپن کے بیٹے کی آنکھیں نکال لی تھیں۔
جو محافظین کے پہرے میں اُس کے دربار تک گیا تھا۔ لوئی کے بیٹے
لوتھیر نے اپنے سوتیلے بھائی کے خلاف حاسدانہ جذبے سے متاثر ہو کر
اُس کے ولی کی چھوٹی سی بچی کو ایک خانقاہی مدرسے سے پکڑا۔ اس کی مشکیں
باندھ کر اس کو ایک بڑے پیپے میں ڈالا۔ اور دریا میں پھینک دیا۔ لومبارڈ

کے دربار میں بھی فرینک دربار ہی جیسا ایک خوفناک منظر نظر آتا ہے۔ لمبارڈ کے شرابی Alboin نے اپنی بیوی روزمونڈا کو مجبور کیا۔ کہ وہ اپنے مقتول باپ کی کھوپڑی میں شراب ڈال کر پیئے۔ اور پھر اُس کی سہیلی سے شادی کر لی۔ اس پر روزمونڈا نے Alboin کو قتل کر دیا۔ برگنڈی کے بادشاہ Gundebald نے اپنی بادشاہی کو مستحکم کرنے کے لئے اپنے تین بھائیوں کو قتل کر دیا۔ خود تھیوڈورک دوسرے تمام بربریوں کے مقابلے میں رومن تعلیم کے اثرات کا قابل تعریف نمونہ تھا لیکن کچھ مدت کے بعد نامکمل طور پر سدھے ہوئے درندوں کی طرح از سرِ نو قدیم وحشت اور غضبناکی کا مجسمہ بن گیا۔ اس کے بعد جتنے گاتھ بادشاہ ہوئے۔ اُن میں سے ہر ایک نے اپنے پیشرو کو قتل کیا۔

اگر کوئی ٹیوٹن سردار پست ترین بربری سطح سے اُوپر اُٹھا۔ تو اس کی وجہ صرف یہ تھی۔ کہ وہ یونانی و رومی تہذیب کے خاص روابط سے متاثر ہوا تھا۔ الارک، اوڈوکر اور تھیوڈورک کی شخصیتیں رومائی کے فوجی دستوں میں پروان چڑھی تھیں۔

لیکن کوئی بربری قوم ہر قسم کے تہذیبی اثرات سے اتنی غیر متاثر اور منحرف نہیں ہوتی۔ جتنے "ٹیوٹن بہادر" چکنے گھڑے ثابت ہوتے۔ بجائے اس کے کہ وہ جس تہذیب کو مغلوب کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ اس کے بعض اجزا کو جذب و اخذ کرتے۔ وہ عیاشی کے بہتر وسائل مواقع پا کر پہلے سے بھی زیادہ وحشی و بیدرد ہو گئے۔ وہ اپنی فتوحات کو میخواری کے ہنگاموں اور فحش کاری کے مظالم کی تقریب اور بہانہ سمجھتے تھے۔ جب اُنھوں نے مسیحیت قبول کر لی۔ تو اُنھوں نے Walhallas کی خانقاہوں کو شراب کے اڈے بنا دیا۔ آٹھویں۔ نویں اور دسویں صدیوں کے دوران میں کلیسا اور خانقاہوں اور زاویوں کی ہولناک بدحالی کی وجہ صرف

رومن پادریوں کی بدعنوانی نہ تھی۔ بلکہ بربری پادریوں اور راہبوں کی آمد کا بھی اس میں خاصہ حصہ تھا۔ خانقاہیں رات بھر میخواروں کے شور و غوغا سے گونجتی رہتی تھیں۔ Carolingian زمانے کے مجموعہ ہائے قوانین میں دوسرے ضوابط کے علاوہ ایک یہ بھی تھا کہ "پادری ایک بیوی سے زیادہ نہیں کریں گے"۔ اس کے علاوہ تزوتج محرمات کے مرتکب نہ ہونگے راہب سراؤں اور ہوٹلوں میں وقت ضائع نہیں کریں گے۔ اور کوئی پیر خانقاہ کسی حالت میں اپنے کسی راہب کی آنکھیں نہ پھوڑے گا۔ نہ اُن کا مثلہ کرے گا۔ خواہ اُن سے کسی بھی جرم کا ارتکاب ہوا ہو"۔ ۱؎ ان قوانین سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے۔ کہ عورتوں میں شراب خواری عام تھی۔ اور سینٹ بونی فیس شکایت کرتا ہے کہ زیارت اوریاتنا کے بہانے سے ٹیوٹن طوائفوں کے گروہ کے گروہ یورپ کے ہر حصے میں چھوڑ دیئے گئے تھے ۲؎ چونکہ بربری حملہ اور جسمانی قوت اور جنگجوئی کے اوصاف کو اعلےٰ ترین انسانی محاسن میں شمار کرتے تھے۔ اس لئے وہ امن آبادی کو انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ وہ اس "ذلیل نسائیت" کا ذمہ دار تعلیم اور ثقافت کو سمجھتے تھے۔ لہذا اپنے بچوں کو تعلیم دلانے کے سخت مخالف تھے۔ کیونکہ "تعلیم ذہن کو بدعنوان۔ ضعیف اور پست بناتی ہے" ۳؎

رومن سلطنت کی ساخت ایک بہت بڑا نمایندہ چھوڑ گئی تھی۔ یعنی مسیحی کلیسا جس کا یورپ ہمیشہ احسانمند رہے گا۔ یہ ایک بندھن تھا دُنیا ٹوٹ پھوٹ کر جن بادشاہتوں اور علاقوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ اُن سب کو اُس نے مسیحیت کے نظریاتی مجموعے کی شکل میں باندھ رکھا

۱؎ Baluzii Copit. Reg Franc
Epist. 75 ۲؎ ep. mon. Germ Hist. Cap. metonse

۳؎ Procop. De Bell, Goth 1-4

تھا۔ لہذا ہماری تہذیب کا نشو و ارتقا اطالوی فرانسیسی یا جرمن خطوط پر نہ ہوا بلکہ یہ تہذیب "یورپی تہذیب" کہلائی۔ روما کی زبان اس کے نظم و نسق کے نظام اور تصورات کی بعض یادگاریں اور روایتیں اس بندھن کا ایک حصہ تھیں۔ جو رومی کلیسا کے ماتحت محفوظ تھیں۔

کلیسا اس طرح جو تہذیب آموز اثر ڈال رہا تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی۔ کہ اس کو رومی تہذیب کے نمایندے کی حیثیت حاصل تھی۔ اور وہ ایک پھیلتے ہوئے مذہب کے مخصوص اسرار۔ اختیار و اقتدار کی بنا پر رومی تہذیب کی روایات۔ اس کے روابط۔ اس کے خیالات۔ اس کی زبان اور اس کی عام فضا کو دوسروں پر مسلّط کرسکتا تھا۔ وہ ایک معلّم تہذیب کا فرض ادا کر رہا تھا۔ اس لئے نہیں کہ وہ مسیحی تھا۔ بلکہ اس لئے کہ وہ رومی تھا۔ روما کے مذہب پر اس کے ذاتی وقار و تمکنت اور اس کے حقوق کی وجہ سے سلطنت کے انقلابی نشیب و فراز کا کوئی اثر نہ ہوا تھا۔ اور صرف وہی رومی عظمت و شان کا علم بردار تھا۔ بربری وحشی رومن طاقت کو پامال کرنے کے باوجود اس نئے روما کا شہری بننے میں کوئی سُبکی محسوس نہ کرتا تھا۔ وہ رومی مذہب کو تسلیم کرنے پر آمادہ تھا۔ کیونکہ اس مذہب سے وہ وقار و عظمت اور شان و شوکت منسوب تھی۔ جو شدید ترین دشمنوں کے نزدیک بھی روما کے نام سے وابستہ سمجھی جاتی تھی۔ اس کی ہو بہو مثال یہ ہے۔ کہ آج کل کے زمانے کا وحشی پادریوں کی تبلیغ کو سُننے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ نہیں کہ پادری کے مذہب میں کوئی مابعدالطبیعی یا اخلاقی کشش موجود ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ وہ پادری یورپی تہذیب کی ساحرانہ قوت کا نمایندہ ہے۔ بربری رومیوں کا مذہب اختیار کر کے اُسی طرح فخر محسوس کرتا تھا۔ جیسے آج کل کا وحشی گورے انسانوں کے مسلک کو اختیار کر کے

اِتنا تا پھر تلہ ہے۔ بربری کو پولوس یا انھاناسیوس نے مشرف بہ مسیحیت نہیں کیا۔ بلکہ حقیقت میں یہ یونان کے عقلی فکر کے عَلم بر دار دل یعنی پریکلیس۔ افلاطون۔ ہرقلیوس۔ ارسطو۔ کیٹو۔ سینرا اور ٹراجن اور رومائی زبیہ کی اور قابلیت کا کرشمہ تھا۔ ازمنۂ متوسطہ کے اوائل میں "رومی" اور "مسیحی" دونوں لفظ بطور مترادف استعمال کئے جاتے تھے۔

صرف پادری ہی پڑھنا جانتے تھے۔ اور بعض لکھ بھی سکتے تھے۔ بادشاہ اور حکمران اپنے مختلف فرامین پر دستخط کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ ہم اب تک نام لکھنے کے بجائے "نشانِ دستخط" کا لفظ استعمال کرتے ہیں لفظ "کلرک" سے عام طور پر پادری یا وہ شخص مراد ہوتا تھا۔ جو پڑھنا جانتا تھا لیکن تمام پادری بھی لکھنا نہ جانتے تھے۔ بے شمار ایسے بشپ تھے جو اپنی کونسلوں کے توانین پر دستخط تک نہ کر سکتے تھے۔ جو اشخاص پادری کی اسامی کے امیدوار ہوتے تھے۔ اُن سے ایک سوال یہ بھی کیا جاتا تھا کہ "آیا وہ انجیلوں اور مکتوبوں کو پڑھ سکتے ہیں۔ اور اُن کا مفہوم کم از کم لفظی طور پر سمجھا سکتے ہیں"۔ شاہ الفریڈ نے شکایت کی ہے۔ کہ ھمبر سے لے کر سمندر کے کنارے تک ایک بھی ایسا پادری نہیں ملتا۔ جو دُعاؤں کو اپنی مادری زبان میں سمجھا سکتا ہو۔ یا لاطینی کے کسی آسان سے آسان فقرے کا ترجمہ کر سکتا ہو۔

الگ تھلگ ویران جنگلوں اور وحشی علاقوں کی گھاٹیوں میں جو راہبوں کے صومعے موجود تھے۔ اُن میں خواندگی کے کچھ آثار نظر آتے ہیں۔ لیکن وہ بھی علی العموم ابتدائی حرف شناسی سے آگے نہیں بڑھنے۔ مشہور مؤرخ *Benvenuto de Imola* نے لکھا ہے۔ کہ زیادہ تر کتب خانوں میں سبزہ اُگا ہوا تھا۔ اور راہبوں کی ادبی سرگرمیاں زیادہ تر یہ تھیں۔ کہ یونان و روما کی کتابوں کو نابود کر کے اُن کی جگہ اولیائے مسیحی کی داستانیں

بھردی جائیں۔ غیر مذہبی کتابوں میں Cassiodorus اور Boethius کے رسالے موجود تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ورجل۔ ٹیرنس اور پلاوطوس کے ساتھ ساتھ شاذ ہی کسی رومن مصنف کی کوئی کتاب پڑھی گئی ہو۔ وہ ذیل سے نام نہاد "سکول" جو شارلمین نے قائم کئے تھے۔ اور جن کے نہایت مبالغہ آمیز ذکر سے ہماری تمام تاریخیں بھری پڑی ہیں محض اس ناکام کوشش کے مظہر تھے۔ کہ مزید پادری تیار کئے جائیں۔ اور ایسے پادری پیدا کئے جائیں۔ جو کم از کم پڑھنا لکھنا جانتے ہوں۔ یہ سکول صرف ایک دن قائم رہے۔ اور ان کے نصاب درسی کی یہ کیفیت تھی۔ کہ اطفال شیر خوار کے ابتدائی سکول کو بھی دیکھ کر شرم آئے۔ "پلاٹین اکاڈیمی" کا وجود مؤرخین کے تخیل کے سوا خارج میں کہیں نہ تھا۔ ہم عصر شہادت سے اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ جب ہم پڑھتے ہیں۔ کہ "سکول" قائم کئے گئے تھے۔ اور "فنون ہفتگانہ" سکھاتے جاتے تھے۔ اور دوسرے علوم کے علاوہ ریاضیات اور فلکیات کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ تو ہم پر اس کا رعب پڑتا ہے لیکن حقیقت میں یہ مرعوبیت بالکل بے بنیاد ہے۔ مثال کے طور پر ذرا ایک سکول کے قیام کا قصہ سنو۔ شارلمین نے Fontenelle کے پیر خانقاہ Gerwold کو حکم دیا۔ کہ اپنے صومعہ میں ایک مدرسہ قائم کرے اس حکم کی تعمیل ہوئی۔ اور ایک سکول کھولا گیا جس میں صرف گانا سکھایا جاتا تھا۔ کیونکہ اگرچہ وہ شخص دوسرے علوم و فنون کے متعلق کچھ زیادہ نہ جانتا تھا لیکن گانے کے فن کا بڑا ماہر تھا۔ اور اس کی آواز میں لطف انگیزی اور قوت کی خوبیاں ہرگز کم نہ تھیں"[1] Alcuin of York ان Corolingian سکولوں کا منتظم تھا۔ اور اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ "وہ اپنے زمانے کا نہایت عالی پایہ عالم تھا۔ اور اس وقت اس سے

---

[1] Chron. Fontanelle ad a. 787

زیادہ علم و فضل کا حامل کوئی نہ تھا" وہ صرف و نحو اور بلاغت میں اپنے شاگردوں کو یوں تعلیم دیتا ہے۔ وہ انھیں بتاتا ہے۔ کہ *Vellus* اور *Bellus* ۔ *Vel* اور *Fel* اور *quad* اور *quot* میں فرق و امتیاز کرنے میں احتیاط سے کام لیں۔ اس کے علاوہ یہ کہہ کر اُن کی معلومات میں اضافہ کرتا ہے۔ کہ *hippocrita* ، *hippo* سے ماخوذ ہے۔ *Falsum* اور *Chrisis* ، *Judicium* ۔

اس کی "ریاضیات" اس سے زیادہ نہ تھیں۔ کہ وہ "تین کے قاعدے" کا نہایت پُر مشقت اور غیر یقینی استعمال سکھاتا تھا۔ اعداد کی صحیح واقفیت سے ہمیں معلوم ہوتا ہے۔ کہ بعض اعداد جُفت ہیں۔ اور بعض "غیر جُفت" اور جُفت اعداد میں بعض کامل ہیں اور بعض غیر کامل۔ مزید یہاں غیر کامل اعداد میں سے بعض بڑے ہیں بعض چھوٹے ....

مثال کے طور پر چھ کا عدد لو۔ جس کا نصف تین ہے۔ اور تہائی ۲ ہے اور چھٹا حصہ ایک ہے۔ لہٰذا خلاقِ کائنات نے جو تمام اشیا کو نہایت اچھی طرح بناتا ہے۔ اس دُنیا کو چھ دنوں میں پیدا کیا۔ گویا ظاہر کر دیا۔ کہ ہر چیز جو بنائی گئی ہے۔ وہ اپنی جگہ بالکل کامل و مکمل ہے ....

جب طوفان نوح کے بعد یہ کُرۂ ارضی دوبارہ نسلِ انسانی سے معمور ہوا۔ تو اس کا آغاز ۸ کے عدد سے ہوا .... جو اس بات کا ثبوت ہے۔ کہ دوسری نسل پہلی نسل کی نسبت کم مکمل ہے پہلی نسل ۶ کے عدد سے پیدا ہوتی تھی۔ جن ساٹھ رانیوں اور اسّی کنیزوں کا ذکر سلیمان ع کی غزل الغزلات میں آیا ہے۔ وہ کلیسائے مقدس کے افراد ہیں وغیرہ وغیرہ

یہاں تک کہ دینیات کا مطالعہ جس کا درجہ دوسرے تمام علوم کے بعد ہے کسی نازک اور پُر اسرار منطق کا سراغ نہیں دیتا۔ دینیات کا مطلب صرف یہ تھا۔ کہ صرف کتاب مقدس اور آبائے مذہب کے اقوال کو نقل کر دیا

جاتے۔ استدلال کا واحد طریقہ یہ تھا۔ کہ متن پیش کر دیا جاتے۔ یہ اُس علم وفضل کی حقیقت تھی جس کے متعلق ہمیں بتایا جاتا ہے۔ کہ باقی رہا۔ اور صومعوں میں محفوظ رکھا گیا۔

لیکن اگر محض اتنی سی خواندگی صرف کلیسا کے اندر موجود تھی۔ تو اس کے اثر کا انتہائی بوجھ بھی تھا جس نے ذہانت و ثقافت کو مفلوج کر رکھا تھا۔ ہمارے لئے اس کابوس کے اثر کا اندازہ لگانا دشوار ہے۔ جس نے اُس زمانے کے قلوب پر قابو پاکر ذہن انسانی کو کاملاً ماؤف و منجمد کر رکھا تھا۔ نہ صرف مذہب کے بنیادی عقائد لاحق تھے۔ اور عذاب جہنم کا خوف مسلسل اور قطعی طور پر ہر وقت چھایا رہتا تھا۔ بلکہ اگر توجہ کسی دوسری طرف منعطف ہوتی۔ "خواب آور تصوّرات کی کسی ایک شئے سے ذہن اِدھر اُدھر منحرف ہو کر کسی اَور چیز سے شغف اختیار کرتا۔ تو اُس کو نہایت شدید اور جہلک گناہ اور ناپاکی تصور کر کے مردود و ملعون قرار دیا جاتا۔ یہ امر قابل ذکر ہے۔ کہ اُس زمانے میں کلیسا اِس بنا پر علم کا مخالف نہ تھا کہ وہ "خطرناک" ہے۔ اور اس سے دین خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ یہ خیال بعد کے تجربے کا ثمر تھا۔ اذعانی یقین و اعتماد کی جو سادگی زمانۂ قدیم میں موجود تھی۔ اُس میں یہ تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کہ کوئی علم خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔ یا مقدس عقائد سے متصادم بھی ہو جاتا ہے۔ بلکہ اس کے برعکس علم کو کلیسا کا زیور سمجھا جاتا تھا۔ جس سے اُس کے وقار و تمکنت میں اضافہ ہوتا تھا۔ اور اس سے مذہب کی عظمت روز افزوں ہو جاتی تھی۔ بعض ذہنوں میں یہ خیال جاگزیں بھی تھا۔ مثلاً سینٹ بینی ڈکٹ کے راہب حتی الامکان اپنے علم کو ترقی دینے کی کوشش کرتے تھے۔ اور اسے مذہب کی زینت اور اس کا طبعی لازمہ سمجھتے تھے۔ لیکن عام طور پر اس خیال کی سخت مخالفت کی جاتی تھی۔ اور اُس کو دبایا جاتا تھا۔ دنیاوی

کتابوں کا مطالعہ نہ صرف مذہب کے لئے خطرناک سمجھا جاتا تھا۔ بلکہ اس کو مذہب سے الگ ایک مشغلہ قرار دیا جاتا تھا۔ کیونکہ ان لوگوں کے نزدیک انسانی ذہن کا ایک ہی جائز مرکز تھا جس سے انحراف بالکل ناجائز تھا۔ ثقافت کے متعلق مسیحی ذہن کا رویہ سینٹ جیروم کی مانند تھا۔ جو اگرچہ طبعاً ادبیات سے شغف رکھتا تھا۔ لیکن محض تزکیہ نفس کی خاطر اس سے قطعی طور پر دست بردار ہو گیا تھا۔ گویا اس طریقے سے وہ ایک شیطانی ترغیب سے چھٹکارا حاصل کر کے اپنے آپ کو گناہوں سے پاک کر رہا ہے۔ Alcuin بھی غیر مذہبی ادب کے مطالعہ کو باقاعدہ ناپسندیدہ قرار دیتا تھا۔ اس انتہا پسند معلم نے اپنے ایک سابق شاگرد کو خط لکھ کر ورجل کی کتاب پڑھنے پر سخت ملامت کی۔ اور لکھا۔ کہ بارہ Æneada کے بجائے تمہارا ذہن اناجیل اربعہ سے معمور ہونا چاہئے۔ یہی رویہ تمام ازمنہ مظلمہ میں جاری و ساری نظر آتا ہے۔ اس سے خاصی مدت بعد کا ذکر ہے۔ جب ایڈمنڈ رچ نے جو آکسفرڈ کے بانیوں میں سے تھا۔ اشکال ریاضی کا مطالعہ شروع کیا۔ تو اس کی ماں اس کو خواب میں نظر آئی جس نے تین متقاطع دائرے کھینچ کر (جن سے تثلیث مراد تھی) بیٹے کو دکھائے اور اس کو حکم دیا۔ کہ "آیندہ تیری "اشکال" کی یہ صورت ہونی چاہئے"۔ پوپ گریگری کو لیوی اور سسرو کی جتنی کتابیں دستیاب ہو سکیں۔ اس نے سب کی سب نذر آتش کر دیں۔ اس کے پاس ایک افواہ پہنچی۔ کہ ویانا کے لاٹ پادری ڈیسی ڈیریئس نے ایک ادبی موضوع پر کوئی مقالہ پڑھا ہے۔ اس پر اس نے پریشان ہو کر اسے خط لکھا "ایک ایسی خبر ہم نے سنی ہے۔ جس کے ذکر سے ہمیں خود شرم آتی ہے۔ کہ تم نے جو ہمارے بھائی ہو۔ ادب پر مقالہ پڑھا ہے۔ مجھے امید ہے۔ تم مجھے لکھو گے۔ کہ تم کو ان لغویات سے کوئی سروکار نہیں"۔

یہاں تک کہ سینٹ برنارڈ نے بارھویں صدی میں بھی قوانین دیوانی کے مطالعہ کی شدید مخالفت کی۔ اور اس امر پہ ماتم کیا کہ عدالتیں جسٹینین کے قوانین میں مصروف ہیں (اُمالفی کے ضوابط حال ہی میں دریافت ہوئے ہیں) حالانکہ انھیں اپنے فیصلے قوانینِ ربانی کے اندر محدود رکھنے چاہئیں۔

اُس زمانے کے اکابرین بعض ایسے بھی تھے جنھیں اس ہولناک تباہی و بربادی کا کسی قدر احساس تھا۔ روما اور اُس کی مہذّب دُنیا کا تصوّر اور اُس کی یاد اس قدر گہری اور اتنی قریب العہد تھی۔ کہ اُن کی آنکھوں کے سامنے ہر وقت اس کا منظر موجود رہتا تھا۔ اور موجودہ زوال و انحطاط کا احساس اُن کو پریشان کئے ہوئے تھا۔ ازمنہ مظلمہ کے موجودہ مؤرخین ان پیہم کوششوں کا ذکر کرتے ہیں۔ جو بڑی حکمرانوں نے اس تباہی اور ابتری میں کسی قدر ترتیب کے ابتدائی عناصر پیدا کرنے کی غرض سے کیں۔ تھیوڈورک نے حتی الوسع بڑا کام کیا۔ قوانین کی تدوین کی۔ اور کسی قسم کے نظم و نسق کے قیام کی کوششیں بھی کیں۔ لومبارڈی اور برگنڈی بھی اسی طرح قوانین و ضوابط کو ضبطِ تحریر میں لاتے۔ افسروں کو مقرر کیا۔ اور فرمان صادر کئے۔ شارلمین ایک پرہیزگار بڑی جنگجو مشنری تھا جس نے اپنے بڑے بھائیوں کو بزورِ شمشیر عیسائی بنایا۔ اور شکرگزار پادریوں نے اُس کو داستانوں کا ہیرو اور بہت بڑا آدمی بنا دیا۔ اُس نے بھی رومی کلیسا کے تعاون سے ایک "مسیحی مقدس رومی سلطنت" قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد مختلف سرداران قبائل نے چھوٹی چھوٹی بادشاہتیں قائم کیں۔ اور ہر ایک نے تنظیم۔ قانون سازی اور نظم و نسق کے قیام کی سرتوڑ کوششیں کیں۔

لیکن ان تمام سیاسی کارناموں کا تفصیلی مطالعہ کرنے کے بعد ایک نمایاں نتیجہ یہ نکلتا ہے۔ کہ یہ تمام کوششیں بالکل بیکار تھیں۔ تمام

قوانین۔ تمام تنظیمات اور تمام آئین صرف کاغذ پہ موجود تھے۔ بادشاہتیں مملکتیں۔ مقدس سلطنتیں بزورِ شمشیر اور پوپ کی دعاؤں کے ماتحت وجود میں لائی جاتی تھیں۔ لیکن یہ سب محض کاغذی قلعے تھے۔ اور جس تیزی سے تعمیر کئے جاتے تھے۔ اسی سرعت سے منہدم بھی ہو جاتے تھے۔ شارلمین نے مخلصانہ کوششیں کیں۔ جو تفصیلی بیانات میں "دُنیا کی جدید تنظیم" بلکہ "نشاۃ ثانیہ" قرار دی گئیں۔ لیکن ان کوششوں کی حقیقی قدر و قیمت اس سے ظاہر ہے۔ کہ جونہی شارلمین کا جسم فانی Aachen کے تہ خانے میں دفن کر دیا گیا۔ اُن تمام مساعی کا کوئی سراغ بھی باقی نہ رہا۔ اگرچہ اُن فرضی سرکاری القاب و قوانین اور سیاسی حیلہ سازیوں سے تاریخ بھری پڑی ہے لیکن معاشرۂ انسانی کے اصلی حقائق میں کوئی تغیر واقع نہ ہوا۔ وہ بالکل غیر متاثر اور غیر متغیر طور پر جاری رہے۔ ڈاکوؤں کے سردار جنگ و پیکار۔ لوٹ مار اور قتل و نہب سے اُن مصیبت زدہ بدنصیبوں کی آبادیوں کو بے نشان کرتے رہے۔ جو حفاظت کے لئے اپنی اپنی ٹولیاں بنائے دبکے پڑے تھے۔

حقیقت یہ ہے۔ کہ اگر ثقافت کا وجود نہ ہو۔ تو نہ قانون و امن کی کوئی تدبیر کی جا سکتی ہے نہ انسانوں کی آبادیوں کو کسی نظم و ترتیب کے ماتحت لایا جا سکتا ہے۔ کتنے ہی کاغذی قانون بنا لو۔ کاغذی بادشاہتیں قائم کر لو۔ شاندار القاب والے افسر مقرر کر لو۔ اور قیامت تک احکام و فرامین پر دستخط کرتے رہو۔ لیکن اگر انسانیت ناخواندہ بربریت کی حالت میں ہے۔ اور ذہنی اور دماغی اعتبار سے مفلس ہے۔ تو تمہاری تمام تر سیاسیات اور نظم و قانون کی سرگرمیاں محض باد ہوا ثابت ہوں گی۔ آگے چل کر ہم بتائیں گے۔ کہ جب تک لوگ ذہنی اعتبار سے تیار نہ ہو چکے ہوں کوئی صحت آموز تحریک خود اُن لوگوں میں سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس

کا اُلٹ بھی بالکل صحیح ہے۔ کوئی اصلاح۔ کوئی تنظیم اور کوئی ترقی جو بعض نیک نیت حکمران اپنی رعایا پر عائد کرنا چاہیں۔ مؤثر نہیں ہو سکتی۔ تاوقتیکہ وہ ثقافتی اعتبار سے اُن چیزوں کے قبول کرنے کے قابل نہ ہو گئے ہوں جو بہ حیثیت ذہنی ثقافت سے محروم ہو۔ اُس پر اُوپر سے یا نیچے سے تہذیب عائد نہیں کی جا سکتی۔

جب تک عوام میں یا حکمرانوں میں کسی قسم کی ذہنی تنویر موجود نہ ہوتی ایک نئے یورپ کی تخلیق ناممکن تھی۔ نہ تو رومن سلطنت کی نہایت قدامت پسندانہ ساخت میں کوئی ایسے عناصر موجود تھے۔ اور نہ اذعانی کلیسا سے کوئی ایسا عنصر اخذ کیا جا سکتا تھا جس کی وجہ سے ازمنۂ مظلمہ کے یورپ میں کوئی ترقی پسند تہذیب پیدا ہو سکتی۔ اور ان عناصر کی یہی حالت قلمرو بازنطیم میں تھی۔

اُس زمانے کی تمام بادشاہتوں میں بازنطیم تنبیہ کے ایک بےمثال عجیب بھیانک اور نیم مفہوم ہیکل کی شکل میں موجود تھی۔ جیسے زندگی کے جلسۂ ضیافت میں ایک شاندار آراستہ پنجر کھڑا ہو۔ صرف وہی ایک ایسی سلطنت تھی جس پر قسمت نے اپنے تمام فیوض و برکات کی بارش کر دی تھی۔ وہ ایک بے نظیر محفوظ مقام میں قائم تھی۔ جو قدیم ترین زمانے سے لے کر آج تک ہر سلطنت آفرین شخص کا مرجع نظر رہا ہے۔ اگرچہ اس کے گرداگرد کی دنیا تباہی و بربادی میں غرق ہو چکی تھی لیکن یہ محفوظ رہا۔ اور اس پر کوئی آنچ نہ آئی جس زمانے میں مغربی یورپ از سرتاپا نابود ہو رہا تھا۔ یہ سلطنت بظاہر ایک خوشحال مطمئن اور درخشاں تہذیب کی حامل نظر آتی تھی۔ اس کی شوکت۔ اس کی خوشحالی۔ اس کی فراوانی خیرہ کُن تھی اس کے عظیم الشان ہال جو عباے شاہی کے جواہرات سے درخشاں تھے۔ Magnanra کو باباب کر رہے تھے۔ یہ سب ایک خواب

تھا جس میں انسان کی بجائے ایک مافوق الانسان کی جھلک نظر آتی تھی ہر طرف عود سوزوں اور بخوردانوں کے دھوئیں اُڑ رہے تھے۔ چھت سے لٹکتے ہوئے جھاڑ فانوس روشنی پھیلا رہے تھے۔ طلائی گل و برگ کی سرسراہٹ اور نقرئی ارغنونوں کے نغمے بلند ہو رہے تھے۔ اور اس شان و شوکت کے درمیان بڑے بڑے شہزادے سربسجود نظر آتے تھے۔ گرد اگرد اُمرا اور اُن کے اہلکاروں کی قطاریں کھڑی تھیں۔ عالم نما محافظین چاندی کے چار آئینے سجائے اور طلائی ڈھالیں اُٹھائے اپنے اپنے مقام پر متمکن تھے۔ اس کے بے شمار محلات و قصور جن کے دروازے ہاتھی دانت کے تھے۔ سحر زدہ ساحل پر درخشاں قطاروں میں سربلند نظر آتے تھے۔ اور سنگ مرمر کے شہ نشینوں سے انسان کی نظریں ایک بےنظیر حُسن و جمال کے منظر کا احاطہ کر لیتی تھیں۔ مارمرا اور پرنکیپو کے جزیرے۔ پہاڑیاں درختوں کے جھنڈوں اور باغوں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ اور اُن میں محل اور بنگلے بنے ہوئے تھے۔ "فواروں کا محل" کریسو پولس ایشیائی ساحل پر۔ بریاس میں بغداد کے قصر التاج کی ایک نقل۔ شاخ زرّیں پر Blacherne اور Boukoleon کی خاص شاہی بندرگاہ جہاں سُرخ اور سنہری بجرے لنگر ڈالے کھڑے تھے۔ گوناگوں اور رنگ برنگی قلموں گرجاؤں کی چمک دمک۔ اُن کے ہوادار گنبدوں کی قطاروں کی قطاریں۔ جو معلوم ہوتا تھا۔ کہ آسمان پر ایک طلائی زنجیر سے لٹک رہے ہیں۔ گھوڑ دوڑ کا میدان (ہپوڈروم) تھیبس کے مخروطی مناروں۔ ڈیلفی کی تپائیوں اور Praxiteles کے مجسموں سے آراستہ تھا۔ یہ خوابوں کی سرزمین کا ایک ایسا نازک و نفیس منظر تھا۔ کہ یورپی مغرب کی غلاظت۔ خستہ حالی اور ویرانی کا اس سے کوئی مقابلہ کرنا بالکل ہی خارج از بحث تھا۔ بازنطیم دُنیا کی تجارت کا قدرتی مرکز تھا اس کی صنعتیں ترقی کر رہی تھیں۔ اس کی قلمرو ایشیا کے سب سے زیادہ ثروتمند

صوبوں پر پھیلی ہوئی تھی۔ دنیا بھر کے اناج کے کھتوں اور عمارتی لکڑی کے ذخیرے پر اسی کا قبضہ و اقتدار تھا۔ اسی کی فوجیں ضبط و نظم رکھنے والی اور سائنسی تربیت سے بہرہ ور تھیں۔ ان کے عہدہ دار اور افسر ماریس اور لیو (دانشمند) کے فنی رسالے اپنے تھیلوں میں ڈالے پھرتے تھے۔ ان کو ایک خاص قسم کا "توپ خانہ" بھی میسر تھا یعنی ان کو خوفناک "یونانی آگ" کا راز معلوم تھا جسے اس زمانے کے آتش ریز بم سمجھنا چاہیے۔ جس حالت میں باقی تمام مسیحی دنیا وحشیوں اور رندوں سے بھری پڑی تھی۔ مشرقی سلطنتوں کے بادشاہ اور شہری خوش اطوار ہی۔ شائستگی اور تمیزداری کے پیکر تھے۔ اور اپنے ذوق اور اسلوب زندگی میں بے حد نفاست پسند واقع ہوئے تھے۔ بازنطینی ثقافت یونانی اور ہیلانی دنیا کی تنہا وارث اور امین تھی۔ اس نے محققین۔ شعرا اور ریاضی دان پیدا کیے۔ بے انتہا دولت و ثروت کے باوجود اس کا دربار (صرف چند مستثنیات اور قلیل اللذت فسادات کو چھوڑ کر) عیوب و جرائم اور بدعنوانیوں سے بالکل پاک صاف تھا۔ بحیثیت مجموعی یہ معاشرہ ایک شائستہ باقاعدہ۔ خوش اطوار اور نیک نیت معاشرہ تھا۔ اس کا مرتب نظم و نسق جو رومن قانون کا نمایندہ تھا۔ نہایت خوش اسلوبی سے چل رہا تھا۔ اس کے حکمران عموماً انصاف پسند۔ محب وطن۔ رفاہ عام کے خواہاں اور انتہائی حزم و احتیاط پر عمل کرنے والے تھے۔ غور کرو۔ اس زمانے سے لے کر آج تک کتنے ایسے بادشاہ گزرے ہیں جنھوں نے باسل اول کی طرح تنظیم فوج کے رسالے یا قانون کی کتابیں لکھی ہوں۔ یا قسطنطین پروفایروجے نیٹس کی مانند اپنی قلمرو کے حالات یا نظم و نسق سلطنت پر رسالے مرتب کیے ہوں؟ وہ ہمیشہ اپنی فوجوں کی کمان بنفس نفیس کرتے تھے اپنے وزیر خزانہ بھی خود ہی تھے۔ مالیات کے نظام کی نگرانی بھی بذات خود کرتے تھے۔ اور کبھی اپنے سکے کی قیمت گرنے نہ دیتے تھے۔

اس طرح گویا دس طویل صدیوں تک بازنطینی سلطنت ثقافت کی محافظ اور تہذیب کے لئے "کشتی نوح" بنی رہی۔ اور اس دوران میں اس کے آس پاس کی مسیحی دنیا قدیم طوائف الملوکی کا شکار ہو کر دوبارہ زندہ ہوئی۔ بلاشبہ وہ احوال و ظروف بے نظیر تھے۔ اور ایک عظیم، پُرشوکت اور قوی انسانی معاشرے کے نشو و ارتقا کے لئے بے حد سازگار تھے جو ترقی کا رہنما، تہذیب کا اُستاد اور دُنیا میں روشنی پھیلانے والا تھا۔

لیکن اس کے باوجود یہ تہذیب جو تقدیر کی لاڈلی محبوبہ تھی۔ تاریخ کے سوچے سمجھے فیصلے کے مطابق اپنے معاصرین کے نزدیک نفرت و حقارت کے قابل بن گئی۔ حالانکہ بعض بازنطین پسندوں نے اس کو نئے سرے سے بحال کرنے کی کوشش بھی کی۔ اس کی اہمیت اس قدر کم ہو گئی کہ اہلِ فکر ارتقا نے انسانیت کے تاریخی مطالعہ میں اس کو نظر انداز کر جانے اور بھول جاتے ہیں۔ اس نے انسانی نشو و نما میں کوئی مفید حصّہ نہیں لیا۔ یہ نسلِ انسانی کے ارتقائی رفتار سے باہر رہی۔ اس کی حیثیت ایک پُرانی یادگار، ایک حنوط شدہ نعش اور ایک ناکام معاشرے سے زیادہ نہ تھی۔ اس نے اپنی ایک ہزار سال کی زندگی میں زندگی تو درکنار، ترقی کا ایک شرارہ بھی پیدا نہ کیا۔ وہ ایسی آبادیوں میں گھری ہوئی تھی جو تاریکی سے باہر نکلنے کی جد و جہد کر رہی تھیں۔ اور مخلصی اور نجات کے لئے سراپا فریاد تھیں لیکن بازنطینی تہذیب نے نہ انھیں کچھ سکھایا۔ نہ خود سیکھنے کی کوشش کی، نتیجہ یہ ہوا کہ عربوں نے آکر ان کے بیڑوں کو سمندر سے نابود کر دیا۔ اس کی تجارت پر پہلے عربوں نے اور اس کے بعد فتلانیہ، جنوا اور وینس والوں نے قبضہ کر لیا۔ اس کی فوج نے اگرچہ بار بار سلطنت کو بچایا تھا لیکن آخر میں فرینک اور عرب دونوں اس کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس کا ادب بالکل بے حقیقت تھا۔ بد ذوقی کا نمونہ جعلی صنمیاتی اور داہام

پرستانہ لغویتوں کا یہ مُتصنّع مجموعہ۔ جس میں معجزات وکرامات کی عجیب سی کہانیاں بیان کی جاتی تھیں۔ یہ اب اب تک پڑھنے کے قابل نہیں۔ سوائے اس کی خود تصوّر کردہ ——— تاریخ کے جس کی شکل داستان سرائی سے بگاڑ کر لکھ دی گئی ہے۔ اس کے چند عالم (وہ بھی زیادہ نہ تھے) مثلاً لیو صرفی نحوی یا فوشیئس محض نقّال مؤلف اور لفاظی کا شکار تھے۔ اُنھوں نے افادی حیثیت رکھنے والی صرف وہ کتابیں چھوڑی ہیں۔ جو کتب خانوں کی فہرستیں تھیں۔ اور سوئیداس کی لُغت تھی لیکن وہ خود اُن چیزوں کے استعمال سے بے خبر تھے۔ مَیں اس سے پہلے لکھ چکا ہوں۔ کہ بازنطینی سلطنت کو فوائد مواقع بے شمار حاصل تھے۔ لیکن وہ قطعی طور پر بے کار اور بے ثمر ثابت ہوئے اور یہ امر تاریخ میں کوئی مثال نہیں رکھتا۔

اگر اس حیرت انگیز "بانجھ پن" کے اسباب کی تحقیق کی جائے۔ تو ان کی تین بڑی بڑی قسمیں ہوں گی۔ اوّل بازنطینی سلطنت میں اختیار و اقتدار اُن بے شمار راہبوں کے ہاتھ میں تھا۔ جو پہلے درجے کے جاہل اور مذہبی دیوانے تھے۔ وہ ہر ولایت اور ہر شہر میں بکثرت موجود تھے۔ قسطنطنیہ میں محلّوں کے محلّے خانقاہوں سے بھرے ہوتے تھے۔ کوئی ایک سو سے زیادہ تو ضرور ہوں گی۔ صرف ایک صومعہ ستودیون میں ایک ہزار راہب موجود تھے کوہ اتھوس۔ کوہ ایدا۔ المپس۔ مارمرا و مجمع الجزائر کے جزیرے سب کے سب صومعوں اور خانقاہوں سے پٹے پڑے تھے۔ دس قدم بھی چلئے تو کئی لمبے بالوں اور چھوٹی عباؤں والے "راسپوٹین نما" لوگ نظر آجاتے تھے۔ جن کو لوگ گھیر لیتے تھے۔ اور اُن کے ہاتھوں پر بوسے دیتے تھے۔ ہر امیر۔ ہر تاجر۔ ہر دولتمند آدمی اور ہر پرہیزگار خاتون یا تو کسی خانقاہ کو قائم کرتی۔ یا اُس کے لئے جائداد وقف کر دیتی۔ شہنشاہ نیکو فیروس (نقفور) اگرچہ خود راہب کی زندگی بسر کرتا۔ بالوں کا بنا ہوا کرتہ پہنتا اور ننگے تخت پر سوتا۔

لیکن جب اُس نے دیکھا۔ کہ سلطنت کی آبادی کم ہو رہی ہے۔ دولت دھڑا دھڑ صومعوں اور خانقاہوں میں منتقل ہو رہی ہے۔ اور فوجی بھرتی اور مالی اُمور میں مشکلات حائل ہو رہی ہیں۔ تو اُس نے نئے قانون وضع کر کے اس صورت حال کو درست کرنے کی کوشش کی۔ بُتوں کے مسئلے پر جو طویل کش مکش ہوئی۔ وہ ہمیں بے حقیقت سی معلوم ہوتی ہے لیکن وہ حقیقت میں شہنشاہوں کی طرف سے ایک ناکام کوشش تھی۔ کہ کسی نہ کسی طرح راہبوں کے ناقابلِ برداشت تسلط سے نجات حاصل کریں عام لوگوں، عورتوں اور سلطنت کے امیروں پر راہبوں کو کامل اقتدار حاصل تھا۔ اور وہ اُنھیں حیرت انگیز داستانیں۔ کرامتوں کی کہانیاں اور اولیا کی زندگی کے حالات سُنایا کرتے تھے۔ دینیات بلکہ جہنّم تک کو اُن کے عقائد میں کوئی مقام حاصل نہ تھا۔ ہر واقعہ اور ہر عمل فوق الفطرت نشانیوں اور شگونوں سے گھرا ہوا تھا۔ اور بازنطینی یونانی ایک ایسی دُنیا میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ جو بدرُوحوں۔ بھوتوں۔ فرشتوں اور عفریتوں سے آباد تھی۔ اُن کے بڑے بڑے مسجود و معبود اولیا کی وہ معجزہ نما تصاویر تھیں جن میں سے اکثر فوق الفطرت طاقتوں کی کھینچی ہوئی تھیں۔ اُن کے سامنے عوام کے ہجوم گرجاؤں کے فرش پر بوسے دیتے تھے۔ اور انہی سے زندگی کے تمام حالات میں امداد کے طالب ہوتے تھے۔ کاروبار تجارت میں کامیابی کے لئے۔ گم گشتہ مال کی بازیابی کے لئے اور گنٹھیا کے علاج کے لئے بھی اُنہی سے دُعائیں مانگتے تھے۔ عوام الناس اور عورتوں کی اس مجنونانہ پُشت پناہی کے بل پر راہب حکومت کے اقتدار و اختیار کا علانیہ مقابلہ کرتے۔ اور اگر شہنشاہ کے افعال و اعمال بھی اُن کے نزدیک پسندیدہ نہ ہوتے۔ تو وہ اُس کو بھی محلِ شاہی کے اندر اور بہ سرِ بازار ڈانٹ ڈپٹ کرتے۔

دوسری وجہ یہ تھی۔ کہ یہ سلطنت اپنے محل وقوع کی بیش بہا محفوظیت کے باوجود بعض مصنوعی حدبندیوں کے باعث باقی دُنیا سے بالکل علیحدہ اور منقطع تھی۔ یونانی لوگ لاطینی اور جرمن مسیحیوں کو سخت حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اور اُنھیں محض وحشت و بربریت کا پیکر سمجھتے تھے (اور ماننا پڑتا ہے۔ کہ وہ اس میں حق بجانب بھی تھے)"مقدس رومن سلطنت" کا خود ساختہ شہنشاہ اُن کی نظر میں ایک بیہودہ سا"نو دَولتا" تھا جس کے لقب پر اُنھیں ہنسی آتی تھی۔ وہ اُنھیں ویسا ہی مضحکہ خیز معلوم ہوتا تھا۔ جیسے آج کل Dahomey کا حبشی شہنشاہ فراک کوٹ اور ریشمی ہیٹ پہن کر مہذب انسانوں کی نقالی کرے۔ یونانیوں کے نزدیک"غیر مُلکی" کی اصطلاح کا مفہوم اُسی غیر محدود نفرت وحقارت کا حامل تھا۔ جو آج کل کے صحیح اور کھرے انگریز کے نزدیک ہے۔ یہ جذبات اُس وقت حدِکمال کو پہنچ گئے تھے۔ جب جدوب صلیبی کے اراذل اور انفار نے آکر سلطنت پر قابو پالیا۔ اور اُن سے پہلے درجے کے گنوار اور جنگجو سردار اپنے بدنما کپڑے پہنے شہنشاہی محلوں کے ارد گرد آوارہ گردی کرنے لگے۔ وہ شہنشاہ کی پُشت پر تھپکیاں تک دیتے۔ اور اُس کے تختِ شاہی پر دھڑام سے بیٹھ جاتے۔ گویا یا زنطینی اطوار و آداب کے شیش محل میں سانڈ آن گھُسے تھے۔ دوسری طرف سے اس نفرت وحقارت کا بالکل تُرکی بہ تُرکی جواب دیا گیا۔ دُنیائے مسیحیت کا زیادہ حصہ جو سب سے زیادہ دولتمند اور مہذب ترین تھا۔ تمام تر کوششوں کے باوجود پاپائے روما کے دائرۂ اقتدار سے قطعاً آزاد رہا۔ اُس نے نہ پوپ کو تسلیم کیا۔ اور نہ کسی شکل میں اُس کے اختیار و اقتدار کو مانا۔ یہ تلخ ترین گولی تھی۔ جو پاپائیت کے پندار اور حرص وہوا کو نگلنی پڑی۔ ان ضدی اور متشدد"فرقہ پرستوں" کو (جیسا کہ عموماً ہوتا ہے)"کفار و ملحدین" سے بھی زیادہ نفرت کا نشانہ بنایا گیا

یورپ کے روحانی پیشواؤں نے ہر جگہ اُن کو بدنام و رُسوا کرنا شروع کر دیا۔ لاطینی اور جرمن اِن "زنخے" "گریفیوں" کو اُسی حقارت سے دیکھتے تھے۔ جس سے وہ مغربی وحشیوں کو دیکھتے تھے۔ آخر الذکر لوگ ان کو (زیادہ تر غیر منصفانہ طور پر) مسلسل عیاری اور غداری سے متہم کرتے تھے۔ اور یہ بالکل چھاج اور چھلنی والا معاملہ تھا۔ اس کی مثال یہ ہے۔ کہ گیلی پولی کی مہم میں ہمارے اُجڈ سپاہیوں کو جب کبھی مسلمانوں سے واسطہ پڑتا تھا۔ وہ اُنھیں نہایت "معزز دشمن" سمجھتے تھے۔ اور اُن کی فراخ دلی اور بہادری سے بے انتہا متاثر ہوتے تھے۔ لیکن یونانیوں کو نہایت مکار اور کمینہ خیال کرتے تھے۔ ان کی دولت و ثروت۔ اُن کے درخشاں ساز و سامان اور اُن کی تہذیب کو دیکھ کر تحسین یا تقلید کا جذبہ پیدا نہ ہوتا۔ بلکہ صرف اُن کی حرص و آز بیدار ہو جاتی۔ وہ ہمیشہ سوچتے تھے۔ کہ بیت المقدس کو نجات دلائیں یا یونانیوں کی سلطنت پر دھاوا کر کے اُسے لوٹ لیں۔ بالآخر اُنھوں نے چوتھی حرب صلیبی میں یہی کیا۔ اس طرح گویا بازنطینی تہذیب باہمی نفرت و حقارت کی دیوار سے بس اسی قدر محفوظ و منقطع ہو سکی جیسے وہ شیشے کی کوئی دیوار ہو۔

اس سلطنت کے "بانجھ پن" کا تیسرا پہلو یہ ہے۔ کہ وہ اپنے آغاز اور اپنی لاغیریت کے پندار ہی میں ملفوف ہو کر زندگی بسر کرتی رہی۔ اس کے حکمران طبقے مختلف النسل قوموں پر مشتمل تھے لیکن صرف "رومن" کہلاتے تھے۔ اور اپنی سلطنت کو "رومن سلطنت" کہتے تھے۔ یونانیوں کے نام سے اُنھیں نفرت تھی۔ ثقافت۔ اچھی حکومت اور سچا مذہب یہ سب چیزیں صرف اُنہی سے مخصوص تھیں۔ اُن کا مخصوص قومی کلیسا غیر مہذب غیر ملکیوں کی نام نہاد مسیحیت کے مقابلے میں نہایت بلند و برتر تھا۔ علاوہ بریں وہ اٹلی کے کسی پادری کے سامنے عاجزانہ سر اطاعت خم

نہ کرتے تھے۔ چونکہ یہ صورت حالات نہایت پسندیدہ۔ اعلیٰ وارفع تاریخی اور مقدس تھی۔ اس لئے اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت دامی نہ ہوتی تھی۔ ان کا رویہ معاملات وامور کے متعلق وہی تھا۔ جو مثال کے طور پہ ہمارے قدیم ٹوریوں، ہمارے "کاسل ریگوں" ہمارے ویلنگٹنوں اور ہمارے "مارننگ پوسٹ" نے ہمارے عظیم جلیل دستور (کانسٹی ٹیوشن) کے متعلق اختیار کیا تھا۔ انھیں رومن سلطنت کا وہ دستور ورثے میں ملا تھا جس کو Diocletian نے تیسری صدی میں بالکل نئے سرے سے وضع کیا تھا۔ اس کا نصب العین یہ تھا۔ کہ استحکام پختہ اور غیر متغیر ہو۔ پوری آبادی ذاتوں میں منقسم رہے۔ تاکہ ایک نسل دوسری نسل کے نقش قدم پہ گامزن رہے۔ اور صرف انسانی مواد میں تبدیلی ہو۔ اصل نظام بالکل قائم ودائم رہے۔ اُن کی ثقافت کا حال یہ تھا۔ کہ عظیم یونانی ادب گویا بازنطیم کے "صندوقچہ تبرکات" میں پڑا تھا۔ اور وہ لوگ اُسے کوئی محرک یا موجب ہدایت چیز نہ سمجھتے تھے۔ بلکہ محض قسیسانہ منتروں کا مجموعہ۔ علم و فضل کا مشق نامہ اور ایک بے معنی سی دُعا خیال کرتے تھے۔ وہ اسے زیادہ تر کافرانہ چیز سمجھ کر نشانۂ نفرت بناتے۔ اور اُس کی جگہ اولیاءِ مسیحی کے حالاتِ زندگی کا مطالعہ کرتے۔

بازنطیم اگرچہ بظاہر تہذیب کے رنگ وروغن سے آراستہ تھا لیکن اندرونی طور پہ اُس کا قلب بالکل بربری تھا۔ اور اس کی بربریت میں نسلاً بعد نسلٍ برابر اضافہ ہوتا رہا۔ اس کی تقبیل اصول پرستی اور متین پرہیز گاری کے ساتھ ہی نہایت ملعون ظلم وبیدردی کا رواجی شعار بھی شامل تھا محلاتی انقلابات مہیب ہولناکی کے ڈرامے ہوتے تھے۔ مثلاً شہنشاہ بیگم تھیوفانو شہنشاہ کے قاتلوں کے لئے محل کا دروازہ کھول دیتی ہے — زوئی اپنے شوہر کو زہر دے دیتی ہے۔ شہنشاہ بیگم آئرین جس نے بہت

سے گرجے ۔ صومعے اور یتیم خانے قائم کئے تھے ۔ اور جسے کلیسائے یونان نے "اولیا" کی فہرست میں جگہ دے دی تھی ۔ اپنے بیٹے کو مہر مادری کا واسطہ دے کر تخت سے اُٹھا کر لے جاتی ہے ۔ اور اُس کی آنکھیں پھوڑ دیتی ہے ! آنکھیں نکال دینا ۔ زبان کاٹ دینا ۔ خصی کر دینا جسم میں میخیں ٹھونک دینا سُولی پر لٹکا دینا اور زندہ انسان کی کھال کھینچ لینا ۔ وہ سزائیں تھیں ۔ جو عام طور پر دی جاتی تھیں ۔ Augusteon کے کنارے جو محل تھا ۔ اُس کے دروازہ چاکے کو ترکی سلاطین کی محلسرائے (سراگلیو) کی طرح مقتولوں کے سیاہ ہوتے ہوئے سروں سے آراستہ کیا جاتا تھا ۔ ایک دفعہ روسیوں پر فتح پانے کے بعد قسطنطنیہ کی فصیلوں پر بے شمار کٹے ہوئے ہاتھوں کے ہار لٹکائے گئے ۔ عربوں کے خلاف جو چند بحری کامیابیاں ہوئیں ۔ اُن میں سے ایک پر جو فتح کا جشن منایا گیا ۔ اُس میں آبیڈرامی ٹوس سے لے کر سٹروبلی لوس تک ساحل کو جنگی قیدیوں کی نعشوں سے سجایا گیا ۔ جن کو میخیں ٹھونک کر ہلاک کیا گیا تھا ۔ اسی طرح کمبالنگو کی گھاٹی میں جب شہنشاہ باسل ثانی نے بلغاریوں کو دفعتہً آلیا ۔ تو پندرہ ہزار قیدیوں کی آنکھیں نکال ڈالیں اور ہر ایک سَو قیدیوں کے بعد ایک قیدی کی ایک آنکھ سلامت رہنے دی ۔ تاکہ روتے چیختے اور آنکھوں سے خون بہاتے ہوئے اندھوں کا یہ بے پناہ ہجوم راستہ ٹٹولتا ہُوا اپنے بادشاہ کے پاس واپس جا سکے ۔ جب آرمینیا جیسی ولایات میں بغاوت ہو جاتی ۔ تو ان ولایتوں کو قتل عام ۔ عصمت ریزی اور تباہ کاری کی سزائیں دی جاتیں ۔ اور کٹے ہوئے سروں کے مینار کھڑے کئے جاتے ۔ تاکہ دیکھنے والوں کے لئے عبرت انگیز ہوں ۔ صدیاں گزر گئیں ۔ لیکن اخلاق و انسانیت کے نشوونما کا کوئی سراغ تک پیدا نہ ہو سکا ۔ ترکوں نے بازنطینی دربار کے اکثر معمولات اور روایات کو اختیار کر لیا ۔ لیکن آج اُن پر بازنطینی اقوام کی بربیت کا الزام عائد کیا جاتا

ہے۔ جن پر انھیں بدقسمتی سے حکومت کرنے کا موقع ملا تھا۔

بازنطیم والوں نے یونہی دس صدیاں بسر کر دیں۔ اُن میں کوئی تغیّر نہ ہوا۔ اور وہ ہمیشہ "پشت بہ منزل" رہے۔ بلاشبہ اُن کی قدیم مذہبی منبّت کاری کی شفاف چمک دمک۔ اُن کے چنر دار معبدوں کے جواہرات اور اُن کی چینی کاری۔ اُن کے مذہبی لباسوں کی طلائی شانہ پٹیاں۔ اُن کے کنول کے سے ستون اور طاؤسی تختے۔ اُن کے گرجاؤں کے مرمری نقش و نگار۔ اور اُن کی آرائشی صنعت کاری کی "مقبرہ نما" شان و شوکت جو بالکل ایک مُردہ عورت کے حسن و جمال کی طرح دیکھنے والوں کو دلربائی اور کیکپی کا بیک وقت احساس دلاتی ہے۔ اور بلاشبہ دفتری حکومت کی نظم و نسق کی بعض غیر اہم تفصیلات بھی قابل لحاظ ہیں۔ (کیونکہ جسٹینین کا زمانہ بازنطینی نہیں۔ بلکہ رومن سمجھا جانا چاہئے) لیکن یہ واضح ہے کہ بازنطیم نے انسانی ثقافت و تہذیب اور یورپ کے احیا میں کوئی حصّہ نہیں لیا۔ اور اس پر کسی قسم کا اضافہ نہیں کیا۔ جن مُلکوں کی نشو و نما اُس کے زیر اثر ہوئی (مثلاً روس اور ممالک بلقان) اُن کو اُس نے وہ عناصر ورثے میں دیئے۔ جو اُن کی تہذیب نہیں بلکہ اُن کی بربریت کا سر و سامان ہیں۔

یہ گویا اُس تہذیب کی نوعیت تھی جس کے غیر منقطع تسلسل کی وجہ سے اور ہر قابل تصور فائدے سے پورے استفادہ کے بعد سلطنت روما اور مسیحیت نے جنم لیا تھا۔ یہ گویا ایک کی جامد قدامت پسندی اور دوسرے کی دنیاوی عقیدہ پرستی کی پیداوار تھی۔ آج مؤرخین بہت اہتمام کے ساتھ یہ ظاہر کرتے ہیں۔ کہ قدیم و جدید دُنیاؤں کے درمیان کوئی انقطاع واقع نہ ہوا تھا گویا یہ ثابت کرنا مقصود ہے۔ کہ ازمنۂ ظلمہ کا اندھیرا کچھ زیادہ گہرا نہ تھا۔ اور اسی کے مسلسل اور غیر منقطع عمل سے یورپ کا احیا وجود میں آیا تھا۔ اس قسم کے تسلسل کا اثر بازنطینی سلطنت میں نمایاں ہے۔ مغرب میں رومن

بلدیات کے آثار پر آزاد شہر معرضِ وجود میں آئے۔ اور رومی اداروں اور انجمنوں ہی سے تجارتی کارکنوں کے "گلڈ" پیدا ہوئے لیکن دولت و تجارت کی ترقی سے قبل کوئی آزاد شہر اور کوئی "گلڈ" وجود میں نہ آئے اور نہ آسکتے تھے۔ ازمنۂ متوسطہ کی ثقافت یونانی و رومی ادبیات کی زمین سے اُگی تھی لیکن اجنبی غفائد کے تسلط کے ماتحت اور عالمگیر ناخواندگی کے درمیان یہ ادبیات ختم ہوگئے۔ اور جب تک دوسرے ذہنی عناصر عمل میں آکر محرک ثابت نہ ہوئے۔ عہدِ متوسط کی ثقافت کو اُٹھنے کا موقع نہ ملا" نوجوان اور قوی ٹیوٹن قوموں نے (جن کو Giesebrecht اور ہمارے ٹیوٹن دوست مسیحیت اور جرمنیت کے محاسن کا امتزاج کہتے ہیں۔ اور جن کو ہمارے مؤرخین شپنگلر، "سیلے" اور گرین سے لے کر فرینچ تائین" تک نے دنیائے جدید کی نشاۃ الثانیہ کا سرچشمہ بتایا ہے) ان میں زندگی کی روح نہیں پھونکی۔ بلکہ ہلاکت اور بربریت سے لبریز کر دیا۔ مسیحی اور جرمن محاسن کا نتیجہ ترقی کی شکل میں نہیں بلکہ مستقل اور روز افزوں بربریت آموزی کی صورت میں نکلا۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ کہ دُنیائے قدیم کے کھنڈروں پر یک لخت ایک نئی دُنیا پھلنے پھولنے لگی۔ بلکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ کوئی پانسو سال کی مدت تک یورپ گہرائیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ اور صورتِ حالات برابر بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ نویں صدی میں (بمقابلہ چھٹی اور ساتویں کے) حالات بے انتہا تاریک اور قطعی طور پر یاس انگیز تھے۔ اگر نویں صدی کا وہ اندھیرا دور باقی دُنیا سے منقطع رہتا۔ اور اُسے صرف اپنے ہی وسائل پر حصر کرنا پڑتا۔ تو کوئی وجہ نہ تھی۔ کہ وہ اپنے کسی عنصرِ زندگی کے بل پر کبھی مہذب ہو سکتا۔ افراتفری کے اس تنزل آفرین دور میں کوئی بھی ممکنات مُضمر ہوتے۔ یا کوئی بھی ایسی قوتِ عاملہ ہوتی۔ جو سازگار حالات میں مفید ثابت ہو سکتی لیکن مُشکل یہ تھی۔ کہ ان لوگوں میں زندگی اور ترقی کے وہ

تخم ہی موجود نہ تھے۔ جو اپنی طبعی اور اندرونی قوت سے پھوٹ کر پروان چڑھنے کے قابل ہو جاتے۔ صورت ایسی تھی کہ یورپ ایک قسم کے "بربری جشنہ" کی طرح بالکل منتجر ہو جاتا۔

جس روشنی سے تہذیب کا چراغ ایک دفعہ پھر روشن ہوا۔ وہ یونانی رومی ثقافت کے اُن شراروں سے نہیں اُٹھی۔ جو یورپ کے کھنڈروں میں سُلگ رہے تھے۔ اور نہ باسفورس کی "زندہ موت" سے وجود میں آئی تھی۔ یہ روشنی شمال سے نہیں آئی۔ بلکہ اسے سلطنت کے جنوبی حملہ آور یعنی عرب اپنے ساتھ لائے تھے۔

پانچواں باب

دارُالحکمت

جس سامی قوم نے اسلام کا عَلَم بلند کیا۔ وہ بھی یورپ کی طرح ایک دینی عقیدے سے سرشار تھی۔ اُسی کا نام لے کر وہ اپنے صحرائی خیموں سے اٹھی۔ اور حیرت انگیز طور پر قلیل مدّت کے اندر ایک سلطنت کی بانی بن گئی۔ جو رومن سلطنت سے زیادہ وسیع تھی۔ اور ایک طرف کاشغر اور پنجاب اور دوسری طرف اطلانتک اور جنوبی فرانس تک پھیلی ہوئی تھی۔ بلاشبہ مسیحی عقیدے کی پُرتکلفی اور اس کے پادریوں کی شاہانہ اور مکمل تنظیم کے مقابلے میں اسلام کی خالص خدا پرستی۔ باقاعدہ الٰہیات صنمیات اور روایات کے فقدان۔ رسوم و عوائد سے بیگانگی اور ہر قسم کی مذہبی پیشوائی اور برہمنائی سے آزادی نمایاں تھی۔ لیکن ان کے علاوہ دوسرے وجوہِ تفاوت بھی تھے۔ جو زیادہ بُنیادی تھے۔

کوئی تصور اس سے زیادہ بعید از صداقت نہیں۔ کہ اسلام کے متعلق یہ سمجھا جائے۔ کہ وہ ایک قسم کی "مہدی کی بغاوت" تھی۔ اور وحشی درویشوں کا "جہاد" تھا۔ جو مذہبی جنون کے ماتحت آگ بگولا ہو رہے تھے۔ جن تجربوں کی وجہ سے اس قسم کے تصورات قائم کئے جاتے ہیں۔ اور مسلمانوں کے مذہبی جنون بلکہ خود مسلمانوں کے مذہب کے متعلق رائے

قائم کی جاتی ہے۔ وہ سب بعد کے زمانے کی باتیں ہیں۔ جب اسلام کی حقیقی تہذیب پیوند خاک ہو چکی تھی۔ اور اس کے عقائد کی صورت اشاعرہ کی فقہیات سے بالکل بدل چکی تھی۔ اسلام اپنی ابتدا میں اور اپنے زمانہ عروج و کمال میں اس سے بہت مختلف تھا۔

قبیلۂ قریش جس میں سب سے پہلے اسلام نمودار ہوا۔ اگرچہ اپنی ترکیب کے اعتبار سے "پدرانہ اقتدار" کا ایک سادہ نمونہ تھا لیکن اپنی ذہنیت کے لحاظ سے قطعاً قدیم اور غیر مہذب نہ تھا۔ یہ دولت مند اور جہاں دیدہ تاجروں کی ایک برادری تھی۔ جو بیرونی دنیا سے گہرا رابطہ رکھتی تھی۔ ان کا معاشرہ نہایت خوش اطوار تھا مجلسی ربط و اختلاط، مہذب شائستہ عورتوں کی صحبت۔ شاعری (جو اب تصنع و تکلف سے لبریز ہو رہی تھی) اور راگ رنگ کے جلسوں اور مقابلوں سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ اس معاشرے کا رویہ سنجیدہ یقینیات کے متعلق بالکل دنیا دارانہ اور متشکک ہو چکا تھا۔ اور دوسرے غیر مہذب عرب قبائل کی طرح جو اس کے گرد آباد تھے۔ مختلف روایتی مذہبوں کے انبار سے آگے بڑھ چکا تھا اور صرف روایتی اور رواجی حیثیت ہی سے ان کا پابند چلا جاتا تھا۔ اس قریش برادری کے تجارتی بیوپاریوں میں سے ایک محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تھے۔ جن کی سادگی اور خلوص کا اثر اس برادری پر بالکل ایسا ہی ہوا۔ جیسے توحیدی مسیحیوں (یونیٹیرین) کا کوئی پادری تمے فیئر میں وعظ کہہ کر پیدا کرے۔ انھوں نے جس عام احساس کی ترجمانی کی۔ وہ کسی مذہبی القاء الہام کے جوش و خروش کی نہیں۔ بلکہ اس معقولیت پسندانہ بے اطمینانی کی نمایندگی تھی۔ جو مختلف مسلکوں کے فرسودہ مجموعے سے پیدا ہو چکی تھی۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) وسیع معنوں میں بت شکن تھے۔ ان تمام مذہبی زوائد کے خلاف جو خدا پرستی کے عمومی تصور پر چھائے ہوتے تھے۔

آواز بلند کرکے اس عقیدے کا سادہ ترین اظہار کرتے تھے۔ جس طرح Channing کسی قسم کے معجزنما یا فوق الفطرت دعاوی کے بغیر نہایت خالص انسانی اور عمومی انداز سے اپنے اصلاحی خیالات کی تبلیغ کرتا تھا۔

اس میں شک نہیں۔ کہ پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مقرب رفقا میں ایک جماعت نہایت مخلصانہ مذہبی جوش و خروش سے مالا مال تھی۔ جن کے اردگرد بعد میں سُنّی اور شیعہ فرقے پیدا ہو گئے۔ لیکن انہی میں فاروق اعظم (رضی اللہ عنہ) جیسے رہنما بھی تھے (جنھیں میں اسلام کا "سینٹ پال" کہتا ہوں) جو اسلام کی توسیع و تنظیم کے سب سے بڑے محرک بلکہ ایک معنی میں اس کے اصلی بانی تھے۔ لیکن بہت ہی جلد یہ تمام عناصر معدوم ہو گئے۔ اور ان کا موقف اس قدر پست ہو گیا۔ کہ انھیں کوئی اثر و اقتدار حاصل نہ رہا۔ بعد میں جتنی بھی ترقی اور حیرت انگیز توسیع ہوئی۔ وہ مذہبی نہیں بلکہ سیاسی تحریک تھی جس کا مقصد حقیقی الحقیقت فتح و ظفر اور لوٹ مار تھا۔ مسلمان قبائل کی عام آبادی نہ اسلام کے متعلق کچھ جانتی تھی۔ نہ جاننے کی پروا کرتی تھی۔ ایک سے زیادہ موقع پر ایسا ہوا۔ کہ وہ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ سے آگے کوئی دُعا پڑھنے سے قاصر رہے اور سُننے والے ہنستے رہے۔ فتوحات کی خیرہ کُن سرعت زیادہ تر مسلمانوں کی قابلیت اور بازنطینیوں کی ناقابلیت کا نتیجہ نہ تھی۔ بلکہ شام اور مصر کی مسیحی آبادیوں کی امداد و دوستی نے بڑا کام دیا۔ جو مذہبی تشدد اور مذہبیات سے سخت تنگ آئی ہوئی تھیں۔ خلفائے راشدین کے زمانے میں تو یہ حال تھا۔ کہ مدینہ منورہ کے بازاروں میں متعجب حاجیوں کو "امیر المومنین" دکھلائے جاتے تھے۔ جو ایک پھٹا ہوا جُبّہ پہنے تِلوں کی روٹی پیاز کے ساتھ کھا رہے ہوتے۔ اور

جب فاروق اعظم (رضی اللہ عنہ) نے مفتوح یروشلم کی بیعت و اطاعت قبول کرنے کے لئے اونٹ پہ سفر کیا۔ تو صرف ایک خادم ساتھ تھا۔ اور کھجوروں کا ایک تھیلہ زادِراہ تھا۔ اس کے بعد خلافت قریش کے اُمویوں کے ہاتھ آئی۔ جو اسلام کے سخت مخالف تھے [ل] وہ اس سے وابستگی اور اپنے دعاوی کی خالص سیاسی نوعیت کو علی الاعلان ظاہر کرنے اور اپنی بے پروائی کے اظہار میں کسی احتیاط و تامل کو روا نہ رکھتے۔ کوئی ایسا دین نہ ہوگا۔ جس کی تبلیغ و اشاعت ایمان و عقیدہ کے اس فقد ان سے ہوئی ہو۔ درحقیقت اسلام کا یہ منظر نہایت غیر معمولی اور حیرت انگیز ہے۔ کہ وہ اپنے انتہائی انحطاط کے زمانے میں تو ایک بہت پُرقوت اور وسیع مذہبی تحریک کا باعث ہوا۔ لیکن اپنے آغاز اور عروج کے دوران میں مذہب سے قطعی بیگانہ و بے پروا رہا۔ وہ ایک ایسی تحریک تھی جس میں بڑی بڑی آبادیاں سرد مہر اور غیر مخلص مبلغین کے ہاتھ پر رضامندانہ مسلمان ہوتیں۔ اور اُس کی آخری فتح مذہب کی حیثیت سے ان غیر مہذب حملہ آوروں کے لشکروں کی مدد سے حاصل ہوئی۔ جنھوں نے اسے تہذیب کی حیثیت سے بالکل تباہ کر دیا۔ یہ مخصوص قسم کا ارتقا عیسائیت کے ارتقا سے بالکل اُلٹ تھا۔

عباسی حکمران جو ثقافت اسلامی کے بانی کہلاتے۔ اُمویوں پر زیادہ تر ایران کی مدد سے غالب آئے۔ جہاں اُن کی پرورش اور تربیت ہوئی تھی۔ ساسانیوں کی عظیم الشان اور قدیم سلطنت جو ہمیشہ ہیلانی اور مشرقی تجارت اور ثقافت کے رابطے کا بہت بڑا مرکز رہی۔ جب حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) کے زمانے میں اسلام کے زیرنگین آئی۔ تو اس سے قبل

[ل] یہ کہنا مصنف کی زیادتی ہے۔ اُمویوں میں بھی بڑے بڑے خدام دین پیدا ہوئے حضرت عمر بن عبدالعزیز ان کی ایک روشن مثال ہیں (مترجم)

دو کسراؤں کے ماتحت ایک پُرتکلف اور وسیع المشرب ثقافت کے نقطۂ کمال کو پہنچ چکی تھی۔ اُس نے ہندوستان و چین کی تمام ذہنی اور صنعتی پیداواروں کو فراہم کیا۔ اور پھر مغضوب و معتوب مسیحی فرقوں کو پناہ نگاہ اور مدارات مہیا کی۔ یہاں تک کہ نسطوریوں نے جن کو مذہبی جنوں نے اُن کے مدرسہ ایڈیسا سے بھگا دیا تھا۔ جندی شاپور کے مقام پر ایک پہلے سے بھی زیادہ شاندار مدرسہ قائم کرنے کی ہمت ایرانی حوصلہ افزائی ہی سے حاصل ہوئی۔ ایران کی اس رواداری اور وسیع المشربی کی فضا میں جس نے کئی "نئے مذاہب" دیکھ رکھے تھے۔ اسلام ایک فلسفیانہ نقطۂ نگاہ سے قبول کر لیا گیا۔ جس نے اس کی سادہ دینیات کو لطیف تر بنا کر ایک معتدل سنی خدا پرستانہ "عقلیت" میں منتقل کر دیا۔ جس کو اسلام کے متقیان کرام نے "زندقہ معتزلہ" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ خلفائے عباسی اور تہذیب اسلامی کے دوسرے معماروں نے دین اسلام کے ساتھ محض ایک خفیف سی نام نہاد مطابقت کو قائم رکھا۔ المامون کا قول تھا۔ کہ جن لوگوں نے اپنی عقلی قوتوں میں اضافہ کرنے کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر رکھی ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ انسان اور اُس کے بہترین اور مفید ترین بندے ہیں۔"

ثقافتِ اسلامی کے عروج میں بعض دوسرے سازگار حالات بھی معاون ثابت ہوئے۔ چونکہ عرب ایک زمانے میں قدیم کلدانیوں کی طرح اجرام سماوی کی پرستش کرتے رہے تھے۔ اس لئے صحرائی آبادیوں میں فلکیات و ہیئت کا ذوق پیدا ہو گیا تھا۔ اسی طرح معالجۂ امراض اور نباتیات میں بھی سادہ انداز سے کچھ ترقی ہوئی۔ جن میں خود حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور حضرت ابو بکر (رضی اللہ عنہ) بھی مہارت رکھتے

سے تھے ۔ اور یہ چیز قومی روایات میں شامل تھی ۔ اور جب عربی بدویوں نے شیتم کے خیموں کو چھوڑ کر دمشق و بغداد کے تکلفات اختیار کر لئے ۔ تو اُنھیں نسطوری طبیبوں کی خدمات سے فائدہ اُٹھانے کا موقع مل گیا جن کے علم و ہنر نے خلفاء سے خراج تحسین حاصل کیا ۔ اور اُنھوں نے اُن ماخذوں کی تحقیق شروع کر دی ۔ جن سے اطبا کسب علم کرتے تھے ۔ اس طرح اُنھیں بقراط و جالینوس اور آخر الذکر کے نامور اُستاد یعنی ارسطو سے شناسائی حاصل ہوئی ۔ چونکہ وہ اپنے صحرائی گھروں میں رہ کر یونانی مذہبی سلطنتوں یا روما کی فتوحات سے عملاً محفوظ رہے تھے ۔ اس لئے وہ اب تک زمانہ قدیم کے ساتھی ہی تھے ۔ جب اُنھیں دفعتہً دولت و قوت حاصل ہو گئی اور اُن کا رابطہ گزشتہ بڑی بڑی تہذیبوں کی روایات سے ہوا ۔ جن کے دُھندلے سے آثار ابھی بازنطینی مشرق میں موجود تھے ۔ تو وہ شمالی بربریوں کی طرح روما کے بڑے نام سے مرعوب نہیں ہوتے ۔ جو کئی نسلوں سے خدائی شوکت و قوت کا پیکر چلا آتا تھا ۔ اور نہ اُس کے مذہب ہی سے متاثر ہوتے ۔ وہ اس مادی ثقافت کے حصول کے خواہاں تو ضرور تھے ۔ جو "رومن ممتی" کے ہاتھوں میں سر لمبیرا اور بیکار پڑی تھی لیکن روما کے غیر مہذب لوگوں سے نفرت کرتے تھے ۔

وہ شان و شکوہ جو خلفاء نے اسلام کے اشارے پر جنات کی خیالی مخلوق کی طرح نمودار ہو گئی تھی ۔ اور جس نے اپنی درخشاں ثروت اور نازک سحر کاری کو الف لیلہ کی تہذیب میں نمایاں کر دیا تھا ۔ اس کی روحیت میں کسی قدر قدیم ہیابانی اور کافرانہ لذت حیات بھی شامل تھی ۔ یہ ایک ایسی لذتیت تھی جس کو بدویوں کی اعلیٰ متانت نے لطیف تر اور باوقار بنا دیا تھا یہ ایک فلسفیانہ سنجیدگی تھی ۔ جو جام و مینا سے لطف اندوز ہوتے وقت سمجھتی تھی ۔ کہ یہ معمولی بات ہے ۔ اور اس میں کوئی مضائقہ نہیں ۔ تمتب

عیش ناپائدار ہے۔ اور قسمت کی تلوّن مزاجی کا کوئی اعتبار نہیں۔ بغداد شیراز اور قرطبہ کے حکمران ذہنی ثقافت کے لازوال خزائن اور اُن کی سرپرستی کو اپنے درباروں کی بہترین شوکت و عظمت خیال کرتے تھے۔ لیکن اُن کی سرپرستی میں اسلامی علوم و فنون نے جو حیرت انگیز ترقی کی۔ اس کا یہ مطلب نہیں۔ کہ یہ محض اُن کے شاہانہ پندار کا لازمہ تھا۔ بلکہ وہ ذاتی جوش و خلوص سے ثقافت کے حصول کی کوشش کرتے تھے۔ اور اس کے حامل و مالک بن جانے کے خواہاں تھے۔ اس امر کی نہ کوئی مثال پہلے موجود تھی۔ نہ اب تک ہے۔ کہ کسی وسیع سلطنت کے طول و عرض میں حکمران طبقے اتنے بڑے پیمانے پر حصول علم کی مجنونانہ خواہش سے سرشار ہو گئے ہوں۔ خلفا و اُمرا اپنے محلوں سے اُٹھ کر کتب خانوں اور رصدگاہوں میں جا گھستے تھے۔ وہ اپنے امور سلطنت سے عام طور پر غفلت برتتے تھے۔ اور نظم و نسق خاطر خواہ نہ ہوتا تھا۔ لیکن اہل علم کے خطبات کو سننے اور اُن سے مسائل ریاضی کے متعلق مذاکرات کرنے میں ہرگز کوتاہی نہ کرتے۔ مسوّدات و مخطوطات اور نباتیاتی نمونوں سے لدے ہوئے کاروان بخارا سے دجلہ تک اور مصر سے اُندلس تک رواں دواں رہتے تھے۔ صرف کتابوں اور معلّموں کے حصول کی خاطر قسطنطنیہ اور ہندوستان کو خاص سفیر بھیجے جاتے تھے کسی سلطنت سے تاوان جنگ وصول کرنے کے سلسلے میں یونانی مصنّفین یا کسی ممتاز ریاضی دان کی تصنیف حاصل کرنے کا مطالبہ کیا جاتا تھا۔ ہر مسجد کے ساتھ ایک مدرسہ ملحق ہوتا تھا۔ وزرائے سلطنت کتب خانوں کے قیام۔ مدارس کے لئے اوقاف کے انتظام۔ اور غریب طلبہ کے لئے وظائف کے اہتمام میں اپنے آقاؤں سے بھی آگے بڑھ جانا چاہتے تھے۔ اہل علم کو بلا امتیاز نسل و مذہب دوسرے

سب لوگوں پر فوقیت دی جاتی تھی۔ اُن پر دولت و ثروت اور اعزازات کی بارش کر دی جاتی۔ وہ ولایات کے حاکم تک مقرر کر دیئے جاتے جب خلفا کسی سفر یا مُہم پر روانہ ہوتے۔ تو اہلِ علم کا ایک گروہ اور کتابوں سے لدے ہوئے اُونٹوں کی قطار ہمراہ ہوتی۔

یورپ کی حقیقی نشاۃ الثانیہ پندرھویں صدی میں نہیں۔ بلکہ عربوں اور مُوروں کی احیائے ثقافت کے زیر اثر وجود میں آئی۔ یورپ کی نئی پیدائش کا گہوارہ اٹلی نہیں ہسپانیہ تھا۔ یہ برّاعظم بربریت کے گڑھوں میں گرتے گرتے جہالت و تنزل کی تاریک ترین گہرائیوں میں پہنچ چکا تھا۔ حالانکہ اُسی زمانے میں عربی دُنیا کے شہر بغداد، قاہرہ، قرطبہ طلیطلہ تہذیب اور ذہنی سرگرمی کے روز افزوں مرکز بن چکے تھے۔ وہیں وہ زندگی نمودار ہوتی جس کو آیندہ چل کر انسانی ارتقا کی ایک نئی منزل کی شکل اختیار کرنا تھا۔ جس وقت اس ثقافت کے اثرات معرضِ احساس میں آئے اُسی زمانے سے ایک نئی زندگی کی حرکت شروع ہوتی۔

اس حقیقت کو بار بار پیش کیا جا چکا ہے لیکن بعض لوگوں نے اس سے ہمیشہ تغافل کیا ہے۔ اور اس کی اہمیت کو کم کرنے کی بہیم کوششیں کی ہیں۔ یورپ کسی کا "فرستگیتہ" کا شرمندۂ احسان ہو۔ اس اعتراف کو سیحی تاریخ میں کوئی مقام حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اور بعد کے تمام تصوّرات پر دروغ بافی اور غلط بیانی کا غلبہ رہا ہے۔ روایاتِ قدیم کی گرفت اُن کے شدید مخالفین پر بھی قائم رہتی ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے۔ کہ خود گبن بھی اسلام کو بنظرِ استخفاف دیکھتا ہے۔ گزشتہ صدی تک عربوں کی تاریخ و ثقافت کا اتنا علم بھی موجود نہ تھا۔ جو صحت و حقیقت سے قریب ہوتا۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور قرآن کے متعلق جو بیانات یورپ میں انیسویں صدی کے آغاز سے پہلے شائع ہوئے۔ وہ اب

محض ادبی "عجائبات" سمجھے جاتے ہیں"۔ ۵ آج کل کے زمانے میں بھی جب کہ وسیع تر اور صحیح تر علم کا حصول آسان ہوگیا ہے۔ ازمنۂ متوسطہ کی کسی تاریخ میں اسلامی ثقافت کا ذکر موجود بھی ہے تو محض ضمنی حیثیت سے اور صرف "مربیانہ اعتراف" کے طور پر ہے۔ بربریت کی حالت سے یورپ کے احیائے نو کی تاریخیں برابر لکھی جا رہی ہیں۔ لیکن اُن میں عربوں کی تہذیب کا کوئی ذکر نہیں (جیسے شہزادہ ڈنمارک کی تاریخ میں ہملٹ کا ذکر نہ ہو) سوائے اس کے کہ "ہلال پر صلیب کی فتوحات" اور "مُوروں کے قبضے سے ہسپانیہ کی مخلصی" کے نعرے لگائے گئے ہیں ڈاکٹر اوسبورن ٹیلر نے تو کمال ہی کر دیا۔ ازمنۂ متوسطہ کے ذہنی ارتقا پر دو جلدیں لکھ دیں لیکن مسلم ثقافت کے وجود کی طرف کہیں اشارہ تک نہیں کیا۔

یہ بالکل تصور نہیں کیا جا سکتا۔ کہ بربریت میں ڈوبی ہوئی آبادیوں کے پہلو بہ پہلو رہنے اور اُن سے مسلسل رابطہ رکھنے والی ایک درخشاں اور پُرقوت تہذیب تخلیقی توانائی سے بھرپور بھی ہو۔ اور پھر اُن آبادیوں کے نشو و ارتقا پر گہرا اور اہم اثر نہ ڈالے۔ ظاہر ہے کہ اسلام اور یورپ کے رابطہ میں قانونِ فطرت معطل و ملتوی نہ ہوگیا تھا۔ اور اب اُس کے گراں قدر ثبوت مہیا ہو چکے ہیں۔ حالانکہ اس رابطہ کی یادداشتوں کو دبانے بگاڑنے اور محو کر دینے کی سازشیں برابر جاری رہی ہیں۔ اس کی وسعت اور اہمیت بلاشبہ اس قدر زیادہ تھی۔ کہ آج کل تفصیل کے ساتھ اس کا اظہار بھی ناممکن ہے۔ ناپید زندگی کے ارضیاتی آثار کی طرح عربی تہذیب کے متعلق ہمارا علم صرف اُن بکھری ہوئی شہادتوں سے ماخوذ ہے۔ جو اتفاق سے باقی رہ گئیں۔ اور اُن قوتوں کے ہاتھ سے بچ گئیں۔ جو

۵؎ Prof. Bivan Camb. Med. Hist

اُنھیں بالکل محو کر دینے پر تُلی ہوئی تھیں۔ اگر اِن حالات کو ذہن میں رکھا جاتے کہ شہادتوں کو محو کیا گیا۔ بگاڑا گیا۔ اور پھر واحد حقیقت کے متعلق پیہم و متواتر متعصبانہ غلط بیانیاں کی گئیں۔ تو اس میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔ کہ ہم عربوں کے اثر کے متعلق جو کچھ بھی بیان کرینگے۔ وہ حقیقت کے مقابلے میں کم تو ہو سکتا ہے۔ زیادہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ یہ اغلب خیال ہے۔ کہ اگر عرب نہ ہوتے تو زمانۂ حاضر کی یورپی تہذیب پیدا ہی نہ ہوئی ہوتی۔ اور یہ قطعی و یقینی ہے کہ یورپی تہذیب ایسی نوعیت اختیار نہ کر سکتی جس کی وجہ سے وہ ارتقا کی تمام ماقبل منزلوں سے آگے بڑھ گئی ہے۔ کیونکہ اگرچہ یورپ کی نشو و نما کا کوئی ایک پہلو بھی ایسا نہیں جس میں ثقافتِ اسلامی کے قطعی اثر کا سراغ نہ مل سکے۔ لیکن اس کا نہایت واضح اور مہتم بالشان ثبوت یہ ہے۔ کہ یورپ میں وہ قوت پیدا ہو گئی۔ جو دنیائے حاضر کی اعلیٰ ترین امتیازی قوت اور اس کی کامیابی کا سب سے بڑا سرچشمہ ہے۔ (یعنی طبیعی سائنس اور سائنسی روح)

ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا چاہئے۔ کہ ہماری تاریخوں نے اس معاملے میں عام سکوت کی جو روش اختیار کی۔ اُس کے ردِّ عمل کے طور پر بعض مصنفین نے ثقافتِ عرب کے دعاوی کی حمایت کرتے ہوئے عربی علوم کی کامیابیوں کا ذکر کسی قدر مبالغہ سے کیا ہے۔ اس قسم کی مدح خوانیوں کے خلاف اعتراض کرنے والوں نے کہا ہے۔ کہ عرب سائنس نے کوئی عالی پایہ "نابغہ" اور کوئی نمایاں انکشاف مہتم نہیں کیا۔ اور یہ سائنس بعض خارجی سرچشموں سے ماخوذ تھی۔ یہ زیادہ تر صحیح ہے لیکن قطعی طور پر غیر متعلق بھی ہے۔ عربوں کے علم ہیئت نے کوئی کوپرنیکس یا نیوٹن پیدا نہیں کیا۔ لیکن اُنھوں نے جو کچھ کیا۔ اُس کے بغیر کوپرنیکس اور نیوٹن پیدا ہو بھی نہ سکتے تھے۔ اگرچہ مُوروں کے علمائے ہیئت نے نظامِ بطلیموسی کی پیچیدگیوں کو

بار بار نشانۂ تنقید بنایا۔ اگرچہ آلزکیال نے اعلان کیا۔ کہ سیاروں کے مدار دائروں کی شکل میں نہیں۔ بلکہ بیضوی ہیں۔ اگرچہ عطارد کے مدار کو الفارابی نے اپنے نقشوں میں بیضوی ظاہر کیا ہے۔ اور اگرچہ محمد ابن موسیٰ نے "حرکتِ نجوم" اور "کشش انصال" کے متعلق اپنی کتابوں میں عالمگیر کشش ثقل کے قانون کی طرف اشارہ کیا ہے۔ لیکن صداقت کی یہ تمام جھلکیاں کسی بڑی اصلاح میں نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئیں۔ عربوں کے علمِ ہیئت نے صرف چند اہم حقائق کو بے نقاب کیا۔ مثلاً البتانی نے سورج کے اوج مدار کی حرکات کا انکشاف کیا۔ اور ابوالوفا نے قمر کے ثانوی اختلافات کا پتہ چلایا لیکن ان سے تحقیق کی رفتار پر کوئی نمایاں اثر نہ پڑا۔ چنانچہ ٹائیکو کو انہی انکشافات کا اعادہ کرنا پڑا۔ کہا جاتا ہے۔ کہ ابن سینا نے ہوائی مقیاس الحرارت سے کام لیا تھا۔ اور ابن یونس نے وقت کی پیمائش کے لئے یقیناً پنڈولم استعمال کیا تھا لیکن چونکہ گلیلیو نے بطور خود ان ایجادوں کو متعارف کرایا تھا۔ اس لئے ظاہر ہے۔ کہ ان سے سائینس کی نشو ونما میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔

"تاہم یہ امر قطعی طور پر خارج از بحث ہے۔ ہماری سائینس پر عربوں کا جو احسان ہے۔ وہ چونکا دینے والے انکشافات یا انقلابی نظریات پر مشتمل نہیں۔ بلکہ سائینس اس سے بھی زیادہ عربی ثقافت کی ممنونِ احسان ہے۔ کیونکہ در اصل سائینس کو اسی ثقافت نے جنم دیا ہے۔ ہم اس سے قبل ثابت کر چکے ہیں۔ کہ دنیائے قدیم "قبل سائینس" کی دنیا تھی۔ یونانیوں کی فلکیات و ریاضیات باہر سے درآمد ہوئی تھیں۔ چنانچہ یونانی ثقافت انھیں پورے طور پر کبھی جذب نہ کر سکی۔ اس میں شک نہیں۔ کہ یونانی اپنے علوم کو مرتب کرتے تھے۔ عمومیت دیتے تھے۔ نظریات قائم کرتے تھے لیکن صابرانہ تحقیق و تفتیش۔ مثبت علم کی فراہمی۔ سائینس کی باریک بینی۔

مفصّل وطویل مشاہدات اور تجربی تجسّس یہ سب لوازمِ علمی یونانی مزاج سے قطعاً بعید تھے۔ قدیم کلاسیکی دُنیا میں صرف ہیلانی اسکندریہ کے اندر سائنسی عمل کی سعی کا سُراغ ملتا ہے۔ ہم جس چیز کو سائینس کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ وہ ان امور کا نتیجہ ہے۔ کہ تحقیق کی نئی رُوح پیدا ہو گئی۔ تفتیش کے نئے طریقے معلوم کئے گئے۔ تجربے۔ مشاہدے اور پیمائش کے اسلوب اختیار کئے گئے۔ ریاضیات کو ترقی دی گئی۔ اور یہ سب کچھ ایسی شکل میں نمایاں ہُوا جس سے یونانی بالکل بے خبر تھے۔ دُنیائے یورپ میں اس روح کو اور ان اسالیب کو رائج کرنے کا سہرا عربوں کے سر ہے۔

خلفائے عباسی کے درباروں میں یونانی کتابوں کے مسوّدے فراہم کئے گئے۔ اور اس قدر سرگرمی سے اُن کے تراجم تیار کرائے گئے۔ کہ ایسی سرگرمی پندرھویں صدی میں اٹلی کے Aurispas اور Filelfos کو بھی نصیب نہ ہوتی ہو گی۔ لیکن عرب جمع آوروں کا انتخاب اور اُن کے شغف کا مقصد بالکل مختلف تھا۔ اُنھوں نے یونان کے شعراء مؤرخین کی طرف صرف اتنی ہی توجہ کی۔ کہ اُن کے بعض نمونے ترجمہ کرا کر اپنی اعجوبہ پسندی کی تسکین کر لی۔ باقی ہیچ۔ اُن کا مقصد حصولِ معلومات تھا اُنھوں نے تھیلز سے لیکر Tyana کے اپولونیس تک فلسفیوں کی کتابوں اور طب کے نصابِ درسی سے استفادہ کیا۔ لیکن جن چیزوں پر اُن کی توجہ زیادہ تر مرتکز رہی۔ وہ اکادمی اسکندریہ کی تحریرات۔ بطلیموس کی ہیئت اور جغرافیہ کی کتابیں۔ اور اقلیدس۔ ارشمیدس۔ دیوفانتیس۔ تھیوں اور پرگا کے اپولونیس کی تصانیف تھیں۔ اُنھیں خیالی نظریات اور وسیع تعمیمات سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ علم کو تعمیمی استقرا کی بنیاد بنانے کے خواہاں نہ تھے۔ بلکہ معلومات کو صرف علم میں اضافہ کرنے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ یونانیوں نے جن نتائج کا استخراج کیا تھا۔ اُن کو عربوں نے

قبول کر لیا۔ کیونکہ وہ سائینسی تحقیق کی رفتار میں عملی نظریات کی حیثیت سے ضروری تھے۔ لیکن جہاں کہیں علم وسیع تر ہو جانے کی وجہ سے اُن نتائج کو نئے حقایق کے ساتھ مطابق بنانے کی ضرورت پیش آئی۔ عربوں نے اُن پر تنقید بھی کی۔ اور اُنھیں ترمیم بھی کر لیا۔ اُن کو ملامت کی جاتی ہے۔ کہ اُنھوں نے یورپ کی سائینس پر اذعانی روح عائد کر دی یعنی "عقائد" تجویز کر دیئے حالانکہ مسیحی یورپ پہلے ہی عقیدہ واذعان کے راستے پر گامزن تھا۔ اور یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ یہ نظریات یعنی نظام بطلیموسی "آب وہوا" کا جغرافیائی عقیدہ اور کیمیائی استحالہ کا عقیدہ جو یورپ کو عربوں سے حاصل ہوتے ہیں عربی نہیں بلکہ یونانی تھے۔ لیکن عربوں نے اُس زمانے کے موجودہ مواد کو جس طریقے سے استعمال کیا۔ وہ یونانیوں کے طریقے سے بالکل متضاد تھا یونانی نابغہ کا جو پہلو کمزور اور ناقص تھا۔ اُس کی کمی کو عربوں نے پورا کر دیا۔ یونانیوں کو صرف نظریہ اور تعمیم سے شغف تھا۔ وہ واقعیت سے غافل و بے پرواہ تھے۔ لیکن اس کے بالکل برعکس عرب محققین نظریے کو چنداں اہمیت نہ دیتے تھے۔ ٹھوس حقائق کی جمع آوری میں مصروف رہتے تھے اور اپنے علم کی باقاعدگی اور کمیّت کی طرف زیادہ توجہ کرتے تھے۔ نتیجہ خیز پائدار سائینس اور محض ڈھیلی ڈھالی سائینسی عجائب پسندی کے درمیان جو فرق وتفاوت ہے۔ وہ یہی ہے کہ کمیّت کو کیفیّت پر ترجیح دی جائے۔ اور پیمائش میں انتہائی قابلِ حصول صحت و درستی کا خیال رکھا جائے۔ عربوں کی سائینس کا وسیع عمل اسی معروضی تحقیق اور صحتِ کمیّت کے ساتھ جاری رکھا جاتا تھا۔ اُنھوں نے بطلیموس کے علم الکائنات کو تو قبول کر لیا۔ لیکن اُس کی فہرستِ نجوم یا ستاروں کی جدول یا اُس کی پیمائشوں کو تسلیم نہیں کیا۔ اُنھوں نے خود ستاروں کی بے شمار نئی فہرستیں مرتب کیں۔ جن میں بطلیموس کی فہرست کو صحیح بھی کیا۔ اور اُس میں بہت بڑا اضافہ بھی کیا۔

اُنھوں نے سیاروں کی نئی جدولیں تیار کیں۔ اور کسوف کے ترچھے پن اور استقبال اعتدالین کے متعلق صحیح اقدار معلوم کیں۔ اور سمت الراس کی دو الگ الگ پیمائشوں سے کرۂ ارضی کی جسامت کو معین کیا۔ اُنھوں نے ان مشاہدات کے لئے نہایت کارآمد آلات تیار کئے۔ جو یونانیوں کے آلات سے بدرجہا بہتر تھے۔ اور صحت و درستی میں اُن آلات پر فوقیت رکھتے تھے۔ جو پندرھویں صدی میں نیورمبرگ کے مشہور کارخانے میں تیار کئے گئے تھے۔ ہر محقق بجائے خود اور آزادانہ کام شروع کر دیتا۔ ذاتی شغف و رجحان کو بالکل کالعدم کر دینے کی کوشش کرتا۔ اور مسلسل مشاہدہ نہایت باقاعدگی کے ساتھ جاری رکھتا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا۔ کہ دمشق۔ بغداد اور قاہرہ کی رصدگاہوں میں یہ مشاہدے بارہ بارہ سال سے بھی زیادہ مدت تک جاری رہتے۔ وہ اپنی یادداشتوں میں صحت و درستی کو اس قدر اہمیت دیتے تھے۔ کہ خاص دلچسپی اور اہمیت رکھنے والی یادداشتوں پر باقاعدہ قانونی حلف اُٹھانے کے بعد دستخط کئے جاتے تھے۔

اسی قسم کی معروضی او رکیفیت پسند روح اُن کی تمام سرگرمیوں میں نمایاں نظر آتی ہے۔ جب المامون نے اپنے صاحب البرید ابن خورد اذبہ کو حکم دیا کہ اس کی قلمرو اور اس کے مستعمل بری و بحری راستوں کا حال قلم بند کرے۔ تو اس کے ساتھ ہی یہ تاکید بھی کر دی۔ کہ ہر مقام کا محل وقوع طول بلد اور عرض بلد سے معین کر دیا جائے (یہ کتاب عربوں کی ان بے شمار جغرافیائی تصانیف میں سے ہے۔ جنھوں نے دُنیا کا ایک نیا منظر اور ایک نیا جغرافیہ اہل عالم کی نظروں کے سامنے پیش کر دیا) البیرونی نے معدنیاتی نمونے جمع کرنے کے لئے چالیس سال سفر میں بسر کر دیئے۔ اُس نے مختلف اشیا کو الگ الگ تول کر اوزان مخصوصہ کے جو نقشے تیار کئے ہیں۔ وہ اب تک بالکل صحیح ہیں۔ ابن بیطار نے پوری دُنیائے اسلام

سے نباتاتی نمونے جمع کئے۔ اور ہندوستان اور ایران کی روئیدگیوں کا مقابلہ یونان اور ہسپانیہ کی نباتات سے کیا۔ اس کی کتاب میں چودہ سَو پودوں کی تفصیلات درج ہیں۔ میئیر نے اس کتاب کو "محنت[1] وجفاکشی کا یادگاری مینار" قرار دیا ہے۔ اس سائینسی تدقیق اور محنتِ مشاہدہ کا مقابلہ قدما کے خیالی اسالیب سے کرو۔ جو محض تجربیت کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ارسطو سے مقابلہ کرو۔ جس نے طبیعیات پر کتاب لکھ دی۔ اور تجربہ ایک بھی نہ کیا۔ "تاریخ طبعی" پر تصنیف مرتب کر دی۔ اور نہایت آسانی سے تصدیق ہو سکنے والے حقائق کو معلوم کرنے کی تکلیف بھی گوارا نہ کی۔ وہ نہایت متانت سے بیان کرتا ہے۔ کہ مرد کے دانت عورت کے دانتوں سے زیادہ ہوتے ہیں۔ یہ ارسطو کی کیفیت تھی۔ اب جالینوس کی سنو۔ جو تشریح اعضا کے علم پر سند سمجھا جاتا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ کہ انسان کے زیریں جبڑے میں دو ہڈیاں ہوتی ہیں۔ یہ بیان لوگوں نے تسلیم کر لیا۔ اور کسی نے اس کی تردید نہ کی۔ یہاں تک کہ عبداللطیف نے انسانی کھوپریوں کا معائنہ کرنے کے بعد بتایا۔ کہ جالینوس کا خیال غلط ہے۔

عربوں نے اُن تمام ماخذوں اور سرچشموں سے جو دستیاب ہو سکتے تھے۔ اپنا علم حاصل کیا۔ زیادہ تر علم ہیئت اور کسی قدر ریاضیات اُنھوں نے یونانی اور بابلی ماخذوں سے اخذ کیں۔ یونانیوں کی قدیم سائینس بھی ابتداءً اُن بابلیوں سے اخذ کی گئی تھی۔ جو عربوں کی طرح عرب سے میسوپوٹیمیا میں ہجرت کر گئے تھے۔ گویا عربوں نے جو قدیم سائینس یورپ کو دی۔ وہ اُن کے اپنے قدیم العہد بھائیوں ہی کا سرمایہ تھی۔ جو ایک زمانے میں یونانیوں نے اُن سے مستعار لی تھی۔ لیکن

[1] Gesch. der Botanik 233

حسنِ اتفاق سے سائنسی علم کا ایک اور سرچشمہ بھی دستیاب ہو گیا۔ ہندوستان میں پانچویں صدی کے اندر ایک خاص ذہنی تحریک پیدا ہوئی۔ جسے گپت عہد کی نشاۃ الثانیہ کہنا چاہئے۔ خصوصاً اُس عہد میں آریہ بھٹ اور برہم گپت دو ایسے مصنفین پیدا ہوئے۔ جنھوں نے ریاضیات میں بعض اہم جدتیں پیدا کیں۔ عربوں کے ہاتھوں میں یہ دو طریقے یونانی ریاضی دانوں کے بے ہنگم اور غیر عملی طریقوں سے مخلوط ہو کر زیادہ مفصّل و مشرّح ہوگئے۔ مسیحی مغرب کا اعلیٰ ترین علم ریاضی اس سے آگے نہ بڑھ سکا۔ کہ وہ "قاعدۂ ثلاث" کا استعمال (اور وہ بھی دشواری کے ساتھ) کر لیا کرتے تھے۔ اور علم الحساب کے سادہ ترین حل بھی "ابیکس" کے ذریعے سے انجام دیتے تھے (یہ وہی تاروں اور منکوں کا آلہ تھا۔ جو آج کل ہمارے کنڈرگارٹن سکولوں میں استعمال کیا جاتا ہے) لیکن عربوں نے "صفر" کا استعمال رائج کر کے ترسیمِ اعداد کے نظامِ اعشاریہ کو مکمل کر دیا۔ اُنھوں نے الجبرا ایجاد کیا۔ اور اسے چوتھے درجے کی تعدیلات کے حل تک پہنچا دیا۔ اُنھوں نے "علمِ مثلث" کا استعمال شروع کیا۔ اور یونانیوں کے "وتر"[1] کی جگہ "جیبِ[2] زاویہ" اور "مماس"[3] کو ترجیح دی۔ اس طرح اُنھوں نے انسانی تحقیق و تجسّس کی قوتوں میں ہزار گنا اضافہ کر دیا۔

عربوں نے صرف وہی ریاضیات پیدا نہیں کیں۔ جو سائنسی تجزیہ و تحلیل کا ناگزیر آلہ بننے والی تھیں۔ بلکہ اُنھوں نے تجربی تحقیق کے اُن اسالیب کی بنیاد رکھ دی۔ جنھوں نے ریاضیاتی تجزیہ کے ساتھ مل کر زمانۂ حال کے علمِ کیمسٹری کو جنم دیا۔ اس علم کی ابتدا اُن عملیات سے ہوئی تھی۔ جو مصر کے ماہرینِ فلزات اور زرگر لوگ استعمال کیا کرتے تھے۔

[1] Chord [2] Sine [3] Tangent

(یعنی دھاتوں کو ملا کر مختلف قسم کی مرکّب دھاتیں تیار کرنا اور انھیں ایسے طریق سے رنگ دے دینا۔ کہ وہ سونے سے مشابہ معلوم ہوں) یہ عملیات مدّت دراز سے پیشوایانِ مذاہب کے خفیہ اجارے کے طور پر محفوظ رکھے گئے تھے۔ اور حسب معمول صوفیانہ اور پُر اسرار افسونوں میں ملفوف تھے۔ لیکن جب وہ عربوں کے ہاتھ آئے۔ تو اُن سے تحقیق کا وسیع اور منظم جذبہ پیدا ہوگیا جس سے عربوں نے تقطیر۔ تبخیر اور تصعید کے طریقے ایجاد کر لیئے۔ اس کے علاوہ الکحل۔ شورے کا تیزاب۔ گندھک کا تیزاب (قدما کو سرکے کے سوا اور کوئی تیزاب معلوم نہ تھا) الکلی۔ پارے کے نمک۔ شورہ اور ایسمنتھ کو دریافت کیا۔ اور بعد کی مکمل کیمسٹری اور طبیعیاتی تحقیق کی بنیاد رکھ دی۔

ہیلانی مواد کی مانند جس سے عربی سائینس نے استفادہ کیا۔ عربی سائینس اور ازمنۂ متوسطہ کی سائینس دونوں اُن تمام خیالی ابتریوں سے دامندار تھیں۔ جو مشرقی اور ہیلانی دُنیا میں ہمیشہ سائینس سے منسوب کی جاتی تھیں۔ اس کا علم ہیئت کلدانی علم نجوم سے اور اس کی کیمسٹری سنیاسیوں کی کیمیا سے پیدا ہوئی تھی۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ سائینس کا مواد بھی "ہیلانی مشرق" کی اُسی پُر اسرار اور باطنی فضا سے ماخوذ تھا۔ جس سے نئے مذاہب اور مسیحیت کی ابتدائی دینیات کے سرچشمے پھوٹے تھے۔ لیکن جہاں تک دینیات اور مذاہب کا تعلق ہے۔ یہ اوہام و تخیّلات ہی اُس نظری و خیالی نظام فکر کا کل سرمایہ ہیں۔ مگر مناظرِ فطرت کی تحقیق میں اُن کی حیثیت صرف خارجی ملبوس اور اصطلاح کی ہے۔ سائینسی تحقیق کی بنیاد ایک خاص نقطے تک مفید طریقے سے ضرور چل سکتی ہے۔ اور اس کی رفتار میں کوئی خاص فساد یا خرابی پیدا نہیں ہوتی فلکیاتی مشاہدات کو علم نجوم کی حیثیت سے جاری رکھا گیا۔ تو انھیں

کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا۔ بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ علمِ نجوم کے تمام مفروضات نے بھی سائینس کی ترقی کو اتنا عظیم نقصان نہیں پہنچایا۔ جتنا اُس تنگ نظری اور کوتاہ بینی سے پہنچا ہے۔ جو بطلیموس جیسے نامور نے علمِ ہیئت پر کتاب لکھتے ہوئے ظاہر کی۔ تجربی تحقیق میں علم الکیمیا کے تصورات نے علم کی ترقی میں ہرگز کوئی رُکاوٹ پیدا نہیں کی۔ بلکہ ایسا موقع مہیا کیا جس کے بغیر تحقیق و تجسس کے مشکل خطوط پر اقدام ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اُس کو صحیح طور پر ایک ایسا کارآمد مفروضہ سمجھا گیا۔ کہ علم کے فقدان کی صورت میں اس سے بہتر کوئی اساس پیدا نہ کی جا سکتی تھی۔ جو ذہنِ انسانی کی رہنمائی کر سکتی۔ تصور یہ تھا۔ کہ تمام اجسام اور تمام مادّے ایک غیر متبدل اور عالمگیر "مواد ابتدائیہ" پر مشتمل ہیں۔ اور اُن کی شکلیں ارسطو کے عناصر اربعہ یعنی آب۔ خاک۔ باد اور آتش کے امتزاج سے گوناگون ہو گئی ہیں۔ لیکن چونکہ ابتدائی مادّے میں ان عناصر کے وجود و امتزاج سے مادّوں کے مخصوص اوصاف کا استخراج نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لہٰذا اُن کو بعض "پوشیدہ اوصاف" سے منسوب کر دیا گیا۔ جو کسی طریقے سے "فلزاتِ سبعہ" سے تعلق رکھتے تھے۔ اور تصوّر یہ کیا گیا۔ کہ اُن کا کوئی تعلق "سیاراتِ سبعہ" کے ساتھ ہے۔ اب ان پوشیدہ اوصاف کو معلوم کرنے کا صرف یہی ایک طریقہ تھا۔ کہ ان مادّوں کا اور ان کے مختلف مرکبات کا مطالعہ کیا جائے۔ انھیں منسوب کرنے والے عناصر سے پاک کر کے خالص حالت میں لایا جائے۔ اور وہ عملیات اور مؤثرات دریافت کئے جائیں۔ جو ان میں تغیرات کُلّی کو نمایاں کر دیں۔ یہ یاد رکھنا چاہئے۔ کہ عربوں اور ازمنۂ متوسطہ کے سائینسی محققین کے نزدیک "اسرار نظریہ" اور حقائق حاصلہ کو جو اضافی اہمیت دی جاتی تھی۔ وہ ہر درجے میں وسیع فرق و تفاوت

رکھتی تھی۔ بازاری عطائی تو اُن کے ذریعے سے عوام کی جہالت سے فائدہ اُٹھاتے تھے۔ اور ذہنی محقق صرف نتائج سے تعلق رکھتے تھے۔ اور اُن کے نزدیک نظریات کی حیثیت صرف مفروضے کی تھی۔ اگرچہ ازمنۂ متوسطہ کے عوام سائنس کو محض جادو سمجھتے تھے۔ اور عرب سائنس دانوں کو جادوگر خیال کرتے تھے لیکن زیادہ ممتاز افراد اس فضا سے اعلیٰ و ارفع ہوتے تھے۔ اس طرح گویا تمام عرب ماہرین فلکیات کے نزدیک نتائج کے مشاہدہ و تجزیہ کا کام سب سے زیادہ اہم تھا۔ باقی رہا جنم پتریاں بنانا اور جوتش سے پیشگوئیاں کرنا۔ تو یہ کام بازاری نجومیوں اور عطائیوں کے لئے چھوڑ دیا جاتا تھا۔ جہاں تک علم الکیمیا کے تصورات کا تعلق ہے۔ بے شمار بڑے بڑے عرب کیمسٹوں نے اس ناپختہ ارتقائی نظریے کی شدید مخالفت کی۔ اور گیارھویں صدی میں اس نظریے کے حامیوں اور مخالفوں کے درمیان بحث مباحثوں کا خاصا طوفان برپا ہو گیا۔ یہاں تک کہ ابن سینا جیسے جلیل القدر حکیم نے لکھا "جو لوگ کیمیاوی حرفت سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ خوب جانتے ہیں۔ کہ مادوں کی مختلف انواع میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی جا سکتی۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ ظاہر میں اُن کی شکل صورت متغیر ہو جائے۔" یورپ نے (جہاں ۱۲۱۵ء میں لیٹران کونسل میں "تبدیل جوہر" کے عقیدے کا اعلان کیا گیا تھا) عام طور پر دھاتوں کے استحالہ کے نظریہ کو اختیار کر لیا۔ جس کو عربوں نے بالکل رد کر دیا تھا۔ سر ایڈورڈ تھورپ نے لکھا ہے "علم الکیمیا میں جن لوگوں نے تھیوسوفی اور تصوف کو سب سے پہلے داخل کیا۔ وہ عرب نہ تھے۔ بلکہ مسیحی کارکن تھے۔"[1]

سائنس کوئی "روایت" نہیں۔ بلکہ ترقی پذیر فکر کا خلاصہ اور

---

[1] History of Chemistry 36

جوہر ہے نتیجہ یہ ہے۔ کہ ایک نسل کی سائینس کو بعد میں آنے والی نسلیں حقارت کی نظر سے دیکھتی ہیں۔ حالانکہ خود اُن کی ترقی میں وہی سابقہ سائینس معاون ہوئی ہے۔ خود ہمارے عضویاتی اور حیاتیاتی نظریے بھی غالباً ہمارے اخلاف کو اتنے ہی عجیب و غریب معلوم ہوں گے۔ جتنے ہمیں وہ تصورات عجیب معلوم ہوتے ہیں۔ جن میں سائینس اپنی طفولیت کے زمانے میں ملفوف تھی۔ اُس نے حال ہی میں ان تصورات سے پیچھا چھڑایا ہے۔ کیپلر جسم پتریاں بنایا کرتا تھا۔ کوپرنیکس سیاروں کی حرکت کا باعث یہ بتاتا تھا۔ کہ ان کو فرشتے دھکیل رہے ہیں۔ خود نیوٹن نے بھی دانیال نبی کی کتاب کی منجمانہ پیشگوئیوں کی تعبیر میں اپنے کمال ریاضیات کو استعمال کیا۔ کیمیاوی استحالے کے عقیدے پر آبرٹ بوائل۔ فان ہیلمونٹ۔ بوئرہاف۔ نیوٹن۔ لائبنٹز اور سٹال جیسے اہل علم سختی کے ساتھ ڈٹے رہے۔ پریسٹلے پر Philogniston کے نظریے کا اتنا اثر تھا۔ کہ اُس نے خود آکسیجن کی اپنی ہی دریافت کی اہمیت کو تسلیم نہ کیا۔ یہاں تک کہ انقلاب فرانس سے ذرا پیشتر لیوازیئر کی طفیل سے مادے کی مختلف اشکال کے نئے تصورات نے اُن تمام مفروضات کا استیصال کر دیا۔ جن کے ماتحت عربوں کے زمانے سے تجزیہ کیمیائی اور فطرت کی تجربی تحقیق کا کام ہوتا چلا آیا تھا۔

اُنھوں نے جو نئے طریقے اختیار کئے یعنی وہ ستارہ بینی۔ وہ قرنیقیں اور وہ خام اُن گھڑ اور وہمی و خیالی اصول جو قدیم کلاسیکی ثقافت کے مزاج سے قطعاً مختلف تھے۔ اور یورپ میں سائینس کے احیاء سے بہت پہلے موجود تھے۔ انہی طریقوں میں دُنیا کا مستقبل مضمر تھا۔ گویا وہ ایک ایسا جرثومہ تھا جس سے کئی صدیوں کی پختگی اور

رسیدگی کے بعد زمانہ حال کی سائینس کی زبردست طاقت نمودار ہونے والی ہے۔

عربی علوم ابتداہی سے مسیحی یورپ میں نفوذ کرنے لگے تھے۔ اگر سینٹ ڈنسٹن کے کیمیائی مشاغل کی داستان میں حقیقت و واقعیت کا کوئی دخل ہے۔ تو ماننا پڑتا ہے۔ کہ دسویں صدی میں عربی اصول و عقائد نہایت وسیع اشاعت پا چکے تھے۔ گو موجودہ یادداشتوں سے اس کا پورا ثبوت مہیا نہ ہو۔ چونکہ ہسپانوی خلافت قطعی طور پر مذہبی رواداری پر عامل تھی۔ اس لئے مسیحیوں کو پوری آزادی حاصل تھی۔ دارالخلافہ کے مفصلات میں بے شمار صومعے اور خانقاہیں موجود تھیں۔ جو مسافروں کے لئے قیام گاہوں کا کام بھی دیتی تھیں۔ اور راہب قرطبہ کے بازاروں میں عام طور پر چلتے پھرتے نظر آتے تھے۔ یورپ کے تمام حصوں سے بے شمار طالبانِ علم روشنی کی تلاش میں عربوں کے عظیم علمی مرکزوں کا رُخ کر رہے تھے۔ کیونکہ یہ روشنی صرف انہی شہروں میں دستیاب ہوسکتی تھی۔ قرطبہ کا ایک پادری اَلوارو نویں صدی میں لکھتا ہے "جتنے نوجوان مسیحی علم و استعداد کے اعتبار سے ممتاز ہیں۔ وہ سب عربوں کی زبان و ادب سے باخبر ہیں۔ عربوں کی کتابیں ذوق شوق سے پڑھتے ہیں۔ زرکثیر صرف کر کے عربوں کے عظیم کتب خانوں میں جمع ہوتے ہیں۔ اور ہر جگہ نہایت بلند آہنگی سے عربی ادب کی تحسین و تعریف کرتے پھرتے ہیں"

Gerbert Aurillac کا مشہور مُعلّم ہسپانیہ سے فلکیات اور ریاضیات کی بعض ابتدائی معلومات لے کر آیا۔ اور اپنے حیران اور ششدر طلبہ کو ارضی اور فلکی کُرّوں کی مدد سے تعلیم دینے لگا۔ اگرچہ اُس کا علم زیادہ گہرا نہ تھا۔ اور غالباً یہ بھی غلط ہے۔ کہ اُس نے نظامِ اعشاریہ کو رائج کیا تھا (کیونکہ وہ برابر رومی ابیکس استعمال کرتا تھا)

لیکن اُس کے ذوق علمی نے (جو ولیم آف مالمزبری کے قول کے مطابق اُس نے عربوں سے "چُرایا" تھا) اس کو پوپ سلوسٹر ثانی کی طرح فاؤسٹ کے اُن خیالی افسانوں کا ہیرو بنا دیا۔ جو ازمنۂ متوسطہ میں عالمگیر مقبولیت رکھتے تھے لہ

آیندہ دو صدیوں کے دوران میں نشر و توزیع کا عمل نہایت وسیع ہو گیا۔ ایک افریقی راہب قسطنطین نے جو رابرٹ گِسکارڈ کا سکرٹری تھا۔ نہایت ذوق شوق سے عربوں کی درسی کتابوں کا ترجمہ کرنا شروع کر دیا۔ اور مانٹ کازینو کے بینی ڈکٹی راہبوں کے مرکز میں نئے علوم رائج کر دیئے۔ جہاں سے وہ اس سلسلۂ راہبین کے دور دست صومعوں تک پہنچ گئے۔ ایک اور بینی ڈکٹی راہب ایڈلہارڈ آف باتھ قرطبہ سے کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ اور عربوں کے اصول و قواعد تک لایا۔ اور اُن کو اُس نے اور اُس کے بھتیجے نے فرانس اور انگلستان میں پھیلا دیا۔ اُس زمانے سے لے کر ۱۵۳۳ء تک اقلیدس کی جتنی کتابیں شائع ہوئیں وہ سب اسی راہب کے لائے ہوئے مسودے سے نقل کی گئی تھیں۔ اسی طرح ڈینیل دامورلے ریاضیات و فلکیات سیکھنے کے لئے قرطبہ گیا۔ اُس نے اپنے مطالعہ کے نتائج کو شائع کیا۔ اور آکسفرڈ میں لکچر بھی دیئے پلاٹو آف ٹیوالی نے البتانی کی کتاب ہیئت اور دوسری کتب ریاضی کا ترجمہ کیا۔ بارھویں صدی کے آخر میں پیسا کا ایک نوجوان تاجر لیونارڈو فیبوناچی الجزائر اور ہسپانیہ کی سیاحت کے دوران میں عربوں کے جدید علوم ریاضی پر فریفتہ ہوگیا۔ اور متعدد نئے سفروں کے بعد اُس نے الخوارزمی کی عظیم تصنیف "الجبرا" کا ترجمہ شائع کیا۔ اُس نے مکمل شدہ

لہ Indiculus luminosus, in Florez, Espana Sagrada Vol XI

نظامِ اعشاریہ کو مقبولِ عام بنایا۔ اور اس سے جو سہل طریقۂ حساب پیدا ہوا وہ عرب مصنف کے نام کی رعایت سے "الگورزم" (الخوارزمی) کہلایا۔ فیبوناچی کو جس کا کام نہایت وسیع الاثر تھا۔ مسیحی یورپ میں ریاضیاتِ جدیدہ کا بانی سمجھنا چاہیئے۔ اطالوی ریاضی دانوں کی طویل صف میں اس کا مقام اوّل ہے۔ جیرارڈ آف کریمونا ادبیاتِ عرب کو مقبول بنانے والوں میں سب سے زیادہ محنتی تھا۔ اُس نے قرطبہ کی خلافت میں پچاس سال بسر کیئے۔ اور کوئی ساٹھ کتابوں کا ترجمہ کیا۔ جن میں المجسطی اور الہیثم کی کتاب الہیئت بھی شامل تھیں۔ مائیکل سکاٹ نے مسوّدات کے حصول اور ترجمے کے لئے قرطبہ کے کئی پھیرے کئے۔ ہسپانیہ میں طلبہ کا دُرود اور مترجموں کی سرگرمیوں کا سلسلہ خلافت کے آخری ایام تک برابر جاری رہا۔ آرنلڈ آف وِلے نوف) اور ایمنڈ لگی (بیکن کا دوست) نے ہسپانیہ میں تعلیم حاصل کی۔ اور مونٹ پیلیئر میں پڑھاتے رہے۔ کمپانوس آف نوارا نے قرطبہ سے ریاضی کی تحصیل کی۔ اور ویانا میں اس کا درس دیتا رہا۔ اور الفانسو (دانشمند) نے طلیطلہ میں عربی کی درسی کتابوں کے ترجمے کے لئے باقاعدہ مکاتب قائم کئے۔

مُوروں کی حکومت کے کامل رواداراںہ سلوک کی وجہ سے یہودیوں نے بھی خلافت کے ثقافتی ارتقا میں حصہ لیا۔ اور جب وہ (بالخصوص الموحدین کی فتح کے بعد) یورپ میں پھیل گئے۔ تو انھوں نے اس ثقافت کو دُور دست نیم مہذب علاقوں تک پھیلا دیا۔ وہ الگ تھلگ صومعوں کے راہبوں کو آزادانہ تعلیم دینے اور اُن سے بحث کرنے میں مصروف ہوتے تھے۔ اور اس عجیب علم کے ساتھ راہبوں کا ذوق شوق اُن کے مذہبی تعصبات پر غالب آگیا تھا[۱]۔ فرانسیسی اور جرمن راہبوں

---

[۱] حاشیہ اگلے پر مطالعہ کریں۔

نے نئے علوم کی کتب درسی اُنہی سے حاصل کیں۔ یہاں تک کہ Mariangian صومعوں کی بعض ادیب راہبات مثلاً مشہور Hildegrad اور Moswitta نے بھی اُن کے علم سے

حاشیہ صفحہ ۲۵۹ - جوتن وتے کا ایک پیراگراف اس سلسلے میں قابلِ اقتباس ہے۔ کیونکہ یہ کئی اعتبار سے دلچسپ رہے گا:-

" سینٹ لوئی (لوئی نہم) نے مجھ سے بیان کیا کہ کلونی کے صومعہ میں پادریوں اور یہودیوں کے درمیان ایک شدید جھگڑا چلا آتا تھا۔ ایک نائٹ کو ایبٹ (صومعہ دار) نے خدا کے نام پر راہب بنایا تھا۔ اُس نے صومعہ دار سے اجازت طلب کی۔ کہ وہ سب سے پہلے مجمع کو خطاب کرے گا۔ صومعہ دار نے فی الفور اجازت دے دی۔ اس کے بعد نائٹ اپنے صلیبی عصا کے سہارے کھڑا ہوا۔ اور کہنے لگا۔ کہ یہودیوں کے سب سے بڑے اُستاد کو اندر بلاؤ۔ چنانچہ وہ لے آئے۔ نائٹ نے اُس کو مخاطب کر کے کہا: اے اُستاد! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں۔ آیا تمہارا یہ عقیدہ ہے۔ کہ کنواری مریم نے جو خدا کو اپنے بطن میں اور پھر اپنی آغوش میں لئے پھرتی تھی۔ کنواری ہونے کی حالت میں بچہ جنا؟ اور کیا تم یقین رکھتے ہو۔ کہ وہ خدا کی ماں ہے"؟

یہودی نے جواب دیا۔ کہ میں تو اس ساری کہانی کے ایک لفظ پر بھی ایمان نہیں رکھتا۔" نائٹ نے کہا "تم عجب بے وقوف ہو۔ کہ نہ کسی چیز پر ایمان رکھتے ہو۔ نہ تمہارا عقیدہ درست ہے۔ اور پھر تم صومعہ میں اور صومعہ دار کے مکان میں داخل ہو گئے ہو۔ تم کو یقیناً اس حماقت کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا"!

یہ کہہ کر اُس نے یہودی کی کنپٹی پر اس زور کا گھونسا رسید کیا۔ کہ وہ زمین پر گر پڑا۔ اس پر سب یہودی اپنے زخمی اُستاد کو ساتھ لے کر بھاگ کھڑے ہوئے غرض اس طریقے سے وہ جھگڑا ختم ہوا۔ (باقی صفحہ ۲۶۱ پر)

استفادہ کیا۔ انھوں نے بے شمار ایسے مدرسے قائم کئے (مثلاً Kimhis کا سکول اور ناربون میں Ben Ezra کا مدرسہ) جہاں عربی علوم کو رواج دیا جاتا تھا۔ اور عربی کی کتابوں کا ترجمہ کیا جاتا تھا۔ بے شمار یہودی ولیم آف نارمنڈی کے جلو میں انگلستان آئے۔ اور اس کی حمایت وحفاظت سے مستفید ہو کر انھوں نے پہلے سنگین شہری مکانات بنائے۔ جو آج بھی لنکن اور سینٹ ایڈمنڈز بری میں موجود ہیں۔ اور آکسفرڈ میں سائینس کا ایک مدرسہ بھی قائم کیا۔ اسی آکسفرڈ سکول میں اُن کے جانشینوں ہی سے راجر بیکن نے عربی زبان اور عربی سائینس کا علم حاصل کیا تھا۔ راجر بیکن اور اُس کے ہمنام کے متعلق جو بعد میں ہوا۔ یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔ کہ تجربی اسلوب کی ترویج کا سہرا اُن کے سر ہے راجر بیکن کی حیثیت اس سے زیادہ نہ تھی۔ کہ وہ مسیحی یورپ کو مسلمانوں

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶۰ - پھر ہومعر دا نائٹ سے ملنے آیا۔ اور کہنے لگا۔ کہ تم نے یہ نہایت احمقانہ حرکت کی۔ نائٹ نے جواب دیا۔ کہ تم اُس سے بھی زیادہ حماقت کے مرتکب ہوتے ہو۔ کہ تم نے اس قسم کے مباحثے کا انتظام کیا۔ کیونکہ جب تک مباحثہ کو اختتام تک پہنچایا جاتا۔ وہ نیک اور سچے مسیحیوں کا ہجوم کافر ہو گیا ہوتا اس لئے کہ وہ لوگ یہودیوں کی باتوں کو صحیح طور پر سمجھ نہ سکتے تھے۔ نائٹ نے کہا۔ میں یہی تم کو مشورہ دیتا ہوں۔ کہ جب تک کوئی شخص مسیحیت کا عالم فاضل نہ ہو۔ اُسے یہودیوں کے ساتھ مباحثہ و مناظرہ نہیں کرنا چاہئے لیکن اگر کوئی عام شہری کسی کو مسیحیت کے خلاف ہرزہ سرائی کرتا ہوا سُنے۔ تو اس کا فرض یہی ہے کہ مسیحی شریعت کی حمایت کے لئے تلوار اٹھائے۔ اور اس طرح دل و جان سے جنگ کرے۔ گویا وہ تلوار خود اُس کے پیٹ میں گھونپی گئی ہے"۔ یہودیوں کے ساتھ ظلم اور عدم رواداری کا سلوک ازمنۂ متوسطہ کے اوائل کی نہیں۔ بلکہ بعد کے زمانے کی خصوصیت ہے۔

کی سائنس اور اُن کا اسلوب سکھانے کا ذمہ دار تھا۔ اور وہ اس امر کا اعتراف کرتے ہوئے تھکتا ہی نہ تھا۔ کہ اُس کے معاصرین کے لئے علم صحیح کا واحد ذریعہ صرف عربی زبان اور عربی سائنس ہے۔ اس کے بعد جو بحثیں ہوئیں۔ کہ تجربی اسلوب کا بانی کون تھا۔ عربوں کے ہر انکشاف اور اُن کی ہر ایجاد کا سہرا اُسی یورپین کے سر باندھ دیا گیا۔ جس نے پہلے پہل اس کا تذکرہ کیا۔ مثلاً قطب نما کی ایجاد ایک فرضی شخص فلیویو گیوجا (آف امالفی) کے سر منڈھ دی گئی۔ الکحل کا موجد وِلّے نوف کے آرنلڈ کو قرار دیا گیا۔ عدسہ اور بارُود کو بیکن یا شوارز کی ایجاد بتایا گیا۔ یہ بیانات اُن مُہیب غلط بیانیوں میں سے ہیں۔ جو یورپی تہذیب کے ماخذوں کے متعلق کی گئیں۔ حالانکہ بیکن کے زمانے تک عربوں کا تجربی اسلوب یورپ بھر میں پھیل چکا تھا۔ اور نہایت سرگرمی سے اختیار کیا جا رہا تھا۔ باتھ کے ایڈل ہارڈ۔ نیکم کے الگزنڈر، بووے کے ونسنٹ، وِلّے ناف کے آرنلڈ۔ برنرڈ سلوبیسٹرس (جس نے اپنی کتاب کا نام ہی Experimentarius رکھا تھا) کان ٹمپرے کے ٹامس، اور البرٹس میگنس سب نے اس امر کا اعلان کیا ہے۔

عربی مدارس میں فنِ طبابت قدیم حکماء کے زمانے کی نسبت بہت زیادہ ترقی کر چکا تھا۔ اُن مدرسوں سے جو یہودی ڈاکٹر تربیت پا کر نکلے تھے۔ وہی پورے ازمنۂ متوسطہ میں طب کی تعلیم اور پریکٹس پر قابض و مسلط رہے۔ جو قارباکوپیا (قرابادین) عربوں نے مرتب کیا تھا۔ وہی آج کل کے زمانے میں برابر زیر استعمال ہے۔ صرف حال میں بعض کیمیاوی اور عضوی نسخوں کا اس میں اضافہ کیا گیا ہے۔ ہماری عام دوائیں نکس وامیکا (کچلہ) ڑوبرب (ریوند چینی) ایکونائٹ (جدوار) جنتیانا مُرکیلوٹل (زیبق) اور ہمارے نسخوں کی ترکیب سب کچھ عربی طب

سے ماخوذ ہے۔ مونٹ پیلیئر کا طبی مدرسہ یہودی ڈاکٹروں کے ماتحت قرطبہ کے مدرسہ کے نمونے پر قائم کیا گیا تھا۔ اسی مثال کی پیروی پہلے پڈوا میں اور پھر پیسا میں کی گئی۔ جہاں موروں کی ریاضیات و فلکیات بھی پڑھائی جاتی تھیں۔ اور ابن سینا کی "قانون" اور ابوالقاسم کی "جراحت" کا درس بھی دیا جاتا تھا۔ یہ دونوں کتابیں سترھویں صدی تک سارے یورپ میں تعلیم طب کے درسی نصاب میں شامل رہیں۔ یہی وہ گہوارے تھے جن میں پل کر فیلو پیئس۔ ویسالیوس۔ کارڈن۔ ہاروے اور گلیلیو جیسے اشخاص دنیا میں نامور ہوئے۔

جس طاقت نے مادی اور ذہنی دنیا کی شکل بدل کر رکھ دی۔ وہ ازمنۂ متوسطہ کے اواخر کے منجموں۔ کیمیاءدانوں اور طبی مدرسوں کے گہرے رابطے کی پیداوار تھی۔ اور یہ رابطہ بلاواسطہ اور صرف عربی تہذیب ہی کا نتیجہ تھا۔ پندرھویں صدی تک یورپ میں جتنی بھی سائنسی سرگرمی موجود تھی۔ وہ زیادہ تر عربوں کے علم و فضل سے ماخوذ تھی۔ اور اس پر کوئی خاص اضافہ نہیں کر رہی تھی۔ پرتگال کے پرنس ہنری نے سینٹ ونسنٹ کی راس پر عرب اور یہودی اُستادوں ہی کے زیر سایہ اپنی عظیم بحری اکاڈمی قائم کی۔ جس نے واسکوڈی گاما کے لئے راستہ ہموار کیا۔ اور یورپ کو کرۂ ارضی کے آخری کناروں تک پھیلا دیا۔ ۱۴۹۴ئہ میں یورپ کے اندر ریاضی کا جو پہلا رسالہ چھاپا گیا۔ وہ صرف لیونارڈو فیبو ناچی کے ترجموں کی تشریح ہے۔ اور بعض حصے تو بالکل اُن سے نقل ہی کر لئے گئے ہیں (یہ ترجمے لوکا پاسیولی نے کئے تھے۔ جو ایک دوسرے لیونارڈو یعنی مشہور مصور داونچی کا دوست تھا) Ragiomontanus نے البتانی کی الواح کی مدد سے نقشہ ہائے ہیئت (Ephemerides) تیار کئے۔ جن کی مدد سے کولمبس

کا بحری سفر ممکن ہو گیا۔ کیپلر نے اس کا کام ابن یونس کی الواح حاکمی کے ذریعے سے جاری رکھا۔ ویسا لیوس نے الرازی کی کتابوں کا ترجمہ کیا۔ سائنس کی رُوح کلاسیکی نشاۃ الثانیہ کے زمانے سے غیر متاثر گزر گئی۔ اور کلاسیکی اثرات سے محفوظ اور بالکل آزادرہ کر گوشۂ خلوت ہی میں ترقی کرتی رہی۔

سائنس حقیقت میں دُنیائے حاضرہ پر عربی تہذیب کا بہت بڑا احسان ہے۔ لیکن اس کے ثمرات بہت آہستہ آہستہ پختہ ہوئے۔ مُوروں کی ثقافت دوبارہ تاریکیوں میں غرق ہو گئی۔ اور اس کے مدتوں بعد وہ دیو (جو اس نے پیدا کیا تھا)، پوری قوت و شوکت کے ساتھ اُٹھا لیکن صرف سائنس ہی نے یورپ کو حیاتِ تازہ نہیں بخشی بلکہ اسلامی تہذیب کے دوسرے بے شمار اثرات نے بھی یورپی زندگی کو روشنی کی پہلی شعاعوں سے مالا مال کیا۔

چھٹا باب

یورپ کی ولادتِ نَو

مشرق، مُوروں کے ہسپانیہ اور سسلی کی صنعتی اور تجارتی سرگرمیوں نے یورپ کی تجارت و صنعت کو جنم دیا۔ اُنھوں نے تاجر طبقوں اور تجارتی شہروں کو دولتمند اور قوی بنایا۔ شہری برادریاں اتنی طاقتور ہو گئیں۔ کہ اُنھوں نے جاگیرداری اقتدار کا کھُلم کھُلا مقابلہ کیا۔ اور آزاد جمہوریتوں اور پنچایتوں نے نوابوں کے ظلم اور لاقانونی کو شکست دے دی۔ اسی طرح لیوانت (بحیرۂ روم کے مشرق) سے ثقافت کی طرح سیاسی آزادی اور تنظیم بھی آئی۔ اور مال کی گٹھڑیاں بھی آنے لگیں۔ جب تک تجارت اور صنعت ترقی پذیر نہ ہوئی تھی۔ اور جب تک شہری لوگ مشرقی درآمد و برآمد سے اثر و نفوذ کے مالک نہ بنے تھے۔ نہ کوئی پنچایتیں قائم ہوئی تھیں۔ اور نہ شہر وجود میں آتے تھے۔ قطلونیا اور پراونس کے ساحلی قصبے سب سے پہلے عربوں کے ساتھ تجارت کر کے زندگی اور اہمیت کے حامل بنے۔ مارسیلز، آرلس اور نیس میں آزاد و خود مختار جمہوریتیں قائم ہو گئیں۔ اس دولت نے اوائل ایام سے جس سرچشمے سے نشو و نما حاصل کی تھی۔ اُس کا حال آدلی اَنز کے بشپ تھیوڈلف کے اُس بیان سے فراہم ہو سکتا ہے۔ جو اُس نے جنوبی

فرانس کے ایک سفر کے متعلق دیا ہے۔ یہ سفر بشپ مذکور نے شارلمین کے ایلچی کی حیثیت سے اختیار کیا تھا۔ اُس نے لکھا ہے۔ کہ جب ہم مارسیلز پہنچے۔ تو مرد۔ عورتیں۔ بچے۔ بوڑھے جوق در جوق تحائف و ہدایا سے لدے ہوئے ہمارے پاس آئے۔ اور کہنے لگے۔ کہ یہ تحفے صرف آپ کی دُعائیں حاصل کرنے کے لئے پیش کئے جا رہے ہیں .... ایک شخص نے بلور پارے اور مشرقی موتی پیش کئے .... ایک اَور شخص طلائی سکوں کا ایک انبار لے کر آیا۔ جن پر عربی کے فقرات و حروف درخشاں تھے۔ .... ایک شخص نے کہا۔ میرے پاس ایسے پارچات ہیں جو عربوں کے ہاں سے آتے ہیں۔ اور اُن کی بوقلمونی اور اُن کے نقش و نگار کی نزاکت کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا .... ایک شخص نے مجھے قرطبہ کی کھالوں کے ٹکڑے دکھائے۔ جن میں سے بعض برف کی طرح سفید اور بعض سُرخ تھے .... ایک اَور شخص نے قالین پیش کئے "۱ھ

اس کے بعد جنوبی اٹلی کے شہروں کی باری آئی۔ آملفی۔ سلرنو۔ نیپلز اور گیٹا اپنے سسلی کے ہمسایہ مسلمانوں کے ساتھ تجارت کر کے رفتہ رفتہ دولت اور آزادی حاصل کر گئے۔ اور اُنھوں نے عرب تاجروں کی معیت میں اپنے تعلقات کو افریقہ اور شام تک وسیع کر دیا۔ شہنشاہ لُڈوِگ ثانی نے کہا۔ کہ نیپلز تو بالکل پلرمو کی طرح مسلمانوں ہی کا شہر ہے آملفی اور جنوبی اٹلی کے پہلے آزاد شہروں نے مسلمانانِ سسلی کے ساتھ معاہدۂ اتحاد کر لیا (۸۵۷ء) اور جب وہ روما کے دروازوں کی طرف بڑھے تو اٹلی والوں نے اُن کی عملی امداد کی۔ پوپ جان ہشتم اُنھیں ذات باہر کر دینے کے فتوے صادر کرتا ہی رہا۔ لیکن اُنھوں نے ان فتووں کی کوئی پروا نہ کی۔ اور جب اسلام کے خلاف حرب صلیبی کا اعلان ہوا۔ تو اُنھوں

ھ۱ Mon. Germ. Hist. Poet. Lat 1, 499

نے اُن لوگوں کے خلاف ہتھیار اُٹھانے سے قطعاً انکار کر دیا۔ جنھوں نے اُن کو دولت وعظمت حاصل کرنے میں امداد دی تھی۔ پیسا۔ جنوا۔ اور وینس اس موقع سے استفادہ کرنے میں آملفی اور نیپلز سے بھی سبقت لے گئے۔ پیسا کے متعلق ڈونیزو نے اپنی تاریخ (۱۱۱۴ء) میں لکھا ہے۔ کہ "یہ شہر عربوں۔ ترکوں۔ لیبیائیوں اور کلدانیوں کے ہجوم سے ناپاک ہو رہا ہے" لہ جو شہر کے ایک پورے محلے کنسیکا پر قبضہ کئے ہوئے تھے۔ لیکن اس شہر کو بھی جنوا کی طرح سارڈینیا کے عربوں سے تجارت کرنے کے باعث اہمیت حاصل ہوتی تھی۔ اس تجارت کے نشو ونما سے پہلے یورپ کے افلاس کی یہ حالت تھی۔ کہ جب اٹلی کے پہلے طالع آزما تاجروں نے محسوس کیا۔ کہ عربوں کے مال کے عوض میں دینے کو نہ اُن کے پاس کوئی ملکی پیداوار ہیں۔ نہ روپیہ ہی میسّر ہے۔ تو اُنھوں نے آس پاس کے دیہات سے بچوں کو اغوا کرنا شروع کر دیا۔ اور عربوں کے مال کی قیمت انسانی گوشت پوست کی شکل میں ادا کرنے لگے۔ سارڈینیا کی اُون انگلستان کے سوا باقی ممالک کے مقابلے میں نفیس ترین تھی۔ چنانچہ جنوا اور پیسا نے متحد ہو کر سارڈینیا کو فتح کر لیا۔ اس کے بعد اُن کی تجارت لکّا کی طرف منتقل ہو گئی۔ جہاں فن پارچہ بافی پلرمو سے لایا گیا تھا۔ اور جب Uguccione della Faggiola نے اس شہر کو تاخت وتاراج کر دیا تو پارچہ بافی کے ماہر کاریگروں نے فلارنس کو اپنا مرکز بنا لیا۔ اور یوں فلارنس کی اس دولت وعظمت کی بنیاد رکھی گئی جس نے قلیل مدت کے اندر ٹسکن تاجروں کو یورپ کا ساہوکار بنا دیا۔

عربوں نے ہندوستان۔ چین۔ ملاکا اور ٹمبکٹو تک خشکی کے راستے کھول دیئے۔ آخر الذکر مقام وسط افریقہ کی تجارت کا مرکز قرار پایا۔ وہ

لہ Muratori Ant. Med. Aev. diss 30

اپنے کاروانوں کو صحرائے اعظم کے پار کے زرخیز علاقوں میں اُس زمانے سے بھیج رہے تھے۔ جب ابھی پرتگیزوں نے راس Verde کے گرد چکر نہ لگایا تھا۔ ہندوستان کے بحری راستوں کا اجارہ بھی انہی کے قبضے میں تھا۔ اور Emosaids نے ساحل سوڈان اور سقوطرہ سے لے کر ممباسہ۔ موزمبیق۔ زنجبار اور مدغاسکر تک تجارتی نوآبادیوں کا ایک سلسلہ قائم کر دیا تھا۔

اُنھوں نے جہازسازی کے فن کو ترقی دی۔ بحیرہ روم کے بحر پیماؤں کو سکھایا۔ کہ ہلکے بادبانی جہاز (غاربث) کیونکر بنائے جاتے ہیں۔ کولتار سے کشتیوں کی درزبندی کیونکر کی جاتی ہے۔ (یہ رومانی زبانوں میں اب تک عربی لفظ "غطران" سے موسوم ہے) (فرانسیسی goudron اطالوی Caltrame) بادبانوں اور رسّوں سے کیونکر کام لیا جاتا ہے (رسّا: عربی حَبل) مُور تاجروں نے اپنے فُندق مسیحی بندرگاہوں میں قائم کئے۔ وہ اندلسیہ۔ بلنسیہ۔ المیریا اور ملاغہ جیسی عظیم بندرگاہوں اور سپاولس اور جنوبی فرانس کے درمیان آمدورفت میں مصروف رہتے تھے۔ اور اپنی مصنوعات کو مونٹ پیلیئر اور ناربون کی منڈیوں تک پہنچاتے تھے۔ عربوں کے دینار آج بھی بحر شمالی اور بالٹک کے ساحلوں تک رومی سکوں اور یونانی پیسوں کے مقابلے میں بہت زیادہ افراط سے ملتے ہیں۔ انھوں نے ہُنڈیوں کا طریقہ رائج کیا۔ بحیرۂ روم کی تجارت کا نظام بحری قونسلوں کے ادارے کے ہاتھ میں تھا۔ جو سب سے پہلے بارشلونا میں قائم کیا گیا تھا۔

عربی دُنیا کے نفیس اور شاندار کتانی۔ سُوتی اور ریشمی پارچات۔ ساٹن اور نرم ریشم کے کپڑے۔ ایرانی تلفتے۔ دمشقی مشجر۔ بغداد کے حریر و پرنیاں۔ موصل کی ململ۔ غزہ کی جالی۔ غرناطہ کا جالی دار ریشمی اُونی کپڑا۔

ابری ریشم۔ کریپ۔ طرابلس کی شیفون کیملٹ۔ گزبی۔ رانیمیرو وغیرہ نے یورپ کی موٹا جھوٹا پہننے والی آبادی میں اعلیٰ درجے کے لباس کا ذوق شوق پیدا کر دیا۔ مشہور نغمہ نیبو لنگ میں کرم ہلڈ اپنے آپ کو آراستہ کرنے کے لئے انہی پارچات کا ذکر کرتی ہے:۔

"عرب کے ریشمی کپڑے برف کی طرح سفید اور ززامان کے پارچات . . . . تپتیا گھاس کے پتوں کی طرح سبز۔ ارضِ مراکش سے اور لبنان سے دُنیا کے بہترین حریر۔"

شام اور ہسپانیہ میں بے شمار کرگھے تھے۔ جن میں سے صرف اشبیلیہ میں سولہ ہزار تھے۔ قرطبہ میں ایک لاکھ تیس ہزار ریشم باف کاریگر کام کرتے تھے۔ اور اُمرائے سلطنت کے ملبوسات اور مسیحی پادریوں کی مقدس عباؤں کے لئے کپڑا تیار کرتے تھے۔ اس قسم کے منظر اکثر نظر آتے تھے۔ کہ ایک بشپ گرجا میں نماز پڑھا رہا ہے۔ جس کے حُلّۂ عبادت پر قرآن مجید کی آیات نہایت نفاست سے کڑھی ہوتی ہیں۔ یورپ کی خواتین نے بھی عربی قمیص اور جُبّہ پہننا شروع کر دیا تھا۔ مسیحیت کے مجاہد دمشق۔ المیریا یا طلیطلہ کی تلواریں باندھنے اور قرطبہ کے ساز و یراق والے گھوڑوں پر سوار ہونے کے شوقین تھے۔ نیشکر کو رواج دیا گیا۔ اور یورپ کے لوگوں کو پہلے پہل مٹھائیاں چکھنے اور شربت پینے کا موقع ملا۔ رفتہ رفتہ مسیحی یورپ میں مشرق کی مصنوعات عام ہوگئیں۔ اور اُن کی نقالی بھی کی جانے لگی۔ نارمن سسلی میں ریشم کے کرگھے لگاتے گئے۔ وینس والوں نے دیسی کاریگروں کی مدد سے انطاکیہ کی شیشہ گری کی نقل کی۔ لی انزنے دمشقی مشجر۔ پیرس نے "عربی قالین" اور ریمز نے شام کا کتانی کپڑا بنانا شروع کر دیا۔ مشرق کے بھرپور رنگ نیز و جزیں لائے گئے۔ اور اُن سے انگریزی اُون رنگ کر

بازار کے لئے تیار کی جانے لگی۔ ہسپانیہ اور مجارکا کے مال کو دیکھ کر اٹلی میں کارخانے قائم کئے گئے۔ جن میں مجولیکا (نقشیں ظروف) تیار کئے جاتے تھے۔ قندسازی کے کارخانے سسلی سے اٹلی اور ہسپانیہ سے جنوبی فرانس میں منتقل ہونے لگے۔

عربوں نے یورپ میں اپنی تین ایسی ایجادیں رائج کیں جن میں سے ہر ایک نے دُنیا میں عجیب انقلاب پیدا کر دیا۔ اوّل ناخداؤں کی قطب نما جس کی برکت سے یورپ دُنیا کے کناروں تک پھیل گیا۔ دوم بارود جس نے زرہ بکتر پہننے والے نائٹوں کے اقتدار کا خاتمہ کر دیا۔ سوم کاغذ جس سے اشاعت و طباعت کا رستہ صاف ہوا۔ کاغذ کے رواج نے جو انقلاب پیدا کیا۔ وہ اہمیت میں طباعت کی ترویج سے کم نہ تھا۔ کتابوں کی انتہائی نایابی کی بہت بڑی وجہ یہ تھی۔ کہ چرمی جھلّی بہت کمیاب تھی۔ ہمیں معلوم ہے۔ کہ قدیم مسودات کے متن بار بار مٹا دیئے جاتے تھے۔ تاکہ اولیائے مسیحی کی عبادتی کتابیں اور روایتیں لکھنے کے لئے کاغذ مہیا کیا جا سکے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ آج گیارھویں صدی سے زیادہ پُرانا کوئی مسودہ مشکل ہی سے دستیاب ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے۔ کہ ایسی صورت میں کتابیں بے انتہا مہنگی ہوتی تھیں۔ اینجو کی ایک کاؤنٹس (نواب بیگم) نے پند و نصائح کی ایک کتاب کے لئے دو سو بھیڑیں اور گندم۔ رائی اور باجرے کے پانچ پانچ پیمانے بطور قیمت ادا کئے۔ یہاں تک کہ لوئی یازدہم کے عہد میں بھی یہ حال تھا۔ کہ جب شہنشاہ نے الرازی کی طبّی تصانیف پیرس یونیورسٹی کے کتب خانے سے عاریتہً حاصل کیں۔ تو بطور ضمانت نقرئی وطلائی مُہروں کی خاصی تعداد بھی دینی پڑی۔ اور اپنے ساتھ ایک امیر کے دستخط بھی ضمانت نامے پر کرانے پڑے۔ تاکہ کتابوں کی واپسی بالکل

تبیقن ہو جائے۔ عربوں نے پہلے پہل چین کی طرح ریشم سے کاغذ تیار کرنا شروع کیا۔ یہ ریشمی کاغذ سمرقند اور بخارا میں بنایا جاتا تھا۔ پھر انھوں نے ریشم کی جگہ رُوئی۔ دمشقی قرطاس اور بعد میں کتان اختیار کرلی۔ کتان کے کاغذ کی صنعت مدت تک ژاتیوا (متصل بلنسیہ) کا اجارہ بنی رہی۔ جہاں سے پہلے قطلونیا اور پراونس میں اور پھر ٹریویسو اور پڈوا میں رواج پا گئی لے

یورپ کے جن حصوں نے پہلے پہل بربریت سے نجات پائی۔ وہ وہی تھے۔ جو براہِ راست مُوروں کی ثقافت کے زیر اثر تھے۔ یعنی ہسپانیہ میں قطلونیا۔ پراونس اور سسلی۔

یہ قطعی طور پر غلط تصور ہے۔ کہ ہسپانیہ کی مُور اور مسیحی سلطنتیں نفرت عدم رواداری اور مسلسل جنگ و پیکار کے باعث ایک دوسری سے متنفر اور بیگانہ تھیں۔ ہسپانیہ میں جو مذہبی جنون نظر آتا ہے۔ وہ بعد کی پیداوار ہے۔ اور اس کو زیادہ تر اجانب نے پیدا کیا ہے۔ جو لوگ تہذیب اسلامی کی ثقافت میں زندگی بسر کرتے تھے۔ اُن کے لئے اُس قسم کے تصورات حیطۂ امکان سے باہر تھے۔ جو دُور دست آبادیوں میں پادریوں نے پیدا کر رکھے تھے۔ اُن لوگوں کا قول تو یہ تھا۔ کہ یہ ناپاک "کُفّار" (یعنی مسلمان) پرلے درجے کے وحشی اور بدمعاش ہیں۔ جنھوں نے "موہوم" نام کے ایک مکروہ بُت کی پوجا اختیار کر رکھی ہے۔ ہسپانوی بادشاہوں نے رفتہ رفتہ مسلمانوں کے علاقوں پر تسلط حاصل کرلیا۔ تو اس کی وجہ صرف یہی نہ تھی۔ کہ اُن کے حملے پُرجوش تھے۔ بلکہ یہ مسلمانوں کے اندرونی تفرقوں کا ثمرہ بھی تھا۔ ہسپانویوں کو یہ فتوحات صرف زورِ شمشیر

لے ہم کاغذ کو "پیپر" اس لئے کہتے ہیں۔ کہ مصر میں ایک ایسی ہی نباتی چیز "پیپرس" کہلاتی تھی لیکن ہم نے اس کا پیمانہ "ریم" مقرر کیا ہے (عربی رزمہ یعنی پلندا)

سے حاصل نہ ہوتی تھیں۔ بلکہ بعض حریص مُور شہزادوں نے بھی اُن
کے ساتھ اتحاد کر لیا تھا۔ گویا دوستانہ تعلق اور بے تکلف میل جول
کمیاب نہ تھا۔ بلکہ عام بات تھی۔ Roncesvalles کے زمانے
میں مُوروں اور مسیحیوں نے مل کر شارلیمین کی خونریز فوج کو شکست
دی تھی۔ یہ فوج عبدالرحمٰن الاول کے ایک باغی سلیمان العربی کی
دعوت پر کوہ پیری نیز کو عبور کر کے آئی تھی۔ مسیحیوں کے مالِ غنیمت
سے لدی ہوئی تھی۔ اور اس کا مقابلہ کسی مُور سے نہ پڑا تھا۔ اُسی
زمانے سے مسیحی اور مُور مسلسل پہلو بہ پہلو لڑتے رہے۔ اور ایک
دوسرے کے پیچیدہ اندرونی جھگڑوں میں برابر امداد و اعانت
کا حق ادا کرتے رہے۔ ہسپانوی شہزادے مُوروں کی اُس فوج
کی سرداری کیا کرتے تھے۔ جو کسی مسلمان حلیف نے اُن کے علاقوں
کی بحالی کی غرض سے بھیجی ہوتی تھی۔ اسی طرح مُور اُمرا بھی اپنے
حریفوں کے مقابلے میں مسیحی فوج لے کر آتے تھے۔ مسیحیوں اور
مسلمانوں میں عام "بھاڑے کے" سپاہیوں کی پلٹنیں موجود تھیں۔
جو مسیحی اور مُور آقاؤں کے لئے کرائے پر لڑتی تھیں۔ مُوروں کے
قابل ترین جرنیل المنصور نے مسیحی فوجوں کی مدد سے فتوحات
حاصل کیں۔ اور Compostella کی زیارت گاہ کو تاخت و
تاراج کیا۔ مشہور راڈریگو (ڈیئیز دا بیوار) جس کو روایات نے مسیحی
دین کا بہادر علمبردار بنا دیا ہے۔ حقیقت میں ایسا ہی بھاڑے کا
"ٹٹو" تھا۔ جو ہمیشہ کبھی مُوروں کے علم کے نیچے لڑا۔ اور کبھی کیتھولک
عیسائیوں کے جھنڈے تلے مصروف پیکار رہا۔ یہ سات سال تک
سارا گوسا کے امیر کی ملازمت میں رہا۔ اس نے مسجدوں کو لوٹا۔ اور
اسی جوش و خروش سے گرجاؤں کو بھی برباد کیا۔ یہ مُوروں کا سالار

پہنتا تھا۔ مُوروں کے باڈی گارڈ پر پورا اعتماد رکھتا تھا۔ اور یہ عام طور پر عربی لقب "سیّد" سے مشہور ہے۔ شارلیمن نے ہسپانیہ کی مہم میں جو ذلت آمیز شکست کھائی۔ اس کو قصّہ نویسوں نے ایک "داستان شجاعت" بنا لیا ہے۔ اور اس میں جادوگروں۔ مُہم جُو بانکوں۔ بالشتیوں۔ اژدہاؤں اور عربی افسانوں کے طلسمی محلات وقصور کے ذکر سے آرائش پیدا کی ہے۔ لیکن ہم جو کچھ بیان کر رہے ہیں۔ وہ محض افسانہ نہیں۔ بلکہ ایک صحیح روایت ہے جس کی داستانوں اور نظموں سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ کہ مسیحی اور مُور نائٹ آپس میں دوستانہ تعلقات رکھتے تھے۔ اکھاڑوں اور مقابلوں میں اکٹھے شامل ہوتے تھے۔ اور معزز مہمانوں کی حیثیت سے ایک دوسرے کی خاطر مدارات کرتے تھے۔ ہسپانوی اور مُور شہزادے اور اُن کے اہل علم اور مُطرب و فنکار برابر ایک دوسرے کے درباروں میں مقیم ہوتے تھے۔ مسیحی حکمران عرب اتالیقوں سے اپنے بیٹوں کو تعلیم دلاتے تھے۔ اور جب کبھی کسی مزمن مرض میں مبتلا ہوتے تو قرطبہ جا کر باکمال طبیبوں سے مشورہ کرتے تھے۔ یہاں تک کہ مسیحی پادریوں اور مُور حکمرانوں کے درمیان بھی دوستانہ ارتباط تھا۔ بشپ ہیرب نے عربی کی تقویم کا ترجمہ کیا۔ اور بشپ گوبمارسے نے عربی میں تاریخ فرنگ لکھی۔ اور دونوں نے اپنی کتابیں خلیفہ حاکم کے نام سے مُعنون کیں۔ باہمی ازدواج عوام میں تو عام تھا۔ لیکن اکثر اُمرا بھی کر لیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ لیون کے شاہ الفانسو پنجم نے اپنی بہن کی شادی طلیطلہ کے بادشاہ محمد سے کر دی۔ اور الفانسو ششم کی شادی شہزادی زائدہ سے ہوئی۔ جو شاہ اشبیلیہ ابن آبت کی بیٹی تھی۔ المنصور نے برموڈو ثانی کی بیٹی ٹیریسا سے شادی کر لی۔ اور ٹیریسا نے اپنے کُنبے کی منظوری سے اپنے شوہر کا دین بھی اختیار کر لیا۔ جو مُور شہزادے شاہ قسطیلیہ

کی بالادستی کو قبول کرتے تھے۔ انھیں ہسپانوی مجلس حاکمہ میں بیٹھنے کی اجازت تھی۔

موروں کی شائستگی کا نور جزیرہ نما میں اور جنوبی فرانس میں بے روک ٹوک اپنی تجلیاں بکھیرتا رہا۔ مستعربین (ہسپانوی مسلم) اور یہودیوں کی آبادیاں اندلسیہ سے قطلونیا اور لانگیڈوک میں برابر منتقل ہوتی رہیں۔ اور پوپ کا نمائندہ پرادنس کے نوابوں کو ہمیشہ متہم کرتا رہا کہ تم لوگ "موروں۔ یہودیوں اور ہر قسم کے کافروں" کی سرپرستی کر رہے ہو۔ پراونس جہاں مور تقریباً دو سو سال سے آباد چلے آتے تھے۔ ہسپانوی سرحدی علاقے سے ملحق ہو گیا۔ جہاں وہی زبان بولی جاتی تھی۔ اور بارشلونا کے نواب ریمنڈ بیرنجر نے جیوادان کے گلبرٹ کی بیٹی ڈوسکے سے شادی کرلی۔ جو نوابانِ پراونس کے خاندان کا آخری فرد تھا۔ یہی وہ مقام تھا۔ جہاں سے یورپ کی ثقافت اور شائستگی (جو البی جنیشین "حرب صلیبی کی خوفناک خونریزی کے باعث بے نشان ہو گئی تھی) موروں کی تہذیب کے زیر اثر پروان چڑھی۔ اور پھولی پھلی۔

اجڈ۔ ناخواندہ اور غلیظ ڈاکو سرداروں کی جگہ اب وہ لوگ سامنے آئے جو شعر و موسیقی سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ اور راگ رنگ کے مقابلوں میں شغف رکھتے تھے۔ ڈھیلے ڈھالے اونی غرغلوں اور چرمی پوستینوں کی جگہ اب تنگ و چست روئی دار چغے نظر آنے لگے۔ (ان کو اہل اول dnho کہتے تھے۔ عربی: جُبّہ) اور چمکیلے ریشم کی عبائیں جن کا رواج رفتہ رفتہ شمالی یورپ میں بھی ہو گیا۔ موروں کے ہسپانیہ کی طرح یورپ میں بھی عورتیں ذہنی مشاغل اور فنی ذوق میں مساوی حصہ لینے لگیں۔ انھوں نے راہبات کی سی سادہ عادات کو چھوڑ کر پُر تکلف ملبوسات و زیورات اختیار کر لئے۔ انھوں نے شلوکے پہننے شروع کئے جن کے

ساتھ ریشمی سایوں کے دامن سرسراتے تھے۔ بالوں کی لمبی چوٹیاں گوندھنے کے بجائے انھوں نے اُن کو نہایت نفاست سے اُوپر لپیٹنا شروع کیا۔ اس فیشن کو شمال میں ''پیاونسی فیشن'' کہتے تھے۔ وہ زردوزی اور جواہرات کے کام والے ایرانی تاج پہنتی تھیں جنھوں نے چودھویں صدی میں قندپارے اور سینگوں والی ٹوپیوں کی شکل اختیار کرلی۔ اور جو ''کلاہ شامی'' کے نام سے مشہور ہوئیں۔ ایک عرب مصنّف ابن جُبیر نے اُس زمانے کی عورتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:'' وہ سُنہرے رنگ کی ریشمی خلعتیں پہنتی تھیں۔ نہایت نفیس عباؤں میں ملفوف۔ بوقلموں نقابوں سے مزیّن۔ پاؤں میں طلائی پاپوش پہنے۔ رنگارنگ گریبانوں اور پیٹیوں سے آراستہ۔ آنکھوں میں کاجل (کُحُل) لگا کر اور خوشبوؤں سے معطر ہو کر باہر نکلتی تھیں۔ غرض اُن کا لباس بالکل ہماری مسلم خواتین کی مانند تھا۔ زاہد لوگ اس قسم کے بناؤ سنگار کے خلاف سخت شور و غوغا برپا کرتے تھے لیکن اُن کو مذہبی دوائر میں خواہ کتنا ہی اقتدار حاصل ہو۔ جب دوسرے معاملات میں لوگ اُن کی پروا نہ کرتے۔ اور شعرا اُن کی ہجویں لکھتے۔ تو وہ بے بس ہو کر دبک جاتے۔ اندلسیہ کے گلزار راگ رنگ سے لبریز تھے۔ ہر دربار میں عاشقانہ داستانوں اور رُباعیات کی آوازیں گونجتی تھیں۔ شاعر اور گویّے ہر عرب حکمران اور ہر امیر کے عملے فعلے میں شامل تھے۔ اور مہارت شعر گوئی ہر معزز مرد اور عورت کے لئے ناگزیر اور لازمی خوبی سمجھی جاتی تھی۔ یہ تمام سرگرمیاں آس پاس کے علاقوں یعنی قسطیلیہ و طلونیا۔ اور پراونس میں عام ہو گئیں۔ تانت والے ساز سب سے پہلے ازمنۂ متوسطہ میں یورپ کے اندر یہیں سے رائج ہوئے۔ مثلاً ''لوٹ'' (عربی: العود)''وایولین'' جس کو پہلے ''رُوبب'' (عربی: رباب) کہتے تھے''سالٹری'' (عربی: سنطیر) جو پیانو کا مورث اعلیٰ تھا''زیتھر''

(ستار) "طنبورہ" (عربی: تانبور) اور "گٹار" (عربی: قیطرہ) اسی زمانے میں نمودار ہوئے۔

یہ امر اب تک علماء محققین کے درمیان موضوعِ بحث چلا آتا ہے کہ قطلونیا اور پراونس کے جو اشعار ٹوروں کے سازوں کے ساتھ گائے جاتے تھے۔ اُن کو کس حد تک عربوں کے ہسپانیہ نے سانچے میں ڈھالا تھا۔ جو لوگ اس امر کا دعوے کرتے ہیں۔ کہ پراونس کا ادب "خود رُو نشو ونما کی ایک حیرت انگیز اور غیر معمولی مثال" ہے۔ اُن کے خیالات میں اگر تعصب کا کوئی شائبہ ہو۔ تو اس کو قابلِ معافی سمجھنا چاہیئے کیونکہ یورپ کے محققین نے عربی ثقافت کے دوسرے اثرات و نتائج کے ساتھ جو سلوک روا رکھا ہے۔ اس کے پیشِ نظر یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ یا لاشبہ پراونس میں بھی عام دیسی شاعری موجود تھی۔ (جس طرح ہر جگہ ہوتی ہے) لیکن عام گیتوں سے بالکل الگ وہاں جو شاعری کا درباری اسلوب و انداز پیدا ہوا۔ اور جو درباری مُطرب نمودار ہوئے۔ اُن سے ٹوروں کے درباری "ٹرواح" کے اثر کا صاف سُراغ ملتا ہے۔ کچھ اُن گھڑ قسم کی قافیہ نوازی اس سے پہلے راہبوں کی تُک بندیوں میں موجود تھی۔ لیکن "ٹروبیڈور" کے گیتوں میں قافیے کے باقاعدہ نمونے۔ متبادل مصرعوں میں ایک ہی لفظ کا ہم آہنگ اعادہ۔ مشکل قوافی کی تخلیق "تاسیدنہ یا" "اتوالی" (جو غزل میں ہمیشہ استعمال کئے جاتے ہیں) یہ سب عربی شاعری اور خصوصاً ہسپانوی اوبستان کی شاعری کی خصوصیات ہیں۔ جس نے "موشح" اور "زجل" کے بند ایجاد کئے۔ اور جو ابہام عالمانہ" کی اسی طرح کو شوقین تھی جس طرح Goiraut de Bornath اور بہت سے دوسرے ٹروبیڈور (غزل گو) Trobar clus کے عاشق تھے۔ ظاہری اور اصطلاحی خدوخال کے علاوہ اس جدید نغمہ سے

قریب قریب وہی مرصع جذبات اور رومانی عاشقانہ احساسات ظاہر ہوتے ہیں۔ جو عربی و ایرانی شاعری کی خصوصیات ہیں۔ اور Bernard de Ventadour اور اُس کے ساتھی شعرا اپنے اندلسی بھائیوں کی طرح "سری الغوانی" یعنی "حسینوں کے قیدی" ہی تھے۔

ہسپانوی اور پراونسی شاعری ادبیات یورپ کا "نغمۂ ولادت" ہے۔ جس نے پورے یورپ میں شاعری کی گونج پیدا کردی۔ جرمنی کے Minnesingers سے لے کر "قبلِ دانتے" کے اٹلی تک کو متاثر کیا اور جدید یورپ کی "مبتذل زبانوں" میں ادبی زندگی پیدا کردی۔ اس سے قبل کے اطالوی شعرا Malospina ، Zorgi ، Sardello Lanfranc Cigala نے پراونسی ٹروبیڈروں ہی کی زبان۔ عروض اور اسلوب کی پیروی کی۔ پہلے اطالوی گیت جو مادری زبان میں لکھے گئے (Jacopo Lentini ، Gindodelle Colonne اور Pier della Vigne کے جدید نغمے) وہ سسلی میں فریڈرک ثانی کے دربار ہی میں وجود میں آئے۔ جو بالکل عربوں کے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ دانتے مدت تک غور و فکر کرتا رہا۔ کہ وہ اپنی عظیم نظم لاطینی میں لکھے یا نہ لکھے۔ لیکن چونکہ وہ پراونسی نغموں کی مقبولیت اور عمدگی سے بے حد متاثر تھا۔ اس لئے بالآخر اُس نے انہی نغموں سے اپنی زبان۔ ہیئت اور ترکیب اخذ کی۔ گویا اگر ہسپانوی مُور نہ ہوتے۔ تو ٹروبیڈور نہ ہوتے۔ اور اگر ٹروبیڈور نہ ہوتے۔ تو دانتے وجود میں آتا۔

جب نارمن تنخواہ دار سپاہیوں نے مسلمانوں کے سسلی اور جنوبی اٹلی کو فتح کرلیا۔ تو اسی سے ولیم (حرامی) کو انگلستان پر حملہ کرنے کی ترغیب ہوئی۔ جب تیس سال کی کش مکش کے بعد مسلم سلطنت اور اُس کے پایۂ تخت پلرمو نے (جو شوکت و ثقافت میں قرطبہ کا حریف تھا) آخرکار

Hauteville کے طالع آزماؤں کے آگے ہتیار ڈال دیئے۔ تو صرف اس شرط پر کہ انھیں مساوی حقوق اور آزادیاں دی جائیں۔ اس شرط پر اس قدر پابندی اور رضامندی سے عمل کیا گیا۔ کہ دونوں سسلیوں کے پہلے بادشاہ روجر اور اُس کے جانشینوں پر بادجہ معقول اتہام لگایا گیا۔ کہ وہ مسیحی نہیں بلکہ مسلمان ہی ہیں۔ آخری Hohenstaufen حکمرانوں کے زمانے تک سسلی مسلم ثقافت کا مرکز بلکہ تہذیب کے احیا کا نقطہ آسکہ بنا رہا۔ یہ تقدیر کا عجیب چکر ہے۔ کہ جب ہنری چہارم نے Canossa کی ذلت کا داغ دھونے کی خواہش کی۔ تو پوپ ہلڈے برینڈ کو سینٹ اینجلو سے بچا لے جانے والے مسلمان فوجی ہی تھے۔ نارمنوں اور سوابیوں کے ماتحت نہ صرف مسلمانوں کی فوج۔ ان کا مذہب اور بہت بڑی حد تک نظم و نسق بھی برقرار رہا۔ بلکہ عزت و اقتدار کے عہدے بھی موروں ہی کے قبضے میں رہے۔ اُن کے "امیر البحر" لاطینی شکل میں "امیراٹی" یا "ایڈمرل" بن گئے۔ اور اُن کے "دیوان" یعنی سرکاری دفاتر Douanes یا dohanes کہلانے لگے۔ سسلی کا نظم و نسق حکومت یورپ کے لئے ایک نمونہ بن گیا۔ انگریزوں کا مالی نظام اور اس کا نام (جو اَب تک موجود ہے) یعنی Exchequer مسلمانوں۔ کے سسلی ہی سے ماخوذ ہے۔ جب طامس براون نے جو روجر ثانی کے ماتحت "قائد" کے عہدے پر ممتاز تھا۔ اپنی خدمات انگلستان کے بادشاہ ہنری ثانی کی طرف منتقل کیں۔ تو اُسی نے یہاں یہ مالی نظام رائج کیا۔ نارمن انگلستان اور نارمن سسلی کے درمیان مسلسل اختلاط جاری رہا۔ جس کی وجہ سے مسلم ثقافت کے بہت سے عناصر براہِ راست برطانیہ کے دُور دست مُلک میں داخل ہو گئے۔ جب سلطنت اطالوی نژاد شہنشاہ فریڈرک ثانی کے قبضے میں منتقل ہو گئی (جس کی شخصیت سے ازمنۂ متوسطہ کی فضا منور نظر آتی

ہے) تو مسلمانوں کا عظیم الشان اور دُور رس تہذیبی اثر یورپ کی بربری قوموں پر نقطۂ عروج تک پہنچ گیا۔ اگر کسی یورپی بادشاہ کے سر اس بات کا سہرا ہو سکتا ہے۔ کہ اُس نے مسیحیت کو بربریت اور جہالت سے نجات دلائی۔ تو وہ شارلمین ہرگز نہیں۔ (جس کو تہذیب و مذہب کا حامی قرار دینا محض ایک افسانہ ہے) بلکہ وہ روشن خیال و سرگرم فرمانروا ہے جس نے عربی تہذیب کو خود بھی اختیار کیا۔ اور اس کو مقبول بنانے میں بھی دوسروں سے سبقت لے گیا۔

شہنشاہ فریڈرک کا دربار نہایت شاندار تھا۔ مُوروں کے بنائے ہوئے نقشین چمنوں والے ہال تھے۔ مشرقی انداز کے باغات میں فوارے اچھل رہے تھے۔ چڑیا گھر نایاب پرندوں اور عجیب و غریب جانوروں سے معمور تھے۔ جو حلیفت خلفا کی طرف سے بطور ہدیہ دستیاب ہوتے تھے۔ اس دربار میں علوم عربی کے فضلا مہمانانِ محترم کی حیثیت سے جمع رہتے۔ اور ریاضی اور تاریخ فطرت کے امور و مسائل پر بحث کرتے۔ پراونسی ٹروبیڈر اور موری مُطرب عود و طنبورہ کے ساتھ اپنے گیت گاتے تھے۔ اور اطالوی شاعری کے آثار اولین کے پھولنے پھلنے میں معاون ہو رہے تھے۔ اِدھر تو یہ دربار حیرت انگیز مناظر اور علم و فضل اور حُسن و نفاست کا مرکز تھا۔ اور اُدھر یورپ کے دوسرے بادشاہوں کے تنگ و تاریک اور سرکنڈوں سے بھرے ہوئے دربار تھے۔ جن میں راہبوں۔ کیڑوں مکوڑوں۔ جہالت اور اوہام پرستی کا دَور دَورہ تھا۔ اور اس فرق و تفاوت کو دیکھ دیکھ کر وہ لوگ متعجب بھی ہوتے تھے۔ اور حسد کی آگ میں بھی جلتے تھے۔ فریڈرک کے خلاف جو "الزام اور اتہام" عائد کئے گئے۔ اُن میں ایک یہ بھی تھا۔ کہ "یہ شخص روزانہ غسل کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اتوار کے دن بھی ناغہ نہیں کرتا"۔ اس شہنشاہ نے نیپلز، مسینیا اور پیڈوا میں یونیورسٹیاں قائم کیں۔ سلرنو

کے بہانے طبی مدرسے کو طب عربی کی ترقیات کے ساتھ از سرِ نو مفید و فعال بنایا۔ اسی کی سرپرستی سے حوصلہ پا کر پیٹوولی کے پلاٹو اور لوئرینرز و فیبوناچی نے جو یورپی ریاضی کے بانی تھے۔ یہودی اور عرب علما کو جمع کیا۔ تاکہ ہر ممکن الحصول عربی کتاب کا ترجمہ کر دیں۔ اس بادشاہ نے اپنے دوست مائیکل سکوٹس کو ابن رشد کی تازہ تصانیف حاصل کرنے کے لئے قرطبہ بھیجا۔ اور ہر مدرسے کو اُن کتابوں کے نسخے مہیا کئے۔

اگر یہ شہنشاہ اپنے تخیل کے مطابق یورپ کو ایک نئی سلطنت کے ماتحت متحد کر دیتا۔ جس کا صدر مقام اٹلی میں ہوتا۔ تو نہ صرف سیاسی تاریخ بلکہ یورپ کے نشو و ارتقا اور ثقافت کی تاریخ بھی بالکل مختلف راستہ اختیار کر لیتی۔ لیکن ابھی پادریوں کی مخالفت نہایت طاقتور تھی۔ پوپ اس شہنشاہ کی مخالفت میں زمین آسمان کر رہے تھے۔ گریگوری نہم نے لومبارڈ کے شہروں میں بغاوت پھیلادی۔ اور ان شہروں کی وفاداری حاصل کرنے اور اُن کو انعام دینے کا یہ طریقہ اختیار کیا۔ کہ ان کے درمیان ایک مذہبی عدالت احتساب (انکوئیزیشن) بھی قائم کر دی۔ اور چند سَو شہریوں کو زندہ جلادیا۔ بھکاری راہب شہنشاہ کے ہر محل میں نفوذ کر گئے۔ اس کے جگری دوستوں کو دھمکیوں اور رشوتوں سے متاثر کیا۔ اور انھیں خنجر اور زہر سے مسلح کرنے لگے۔

کلیسا کو ایک تو یہ اندیشہ تھا۔ کہ اٹلی متحد ہو جائے گا۔ تو پھر پادریوں کی دُنیوی مملوکات چھن جائیں گی۔ دوسرا خطرہ یہ تھا۔ کہ یورپ کی تاریک فضا میں ذہنی بیداری کا نور اپنی شعاعیں بکھیر رہا تھا۔ گریگوری نے فریڈرک کو "دجّال" قرار دیا۔ اور لکھا۔ کہ "یہ ہلاکت اور مضرت رساں بادشاہ دعویٰ کرتا ہے۔ کہ دُنیا کو تین کاذبوں نے فریب دیا ہے۔ اور وہ موسیٰ۔ یسوع اور محمد تھے۔ وہ بلند آہنگی سے اعلان کر رہا ہے۔ اور یہاں تک

کہہ رہا ہے۔ کہ اس عقیدے پر صرف احمق ہی یقین کر سکتے ہیں۔ کہ دُنیا کا قادرِ مطلق خدا کسی کنواری کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا۔ وہ اس ملحدانہ عقیدے پر قائم ہے۔ کہ کوئی انسان مرد اور عورت کے ملاپ کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتا۔ اور ان کُفریات کے علاوہ وہ یہ بھی کہتا ہے۔ کہ صرف وہی باتیں قابلِ قبول ہیں۔ جو توانینِ اشیا اور فطری دلیل و بُرہان سے ثابت کی جا سکیں"۔ اٹلی بھر میں شہنشاہ کے حامیوں کو کافر قرار دیا جاتا تھا۔ "شہنشاہ پرست" کا لفظ بالکل "لذتیت پرست" کا مترادف سمجھا جاتا تھا۔ یہ آخرالذکر اصطلاح اُس زمانے میں فلسفی ملحدین کے لئے استعمال کی جاتی تھی۔ اور جب Guido Cavalcanti اپنے فکر میں غوطہ زن ہو کر چپ چاپ فلارنس کے بازاروں میں سے گزرتا تو (بوکیشیو نے بتایا ہے کہ) عام لوگ آپس میں سرگوشیاں کرتے۔ کہ "یہ ایسے دلائل سوچ رہا ہے جن سے ثابت کر سکے۔ کہ خدا کا کوئی وجود نہیں"۔ آخر کلیسا کے فتوے۔ اس کی لعنتیں اور اُس کے "ذات باہر" کرنے والے احکام Guelphs کی تلواروں سے بھی زیادہ خوفناک ثابت ہوتے۔ شہنشاہ سالہاسال کی اس کش مکش اور روزمرہ کے خطرات کی وجہ سے عاجز۔ درماندہ۔ ہراس زدہ۔ دل شکستہ اور تلخ کام ہو گیا۔ اور ناچار اپنے جانی دشمنوں سے شرائط صلح کا طالب ہوا۔ آخر وہ اٹلی کو چھوڑ کر ایک حرب صلیبی میں فلسطین چلے جانے پر رضامند ہو گیا۔ اور جب یورشلم پہنچا۔ تو اس عجیب ترین صلیبی مجاہد کا استقبال سلطان ملک الکمیل نے اپنے معزز و محترم دوست کی حیثیت سے کیا۔ جب یہ بادشاہ نجیب و فاضل ملک کمیل کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے مسجد سیّدنا عمر (رضی اللہ عنہ) کے شہ نشین پر ٹہل رہا تھا۔ تو اپنی محبوب ریاضیات کی تازہ ترین ترقیات پر گفتگو کر رہا تھا۔ اور ان انسانوں کی حماقت پر

متاسف ہو رہا تھا۔ جو نور کے مقابلے میں ظلمت کو پسند کرتے ہیں۔ اُس نے نہایت حقارت سے اس منظر کو دیکھا۔ کہ بے شمار مذہبی جنونی مقدس ہیکل کے دروازوں کے سامنے گھٹنوں کے بل رینگ رہے ہیں۔ وہ فلپ آگسٹے کی طرح پکار اٹھا "سلطان کتنا خوش قسمت ہے جس کا کوئی پوپ نہیں"۔ ملک نے شہنشاہ کے عزو احترام کے پیش نظر اس کو ایک گھڑی (کلاک) بطور تحفہ دی جس کی شکل ایک بڑے گنبدی خیمے کی تھی جس کے اندر سورج اور چاند کل کے زور سے گردش کرتے تھے۔ اور طلوع و غروب بھی دکھاتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی یہ گھڑی گھنٹے بھی بجاتی تھی۔

جب اس جلیل القدر بادشاہ کی نعش monreale کے تہ خانے میں دفن کی گئی۔ تو مسیحیوں اور عربوں نے مل کر اُس پر آنسو بہائے۔ یہ بادشاہ اپنے پیچھے ایک ایسی طاقت کی بنیادیں چھوڑ گیا تھا۔ جو اُس کے خوابوں کی عظیم سے عظیم سلطنت سے بھی زیادہ قوی تھی۔ وہ طاقت جو ایک دن اس کا انتقام لینے والی تھی۔ اور پوپوں اور پادریوں کے ظلم و ستم کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کرنے والی تھی۔

اب ایک ایسے داعیے نے یورپ کے ذہن کو جمود کی نیند سے بیدار کیا۔ جو اپنے اثرات میں علم طبیعیات سے زیادہ فوری اور رومانی اور شاعرانہ ادب سے زیادہ گہرا تھا۔ عام طور پر اس امر کی کافی وضاحت نہیں کی گئی کہ جن بڑے بڑے عوامل نے دینیاتی عقیدے کے دباؤ کو اُتار کر پھینک دیا۔ اُن میں سے ایک عامل خود دینیات ہی تھا۔ الغزّالی کا قول ہے کہ "کسی مذہبی عقیدے کا سادہ سا تصوف اور اس کا جذباتی تھا ذجب کبھی ذہنی نقطۂ نگاہ سے پرکھا جائے گا۔ تو اُس کو لازماً رد کرنا پڑیگا"۔ نویں اور دسویں صدی ہی میں دُنیائے مسیحیت کے اندر جابجا سرکشی کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔ انگلستان اور آئرلینڈ میں بینی ڈکٹی سلسلے

اور سینٹ کولمبا کے راہبوں کا درجۂ ثقافت تہذیبِ اعظم کے مقابلے میں واضح طور پر بلند تر تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی۔ کہ تھیوڈور نے ایک روایت قائم کر دی تھی۔ یہ ایک مشرقی راہب تھا۔ اور ادبیات کا گہرا ذوق رکھتا تھا وہ پوپ ویلرین کے ماتحت کنٹربری کا لاٹ پادری مقرر کر دیا گیا۔ دوسری وجہ یہ تھی۔ کہ یہ لوگ مرکزی کلیسیائی حکومت کی طفیل سے اور فاصلے کی دوری اور علیحدگی کے باعث گریگوری کی ظلمت پسندی سے محفوظ تھے۔ ایگبرٹ۔ بیڈ اور الکوین اسی امتیاز کی چند مثالیں ہیں۔ ہمارا مطلب یہ نہیں۔ کہ اس امر کی کوئی خاص اہمیت تھی۔ لیکن جب دوسرے ملکوں کی تقریباً کامل ناخواندگی کا مقابلہ انگریزوں کے ذوق سے کیا جائے۔ تو انھیں ضرور بلند تر سطح پر رکھنا پڑے گا۔ کیونکہ سب سے بڑی بات یہ تھی۔ کہ آئرلینڈ کے راہب لاطینی مصنفین سے بھی شغف رکھتے تھے۔ اور شاذ ہی سہی لیکن کبھی کبھی یونانی میں بھی شُدبُد کا ثبوت دیتے تھے۔ اس صورت حال کے نتائج بہت جلد ظاہر ہوتے۔ کیونکہ انھوں نے الہامی کتب اور ابتدائی پادریوں کی کتابیں پڑھ کر اپنے ذہن و فکر کو استعمال کرنے کی جرأت کی۔ آئرلینڈ کے راہبوں کے متعلق ایک مؤرخ نے لکھا ہے۔ کہ "تلسفیوں کے یہ ریوڑ کے ریوڑ طوفانی سمندر کے پار بھی پریشان کُن مداخلت کرتے تھے۔" سینٹ بونی فیس جب جرمنی میں مسیحیت کی نشر و تبلیغ میں مصروف تھا۔ تو اُسے اپنے آئرش معاندین کی طرف سے ہمیشہ کش مکش اور تکلیف ہی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ایک "برادر ورجل" تحت الارض کے علاقوں پر گفتگو کرتا تھا۔ فادر کلیمنٹ نے جیروم۔ آگستائن۔ گریگوری بلکہ قانونِ کلیسیائی کی سَند کو بھی حقارت سے مسترد کر دیا۔ اور متوفی بیوی کی بہن سے شادی کرنے اور بشپوں کے ازدواج کے مسئلے پر اپنے وہ خیالات ظاہر کئے جن کو سُن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے

تھے۔ فادر مکاریوس محض ایک وحدت الوجودی تھا۔ اور اُس نے کوربی کے صومعے میں اپنے ابلیسی خیالات کا اظہار شروع کر دیا۔ اور وہیں سے فادر رَیٹرم کا ظہور ہوا۔ جس نے معجزۂ عشائے ربانی سے انکار کیا۔ لیکن دینِ مسیحی کے اِن مفسدین میں سب سے بڑا اور سب سے دلیر ایک بلند پایہ انسان جان اَریجنا تھا۔ جو مشرق میں سفر کر چکا تھا۔ اور یونانی جانتا تھا۔ اُس شخص نے فادر رَیٹرم کے خیالات کی تائید نہایت عالمانہ اور پُر زور طریقے سے کی۔ عشائے ربانی کے معجزے کو محض ایک نشانی اور علامت قرار دیا۔ اور خالص وحدت الوجودی خیالات ظاہر کئے۔ اُس زمانے میں کوئی مسیحی پادری اتنی قابلیت بھی نہ رکھتا تھا۔ کہ اس شخص کے ملحدانہ عقائد کی وسعت و قوت کا اندازہ بھی کر سکے۔ چہ جائے کہ اس خوفناک آتش آدمی سے منطق و استدلال کی جنگ چھیڑ سکے۔ دینیات اُس زمانے میں صرف اسی بات تک محدود تھی۔ کہ الہامی کتب اور قدیم پادریوں کی تصانیف کی تلاوت کر لی جائے۔ اور اُن کی الہامیت اور قدامت کے سوا اَور کوئی سَند نہ تھی۔ یعنی ڈلٹی راہبوں کے صومعوں میں معجزۂ عشائے ربانی کا انکار ایک صدی سے زیادہ مُدت تک برابر سُلگتا رہا۔ یہاں تک کہ کنٹربری کے آرچ بشپ اَنیسیلم نے اپنی طرف سے اُس کو بالکل فرو کر دیا۔ لیکن اُس کی اُمیدیں رَوسلین نے خاک میں ملا دیں۔ جس نے اَنیسیلم پر تیز و تُند حملہ کرنے میں ارسطو کی منطق کے نئے ہتیار سے کام لیا (جو اُسی زمانے میں ہسپانیہ سے درآمد کیا گیا تھا) روسلین کا ایک شاگرد پیٹر ابیلارڈ تھا۔ جس نے نہایت جوش و فصاحت سے اعلان کیا۔ کہ نہ صرف عقل و ادراک کو ہر قسم کی سَند اور ہر ماخذ پر تنقید کرنے کا حق حاصل ہے۔ بلکہ خود عقل و ادراک ہی سب سے بڑی اور واحد سَند ہے۔

ہمیں پوری صحت کے ساتھ یہ معلوم کرنے کے ذرائع حاصل نہیں ہیں کہ خالص متکلمانہ اصول کے ابتدائی مناقشات کس حد تک مسلم فکر سے متاثر ہوئے۔ رومی کلیسیا کے اندر ملحدانہ عقائد کی پہلی باقاعدہ جماعت جس نے وسیع مذہبی اختلافات پیدا کر دیئے۔ مسلمانوں کے ہسپانیہ ہی میں پیدا ہوئی۔ نویں صدی میں طلیطلہ کے بشپ ایلی پینڈس نے اس کا آغاز کیا۔ اور جنوبی فرانس کے پادریوں کو ابنیت کے نظریہ سے متاثر کر دیا۔ ہمیں معلوم ہے۔ کہ مسلمانوں کا فلسفہ اور اُن کی الٰہیات یہودیوں اور مونٹے کاریو کے اسقف اعظم کے گھر کی معرفت بینی ڈکٹی راہبوں کے صومعوں میں پہنچی تھیں۔ قرطبہ کے آلوارو نے بتایا ہے۔ کہ نویں صدی میں بہت سے مسیحی مسلم علماء سے دینیات و فلسفہ کی کتابیں پڑھا کرتے تھے۔ اور اُن کا مقصد ہمیشہ یہ نہیں ہوتا تھا۔ کہ اُن کی تردید کریں۔ پیٹر (محترم) ایبٹ آف کلونی تھا۔ اور جب ابیلارڈ کو سینس کی کونسل نے ملعون و مردود قرار دیا۔ تو اُس نے پیٹر ہی کے پاس پناہ لی تھی۔ یہی پیٹر بڑے رنج و اندوہ سے لکھتا ہے کہ "میں نے اپنے دوران قیام ہسپانیہ میں دیکھا ہے کہ فرانس۔ جرمنی اور انگلستان کے طلبہ جوق در جوق مُوروں کے مراکز علم و فضل میں جمع ہو رہے ہیں"۔ اس بڑھتی ہوئی لہر کو روکنے کے لئے اُس نے قرآن کا لاطینی میں ترجمہ کرایا۔ اور ساتھ ہی نہایت سادگی سے کہہ دیا۔ کہ اس قسم کی "الہامی" کتابوں کے اندر ہی اُن کی نہایت مؤثر تردید کا مواد موجود ہوتا ہے۔ مسلمانوں اور مسیحیوں کے دینیاتی اختلافات کے درمیان ایک قطعی متوازنیت پائی جاتی ہے۔ اُن کے موقف بھی مشابہ ہیں۔ اور اُن کی مطابقتیں اس قدر بنیادی اور اتنی بے شمار ہیں۔ کہ اُن کو محض اتفاق قرار نہیں دیا جا سکتا۔ نرفوریس کی ایساغوجی میں "کلیات" کے متعلق ایک مابعد الطبیعی مغالطہ ہی نے وہ بنیادی عقیدہ مہیا کر دیا۔ جس کے ارد گرد اسلام اور مسیحیت دونوں

میں اختلافی و نزاعی فکر کی پوری عمارت کھڑی ہوگئی۔ وہی امور اور وہی مسائل جن میں دمشق کے مکاتبِ دینیات مصروف و مشغول تھے۔ صرف ایک صدی کے وقفے کے بعد پیرس میں بالکل یکساں الفاظ میں دُہرائے جانے لگے۔

اسلام کے متشددین نے دمشق و بغداد کے درباروں کی ثقافت کو ہمیشہ شُبہ کی نظر سے دیکھا۔ اور جب المامُون نے اپنا مشہور مرکز ترجمہ "دارالحکمۃ" کے نام سے قائم کیا۔ تو اُس نے متقیوں اور متشددوں کے اطمینان کے لئے یقین دلایا۔ کہ یہ محض گھریلو طبیبوں کا ایک مدرسہ ہوگا۔ علمائے اسلام اور عام مومنین کے نزدیک یہ ساری ثقافتی تحریک اول سے آخر تک ملعون و مردود تھی۔ اور ہارون و مامون کے متعلق کہا جاتا تھا۔ کہ انھوں نے اپنی رُوحوں کو (شیطان کے ہاتھ) فروخت کر دیا ہے۔ مُوروں کے ہسپانیہ میں بھی مذہبی دیوانے کبھی کبھی جوش میں آکر علمی کتابوں کو نذرِ آتش کر دیا کرتے تھے۔ ذہنی ثقافت کے متعلق مذہبی جوش کا رویہ مسلمانوں میں بھی وہی رہا ہے جو مسیحی دُنیا میں نظر آتا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا۔ کہ مسلمانوں میں اہلِ فکر اور ملحدین کچھ مدت تک قوت و اقتدار کے مالک رہے۔ اور راسخ العقیدہ مومنین ناراض و تلخ کام ہونے کے سوا اور کچھ نہ کر سکتے تھے۔ یہاں تک کہ ترک۔ بربر۔ اور ہسپانوی اُن کی امداد کو پہنچے۔ اور اسلام کو پھر ابتدائی ڈگر پر لاکر بربریت کی تاریکی اور جہالت میں غرق کر دیا۔ دسویں صدی میں تو یورپ کے تشنگانِ علوم فاضل مُوروں کے مدارس سے رجوع کرتے تھے۔ لیکن بیسویں صدی میں پروفیسر ویسٹر مارک نے مراکش کا سفر اس لئے اختیار کیا۔ کہ ابتدائی بربریت کے طور طریقوں کا مطالعہ کرے۔ اس فرق و تفاوت کی وجہ یہ تھی۔ کہ دونوں دُنیاؤں میں نور و ظلمت کی کش مکش کے مسائل متضاد تھے۔ ایک میں اذعانی عقیدے کو عقلی فکر نے شکست

دستے دی تھی ۔ اور دوسری میں عقیدہ عقلی فکر پر غالب آ گیا تھا ۔

اگرچہ عربوں کی ذہنی توانائی ریاضیات اور سائینس کے معروضی مشاغل کو دوسرے امور پر ترجیح دیتی تھی ۔ لیکن یہ امر ناگزیر تھا کہ اس کا اطلاق مذہب کی توجیہہ و تعبیر پر بھی کیا جاتا ۔ انھوں نے اپنے نسطوری استادوں سے اور جالینوس سے ارسطو کا انتہائی احترام سیکھا تھا ۔ جس کا مرتب اور جامع ذہن خود ان کے اذہان سے ہم آہنگ تھا ۔ وہ ارسطوئے الٰہیؔ کہلاتا تھا ۔ اور واحد فلسفی (حکیم) تسلیم کیا جاتا تھا ۔ عرب اس کے مفروضہ مقبرے (واقع پلرمو) پر اس قدر احترام سے حاضر ہوتے تھے ۔ گویا وہ کسی ولی کا مزار ہے ۔ انھوں نے ارسطو کی اصطلاحات ۔ اس کے مابعد الطبیعی تصورات ۔ اس کی ترتیبات و تقسیمات اور اس کے منطقی اسلوب کو اپنے عقائد دینی کی تشریح ۔ ان کی قطعیت اور صحت اور ان کی عقلی ترتیب و تنظیم میں استعمال کیا ۔ گویا اسے ایک "علم" بنا دیا ۔ دینیات کے نازک مباحث نے ایک عجیب و غریب بھول بھلیاں کی صورت اختیار کر لی جسے "علم الکلام" سے موسوم کیا گیا ۔ ذہنی فکر نے عقائد مذہبی اور عقلی فکر کو تطبیق دینے کا ایک غیر مختتم کام شروع کر دیا ۔ الفارابی نے ارسطو کی توضیح کی ۔ "وجود" کے اصول بتائے ۔ ذہن کے دوگونہ تصورات کے عقیدے اور مسئلہ "کلیات" کی تشریح کی ۔ ابن سینا نے فارابی کے کام کی اساس ہی پر ارسطو کی فطرت پرستی کو روحانیت کے رنگ میں رنگنے کی کوشش کی ۔ اور اس مقصد کے لئے اس میں متصوفانہ نوفلاطونیت کا آزادانہ امتزاج کیا ۔ جو یہودیوں اور اسکندریہ کے ماخذ سے اخذ کی گئی تھی ۔ دوسروں نے اسرار دین کو وحدت الوجود کا جامہ پہنایا عربوں کے آخری فلسفی ابن رشد نے تعقل کی وحدت کا اعلان کیا ۔ اور "تعدد حق" کا مہلک حل پیش کیا یعنی ممکن ہے ۔ کہ ایک بات دینیات

ہیں حق ہو۔ اور علمی اعتبار سے باطل ہو۔ یا جیسے کہ پروفیسر بری نے لکھا ہے۔ کہ ایک شئے باورچی خانے میں تو سچ ہو۔ لیکن ڈرائنگ روم میں "جھوٹ" ہو۔

یہی "نزاع لفظی" پورے کا پورا مسیحیت میں بھی دخل پا گیا۔ چلتے ہوتے کلمات۔ تنازعات۔ پیچیدہ مسائل۔ طور طریقے۔ اسالیب۔ تصورات کفریات۔ اعتذارات اور مصالح سب کے سب مساجد سے سوربون کی طرف منتقل ہو گئے۔ عربوں نے ارسطو اور اس کی تصانیف کو اپنا معبود علمی بنا کر عقل و فکر کے حقوق کا محافظ قرار دیا۔ حالانکہ اس سے قبل اُس کی کتابوں کے صرف بعض بے حقیقت اجزا کیسیوڈورس۔ کپیلا اور بوتھیوس میں ملتے تھے۔ پیرس میں ارسطو کی تصانیف اور اُن کی عربی شروح کا مطالعہ ممنوع تھا۔

بہرحال مذہبی تقلید پسندی کے حامیوں پر یہ بہت جلد واضح ہو گیا۔ کہ اُن کا ابتدائی اصول یعنی عقلی فکر کے طور طریقوں کا اطلاق عقائد دینی پر نہیں ہونا چاہئے۔ اس جنگ میں کوئی فائدہ نہ دے گا۔ چنانچہ اُنھوں نے اس اصول کو ترک کر کے اپنی حکمت عملی کو بالکل بدل دیا۔ اور مصمم ارادہ کر لیا۔ کہ اس فکری و ذہنی سرکشی کا مقابلہ اسی کے اسلحہ سے کیا جائے۔ اور ارسطو ہی سے حمایت دین کا کام لیا جائے۔ دینیات نے عقلی فکر کے آگے بے شمار دفعہ ہتھیار ڈالے۔ لیکن سب سے پہلی جوالگی یہ تھی۔ کہ اُنھوں نے ارسطو کو مطلع مستند قرار دے دیا۔ اور ڈومینیکن پادریوں نے اس "فلسفی" کو مذہب سے ہم آہنگ بنانے کا کام انہماک سے شروع کر دیا۔ اور حقیقت یہ ہے۔ کہ یہ کام تو اُن سے پہلے ہی کیا رکھا تھا۔ البرتوس میگنوس اور طامس ایکویناس دونوں ادبیات عربی کے عالم تھے۔ اوّل الذکر تو ماہر دینیات کے علاوہ ماہر کیمیا

کی حیثیت سے بھی مشہور تھا۔ اور آخرالذکر فریڈرک ثانی کی قائم کردہ نیپلز یونیورسٹی کے ابتدائی تلامذہ میں سے تھا۔ جب ان دونوں نے دینیات اور ارسطو کی تطبیق کا کام شروع کیا۔ تو انھیں صرف یہی کرنا پڑا۔ کہ "عقل و دین کے تطابق" میں جو دلائل و اسالیب ابن سینا اور اُن کے پیش روؤں الفارابی اور الکندی نے اختیار کئے تھے۔ انھیں بجنسہٖ اختیار کرلیں۔ مخالفین نے اُن کا مقابلہ ابن رُشد کی جسورانہ منطق سے کیا۔ جو "بے دین۔ مردود اور ملعون" مشہور تھا۔

ذہنی ترقی کی لڑائیاں جن جھنڈوں کے تلے لڑی گئیں۔ اُن میں عجیب و غریب تغیرات ہوتے رہے ہیں۔ وُہی مسلمان مُلحد یعنی ابن سینا تھا۔ جس نے کیتھلک کلیسیا کا فلسفہ بھی مہیا کیا۔ اور طبّی مدرسوں کے لئے نصابِ درسی بھی دیا۔ ایک ہاتھ سے ویٹیکن اور پاپائی کی پرورش کی۔ اور دوسرے ہاتھ سے گیلیلیو کی تربیت بھی کی۔ ہمیں یہ تصور کرنے کی عادت ہے۔ کہ ارسطو اور "مکاتبِ فلسفہ" کا اقتدار ایک ایسا دشمن تھا جس پر یورپی فکر کو فتح حاصل کرنی پڑی۔ جب سائینس اور فکرِ جدید نے آخرکار گیلیلیو اور ڈیکارٹ کی مدد سے اپنے شہپر کھولے۔ تو سب سے پہلی آزادی کی جھلک یہ نظر آئی۔ کہ ارسطو اور اُس کے اقتدار کو شکست فاش ہوگئی۔ لیکن ابتدائی مرحلے میں وہی اساتذہ تھے۔ اور وہی ارسطو تھا جس کو عربوں نے یورپ میں متعارف کرایا تھا۔ اور یہ سب ظلمت پسندی اور تصوّف نوازی کے مقابلے میں عقل و دلیل اور ذہنی آزادی کے علَم بردار تسلیم کئے گئے تھے۔ ارسطو ہی وہ سپر تھا۔ جس کی پناہ میں یونیورسٹیوں اور طبّی مدرسوں کے اندر فکر اور سائینس پروان چڑھ رہے تھے۔ اور پختگی حاصل کررہے تھے۔ جب نشاۃ الثانیہ کے انسان شناس اور پٹرارک اور ریمس ارسطو اور ابن رُشد کے خلاف ہنگامہ برپا

کر رہے تھے۔ تو ان حکما کے اذعان و استناد نے اُن کے غیظ و غضب کو برانگیختہ نہ کیا تھا۔ بلکہ وہ سائینس نے "بے دینی" اور "مادہ پرستی" کے خلاف احتجاج کر رہے تھے۔ اُن کا موقف بالکل وہی تھا۔ جو کوپرنیکس ڈاروِن اور اُس سائینس کے مخالفوں کا تھا جس کا اولین کبرا عربوں ہی کے اساتذہ کے خول میں ملفوف تھا۔

مُلّائیت (یا طریقہ متکلمین) یونانی سفسطہ کی طرح اُن ہزیمت خوردہ چیزوں میں سے ہے۔ جن کے نام اُن کے مخالفین کی فتمندی کی وجہ سے مستقل طور پر داغدار ہو چکے ہیں۔ پھر بھی وہ بحث مباحثے جو ہمیں مہمل اور ناقابل فہم معلوم ہوتے ہیں۔ یورپ کے ذہن کی پہلی جنبش سمجھنے چاہئیں۔ کیونکہ اس سے قبل تو موت کی سی خاموشی اور گھٹا ٹوپ تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ مدارس و مکاتب کی عجیب و غریب موشگافیاں اور بحث و نزاع کے ہنگامے گویا اُن اسلحہ کو فساں پر لگا رہے تھے۔ جن سے انسانی ذہن کو آزادی کی لڑائیاں لڑنے اور فتح پانے کے لئے مسلح کیا جانے والا تھا۔ جے ایس مل نے بالکل صحیح لکھا ہے۔ کہ "ہم جس صحتِ فکر اور جس وضاحتِ استدلال پر فخر کرتے ہیں۔ وہ صرف انہی اہلِ مدارس کی بخشش ہے" ہم کو اُن مسائل پر ہنسی آتی ہے جن پر یہ عالم اور مناظر طبع آزمائی کیا کرتے تھے۔ مثلاً "آیا جوہر الوہیت نے باپ کو پیدا کیا۔ یا باپ جوہر الوہیت کو وجود میں لانے کا موجب ہوا۔ اشخاص کی تعین جوہر سے ہوتی ہے یا عرض سے" (پیٹر لومبارڈو) آیا روح القدس سچ مچ فاختہ کی شکل میں نمودار ہوئی تھی۔ آیا آدم و حوا کے جسموں میں ناف تھی یا نہیں"[۱]۔ (ٹامس ایکویناس) لیکن اگر بعض مغالطے جو آج کل کے غیر تربیت یافتہ اور بے سلیقہ مفکرین کے نزدیک "دلائل" کی حیثیت

---

۱ بلا شبہ اس قسم کے تخیل کے موتی صرف نقلیت پسند اور سلف پرست علما کے ہاں ملتے ہیں

رکھتے ہیں۔ ارسطو کے قدیم پجاریوں کے سامنے پیش کئے جا سکیں۔ تو شاید اُلٹا ہماری ہنسی اڑائی جاتی۔ بلاشبہ رسمی منطق "عالمانہ لفاظی" ہے۔ اور عقلی طریقۂ فکر صرف قیاس منطقی ہی پر محدود نہیں لیکن ان چیزوں نے نہایت مفید اور کارآمد تربیت ضرور مہیا کی ہے۔ اور متکلمین ہی کے دشوار راستے پر سے گزرنے کے بعد یورپ کے ذہن کو یہ توفیق حاصل ہوتی ہے۔ کہ وہ صحت و درستی کو پرکھ سکتا ہے۔ الفاظ کے استعمال اور اُن کی تعریف میں احتیاط مدنظر رکھ سکتا ہے۔ بظاہر معقول مغالطوں سے محفوظ و مامون رہتا ہے۔ غیر متعلق اور فقروں کے جال میں پھنسنے سے انکار کر دیتا ہے۔ یہی اس کی طاقت و قوت ہے۔ اور یہی اس کی نشو و نما اور کامیابیوں کے اسباب ہیں۔

یہی وہ منطق کا بے جھجک اطلاق و استعمال تھا جس نے روسیلین اور ابیلارڈ کے زمانے میں عقائد اور روایات کے علمبرداروں کو دہشت زدہ کر دیا تھا۔ اُنھوں نے اس دودھاری تلوار کو حفظ و دفاع میں استعمال کرنے کی کوشش بھی کی لیکن اس کے باوجود یہی وہ چیز تھی جس نے بالآخر اُن کے ذہنی ظلم و تشدد کو نابود کر دیا۔ اسی نے راجر بیکن اور اوکام کے ولیم کو پیدا کیا۔ جنھوں نے ادعائی تجریدیت کے توہمات پر مہلک ضرب لگائی۔ اور صحتِ مشاہدہ۔ تحقیق۔ تجربہ اور ریاضیاتی تجزیہ کے اسالیب کی طرف رہنمائی کی۔ جن کو عربوں کی سائنس نے بصیرت اور علم کی بنیاد کے طور پر رائج کیا تھا۔ تیرھویں صدی کے آخر تک یہ کیفیت ہوگئی۔ کہ پیرس یونیورسٹی نے جن نتائج کو نشانۂ ملامت بنانے کی ضرورت محسوس کی۔ ان میں یہ بھی تھیں "علمائے دینیات کے خطبات محض افسانوں پر مبنی ہیں"۔ "دینیات نے حقیقی علم کو ناممکن بنا دیا ہے"۔ "مسیحی مذہب تعلیم کے راستے میں رکاوٹ ہے"۔

غرض وہ طلسم جس نے ازمنۂ مظلمہ کے دوران میں ذہن انسانی کو اسیر کر رکھا تھا۔ بالآخر ہمیشہ کے لئے ٹوٹ گیا!

ساتواں باب

بناوٹی نشاۃ الثانیہ

موجودہ عہد ہزار سالہ کی پہلی تین صدیوں میں یورپ کی ولادت نو واقع ہوئی۔ پندرھویں اور سولھویں صدی کی اطالوی اور اطالوی نما ثقافت کے متعلق "نشاۃ الثانیہ" کی جو اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ وہ غلط ہے۔ اور خود اس ثقافت ہی کی روایات نے ہمارے تصورات پر اس کا ٹھپہ لگا رکھا ہے۔ اُس عہد کی پوری زندگی کی زرق برق شوکت حقیقت میں اُن حد سے زیادہ کھلے ہوئے پھولوں کا پھیلاؤ تھی۔ جن کے غنچوں کو سابقہ صدیوں نے کھلایا اور زندہ کیا تھا۔ اُس کی قدر و قیمت اسی سابقہ تحریک کی بنا پر تھی۔ ادبیات قدیمہ کے مطالعہ کے مقابلے میں طباعت کی ایجاد بہت بڑی حد تک اس عمل کی تقویت اور سرعت کا باعث ہوئی۔

یورپ کی بیداری میں عربی ثقافت نے جو انتہائی حصہ لیا۔ اُس پر میں نے ذرا تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے۔ کیونکہ موجودہ زمانے کی غلط بیانیاں کچھ حد سے زیادہ بڑھ گئی تھیں۔ اور اُن کے ازالہ کے لئے تفصیل ضروری تھی۔ بہرحال اس میں میں نے مبالغہ نہیں کیا۔ لیکن اس ثقافت کی اصلی اور ذاتی قیمت و کیفیت کو بڑھا کر بیان کرنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔ بلاشبہ یہ ثقافت اپنی کیفیت کے اعتبار سے

بے انتہا مہتم بالشان تھی۔ اور یہ چیز اس کے عمل اور اثر ہی سے ثابت ہے۔ لیکن اس میں غیر محدود ترقی و ارتقا کا اصول مضمر نہ تھا۔ اگر وہ مذہبی جنون کا شکار نہ بھی ہوتی۔ جب بھی یہ امر مشتبہ ہے۔ کہ وہ طویل مُدت تک ترقی کے راستے پر گامزن رہ سکتی۔ یورپ نے اسلام سے جو کچھ حاصل کیا۔ اُسی سے فائدہ اُٹھا کر وہ اس پر سبقت لے گیا، جیسے یونان اپنی ثقافت کو مشرقی ثقافتوں سے اخذ کرنے کے باوجود اُن پر بے انتہا فوقیت حاصل کر گیا۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ یورپی ذہن میں کوئی خاص خوبی ضرور تھی۔ جو اسلام میں مفقود تھی۔ عربی علم جب یورپ میں داخل ہوا۔ تو اگرچہ بڑی اندازکا تھا۔ لیکن وہ یورپی اور مغربی بن گیا۔ اور اُس نے کوئی نئی خصوصیت حاصل کر لی۔ جس نے اس کو زندہ و پائندہ اور سیر حاصل بنا دیا۔ وہ "خاص چیز" یورپی ذہن کی وہ "خاص خوبی" کوئی نسلی راز نہیں۔ جو محسوس نہ کیا جاسکے۔ یا جس کا تعین نہ ہوسکے۔ بلکہ وہ ایک قطعی حقیقت ہے۔ اور وہ اس کے سوا اَور کچھ نہیں۔ کہ اس کا سلسلۂ نسب نسل یونان کے واضح اور مدلل انداز تک پہنچتا ہے۔ اور وہ اُسی کا وارث ہے۔ یورپی ذہن اس اعتبار سے مشرق اور اسلام سے مختلف ہے۔ کہ اس کی پُشت پر یونان اور روما ہیں۔ اُس کی ترکیب و کیفیت میں یہ حقیقت سب سے زیادہ روشن ہے۔ یونان کی روحیت۔ اس کی آزادہ روی۔ اُس کی کامل آزادی۔ اُس کا لاعلاج ذوقِ تجسس۔ اُس کا غیر مذہبی اور دُنیادار زاویۂ نگاہ۔ اُس کی تنقید اور انسانی عقل و ادراک کے تمام واقعات اور حقائق پر بے تکلّف اور آزادانہ تنقید۔ یہی وہ چیزیں ہیں۔ جن کی وجہ سے مغربی دُنیا کا وجود ممکن ہوگیا۔ اور یورپ نے اس لئے ترقی کی۔ کہ وہ اُس "قدامت" سے باہر نکل آیا۔ جو یونانی ذہن کی تہذیب تھی۔ اور تنزل و تباہی کے عمیق ترین اندھیرے میں بھی اُس دُنیا کے گرد و غبار میں اس کی اصلی اور

بُنیادی کیفیت کا کچھ نہ کچھ عنصر ضرور محفوظ رہ گیا تھا۔

لہٰذا نشاۃ الثانیہ کی انسانیت پروری اپنی شکل وصورت میں اُسی طرح حقیقت ثابتہ کی نمائندہ تھی۔ مَیں نے صرف "نمائندہ" کہا ہے۔ اس سے زیادہ نہیں۔ کیونکہ اُس نے اپنے عمل کا نہ آغاز کیا۔ نہ تعیّن کیا۔ نہ کسی ضروری حد تک اس کو قائم کیا۔ اطالوی انسانیت پروری کے ظہور اور یونانی تارکانِ وطن کے ورُود سے پہلے ہی رومن اور پھر یونانی ادب کا شوق وشغف پیدا ہو چکا تھا۔ وطن پروری کا جوش صرف قومی ادب پر نظریں ڈال رہا تھا۔ اور وہی یورپ کا سب سے بڑا اور نمایاں ادب تھا۔ وطن پروروں کا خیال تھا۔ کہ زمانے کے خوفناک "بانجھ پن" کی تلافی کے لئے صرف اُسی ادب کے احیاء وتجدید کی ضرورت ہے۔ جو اٹلی میں پیٹرارک سے بھی پہلے موجود تھا۔ تراویناکا ولگرڈوس بارھویں صدی کے آغاز میں لاطینی شعرا کی ویسی ہی مبالغہ آمیز پرستش کرتا تھا۔ جو نشاۃ الثانیہ کے انسانیت پرور "بُت پرستوں" کا شیوہ رہی۔ یہ مطالعات بھی دوسری تمام ذہنی سرگرمیوں کی طرح برابر وسیع ہوتے چلے گئے۔ لیکن جس کیفیت اور اثرونفوذ کا مَیں ابھی ذکر کر چکا ہوں۔ وہ دراصل مطالعۂ کتب کے اثبات سے بہت گہری اور پُر اسرار چیز ہے۔ وہ یورپ کی پیدائش اور اُس کی ترکیب۔ اُس کی زبان۔ اُس کی اشکالِ فکری۔ اُس کے حافظہ اور اس کی پوری ذہنیت میں مضمر ہے۔ قدیم ادبیات کا مطالعہ صرف قلیل اور جُزوی حصہ ہے۔ اس کی جڑیں ذہنی ساخت کے اندر بہت گہری پھیلی ہوئی ہیں۔ اور یہ ساخت ازمنۂ متوسطہ کے کلیسا۔ قانون اور زبان میں بھی یونان ہی سے داخل ہوئی تھی۔

نشاۃ الثانیہ کی انسانیت پروری نے اُس زمانے میں غیر مذہبی ادب کے مطالعہ کو نئی قوت بہم پہنچائی۔ اور اس طرح دُنیائے حاضر میں

غیر مذہبی فکر کا غلبہ پیدا کرنے میں امداد دی۔ جب یونان اور روما کی کتابیں دوبارہ شائع ہوئیں۔ تو انھوں نے قوت و حیات کا پیغام دیا۔ لیکن اس لئے نہیں۔ کہ اُن کے خاص مندرجات میں معلومات و افکار کا کوئی خاص ذخیرہ موجود تھا۔ یا وہ بسیط "دانش" کی سرمایہ دار تھیں۔ یا اُن میں کوئی فراموش شدہ اور حیات افروز خصوصیت تھی۔ بلکہ اُن کا کام صرف یہ تھا کہ انھوں نے اپنی غیر مذہبی نوعیت کی وجہ سے اُن زنجیروں اور بندھنوں کو توڑ دینے میں مدد دی۔ جنھوں نے ذہن انسانی کو پادریوں کے فکر کے ساتھ جکڑ رکھا تھا۔

لیکن نشاۃ الثانیہ کے فلسفۂ انسانیت کے فوائد و برکات کے متعلق جو کچھ بھی کہا جائے۔ اُن فوائد کے مقابلے میں وہ اثرات بے حد مضرت رساں اور مہلک تھے۔ جو اُس نے یورپ کے نشو و ارتقا پر ڈالے۔

ایک مؤرخ صحیح لکھتا ہے۔ کہ "یہ امر مشتبہ ہے۔ کہ ازمنۂ متوسطہ کے دوران میں ذہن انسانی کو جس راستے پر لگا دیا گیا تھا۔ اُس کو ترک کر دینے سے اسے فائدہ پہنچا ہے۔ یا اس کے لئے وہ انقلاب مفید ہوا ہے۔ جس کو "نشاۃ الثانیہ" کہتے ہیں"۔ بلاشبہ اس نے بارھویں اور تیرھویں صدی کی سابقہ نشو و نما میں اضافہ کیا۔ لیکن یہ اطالوی نشاۃ الثانیہ حقیقت میں فرسودگی۔ بوسیدگی اور انحطاط کی مظہر تھی۔ اور اپنے بنیادی اور اصلی پہلوؤں میں تنزل اور پستی کا باعث تھی۔ جیسے بعض فرمانروا غاصب اپنے اقتدار کے زمانے میں خوشامد اور "بد اخلاقی" کے قصیدہ خوانوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ اُن پنچایتوں اور جمہوریتوں کے اصولِ زندگی کے خلاف جن کا انھوں نے گلا گھونٹ دیا تھا۔ اس نشاۃ الثانیہ نے اُن قوتوں سے جو زیادہ صحت ور اور تخلیقی زمانے میں ارتقا پذیر ہوئی تھیں فائدہ تو اٹھایا۔ لیکن اُن کو ضائع کر دیا۔ اُن کا غلط استعمال کیا۔ اور خود تحقیم

کی تقسیم ہی رہی۔

یونان اور روما کے ادبیات و افکار عالمِ انسانیت کے عظیم و جلیل اور مہتم بالشان کارناموں میں سے ہیں لیکن نشاۃ الثانیہ کے فلسفۂ انسانیت اور اُس کے دُور رس اثرات نے اس حقیقت کا ایک نمایاں ثبوت مہیا کر دیا ہے۔ کہ کوئی چیز خواہ کتنی ہی عمدہ ہو۔ لیکن جونہی اس کو "صنم" بنا لیا جائے۔ اور مقدس اور اعتقادی سند قرار دے دیا جائے۔ اُس کا اثر اُسی وقت سے مضر اور تباہ کن ہو جاتا ہے۔ اور حیات افروز اور ہیجان انگیز ہونے کے بجائے سخت مہلک اور بے دست و پا کر دینے والا ہو جاتا ہے۔ انسانیت پرستوں نے "قدما" کو اور جس چیز کو وہ قدما کا ذوق تصور کرتے تھے۔ بالکل بتوں کی طرح پوجنا شروع کر دیا۔ فلاطون کے مجسمے کے سامنے چراغ جلائے جاتے تھے۔ الفانسو شاہ نیپلز نے پیڈوا کے بیکر یلی کو بھیجا۔ تاکہ لیوی کے بازو کی ایک ہڈی مانگ لائے۔ "اشیائے عتیق" کا عقیدہ ایک ہذیان آموز اور فالج زدہ کرنے والا وہم بن گیا۔ ذہنی کاسہ لیسی کا ایک ایسا رجحان پیدا ہوا۔ جو ارسطو کے لفظ پرست طلبہ کی محتاجی سے بھی زیادہ پست و فرومایہ تھا۔ اس رجحان کی وجہ سے نئے "کلاسیکی" ادب کو اولیا کے ارشادات کا مرتبہ دے دیا گیا۔ فلاطون، یا یوں کہنا چاہئے کہ نو فلاطونیت کے متصوفانہ لغو یہ نے ارسطو کے اِستناد کی جڑ کاٹ دی۔ ذہنِ انسانی غلامانہ احترام کی وجہ سے اس قدر کند ہو گیا۔ کہ وہ اپنے معبود و مستند اُستادوں کے باہمی تضاد و تباین کا اندازہ کرنے کے قابل بھی نہ رہا۔ اطالوی انسانیت پرستوں کے نزدیک ذہنی و فکری خیالات نظریات، تصورات اور معلومات کی کوئی اہمیت ہی نہ رہی۔ وہ ان چیزوں کی کوئی پروا نہ کرتے تھے۔ اُن کے نزدیک جو چیزیں حقیقی اہمیت رکھتی تھیں۔ اور ذہنی شغف اور ثقافت کا مقصدِ وحید سمجھی جاتی تھیں۔

وہ الفاظ تھے۔ علم نحو تھا۔ اندازِ تحریر تھا۔ کلاسیکی بزرگوں کی محض اس لئے پرستش نہ کی جاتی تھی۔ اور صرف اس لئے اُن کو درجۂ استناد نہ دیا جاتا تھا۔ کہ وہ مفکر اور خالق افکار تھے۔ اور غور و تامل کے عادی تھے۔ بلکہ وہ محض اس بنا پر پوجے جاتے تھے۔ کہ وہ الفاظ و اُدوار کے نقاد تھے۔ یونانی لوگ خیالات سے شغف رکھتے تھے۔ عربوں اور مستعربوں کو صرف حقائق سے سروکار تھا لیکن نشاۃ الثانیہ کے نقاط ولسان محض الفاظ سے تعلق رکھتے تھے۔

جن لوگوں نے (پیٹرارک کی طرح) نیم تاریکی کے زمانے میں روما کے ادبیات کی طرف رجوع کیا۔ ان کا نہایت معقول نصب العین یہ تھا۔ کہ اُس ثقافت میں نئی روح پھونکیں۔ جو ماضی میں موجود تھی۔ اور حال میں نہیں ہے۔ اور نئی ثقافت کا جنین ابھی کمزور لیکن صحتمند زندگی کے حصول کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ وہ خواہشمند تو اس کے تھے۔ کہ روما کی عظمتوں کو واپس لائیں۔ لیکن جو کچھ وہ واپس لا سکے۔ وہ روما کے پیر فرتوت کا زمانہ فالج تھا جس چیز کو "علم کا احیا" کہا جاتا تھا۔ وہ حقیقت میں خالی خولی "لفاظی کا احیا" تھا۔ انسانیت پرستوں نے جو "ثقافت" قائم کی تھی۔ وہ اُن کے اُستادوں یعنی بازنطینیوں کی مانند ہی تھی۔ جن کے گرد وہ یونانی سیکھنے کے لئے جمع ہوتے تھے۔ اس ثقافت میں ترقی اور زندگی کے عناصر بس اتنے ہی تھے۔ جتنے اس ثقافت میں موجود تھے۔ جو دس صدیوں سے باسفورس کے کنارے حنوط کے پارچوں میں پڑی سڑ رہی تھی۔ یورپ کے عقل و فکر کی نئی نئی زندگی دنیائے حاضر میں مصروف حرکت تھی لیکن یہ ثقافت اس کا گلا گھونٹ رہی تھی۔

روما اور سلطنت بازنطین کے آخری مرحلوں کے سوا یہ منظر کبھی

نظر نہیں آیا۔ کہ ذہنِ انسانی کے محتویات کو کامل طور پر نابود کر کے اُن کی جگہ مستعار الفاظ و خیالات کا خالی خولی ڈھانچہ کھڑا کر دیا گیا ہو۔ پندرھویں اور سولھویں صدی میں اطالوی علم و فضل کے ان "پنڈتوں" کے درمیان عقلی فکر یا ناقدانہ و آزادروییے کے رجحان کا کہیں سُراغ نہیں ملتا۔ ان دو صدیوں کے دوران میں اٹلی کے اندر جو سنجیدہ ذہنی و فکری سرگرمی ٹیلیسیو۔ جیورڈانو برونو۔ کیپانیلا۔ پومپونازی جیسے لوگوں کی وجہ سے موجود تھی۔ وہ انسانیت پرستی کی تحریک سے بالکل الگ تھی۔ اس کا اس تحریک سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اور نہ اُس پر اس کا کوئی اثر تھا۔ اطالوی انسانیت پرستوں میں "لوڈو ویکو ویلا" واحد شخص ہے (جس کو سرد مہر اور علیحدگی پسند سمجھا جاتا تھا) جو لاطینی اور یونانی علم و فضل کو بلند تر مقاصد کا ذریعہ سمجھتا تھا۔ اس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ اُس نے تاریخی تنقید کا آغاز کیا۔ مثلاً اُس نے جعل و فریب کی بعض چیزوں کو انکشاف کیا (یعنی پوپ کے مجموعہ فتادے نے جعلی ڈاینیسیئس۔ قسطنطین کا عطیہ۔ رسولوں کا عقیدہ) جو کیتھلک کلیسیا کی اسنادِ تصدیق کا رتبہ رکھتی تھیں۔ اور سب سے بڑا ذہین و طباع انسان لیونارڈو داونچی کامل سکوت و تنہائی کے عالم میں کہہ رہا تھا۔ کہ "میں تو انسانیت پرست نہیں ہوں"۔

لیکن اُس زمانے کے بڑے بڑے مفکرین مثلاً پولیشیا یا فیسینو پوگیو یا شیو لینی۔ فیلیلفو میں بھی بلا ارادہ پیدا ہونے والا کوئی شرارۂ فکر نظر نہیں آتا۔ اس عجیب "احیائے علم" کے مصنفین اپنے لاطینی اسلوب اور یونانی مسدّسی بحروں پر فخر کرتے تھے۔ اور اس "انکشاف" کے دعویدار تھے۔ کہ جس چیز کو اُنھوں نے "علم و فضل" سے موسوم کر دیا ہے۔ وُہی ذہن انسانی کی انتہائی منزل مقصود ہے۔ اس ذہنی و فکری نامردی اور بانجھ پن اور خالص حماقت کی کوئی مثال نہیں۔ یہ لوگ نہایت خشک

طبع لفاظ۔ صرفی نحوی۔ مترجم اور نقال تھے۔ جن کی قوتِ فکر بالکل شل ہو چکی تھی۔ اُن کا بلند ترین تعصب العین نقالی اور محض نقالی تک محدود تھا۔ اُن کے نظام ذہنی میں صداقتِ فکر اور عدلِ احساس کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ اور وہ واحد استعداد جس کے لئے کوشش کرنا اور جس کی قدر کرنا اُن کے تصور میں آسکتا تھا۔ یہ تھی۔ کہ سسرو کے ادوار اور افلاطونی جذبات کی نقل کی جا سکے۔ فلارنس اوی اکادمی کے رہنما مارسیلیو رفیسینو کی تصانیف متصوفانہ مہملات کا ایسا نفرت انگیز ملغوبہ ہے۔ کہ اُن کے مقابلے میں مادام بلاوڈسکی کی کتابوں میں ذہانت جلوہ گر نظر آتی ہے۔" اپنے زمانے کا یہ سب سے بڑا فلسفی" جیب باہر نکلتا تھا۔ تو تعویذوں اور گنڈوں سے لدا ہوا ہوتا تھا۔ تاکہ نظر بد سے محفوظ رہے۔ اور حاضرہ ناظر بد روحیں اور بھوت پریت کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں۔ اور بالکل یہی ذہنی سطح اس کے معاصرین کی تھی۔ پوگیو اور فلیلفو کے درمیان جو مباحثے بھاری بھرکم کلاسیکی نفاستوں اور نہایت فحش دریدہ دہنی اور ذاتی دشنام طرازی کے ساتھ ہوتے تھے۔ وہ نہایت بے حقیقت ملا یانہ بحثوں کے مقابلے میں زیادہ مضحک اور بے ڈھنگے تھے۔" عالمِ دین" پولیزیانو ایکسا ہی زنند میں اس دل فریب ادبی اسلوب کی بلندیوں پر پہنچ گیا۔ جو نشاۃ الثانیہ آنے والے ادوار کے لئے ایک لعنت بنا کر چھوڑ دی گئی۔ اس شخص کو فلارنس کا ذکر کرنا ہو۔ تو اس کو" شِلا کا شہر" لکھتا ہے۔ اگر کسی شخص کے متعلق یہ کہنا ہو۔ کہ وہ بیمار ہے۔ تو لکھتا ہے۔ کہ" تپ کی دیوی" اس کے بستر کے پاس بیٹھی ہے۔ پیکو ڈیلا میرنڈولا نے علم نجوم کے خلاف ایک رسالہ لکھا خیال کیا جا سکتا ہے۔ کہ یہ کام اس نے عقلیت کے تقاضے سے کیا ہوگا لیکن اس عقل و شعور کے حامی کا شغف حقیقت میں" اسرارِ باطن" سے تھا۔ اور ابیمس۔ ٹرِ ذخلیین۔ کوتلے اور ہوریے۔ اس کا جا شہ تھا۔ وہ بالکل

اُس مریضانہ سحر و افسوں کا سا تھا۔ جو تصوف کا لازمی نتیجہ ہے۔

اطالوی نشاۃ الثانیہ کے اواخر میں جو مذہبی تشکک پیدا ہوُا۔ وہ کسی تنقیدی و فکری علم کا نتیجہ نہ تھا۔ بلکہ ذہنی سنجیدگی کے کامل فقدان کا اثر تھا مذہب کی تحقیر خود پادریوں ہی سے شروع ہوئی۔ چونکہ اُن کے دعاوی مُسلّم اور اُن کی قوتیں بالکل محفوظ تھیں۔ اس لئے وہ اپنے کاروبار کو علانیہ ایک خالص اور صریح استحصال سمجھتے تھے۔ جب تک کلیسیا کے اختیارات اور اس کے مالی مداخل کو کوئی خطرہ نہ تھا۔ وہ لوگوں کی چہ میگوئیوں کو پرِکاہ کی حیثیت بھی دینے کو تیار نہ تھے۔ اعلیٰ درجے کے اطالوی پادریوں میں عقائد کا جوش اور مذہبی تعدی کا شوق نہ تھا۔ اگر کوئی شخص دہریت کا اظہار کرتا۔ تو وہ محض مُسکرا دیتے، تاوقتیکہ وہ کلیسیا کے مواجب ادا کرتا رہتا۔ اور اپنے عقائد کفریہ کی سرگرمی سے تبلیغ نہ کرتا۔ نکولس پنجم نے وِیلا کو اپنے دربار میں ایک عہدے پر متقرر کر دیا۔ لیو دہم نے پامپونازی کو دعوت دی۔ کہ اس کے سامنے حاضر ہو کر رُوح کے فانی ہونے پر تقریر کرے۔ اور لیو اور اُس کے مشیروں نے دنیاوی مسائل سے بے پروا ہونے ہی کی وجہ سے کو تفکر کو موقع دے دیا۔ کہ وہ روز بروز مقبول تر ہوتا چلا جاتے زندقہ والحاد کے خلاف جبر و تشدد صرف اس وقت استعمال کیا گیا۔ جب سیاسی قوت خطرے میں پڑتی نظر آئی۔ اور نشاۃ الثانیہ کے مہذب متشککین اگرچہ عقائد کی ہنسی اُڑاتے اور ساہبوں کو نشانۂ استہزا بناتے تھے لیکن ایک معاشری اور سیاسی ادارے کی حیثیت سے کلیسیا کے پورے پورے وفادار تھے۔ میکیاولی جیسے لوگ جو مذہبی عقائد سے تشکک اور استہزا کا برتاؤ کرتے تھے۔ اُن کے اس رویے کی یہ وجہ ہرگز نہ تھی۔ کہ اُن کے ذہنی شعور کو کوئی صدمہ پہنچتا تھا۔ وہ اس قسم کے احساس سے کاملاً عاری تھے۔ عقیدے اور صداقت کے درمیان تعلق و رابطہ سے وہ بالکل بے پروا اور بے نیاز

تھے۔ تلاشِ صداقت۔ یہاں تک کہ مجرد صداقت سے بے کیف سا شغف بھی حقیقی ذہنی فعالیت کی علامت ہے۔ لیکن یہ چیزیں نشاۃ الثانیہ سے اطالوی اذہان میں کاملاً مفقود ہیں۔ اطالوی ذہن نہ ادراک پہ ایمان رکھتا تھا نہ القا و الہام پہ۔ اور علی العموم مذہب کو محض ایک مصلحت لیکن بحیثیت مجموعی مفید اور ضروری ادارہ سمجھتا تھا۔ بلکہ زیادہ سے زیادہ ایک "ضروری تبرائی" خیال کرتا تھا۔ یہ تصور اُن کے ذہن میں کبھی نہ آیا تھا۔ کہ صداقت اور "عملی پسندیدگی" اور "مصلحت" کے درمیان بھی کوئی تعلق ہو سکتا ہے۔ اُن کو یقین تھا۔ کہ جھوٹ کا بھی کوئی اچھا نتیجہ نکل سکتا ہے۔ اطالوی ذہن کو عملی حیثیت سے حق و باطل کے درمیان امتیاز کرنے کا کوئی ذوق نہیں تھا۔ بلکہ صرف مختلف قسم کے اباطیل کی مصلحت اور پسندیدگی کے درمیان تمیز کرنے سے سروکار تھا۔

گویا اطالوی نشاۃ الثانیہ کی جعلی تشکک پسندی کبھی کوئی وضع یا یکساں روی اختیار نہ کر سکی۔ یہ ایک عام شیوہ تھا۔ کہ تشکک پسندی کے ماتحت تضحیک و استہزا سے بھی کام لیا جاتا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اس بنیادی عقیدے پر عملی ایمان بھی رکھا جاتا جس پہ کلیسیا کی طاقت و قوت مبنی تھی (یعنی خوفِ جہنم)۔ لورینزو دا میدیچی تضحیک میں کسی سے بھی پیچھے نہ تھا۔ لیکن اپنے بسترِ مرگ پہ ترساں و لرزاں ہو کر ساوونرولا کے ہاتھ پر توبہ استغفار کر رہا تھا۔ کیونکہ "یہی ایک پادری تھا۔ جو لورینزو کے نزدیک ریاکار نہ تھا"۔ یہاں تک کہ عام اور جاہلانہ اوہام بھی اس سطحی تشکک کے ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ خود میکاولی بھی بھوتوں کو مانتا تھا۔ اس بے کار اور غیر عقلی تشکک پسندی کی جہالت کی حد و انتہا نہ تھی۔ آریٹینو نے دینداری اور پرہیزگاری پہ کتابیں لکھیں۔ کفر و الحاد کو بھی قتل اور غداری کی طرح اخلاقی

بیباکی ہی کا نتیجہ سمجھا جاتا تھا۔ اور دونوں قسم کے گناہوں پر یکساں توبہ استغفار کی جاتی تھی۔ سنکو اسینٹو کے مصنفین مذہبی ہجو و طنز کرنے کرتے دُعائیں مانگنے لگتے ہیں۔ گویا یہ ایک بالکل طبعی گریز ہے۔ پولچی جس کی نظم میں "کریڈو" کی غذائی پیروڈیاں مریم عذرا کی مدح ثنا کے ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ اپنے لہجے کے اعتبار سے والٹیر کا دور کا مورث نظر آتا ہوگا لیکن یہ مشابہت بالکل سطحی ہے۔ تضحیک و استہزا کرنے والا والٹیر اپنے اس رویے میں بے انتہا مخلص اور سنجیدہ تھا۔ اور اطالوی نشاۃ الثانیہ کے متشککین کبھی سنجیدہ نہ تھے۔

اٹلی کی طرح فرانس۔ جرمنی اور انگلستان میں بھی یہی ناگوار حماقت جاری رہی۔ لاطینی کے اشعار اور سیفو کی غزلیں۔ اور عامیانہ و فرسودہ انداز کے خطوط و مکاتیب کا مبادلہ آپس میں کیا جاتا۔ گویا ایک "انجمن تحسین باہمی" قائم تھی۔ جس کے ارکان میں لاطینی کے غلط سلط اشعار لکھنے والا "ابھی زمانے کا ہوریس" سمجھا جاتا تھا۔ اور ہر ادبی مخلص کا مؤلف "سالسٹ کی نفاست تحریر اور لیوی کی برجستگی کا جامع" خیال کیا جاتا تھا۔ یہ لوگ ایک دوسرے کی کتابوں کے لئے لاطینی نظم و نثر میں تہنیت۔ دیباچے اور تقریظیں لکھا کرتے تھے۔ "جمہوریۂ اُدبا" کی تشریح کے لئے طول طویل مباحثے بھی دوسری ادبی مصروفیتوں میں شامل کر لئے جاتے۔ اور ان مباحثوں میں کلاسیکی دُشنام طرازی کی لطف انگیزیاں بھی شامل ہوتیں۔

لیکن شمالی ممالک میں فلسفۂ انسانیت نے اٹلی کے مقابلے میں زیادہ سنجیدہ صورت اختیار کی۔ جس کا تعلق علی العموم دینیات سے تھا۔ اس کا رابطہ زیادہ تر "تحریک اصلاح" کے ساتھ قائم ہوگیا۔ جس کا آغاز لوتھر نے کیا تھا۔ اور جو روما اور عقل دونوں کو ایک ہی قسم کے

لطیف الفاظ میں ملامت کی نشانہ بناتا تھا۔ یورپ میں پہلے پہل مطبع کی ایجاد کی وجہ سے کتابوں کی بھرمار ہو رہی تھی "۔ احیائے علوم" اور" اصلاح مذہب کے باوجود فکر شائع اور برانگیختہ ہو رہا تھا۔ اور دُنیائے قدیم کے نقطۂ نگاہ کو پیچھے چھوڑتا جا رہا تھا۔

لیکن جس سرزمین پر اس کا خالص قبضہ ہو رہا تھا۔ وہاں انسانیت پرستی کی تحریک کے تلخ ذہنی موت اور بدعنوانی کی صورت میں مترتب ہو رہے تھے۔ مصنوعی نقالی کی بلا اذہانِ انسانی پر مسلط تھی۔ اور اطالوی ذہن" نشاۃ الثانیہ" کی کھوکھلی اور باطل رجعیت سے پوری طرح مخلصی حاصل کر ہی نہ سکا" یہی چیز تھی جس نے اطالوی جودتِ طبع کو بیکار کر دیا چنانچہ گزشتہ کئی سال سے اٹلی میں خوشامد اور مبالغہ آرائی کے سوا کوئی چیز معرضِ تحریر میں نہ آسکی "۔

اطالوی نشاۃ الثانیہ کے متعلق بیہودہ سرائی کا طوفان پہلے بھی برپا رہا۔ اور آج تک بدستور چلا جاتا ہے۔ جو سرزمین ثقافت کے پرانے سرچشموں کے متصل واقع ہوئی تھی۔ اس کے سحر و افسوں میں کوئی کلام نہیں۔ فنکارانہ پیداوار کی وہ ملحدانہ فراوانی اور درخشاں شگوفہ کاری جو آب تک ہمیں نہایت محبوب ہے۔ انسانیت پرستی کا نتیجہ نہ تھی۔ بلکہ اُس زمانے کی پیداوار تھی۔ جب اطالوی ذہن میں مُوروں اور پیاونسیوں کی ثقافت نے تحریک پیدا کی تھی۔ اور جب اطالویوں میں پوپ شہنشاہ اور جاگیردار اُمرا کے خلاف جدوجہد آزادی نے حیاتِ تازہ کی لہریں دوڑا دی تھیں۔ یہی وہ زمانہ تھا۔ جب دانتے اور گیوتو پیدا ہوئے۔ اور اطالوی فن و ادب زندہ ہوگیا۔ آزادی کو پامال کرنے والے حکمرانوں کی حرص و ہوا نے اُن کے وسائل کو قوت اور انحراف کے سیاسی ذریعے کی حیثیت سے دانستہ استعمال کیا۔ اور اُن کے نشوونما کی رفتار جو آزادی اور

قوت و توانائی سے شروع ہوئی تھی۔ اگرچہ کچھ وقت تک ابتدائی حرکت کے زور ہی سے آگے بڑھتی رہی لیکن جب وہ درباری سرپرستی کے غلام بن گئے۔ تو نہایت سرعت سے زوال پذیر ہو گئی۔ اٹلی کوئی دوسرا دانتے پیدا نہ کر سکا۔ اس کے ساتھ کسی دوسرے اطالوی شاعر کا نام بھی نہیں لیا جا سکتا۔ بلکہ "ڈیوائن کامیڈی" کے بجائے نشاۃ الثانیہ نے سانازارو کی آرکیڈیا پیدا کی۔ صرف یہی نہیں۔ کہ اطالوی نشاۃ ثانیہ نے کوئی دوسرا دانتے پیدا نہ کیا۔ بلکہ یہ تحریک اس شاعر اعظم کی عظمت کا اندازہ کرنے میں بھی قطعی طور پر قاصر رہی۔ اُس نے دانتے کو بالائے طاق رکھ دیا۔ اُس کی توہین کی۔ اور اُس زمانے کے ایک انسانیت پرست کے قول کے مطابق "اُس کو اہل علم کی مجالس سے خارج کر کے پشم بافوں اور نانبائیوں کے حوالے کر دیا" لاطینی کو دوبارہ ادبی زبان کا رتبہ دے دیا گیا۔ اور اطالوی ادبیات کی نشو و نما مسدود ہو گئی۔ انسانیت پرستی کے باپ پیٹرارک کا نصب العین بھی یہی تھا۔ جو زیادہ تر اپنی لاطینی رزمیہ نظم "افریقہ" پر فخر کیا کرتا تھا۔ اور بوکاشیو اگرچہ اپنے تمام جانشینوں سے بے حد فائق و برتر تھا۔ لیکن اُس نے بھی بسرو کی "لطافت" پر فریفتہ ہو کر اپنی اطالوی تصنیفات میں اُسی زہریلی نقالی کو اختیار کر لیا۔ جو فطری اختراعی قوت کے لئے مہلک ہوا کرتی ہے۔ اُس نے بطریق اعتذار یہ لکھا۔ کہ "میں نے بعض چیزیں اس لئے مبتذل زبان میں لکھی ہیں۔ کہ عوام کے کانوں تک پہنچ سکیں"۔ اُس وقت کے بعد جب تک انسانیت پرستی کے غلبے کا دور دورہ رہا۔ اطالوی ادبیات پُر تکلف اور مرصع صنائع بدائع اور تزئین لفظی کا شکار رہیں۔ حتےٰ کہ سترھویں صدی تک خالی خولی لفاظی۔ عبارت آرائی اور مبالغہ و اغراق میں اطالوی ادب ضرب المثل بن کر رہ گیا۔ اس میں شک

نہیں۔ کہ اس کے انتہائی انحطاط سے پہلے ٹاسو اور آیری اوسٹو پیدا ہوگئے۔ جن کے گیتوں کی وہ شوکت و لطافت بے حد دل فریب ہے۔ جن میں ان کا حسنِ تخیل ملفوف معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ان کی کتابوں کے صفحے کے صفحے دیکھ جاؤ۔ کوئی کردار یا کوئی فکر کہیں نام کو بھی نہ ملیگا۔ اور جس طریقے سے اُن کی قابلیتوں کی قدر دانی ثقافت کے سرپرست حکمرانوں نے کی۔ اس کا علم سب کو ہے۔ ٹاسو قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ اور ایری اوسٹو کے درخشاں تملق کے متعلق کارڈینل ڈیسٹے نے یہ کہا۔ کہ

اطالوی مصوری تکنیک کے اعتبار سے لیپیس اور مساشیو کے ہاتھوں سرعت سے ترقی کر گئی۔ اور رافیل کے زمانے میں خاصی بلندی پر پہنچ گئی۔ لیکن اس پر بھی حد سے زیادہ اور مصنوعی تزئین و آسائش کا اثر بدمستا نظا تھا۔ چنانچہ رافیل کے ساتھ ہی یہ بھی سریع تنزل اور کھوکھلی رسم پرستی کا شکار ہو گئی۔ جو لوگ اس زمانے کے ذوق سے کم سے کم متاثر ہوئے۔ صرف انہی میں قبل کے زمانے کی خودداری۔ خود مختاری اور خلوص کے آثار نظر آتے ہیں۔ مثلاً لیونارڈو۔ مائیکل اینجلو اور ایل ڈینس جن کے ذہن درباری "نفاست و لطافت" اور رائج الوقت کلاسیکیت کی رَو سے آزاد اور محفوظ تھے۔ صرف ان میں حقیقی اور تخلیقی قوت کا اظہار ہوتا تھا۔ اور ان میں جو نقائص تھے۔ وہ اس زمانے کے عام ذوق کے مضر اثرات کے ساتھ متناسب تھے۔ جن سے لیونارڈو یا مائیکل اینجلو جیسے لوگ بھی پوری طرح بچ نہ سکے تھے۔

یہ "ذوقِ فن" اور "تحسینِ قدامت" کا بیش قیمت احیا ہی تھا جس نے اس کے سرپرستوں۔ حامیوں اور پاپائی شہزادوں کو تحریک کی کہ سینٹ پیٹرز

کے واجب الاحترام اور تاریخی کلیسیائے باسیلق (ea enlnl ma B) کو گرا دیں۔ اور مائیکل اینجلو اور رافیل کو "رومن فورم" کے مقدس آثار کے تجسس پر لگا دیں۔ تاکہ انھیں ویٹیکن کی پہاڑی کی روز افزوں بدصورتی کے انبار پر نصب کیا جا سکے۔

کلاسیکی انسانیت پرستی کی ثقافت نے اس انتقال پذیر تحریک کے ختم ہوتے ہی پھر اپنے عناصر سے رشتہ استوار کر لیا۔ اور ادب و فن کی انتہائی ذلت و پستی کا مظہر بن گئی جس کی مثال دُنیا میں نایاب تھی یعنی اُس نے انوکھی سی کلاسیکیت اور پُر تکلف ذوق اختیار کر لیا جس آگ کے شعلوں نے یورپ کی نئی زندگی کو روشن کیا۔ اُس میں اگر کوئی شرارہ انسانیت پرستی کا بھی تھا۔ تو یاد رکھنا چاہئے۔ کہ تین صدیوں تک جن پست۔ مبتذل اور باطل نصب العینوں اور ذوقوں نے یورپ کی ترقی کو مظلوم بنا کر اس کی نشو و نما کو روکے رکھا۔ اُن کا سراغ بھی نشاۃ ثانیہ کی انسانیت پرستی ہی میں ملیگا۔ وہ ہلاک اور جعلی کلاسیکی "لطافت" جو سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں یورپ کے لئے ایک آفت بنی رہی۔ وہ بلائے عظیم جس نے فرانس کے ادبیات کو اُس کے نشو و نما اور اثر و نفوذ کے نازک زمانے میں مسموم کیا جس کے ماتحت اس کے قابل اشخاص دو صدیوں تک "کیوپڈ کے تیروں" "حُسن و دلربائی کی تین یونانی دیویوں (Graces)" "فنون لطیفہ کی نو بہنوں" (muses) اور "کلوٹی" کے متعلق ہمل گوئی کرتے رہے۔ وہ بدعنوانی جس نے ویلون اور رابیلے کی زبان کو Vauren ae Hotel Rambouillet اور ques اور ایلزبتھ کے زمانے کی انگریزی کو ایڈیسن اور پوپ کی سطح تک گرا دیا۔ ادبی معیاروں کی وہ پستی جس نے Racine کی تعریف کی۔ اور شیکسپیئر کو حقارت کا نشانہ بنایا۔ وہ بدذوقی اور کورچی جس نے یورپ کو Wren کے "فنِ تعمیر" مصنوعی کھنڈروں" اور

"کلاسیکی ستونوں" سے بھر دیا جن پر سنجاف دار ملبوسات پہنے ہوئے رومن پھیلی ہوئی انگلیوں سے رافیلی اشکال اختیار کرتے ہوئے اور دیویاں بادلوں کے اوپر لیٹی ہوئی نظر آتی تھیں۔ اور دنیائے جدید میں فنی اعتبار سے جتنی فرومایہ اور بدصورت چیزیں نظر آتی ہیں۔ وہ اسی کا نتیجہ ہیں۔ شائستہ تعلیم کے تصورات کی ناقابل بیان بیہودگی جو اب تک ہماری ثقافت اور زندگی کے نہایت اہم وظائف کے لئے بوجھ بنی ہوئی ہے یہ تمام آفتیں اور بلائیں اطالوی انسانیت پرستی کا ورثہ ہیں۔ اگر اور کسی چیز کا نہیں۔ تو کم از کم اس بات کا سہرا رسکن کے سر ہے۔ کہ اس نے اس نشاۃ الثانیہ کی نفرت انگیز بے وقعتی کو بے نقاب کیا۔ جس کے ظالمانہ اثرات نے ہمارے آباؤ اجداد کو اس قدر اندھا کر دیا۔ کہ گوئٹے جیسا شخص بھی پالا ڈیو کی شکستہ لغویات پر تو جھومتا نظر آتا ہے۔ اور اطالوی گاتھک کی حقیقی خوبصورتیوں کی طرف سے غافل گزر جاتا ہے۔ گویا جھوٹے گوٹے ٹھپے پر تو مرمٹتا ہے۔ لیکن خالص سونے کو پھینک دیتا ہے۔ یہ گھٹیا پن صرف اس لئے ہے۔ کہ فن کے اندر وہ نقالانہ تصنع اور غیر حقیقی پن منعکس ہوتا تھا۔ جس میں انسانیت پرست نقاط اور لسان مصروف تھے۔ اور جس نے عقلی اور تنقیدی فکر کے ہر جذبے کو قطعی طور پر معدوم کر دیا تھا۔

آٹھواں باب

یورپ کے عناصر

یورپ کی گوناگوں اور مختلف العناصر دنیا میں حکمران طاقت نے جو بھی شکل اختیار کی ہے۔ وہ ہمیشہ پوری قوت میں ظاہر ہوتی ہے۔ مذہبی اقتدار بھی مشرق کے مقابلے میں زیادہ قوی اور منظم رہا۔ اور نہایت غیر مفاہمانہ انداز سے اپنے اس دعوے پر ڈٹا رہا۔ کہ اُسے انسانوں کے معاملات۔ اُن کی زندگیوں اور اُن کے افکار پر پورا اقتدار ہے۔ یہ اقتدار پہلے پہل سب پر فوقیت رکھتا تھا۔ اور اس قطعی برتری کے حصول کا طالب تھا۔ جس کو ہلڈبرانڈ کا کلیسیا اور بینی ڈکٹ ہشتم اپنے خدائی اقتدار کا منطقی حق سمجھتے تھے۔ اس کے پہلو بہ پہلو پادشاہوں کا اقتدار بھی تھا۔ بربری قبائل کے پاس ابتدا میں کوئی پادشاہ نہ تھے۔ یہ لقب اُن جنگی سرداروں نے اختیار کیا۔ جنھوں نے روما کے خلاف جنگ و پیکار میں اُن کی قیادت کی۔ اور اس کے کھنڈروں اپنی پادشاہت کی بنیادیں استوار کیں۔ بعینہٖ جس طرح اس کے شہنشاہ کیا کرتے تھے۔ کلیسیا نے مغرب کے رومی شہنشاہوں کے حقیقی جانشینوں کو قائم کرنے کی کوشش کی۔ تاکہ وہ اُسی کے نمائندوں اور دنیاوی مددگاروں کی حیثیت سے دُنیائے مسیحیت پر اپنا کاروباری اقتدار قائم رکھیں لیکن

بربری یورپ میں کسی مضبوط مرکزی حکومت کا امکان نہ تھا۔ حقیقی دُنیاوی حکمران۔ بڑے بڑے جاگیردار اور سردار۔ نواب۔ رئیس اور والی ہوتے تھے۔ جن کے درمیان یورپ حصّوں بخروں میں بٹا ہوا تھا۔ اِن حصّوں کی جسامت مختلف تھی۔ بعض تو صرف اُن کی گڑھیوں کے ارد گرد چند ایکڑ اراضی ہی پر مشتمل تھے۔ اور بعض بڑے بڑے صوبے اور بادشاہتیں تھیں۔ یہ سردار اراضی کے مالک ہونے کے علاوہ اُن کے باشندوں کو اپنی رعایا اور اپنے مزارع سمجھتے تھے۔ اور اُن پر کامل اور غیر محدود اختیار و اقتدار رکھتے تھے۔ جب اسلامی تہذیب کے ساتھ رابطہ ہونے کی وجہ سے تجارت نے پہلے پہل بربریت کا قلع قمع کیا۔ تو اس سے اقتدار کی چوتھی شکل وجود میں آئی۔ یہ تاجر تھے۔ اور اُن کی قوت روپے کی قوت تھی۔ وہ دوسری طاقتوں کا کھلم کھلا مقابلہ کرتے۔ اُن سے مخصوص حقوق نامے زبردستی حاصل کرنے اور پنچایتیں قائم کرنے کی قابلیت رکھتے تھے۔ اُن کی مثال کی پیروی یورپ میں ہر جگہ کی گئی۔ نوابوں کو روپیہ دے کر اُن سے حکومت خود اختیاری خریدی جا رہی تھی۔ کیونکہ یہ سردار اپنی تباہ کاریوں۔ صلیبی جنگوں۔ بادشاہوں اور شہنشاہوں کے ہاتھوں مفلس و نادار ہو رہے تھے۔ پروانہ ہائے حقوق کے بَل پر زور شور سے تجارت ہو رہی تھی۔ اور قوی تر اُمرا اور بشپ سخت غیظ و نفرت سے مغلوب ہو کر چلا رہے تھے۔ کہ ان مکروہ ایجادوں کی وجہ سے معاشرے کی بُنیادیں کھوکھلی ہو رہی ہیں۔ نوجنٹ کے صومعہ دار گیوبرٹ کے الفاظ میں "یہ جدّتیں عدل و انصاف کے خلاف ہیں۔ کیونکہ ان سے غلام اپنے آقاؤں کے حلقہ انقیاد سے آزاد ہوتے جا رہے ہیں"۔

حریف طاقتوں کی اس گونا گونی کا ناگزیر نتیجہ یہ ہُوا۔ کہ ان سب کے درمیان طویل اور جانسوز لڑائیوں کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ پوپ اور شہنشاہ۔ بادشاہ اور پادری۔ جاگیردار اور بادشاہ۔ بادشاہ اور شہنشاہ۔ پنچایتیں۔

نواب اور پوپ ایک دوسرے کا گلا کاٹنے میں مصروف ہو گئے۔ یورپ کو نیزوں۔ بھالوں اور جنگی قلعوں سے بھر دیا۔ اور اس کی تاریخ پیکار اور خونریزی سے لبریز ہو گئی۔ اگرچہ یورپ لہولہان ہو رہا تھا۔ لیکن اُس کو آقاؤں کی لڑائیوں سے فائدہ بھی پہنچ رہا تھا۔ کیونکہ وہ سب کے سب کمزور ہو رہے تھے۔ ہر شخص کی حکمت عملی واضح طور پر یہی تھی کہ کم حیثیت طاقت کو اُس کے طاقتور حریفوں کے خلاف صف آرا کر دے۔ چنانچہ کلیسیا نے شہنشاہوں کے خلاف لمبارڈ کی پنچائتیں قائم کیں۔ اور اُن کو مضبوط بنایا۔ شہنشاہوں اور بادشاہوں نے نوابوں کو بے دست و پا کرنے کے لئے پنچائتیں اور پادریوں اور صومعہ داروں کے عہدے قائم کئے۔ انگریز نواب بادشاہوں کے خلاف عوام کو برانگیختہ کرنے لگے۔ اور بادشاہ عوام کو نوابوں کے خلاف مشتعل کرنے لگے۔ عمومی حیثیت سے دولتمند اہلِ شہر کو نفع ہوا۔ اور جب آخر کار اُنھیں اتنا اقتدار حاصل ہو گیا۔ کہ وہ اُمرا بادشاہوں اور پادریوں کو آنکھیں دکھلانے لگے۔ تو اُنھوں نے اپنے آپ کو بے طاقت انسانوں کا حامی بنا لیا۔ اور اُن کو "قوم" اور "عوام" کے نام سے موسوم کرنے لگے۔

لیکن طاقتور حریفوں کی ان کشمکشوں اور زدوخورد کے ہنگاموں نے رفتہ رفتہ ایک نئی صورت اختیار کر لی۔ آہستہ آہستہ اُن کے درمیان اتحاد اور یگانگت کے تعلقات رونما ہونے لگے۔ اوّل اوّل بادشاہوں کی مرکزی حکومت کے اختیارات بے حد قلیل تھے۔ وہ نواب اور سردار جو اراضی شاہی پر بادشاہی کے جاگیرداروں کی حیثیت سے قابض سمجھے جاتے تھے۔ بادشاہ کے مقابلے میں وسیع تر علاقوں پر حکمرانی کرتے تھے۔ اس کے اقتدارِ خسروانہ کو ٹھکراتے تھے۔ اپنے ہمسایوں کے خلاف اپنے طور پر سفاکانہ لڑائیاں لڑتے تھے۔ بیرونی حملہ آوروں کے ساتھ مل جاتے

تھے۔ غرض جو رویّہ انھیں اپنے لئے مفید معلوم ہوتا۔ وہی اختیار کر لیتے لیکن جو سردار کمزور تھے۔ وہ قدرتی طور پر بادشاہ سے حفاظت کے خواہاں ہوتے تھے۔ اور اُس کے گرد زیادہ طاقت فراہم ہو جاتی تھی۔ پھر معلوم ہوا۔ کہ اپنے طور پر نجی لڑائیاں لڑنے کی بجائے یہ زیادہ مفید رہے گا۔ کہ اپنے مزارعین اور رعایا کو بادشاہ کی لڑائیاں لڑنے کے لئے مستعار دے دیا جائے۔ اور مالِ غنیمت میں حصہ لینے کے لئے بادشاہی اعزازات و عطایا حاصل کئے جائیں۔ یہاں سے وہ فقرہ عام ہوا۔ کہ "بادشاہ اور مُلک کے لئے جنگ کرنا چاہیئے"۔ ہنری ہشتم نے اپنے اُمرا کو کلیسیا کی اراضی لُوٹ لینے کی اجازت دے کر ٹیوڈروں کی مطلق العنانی کو مستحکم کیا۔ فرانس اور ہسپانیہ میں ازدواجی تعلقات۔ فتوحات اور خریداری کی وجہ سے مرکزی حکومت میں رفتہ رفتہ اضافہ اور توسیع ہوتی۔ انگلستان میں مرکزی حکومت کو نارمن فتوحات نے متحد کر دیا۔ اٹلی کو منقسم رکھا گیا۔ کیونکہ پوپ "توازن طاقت" کو قائم رکھنا چاہتا تھا۔ اور جرمنی میں حکمرانوں اور بشپوں کی طاقت سے یہی مقصد حاصل کیا گیا۔ کلیسیا نے اُن خوفناک شہنشاہوں کو جنھیں اُس نے خود نہایت نادانی سے قائم کرنے میں اعانت کی تھی۔ بالکل ضعیف و بے کمزور کر دیا۔ اور اُس وقت اسے یہ امر اپنے لئے مفید نظر آیا کہ تمام بادشاہ یگانگت پیدا کرے۔ کیونکہ اس میں دونوں کا فائدہ تھا۔ بادشاہ اپنے تاج پادریوں سے حاصل کر کے خداوند کے ممسُوح۔ خدائی طاقت کے نمائندے اور ایسے مقدس انسان بن جاتے تھے۔ جو کوئی گناہ نہ کر سکتے تھے۔ اور صرف خدا کے آگے جواب دہ تھے۔ عوام کو یہ سکھایا جاتا تھا۔ کہ بادشاہی اقتدار کے "خدائی حق" کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا چاہیئے۔ یہاں تک کہ شہری لوگوں نے بھی دوسری طاقتوں کے ساتھ انتہائی کشمکشوں کے بعد اسی بات کو مفید خیال کیا۔ کہ بادشاہ۔ اُمرا اور کلیسیا کے ہم آہنگ اور ہم کار ہو جائیں۔ انگلستان

ہیں یہ کہا جاتا تھا۔ کہ قدرت نے یہ قلعہ اثر بیاوا اور جنگ و پیکار کے خلاف بنایا ہے۔ یہ بیش بہا پتھر جو ہمیں سمندر میں جڑا ہوا ہے۔ اور اس کے لئے ایک فصیل کی خدمت انجام دے رہا ہے اس کو وہ ملک بنظر رشک دیکھتے ہیں جنھیں یہ مسرت حاصل نہیں " لہذا دفاعی مقاصد کے لئے بڑی بڑی فوجیں رکھنا اور اُن کے کثیر مصارف اُٹھانا بالکل غیر ضروری ہے۔ بادشاہوں کی جارحانہ جنگوں کے مقاصد کے لئے روپے کی فراہمی برابر ضروری تھی۔ لہذا اہلِ شہر کے ساتھ (جو زردار تھے) خاص نوازش و مرحمت کا سلوک ہونا چاہیے۔ پریشان اور مبہوت شہریوں کی وہ پارلیمنٹ جسے ایلبی جین سیمن حرب صلیبی کے ایک سردار کے بیٹے سائمن ڈی مانٹ فورٹ نے بادشاہ کے خلاف قائم کیا تھا۔ غیر معمولی اہمیت اختیار کر گئی۔ مزید براں انگلستان کی جارحیت اور دفاع دونوں کے وسائل بری فوج کی نسبت بحری طاقت سے زیادہ وابستہ تھے۔ اور جہاز زیادہ تر تاجر طبقے کی ملکیت تھے۔ اب چوں کہ واسکوڈے گاما اور کولمبس نے دُنیا کی تجارت کے راستے بالکل بدل دیئے تھے۔ اس لئے یہ تجار اپنے مقاصد کے ساتھ ساتھ دوسرے مفادات کی بھی خدمت کرتے تھے۔ ہسپانویوں کو غلام مہیا کرتے تھے۔ اور اُن سے سونے کے جہاز لیتے تھے۔ اور سمندر پار سلطنتیں قائم کرتے تھے۔ چنانچہ دولتمند شہریوں کے تاجر طبقات انگلستان میں بڑی طاقت حاصل کر گئے اور انگلستان دوسرے کم قسمت ملکوں کے لئے آزاد اداروں کی مثال پیش کرنے کے قابل ہوگیا۔ اٹھارھویں صدی کے صنعتی انقلاب اور اس کی ترقیات نے ارباب اقتدار کے رابطے کو اور بھی زیادہ متغیر کر دیا۔ روپے اور سرمائے کی قوت نے اقتدار کی دوسری تمام صورتوں پر غلبہ پا لیا۔ اور اُنھیں کم و بیش متروک قرار دے دیا۔ پادریوں کی طاقت، پادشاہوں کی طاقت اور مالکانِ اراضی کی طاقت بہت بڑی حد تک روپے کی

طاقت پر منحصر ہوگئی لیکن اس کے باوجود یہ تمام طاقتیں سرمایہ کے بے حد مفید معاون کی حیثیت سے باقی رہیں۔ مثال کے طور پر فوجی طاقت "فنون امن" سے ترقی پاتے ہوئے سرچشمہ ہائے قوت کے درمیان بالکل متروک قرار پا گئی۔ اور اس کا کوئی مقصد باقی نہ رہا۔ اگرچہ یہ دعوے عام ہیں کہ "جنگیں ہمیشہ ہی ہوتی رہی ہیں" اور "فطرت انسانی" کا تقاضا یہی ہے۔ اور ہم اپنی جہالت میں انھیں دہراتے رہتے ہیں لیکن اس کے باوجود جنگیں نوع انسانی کی تاریخ میں نسبتہً تازہ ایجاد ہیں۔ "فطرت انسانی" کو حصولِ مملوکات کے ذریعے کی حیثیت سے جنگ کی عادت گزشتہ پانچ ہزار سال ہی سے پڑی ہے۔ "فطرت انسانی" لاکھوں سال تک اس سے بیگانہ رہی ہے۔ اور اکثر قدیم نسلیں اب تک اس سے بیگانہ ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ فوجی طاقت مالی اقتدار کا اہم ترین حلیف و معاون رہی ہے۔ اس نے نئی منڈیاں پیدا کیں۔ وسیع صنعتوں کی پرورش کی۔ حُبِ وطن کے جذبے کو تیز تر کیا۔ ضبط و نظم۔ اطاعت اور دوسری تمام نیکیوں کو تقویت دی۔ جو لازمی طور پر مفید تھیں۔ یہی کیفیت اقتدار کی تمام دوسری شکلوں کی ہے۔ یورپ نشو و ارتقا کے جس عمل میں سے گزرا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ حریف طاقتوں کا بے جوڑ معجون مرکب آغاز میں حصولِ اقتدار کے لئے ایک دوسرے کے خلاف معرکہ آرا تھا۔ اور اُس نے اپنی مخالفتوں اور کشمکشوں سے یورپ کو اکھاڑا بنا رکھا تھا۔ اب یہ تمام طاقتیں ایک مشترک روح۔ مشترک افکار اور مشترک مفادات کی بنا پر کاملاً متحد ہوگئیں۔ تخت شاہی کلیسا کی قربانگاہ۔ شمشیر۔ قلم اور روپیہ سب کے سب پہلو بہ پہلو کھڑے ہوگئے۔ اور ایک عظیم اور ناقابلِ شکست "اتحاد مقدس" قائم ہوگیا۔

اس عمل کی ایک حیرت انگیز مثال جرمنی ہے۔ یورپ بھر میں کوئی ملک ایسا نہ تھا جس میں مختلف طاقتوں کے درمیان اس قدر پُر زور

اور طویل کشمکش ہوتی ہو جیسی جرمنی میں رونما ہوئی۔ پوپوں نے ہمیشہ انتخابی شہنشاہوں کے اقتدار کی مخالفت کی۔ اور انھیں سر اٹھانے کا موقع نہ دیا۔ علاقائی سرداروں اور بشپوں کا اقتدار جن کو انتخابی حقوق حاصل تھے۔ نام نہاد حکمران کے اقتدار پر چھا گیا تھا۔ شہنشاہ مالیات کے اعتبار سے نادار تھا۔ چارلس پنجم کے پیشرو کو "میکس ملین بے زر" کہتے تھے۔ اور خود چارلس بھی اپنے افلاس کا کوئی علاج نہ کر سکتا تھا۔ شاہی قلمرو کی ایک ایک انچ زمین بالآخر انتخاب کنندوں کو بطور رشوت دی جا چکی تھی۔ ہینسا کے تجارتی شہروں نے شہنشاہ یا علاقائی نوابوں کی اطاعت کا جُوا اپنی گردن سے اُتار پھینکا۔ اور بالآخر جرمنی لاعلاج انقطاع پسندانہ رجحانات کی وجہ سے پارہ پارہ ہو گیا۔ اور کشمکشوں کی تیزی اور شدّت کی وجہ سے تباہی و بربادی انتہا کو پہنچ گئی۔ اس میں تین مختلف مذاہب افتراق انگیزی کر رہے تھے۔ اور ان تمام دوامی تصادمات کی وجہ سے پادریوں شہنشاہوں۔ نوابوں۔ شہریوں اور دوسروں کی طاقتیں بالکل مفلوج ہو کر رہ گئی تھیں۔

لیکن ان تمام حالات کے باوجود جرمنی نے دنیا میں اقتدار یا زوال کا مسلک اختیار کیا تو یہ منظر نظر آیا۔ کہ وہ تمام طاقتیں جو صدیوں سے ایک دوسری کے خلاف موت و حیات کی کشمکش میں اُلجھی ہوئی تھیں۔ مشترک آرزوؤں اور مفادوں کے بندھنوں سے متفق و متحد ہو گئیں۔ قیصر جو ازمنۂ وسطیٰ کے اُن نصب العینوں کا نمایندہ تھا۔ جو "خدائی حق" اور سلطنت کے داعی تھے۔ ٹیوٹن نسل کے نائٹوں اور ڈاکے مارنے والے نوابوں کے "جنکر" جانشینوں کا یار و مددگار بن گیا۔ مالی مفادات۔ فرینکفرٹ کے ساہوکار۔ ہمبرگ کے مالکان جہاز۔ صنعت کار اَلیسن کے فولادی کارخانہ دار۔ شہری تاجروں کے نمایندے سب کے سب قیصر اور عسکریت

پسندوں کی امداد و حمایت پا کر اُن کے مقاصد اور منصوبوں کے حامی بن گئے۔ یہاں تک کہ ویٹیکن کے متعلق بھی یہ شبہ کیا گیا۔ کہ اس سازش میں اس کا بھی ہاتھ تھا۔ زمانہ حال کی طاقتوں کی تمام صورتیں اپنے مقصد اور عمل میں ایسی متحد ہوئیں۔ کہ اُن کی انفرادی ذمہ واریوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرنا اور یقینی طور پر یہ بتانا کہ اصل مجرم کون ہے۔ بے انتہا مشکل ہو گیا۔

جونہی بادشاہوں کا مرکزی اقتدار اپنی اپنی قلمروؤں میں کافی حد تک مضبوط و مستحکم ہو گیا۔ انھوں نے اپنے ہمسایوں پر غلبہ حاصل کرنے اور اُن کی طاقت غصب کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ پہلے طاقت کی انواع کے درمیان طبقاتی جنگ ہوا کرتی تھی۔ اب خود مرکزی طاقتوں کے اندر کشمکش شروع ہوئی۔ انگلستان چونکہ جغرافیہ اور نارمن فتح کی وجہ سے سب سے پہلا ملک تھا۔ جس کے استحکام کی ضرورت تھی اس لئے سب سے پہلے اپنے ہمسایوں پر وہی حملہ آور ہوا۔ فرانس کے باشندے اوّل اوّل یہ نہ سمجھ سکے۔ کہ اگر ایک شاہی نظام قوت دوسرے کے خلاف جارحیت پر آمادہ ہو۔ یا ایک ڈیوک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو۔ یا کوئی بادشاہ کسی ڈیوک سے جنگ کرے۔ تو پھر کیا ہوا آخر اس میں فرق و امتیاز کیا ہے؟ چنانچہ وہ دونوں جانب سے بالکل غافل و بے پروا رہے۔ جب تقریباً ایک صدی تک انگریزی تاخت و تاراج کا سلسلہ جاری رہا۔ جب کہیں جا کر وہ اس مصیبت کے خلاف متنبّہ اور بیدار ہوئے۔ اور اس جذبے نے حُبِّ وطن اور بادشاہ سے وفاداری کی صورت اختیار کی۔ جونہی انگریزوں کا فرانس سے اخراج عمل میں آیا۔ فرانسیسی بادشاہ نے اپنے اقتدار کو مستقل پا کر اُن کی مثال کی تقلید کی۔ اور اپنے طور پر جارحانہ جنگ و پیکار کا آغاز کر دیا۔ اُس نے نیپلز اور میلان پر محض اسی

قسم کے "حق" کی بنا پر حملہ کر دیا۔ جو انگریز بادشاہ کو فرانس کے تاج پر حاصل تھا۔ اس کے بعد پوپ کو بھی خیال آیا کہ میں بھی کیوں نہ دو چار شہروں اور قصبوں پر قبضہ کر لوں۔ جن پر (جعلی ہی سہی) مجھے "حق" حاصل ہے۔ چنانچہ اُس نے فرانس کو۔ شہنشاہ کو۔ اراگون کو اور اطالوی حکمرانوں کو وینس کے خلاف حملہ آور کرا دیا۔ اور جب اس کی لوٹ مار سے فارغ ہُوا۔ تو تجویز کر دی۔ کہ اب اتحادیوں کو اگر کوئی اَور بہتر کام نہیں۔ تو فرانس ہی پر حملہ کر دیں۔ چنانچہ یہ وحشیانہ رقص شروع ہو گیا۔ جو اب تک برابر جاری ہے۔ فرانسس اول نے شہنشاہ چارلس کو "ڈوئل" لڑنے کی دعوت دی۔ افسوس ہے کہ یہ "ڈوئل" نہ لڑا گیا۔ لیکن اس کی جگہ اُنھوں نے چھ جنگیں لڑیں اٹلی اور آرتوے نوار کو تاراج کیا۔ اور ہسپانیہ اور جرمن ایمپائر کو کاملاً تباہ کر دیا۔ اس سلطنت کی سڑتی ہوئی نعش کے حصوں بخروں کی تقسیم پر جرمن اور آسٹروی حکمران۔ سیوائے۔ سویڈن۔ ڈنمارک اور فرانس کے ڈیوک تیس سال تک لڑتے رہے۔ اور اس سلطنت کی دو تہائی آبادی تہ تیغ کر دی گئی۔ شاہ فرانس نے جو سب سے زیادہ نفع اندوز ہُوا تھا۔ اس لُوٹ کو جاری رکھا۔ السٰاس اور فلینڈرز پر قبضہ کیا۔ اور پلیٹی نیٹ میں کھنڈروں کی ایک دُنیا پیدا کر دی۔ جب اُس نے اپنے خاندان کو میڈرڈ میں آباد کر دیا۔ تو اس سے یورپ میں جنگ شروع ہوئی۔ جو اُس وقت تک جاری رہی۔ جب ہر شخص اس سے تھک گیا۔ اور بھُول گیا۔ کہ یہ کس مقصد کے لئے لڑی جا رہی ہے۔ سوائے مارلبرو کے جس نے فوجی ٹھیکیداروں سے کمیشن کی رقوم حاصل کرنے کی غرض سے اس جنگ کو زیادہ پیچیدہ کر دیا۔ اس جنگ سے نقشے میں کوئی تغیر پیدا نہ ہُوا۔ اور انگلستان کو اس کی عظیم ترین فتوحات سے جو بڑا نفع ہُوا۔ وہ "غلاموں کی تجارت" کا اجارہ تھا۔ جو اس کو آسی اینٹو کے معاہدے سے مل گیا تھا۔ فرانسیسی

سب سے پہلے دریچوللہ کے کنارے روسی موجیکوں سے آشنا ہوتے۔ کیونکہ سٹینیس لاس پچپن کی نا ہر روس، اور آسٹروی شہنشاہ کے نزدیک ہرگز معزز و محترم نہ تھا۔ الزبتھ آف پرسا نے اپنے بچوں کے لئے ذریعہ آمدنی پیدا کرنے کی غرض سے پالی کے بیٹے البیرونی کی مدد حاصل کر کے یورپ کو بارہ سال تک شدید مخمصے میں مبتلا رکھا۔ آسٹروی شہنشاہ چارلس ششم کا ایک اور خاندانی انتظام پیش آیا جس کی خاطر اس نے بلجیم کی تجارت انگلستان کے ہاتھ فروخت کی۔ اور اس کے بدلے میں انگلستان نے پسارو ورٹز کے مقام پر سربیا آسٹریا کو اور یونان ترکی کو عطا کر دیا۔ اس انتظام سے یورپ میں جو جنگ شروع ہوئی۔ وہ سات سال جاری رہی۔ لیکن غلط کار چارلس ششم نے یورپ پر جو سب سے بڑی آفت نازل کی۔ وہ یہ تھی۔ کہ اس نے فریڈرک ہوہن زولرن کی جان بچالی۔ حالانکہ اس کا باپ اسے گولی مارنے ہی والا تھا۔ اور اس کا پہلا کام یہ تھا۔ کہ اس نے اپنے محافظ پر حملہ کیا۔ اور اس کی بیٹی جین بی۔ سرتامس ولنسن سے اس خاتون پر بے حد زور دیا۔ کہ فرانس کے خلاف انگلستان اور پروشیا سے مل جائے۔ لیکن اس نے انکار کر دیا۔ اور اپنے سلیشیائی آنسوؤں کو پونچھنے کے لئے پولینڈ کی لوٹ سے حصہ حاصل کیا۔ پوٹسڈم کا ڈاکو انگریزوں سے روپیہ اور نفری کی امداد حاصل کرنے کے بعد دیوانہ ہو گیا۔ اس نے "جرمن سلطنت" قائم کرنے کے دوران میں یورپ کو خاصا مصروف رکھا۔ اور اس طریقے سے اپنے انگریز شریک کار کو "برطانوی سلطنت" قائم کرنے کے قابل بنا دیا۔

بادشاہ اپنے آپ کو "انگلستان"، "فرانس"، "سپین" کے ناموں سے موسوم کیا کرتے تھے۔ جس طرح ہمارے بشپ "کنٹربری"، "یارک"، اور "ونچسٹر" کہلاتے ہیں۔ پچھلے دنوں جونسبرگ کے یہودی بھی اپنے آپ کو

"انگلستان" کہا کرتے تھے۔ اس قسم کے سابقوں کے وجوہ کسی انسانی مقصد و مفاد سے (خواہ وہ "نسلی" ہو یا "قومی") کوئی تعلق نہ رکھتے تھے۔ "نسل" (جس طرح اس اصطلاح کا صحیح یا غلط استعمال کیا جاتا ہے) اور "اقوام" یورپ میں مرکزی طور پر منظم طاقتوں کے قیام ہی سے پیدا ہوئی ہیں۔ آغاز میں رومن سلطنت اور کلیسا کی مسیحی روایات کی بنا پر یورپ اور دنیائے مسیحیت کو بالکل ایک "قوم" سمجھا جاتا تھا۔ جس کا کوئی حصہ باقی حصوں سے منفک نہ تھا۔ اور نہ اس کی نشو و نما علیحدہ ہوتی تھی۔ ازمنۂ متوسطہ کے اوائل کے حالات کو پیش نظر رکھا جائے۔ تو اس اختلاط کی گہرائی اور وسعت نہایت نادر نظر آتی ہے۔ یہ نسبتہً ہمارے زمانے سے بھی زیادہ عمیق و وسیع تھا۔ آئرلینڈ اور انگلستان کے راہبوں نے سفر کر کے جرمنی۔ فرانس اور اٹلی میں سکونت اختیار کر لی۔ اطالوی پادری کنٹربری کے آرچ بشپ اور انگلستان کے چانسلر بن گئے۔ آئرلینڈ کا ایک باشندہ شہنشاہ کا دوست تھا۔ اور ہسپانیہ میں تحصیل علم کر رہا تھا۔ ہر انگریز جو اس قسم کی تعلیم کا شوقین تھا۔ جو فرانس میں حاصل ہو سکتی تھی۔ پیرس کے مدرسوں میں پڑھ رہا تھا۔ پیرس۔ بولونا۔ پیڈوا۔ نیپلز۔ مونٹ پلیئر۔ ویانا اور آکسفرڈ کی پہلی یونیورسٹیاں یورپ کے ہر حصے سے آنے والے طلبہ کی "اقوام" میں منقسم ہو رہی تھیں۔ فرانسیسی جوق در جوق انگلستان میں جمع ہو رہے تھے۔ ہسپانوی جرمنی میں اور جرمن ہسپانیہ میں جا رہے تھے۔ ونچسٹر۔ ڈرہال اور پلیرمو کے نارمن درباروں کے درمیان نہایت گہرا اور مسلسل ارتباط تھا۔ بارسلونا۔ اور طولوس۔ کیرولنگی فرانس اور جرمنی۔ نیپلز اور ویانا ایک دوسرے سے تعلق رکھتے تھے۔ پھر ہر ملک اور روما یا ایونیان کے پاپائی دربار کے درمیان بھی ربط و اختلاط قائم تھا۔ تاجر اٹلی سے درہ برینر کے راستے سوئٹزرلینڈ میں سے گزرتے تھے۔ دریائے رائن کے پاس پاس ہنساس

اور فلینڈرز تک پہنچتے۔ اور پھر انہی راستوں سے واپس آتے۔ چونکہ ڈاک کے ذریعے سے رسل و رسائل کا انتظام تسلی بخش نہ تھا۔ اس لئے جہاں ضرورت ہوتی۔ لوگ خود ہی چلے جاتے۔ پادری۔ شاعر۔ طلبہ اور یہودی ہر جگہ گھومتے پھرتے۔ نارمنڈی یا آئرلینڈ کے زائرین روما کو۔ ارض مقدس کو اور جنوبی اٹلی کی زیارت گاہوں کو جاتے۔ چونکہ ریلوے کے زمانے کے مقابلے میں حالات بالکل مختلف تھے۔ اس لئے گیارھویں۔ بارھویں اور تیرھویں صدی کی آبادی زیادہ تر مسافروں اور سیاحوں پر مشتمل تھی۔ مرکز پسند طاقتیں جتنی مضبوط ہوتی گئیں۔ اسی قدر یہ ابتدائی اتحاد غائب ہوتا چلا گیا۔ اور مختلف ملکوں کا اختلاط اور ثقافتی رابطہ رفتہ رفتہ محدود ہو گیا۔ جن اقوام نے طاقتور بادشاہوں کے گرد اپنے گروہ بنا لئے تھے۔ وہ روز بروز اپنے ہی مرکزوں سے وابستہ ہونے لگیں۔ خود ان قوموں کے رجحانات اور ان کی خواہش "خود اختیاری" کو جب بھی آزادانہ اظہار کا موقع ملتا۔ وہ علی العموم وسیع و برتر اتحاد کی خواہاں نظر آتیں۔ چنانچہ اسی رجحان کی وجہ سے پین جرمن۔ پین سلافی اور پین اطالوی تحریکات پیدا ہوئیں۔ صرف ان ملکوں میں جو مفتوح و مغلوب تھے۔ مثلاً پولینڈ۔ بوہیمیا۔ ہنگری۔ آئرلینڈ۔ قومی تکلیف و مصیبت کی وجہ سے انقطاعی رجحانات پیدا ہوئے۔ اور انھوں نے اپنے گھروں کا انتظام اپنے ہاتھ میں لینے کا نصب العین اختیار کیا۔ قوت کے بعض نظام قائم ہوئے۔ جو زیادہ تر گوناگوں نسلوں۔ زبانوں اور مذہبوں کے لوگوں کا مجموعہ تھے۔ اور ان مجموعوں کے مابین یورپ کی جنگیں معرض ظہور میں آئیں۔ یہ جنگیں زیادہ تر بھاڑے کے "سپاہیوں یا اتحادی طاقتوں کے عارضی دبتے ہوئے لشکروں کے درمیان لڑی جاتی تھیں۔ چارلس ہشتم اور فرانسس اول نے سوئٹزرلینڈ بلکہ ترکی تک کی فوجوں کے بل پر جنگیں لڑیں۔ برگنڈی کے چارلس پنجم نے ہسپانوی اور جرمن فوجوں

کی مدد سے روما کو تاراج کیا۔ جن کی سرداری ایک فرانسیسی کے ہاتھ میں
تھی۔ ٹلی۔ والن سٹائن۔ میکسملین۔ مینسفیلڈ۔ کرسچین (آف برنزوک)
اور گستاوس اڈالفس کی فوجیں جنہوں نے مرکزی یورپ سے تہذیب کا
نام و نشان تقریباً مٹا دیا تھا۔ تمام ملکوں کے طالع آزماؤں پر مشتمل تھیں۔
اور لارڈ چیٹر نے لکھا ہے۔ کہ "بادشاہوں نے یہ فوجیں اراذل و انفار
میں سے بھرتی کی تھیں۔ جن پر اُن کو کوئی اقتدار حاصل نہ تھا" یہ لوگ
موقع ملنے پر ایک طرف سے نکل کر دوسری طرف جا شامل ہوتے۔ اُن
کی تنخواہ اور خوراک صرف لُوٹ مار سے حاصل ہوتی تھی۔ اور "دشمنوں" سے
زیادہ اُن سے "دوست" خوف کھاتے تھے۔ پروشیا کی فوج کی بنیاد
فریڈرک ولیم نے رکھی۔ اور سب سے پہلے اس میں اُن اشخاص کو بھرتی کیا
جو اُس کے بھرتی کے افسروں نے سکنڈے نیویا سے اغوا کر کے ٹرانسلوینیا
اور لیفی سے اُٹھا کر نالمن پہنچا دیئے تھے۔ اور جنگ ہفت سالہ میں اور
روزباخ میں جب فریڈرک کی فوجوں نے جرمن فوجوں کو شکست فاش
دی۔ تو اُن میں نصف بھی پروشین نہ تھے۔ بلکہ ہنگری نے اطالوی فوجوں
کی مدد سے اپنا دفاع کیا۔ اور انگلستان نے جبرالٹر۔ منارکا اور ہندوستان
کی حفاظت پر جرمنوں کو مامور کیا۔

تہذیب یورپ کی قلمرو پانچ صدیوں تک اکھاڑا بنی رہی۔ اور
اس کی وجہ زیادہ تر ایسی تھیں۔ جن کو باشندوں کا کوئی ایک گروہ نہ تو
پرکاہ کے برابر وقعت دیتا تھا۔ اور نہ اُن کو سمجھ ہی سکتا تھا۔ خاندانی
جنگوں کے طوفان کے درمیان مذہبی لڑائیاں کسی قدر اطمینان کا باعث
ہوتی تھیں۔ اس لئے کہ مذہبی جنون کم از کم سچا اور مخلصانہ تو ہوتا ہے
بلاشبہ اس قسم کی کش مکشیں افسوسناک ہیں۔ لیکن حرص و آز کی بے حیائی
کے مقابلے میں قابل قدر ضرور ہوتی ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ مذہبی

جنگیں خالص سیاسی مقاصد کے ساتھ اس قدر گڈمڈ ہو جاتی تھیں۔ کہ چند انسانوں کا مذہبی جوش محض حکمرانوں کی حرص و آز اور ان کی سازشوں کا آلۂ کار بن جاتا تھا۔ ہالینڈ کے پروٹسٹنٹوں نے ڈیوک آف اینجو کے ماتحت فرانسیسی کیتھولکوں کو انگلینڈ رفرنیز کے مقابلے میں اپنی مدد کے لئے بلایا۔ خوفناک جنگِ سی سالہ میں (گارڈینر نے بالکل صحیح لکھا ہے) کیتھولک اور پراٹسٹنٹ اضلاع کی آبادیوں کے درمیان کسی عناد و نزاع کا سُراغ نہیں ملتا۔ یہ اختلاف صرف اُن کے حکمرانوں کے درمیان ہے" جن فرانسیسی سپاہیوں کے بزرگوں نے ھیوجوناٹوں کا قتل عام کیا تھا۔ اور جن کے بھائی اُن کی سرکوبی میں مصروف تھے۔ اُن سپاہیوں کو کارڈینل نے اس لئے بھیجا۔ کہ کیتھولک شہنشاہ کے خلاف لُوتھر کے پیروؤں کی حمایت کریں۔

جس چیز کو یورپ کی سیاسی تاریخ کہتے ہیں۔ وہ کوئی قابلِ فخر شئے نہیں۔ مارکوئی دوشاٹلے لکھتی ہے۔ کہ "رومن سلطنت کے زوال کے بعد سے زمانۂ حاضرہ کی تاریخ نے میرے دل میں جو نفرت پیدا کر دیا ہے اُس پر میں قطعی طور پر غالب نہیں آسکی"۔

یونانی تاریخ کی کیفیت یہ ہے۔ کہ اگرچہ ایرانی شکست کے کارنامے کے بعد اس میں فرومایہ صوبجاتی سیاسیات۔ اشخاص اور دو یا تین ہمسایہ دیہات کے درمیان پریشان کن تصادم پیش آئے لیکن یونانی ذہن نے ہر اتفاقی حادثہ کو آزاد اور واضح فکر کی روشنی میں صاف طور پر دیکھا۔ یہاں تک کہ یہ تمام صوبجاتی۔ اشخاصی اور دیہاتی جھگڑے عمومی مسائل کی صورت اختیار کر گئے۔ اور عالمگیر فکر کے سامنے پیش ہو گئے۔ ہر خفیف اور بے حقیقت بیش بہا ہو گئی۔ اور اس کا مقامی طول و عرض ایسے مقاصد اور نفاوات میں گم ہو کر رہ گیا۔ جو ساری انسانیت پر حاوی ہیں۔ اگرچہ اس

کے بدترین اور ادنیٰ ترین پہلو میں نہایت مکروہ حرص و آز اور بدنما جبلتیں نظر آتی ہیں۔ مثلاً Mytilene کے انجام پر ایتھنز کے پادریوں کی بحث یا وہ چیز جسے Thucydides میں Melian مکالمہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اُن کے دلائل سخت طنز آمیز ہیں۔ لیکن "جھوٹ" ہرگز نہیں ہیں۔ سفید کو سیاہ ظاہر کرنے کی کوشش نہیں کی گئی نہ دعوائے اتقا پر زور دیا گیا ہے۔ اور نہ ڈپلومیسی کی لفاظی اور منافقت اور ارتکاب کے اخفا و ابطال کی غرض سے ذہن انسانی کو فریب دینے کی سعی کی گئی ہے۔ ہم یہاں باطل اقتدار پر نہیں۔ بلکہ انسانی حقائق پر بحث کر رہے ہیں۔ تاریخ روما میں ہمیں بالآخر فرومایہ حرص و ہوا کے نہایت غرض پرستانہ مقاصد پر بحث کرنی پڑتی ہے۔ لیکن نسلِ انسانی سے استفادہ و استحصال کا جو تصور رومیوں کے نزدیک تھا۔ اُس میں نوع انسانی کی تنظیم کا کام شامل تھا۔ اور روزِ اول ہی سے اُن کے ذہن میں یہ اصول جاگزیں ہو چکا تھا۔ کہ نوع انسانی کی تنظیم کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے۔ کہ اس کام کو دیانت اور عدل و انصاف سے سر انجام دیا جائے۔

لیکن یورپ کی "بربری زادہ" دنیا میں حرص و ہوا کے جو تصادم ہوئے اُن کو فکر کی توفیق حاصل نہ ہوئی۔ اور وہ اس کی تنظیمی قوت سے بھی محروم رہے۔ اس کے برعکس اس کی دناءت اس امر سے اور بھی زیادہ شرمناک ہو جاتی ہے۔ کہ دعائے اتقا اور انتہائی مثالیت کی منافقت اور ہر مقصد اور ہر مدعا کو تلبیس سے بناوٹی نیکی کا جامہ پہنانے کی مکروہ کوشش کی گئی۔ چونکہ یورپی معاشرے نے مذہبی قوتِ فکر کے غلبے کے ماتحت پرورش پائی تھی۔ اور یہ قوتِ فکر کتنی ہی مخلص ہو۔ اُسے اپنے مقاصد کو اخلاقی و روحانی رعایات کی اصطلاحوں کا جامہ پہنانا پڑتا ہے۔ اس لئے اس معاشرے نے بھی اسی امر کی تربیت پائی تھی۔ کہ اپنے ہر عمل اور ہر مقصد

کو اخلاقی ادعائے راستبازی کے لباس میں پیش کرے۔ پادری جو اکثر محض بربری تھے۔ اور جنھیں بادشاہوں اور ڈیوکوں نے بڑے بڑے دینی عہدوں پر فائز کر رکھا تھا۔ یورپی سلطنتوں کے پہلے وزیر یا سفیر قرار پائے۔ اُن کے ذمّے یہ کام تھا۔ کہ وہ بربری سرداروں کی اندھا دُھند نفس پرستیوں اور شرمناک غداریوں کو سزاوار اور شایانِ شان زبان میں بیان کریں۔ منافقت اور دروغ بیانی عام طور پر قوت کی معاون تھیں یورپی فنِ مُلک داری کی روایات دغابازی اور ریاکاری کی فضا میں پروان چڑھیں۔ مُلک داری اور ڈپلومیسی کے ان فنون میں رومن دربار ایک اُستاد اور نمونے کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا۔ چھوٹی چھوٹی اطالوی ریاستوں کو باہم متفرق رکھنا۔ جزیرہ نما کو طاقتور اثرات سے محفوظ رکھنا "توازن طاقت" کو قائم رکھنا تاکہ اُن دو صُوبوں کا تحفظ کیا جائے۔ جن کو پوپ اپنی دُنیاوی قلمرو سمجھتے تھے۔ ان تمام کاموں نے مکّاری۔ سازش اور دغابازی کو ایک فنِ لطیف بنا دیا۔ جو سولھویں اور سترھویں صدیوں میں اطالوی سیاسی فکر کی فضا اور اس کے مطالعہ اور شغف کا موضوع بن گیا۔ میکیاولی کا نام اس سیاسی بدمعاشی اور اندھا دُھند فریب کاری کے ساتھ وابستہ ہو گیا ہے۔ اور اس کو (غیر منصفانہ طور پر) اس منظم سیاہ کاری کے مکروہ اصول وعقاید کا بانیٔ اوّل قرار دے دیا گیا ہے لیکن اس کی کتاب "پرنس" میں اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ کہ اُس زمانے کے اطالوی سیاسی عمل کے عام طور پر مُسلّمہ اصولوں کی سیدھی سادی صراحت کر دی گئی ہے۔ اگر اس محنتی فلارنساوی کو یہ معلوم ہوتا۔ کہ محض اِس صحافتی کام کی بنا پر کہ وہ مُروّجہ ومقبول اصولِ مُلک داری ضبطِ تحریر میں لے آیا۔ اُس کو سیاسی بدنہادی کے نظریّے کا بانی قرار دے دیا گیا ہے۔ تو غالباً اُسے خوب بے انتہا تعجب ہوتا۔ تمام یورپی طاقتوں نے

فریڈرک آف پروشیا کی طرح میکیاولی کے اصول کو صدقے کا بکرا" قرار دے
کر اس سے بے تعلقی اور نفرت کا اظہار کیا لیکن انہی پر نہایت سرگرمی
سے عمل کرتے رہے۔ اطالوی مُلک داری حکومت کا قابل تعریف نمونہ قرار
پا گئی۔ لُوئی یازدہم کا دِل سیاسی بدمعاشی کے اُس مکمل نمونے یعنی فرانسسکو
سفورزا کی "خوبیوں" پر مایا پگھلا۔ کہ اُس نے اُس کو لُوٹنے سے احتراز
کیا۔ تامس کرامویل وولزی اور ہنری ہشتم کی پالیسیوں کی تکمیل کرتے
ہوئے اپنی اطالوی تربیت پر فخر کا اظہار کیا کرتا تھا۔ اور "پرنس" کو اپنے
تھیلے میں اٹھائے پھرتا تھا۔ عورتیں بھی قدرتی طور پر کذب و دروغ کے
فنون میں شہزادوں اور پادریوں کا مقابلہ کرنے لگیں۔ لُوئی آف سیوائے
اور آسٹریا کی مارگریٹ نے کیمبرائے کے مقام پر تکرار اور زیادہ طلبی میں
بڑے سے بڑے سفیروں کی برابری کی۔ کیتھرائن دامیڈیچی جس کے دادا
کے نام سے میکیاولی نے اپنی کتاب معنون کی تھی۔ اور میری سٹوارٹ
(دھامنسھا کی شاگرد) بھی بہت شاطر تھیں۔ لیکن ان سے صرف الزبتھ
سبقت لے جا سکی جس کی فریب کاری میں بے انتہا پیچ و خم تھے۔
اور جن پر وہ بے حد فخر کرتی تھی۔ مکارانہ سکیموں منصوبوں اور سازشوں
کی اُلجھنیں اور فریب آمیز چالیں اس حد تک سیاسی عمل میں عام ہو گئیں
کہ حکمران حقیقت میں یہ دیکھ ہی نہ سکتے تھے۔ کہ اُن کے مقاصد کے
حصول کا کوئی صاف اور سیدھا راستہ بھی موجود ہے۔ جب چارلس دی
بولڈ کی موت کے بعد وہ بیش بہا انعام جس کے حصول کے لئے شاہ
فرانس نے کئی سال تک منصوبے باندھے۔ اُس کی گود میں گرنے ہی
والا تھا۔ کہ اُس نے برگنڈی کو کھو دیا۔ کیونکہ اُس نے اس کو سیدھے
طریقے سے حاصل کرنے کے بجائے پیچ در پیچ چالوں سے کام لیا۔
اُسی طرح ہے۔ کہ بسمارک نے اعلان کیا تھا۔ کہ ریاکاری کا سب سے

زیادہ یقینی اور عیارانہ ذریعہ یہی ہے۔ کہ سچ کہہ دیا جائے۔ مؤرخین مدت دراز سے اس کو اپنا سب سے بڑا وظیفہ سمجھتے ہیں۔ اور کوشش کرتے ہیں کہ ظاہری حیلوں بہانوں اور پیچیدہ کذب بیانیوں کے گوناگوں دھندلے نقوش میں سے اس حقیقی مقصد کا پتہ چلائیں۔ جو تاریخ کے سٹیج کے بڑے بڑے ایکٹروں کے پیش نظر تھا۔

یورپی ڈپلومیسی اور سیاسیات کی روایات اسی صورت میں وضع ہوتی ہیں۔ وہ اونچی ڈپلومیسی۔ وہ جوڑ توڑ اور سازشوں کے عیارانہ جال۔ وہ نستعلیق اور پر تکلف فریب کاری۔ وہ آلۂ کار قسم کی سکیمیں اور اُن سے حد سے زیادہ پُر اسرار چکر۔ ایسے "فارمولوں" کی نفیس ترتیب جو ناقابل بیان کمینہ پن کو الفاظ میں بیان کرنے کے قابل بنا دے۔ واضح جد الم اور جبر و تشدد کی بناوٹی اور غلط تاویلات، وہ شائستہ بدمعاشی جس کا تعفن بھی شاندار معلوم ہو۔ چوری اور قزاقی کے طریقے دریافت کرنے والوں کے وہ ٹیڑھے اور خفیہ کاروبار جن سے نوع انسانی کی تقدیروں سے قماربازی کی جاتی ہے۔ یہی وہ طریقے ہیں۔ جن سے نسل انسانی پر اس وقت تک حکومت کی جا رہی ہے۔ ۱۶۴۸ء میں جب بد نظم یورپ کی طاقت ور سلطنتیں تیس سال کی نہایت تباہ کن جنگ کی وجہ سے درماندہ۔ غیر آباد۔ تباہ حال اور کمزور ہو رہی تھیں۔ تو اُنھوں نے منسٹر اور اوسنا برورک کی پہلی یورپی امن کانفرنس میں اپنے نمایندے بھیجے تاکہ کسی قسم کا "تصفیہ" عمل میں آ جائے۔ لیکن اس عالمگیر احتیاج اور مصیبت کی انتہائی حالت میں بھی سب چھوٹے بڑے ملکوں کی غالب خواہش فیصلے اور تصفیے کی نہ تھی۔ بلکہ وہ چاہتے تھے۔ کہ کچھ لوٹ کا مال مل جائے۔ نا بوتھ کے انگورستان قبضے میں آ جائیں "تاوان"۔ "معاوضے" اور "بدلے" میں کچھ حاصل ہو جائے۔ اور انسانیت کی مصیبت سے کچھ نہ کچھ فائدہ اٹھا لیا جائے۔

اگر اُن مہذب نقابوں کو اُٹھا دیا جائے۔ جن سے عام طور پر یورپی تاریخ کی عریانی کو قومی فکر کے تصورات میں ملفوف کیا جاتا ہے۔ تو اس تاریخ کی حدِ نظر انسانیت کے بن مانسی نقطۂ نظر کی طرف مائل معلوم ہوتی ہے۔ قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ اگر زمانہ جدید کی دُنیا کے عناصر اُس تہذیب کے مقابلے میں جس کو اُس نے نابود کر دیا۔ اس قدر فرومایہ اور پست ہیں۔ تو ہمارے قانونِ ارتقائے انسانی کا مطلب کیا ہوگا۔"

درحقیقت تاریخ کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس نے اس قانون کی عظمت و شوکت کو اس سے زیادہ درخشانی عطا کی ہو۔ ایک رفیع و برتر حقیقت یہ ہے۔ کہ اس بے نام کیچڑ اور دلدل اور نجاست کے باوجود ایک روزافزوں نور ستاروں کی طرح جھلملاتا ہُوا نظر آرہا ہے۔ یہ کوئی مُبہم اور محتاجِ بحث "قدر" نہیں۔ جس کی جذباتی تاویل کر کے اس کو تاریخ میں داخل کر لیا گیا ہے۔ بلکہ یہ زندگی کے بطن کا ایک سخت مرکزی ہیرا ہے۔ جو خاک دُھول کے ریزہ ریزہ کر دینے والے پہاڑوں کے نیچے لازوال اور غیر فانی پڑا رہتا ہے۔ یہ یورپی دُنیا صرف ارتقائے انسانی کا معمول ہی نہیں رہی۔ بلکہ اس سے ارتقا کا جو مرحلہ پیدا ہُوا ہے۔ وہ ہر پہلے مرحلے سے فائق و برتر ہے۔ جو کام نہ یونانی فکر کی آزادانہ قوت سے ہو سکا نہ روما کی تنظیمی ہُنرمندی اور اُس کے نصب العین انجام دے سکے۔ اس پر جدید یورپ حاوی ہو گیا۔ نشوو ارتقا کی قوتیں اور اُن قوتوں پر فرد کا تحکم و اختیار نہ صرف غیر محدود طور پر وسیع ہو گیا۔ بلکہ انسان کی عضویت میں اُن کے تسویہ کا کام حسن کمال کو پہنچ گیا ہے۔ وہ اس سے پیشتر مفقود تھا۔ اگر آج ہماری دُنیا مختلف مسائل کا سامنا کرتے ہوئے فکر و تردد سے لرزاں اور ترساں نظر آتی ہے۔ تو خود یہ

مصیبت اور یہ شکوک بھی نوارتقائے حاصلہ کے آثار ہیں۔ اور جن مسائل وممکنات سے پیدا ہوتے ہیں۔ وہ اگر کسی سابقہ دور میں انسان کے سامنے آتے۔ تومثالی نظریہ کے دور دراز مسائل معلوم ہوتے۔

اس حیرت انگیز ترقی کا منظر کُلی طور پر عقلی فکر کے عمل کا نتیجہ ہے۔ یہ عمل جس طریقے سے ظہور میں آیا۔ وہ مجھے یقین ہے کہ آیندہ صفحات میں واضح تر ہو جائے گا۔ تاہم اس پر غور کرنے سے پیشتر جدید یورپ میں ارتقائے فکر کے بعض خد و خال کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

یورپ کی ثقافت اپنی کیفیتِ معاشری کی مانند نہایت بے جوڑ اور متفاوت اجزا کی معجون مرکب ہے۔ اگر ہماری ذہنی ودماغی دُنیا فکر کے متعدد علیحدہ علیحدہ خطوں میں واضح طور پر منقسم ہے۔ اور اس میں دینیاتی ادبی یا تین چار الگ الگ ادبی دوائر۔ فلسفہ اور سائنس موجود ہیں۔ تو یہ فرض نہ کر لینا چاہئے۔ کہ نوعیتِ اشیا سے پرورش پانے والے ذہنی دوائر کی کوئی قدرتی تقسیم ہے۔ یہ محض ایسی تقسیم عمل کی مظہر بھی نہیں۔ جو موجودہ علم کی وسعت کے باعث وجود میں آئی ہو۔ بلکہ اس کے برعکس یہ ایک عجیب اور خاص قسم کا تضاد ہے۔ جو اُن تاریخی اسباب وکیفیات سے پیدا ہوا ہے۔ جن میں یورپ کی ترقی معرض ظہور میں آئی ہے۔ مذہب۔ ادب۔ شعر۔ مابعد الطبیعیات اور سائنس موجودہ صورت میں فکر کے الگ الگ دوائر نہیں ہیں۔ جن کے معیار۔ اقدار اور کیفیات مزاجی منیات واقع ہوئے ہوں۔ بلکہ فکر کے معیارات واقدار کا نظام ایک ہی ہے۔ کسی دوسری ثقافت میں اس قسم کی نمایاں تقسیمات کا وجود نہ تھا۔ مشرقی برہمت اور یونانی حکیم اور دانش پرست تمام علوم اور فنون کو اپنا حلقۂ اثر سمجھتے تھے۔ اُنھی کی طرح مسلمان فضلا کُلیت پسند تھے۔ اور فلکیات کے ساتھ ساتھ شاعری کا ذوق بھی پیدا کرتے تھے۔ اور علوم مابعد الطبیعی کے

ساتھ طب اور موسیقی کو بھی ترقی دیتے تھے۔ سوال یہ نہیں۔ کہ اب یہ تخلیت پسندی ضروری یا ممکن ہے۔ ہمارے نزدیک یہ ناممکن ہے۔ اس لئے نہیں۔ کہ ہمارا دائرہ علم بہت وسیع ہو گیا ہے۔ بلکہ اس لئے کہ اب تین یا چار بالکل علیحدہ علیحدہ ثقافتیں عملاً پہلو بہ پہلو موجود ہیں۔ جو اپنے جوہر کے لحاظ سے اجنبی۔ غیر متعلق اور ناقابل امتزاج ہیں۔ اور صرف اپنے دائرۂ اثر کے اعتبار ہی سے نہیں بلکہ اپنے معیارات اور زاویہ ہائے نظر کے لحاظ سے بھی مختلف ہیں۔ وہ ایک دوسری پر اثر انداز ہوتی تو ہیں۔ لیکن بالکل اسی طرح جیسے مختلف تہذیبوں کی ثقافتیں ہوں۔ اور وہ ثقافتیں بغیر کسی امتزاج یا ارتباط کے علیحدہ علیحدہ خطوط پر ترقی پذیر ہوتی ہیں۔ ہمارے ہاں اُس مذہبی فکر کا اثر باقی ہے۔ جو ایک زمانے میں ہر قسم کے فکر پر حاوی تھا۔ اور ذہن انسانی کے ہر دائرے سے علیحدہ کھڑا تھا۔ اس کو تاریخی فکر سے، مابعد الطبیعی علوم سے، سائینس سے اور تعلیم یافتہ فکر کی رفتار سے کوئی تعلق نہ تھا۔ گویا وہ کسی اَور کائنات میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ ہمارے ہاں ایک علمی دُنیا ہے۔ جو نشاۃ الثانیہ کی انسانیت پرستی کی زائیدہ ہے۔ وہ اپنے عقائد کو متصوفانہ انداز سے دُہراتی رہتی ہے۔ اپنی مخصوص پسند اور ناپسندی کی دُنیا میں زندگی بسر کرتی ہے۔ اور اُس چیز پر اقتدار رکھتی ہے۔ جسے ہم تعلیم کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اور اس حقیقت کے اِخفا میں معاون ہوتی ہے۔ کہ دُنیا پندرھویں صدی سے بہت آگے بڑھ چکی ہے۔ ہمارے ہاں کہیں نہ کہیں ایک دُنیائے فلسفہ بھی ہے۔ جس کا وظیفہ تو یہ ہونا چاہئے۔ کہ تمام فکر و نظر کو متحد کرے۔ اور اس اتحاد کی حفاظت کرے۔ چونکہ بدقسمتی سے اس نے کچھ تو دینیات کی چھاتیوں سے دُودھ پیا۔ اور کچھ اُن سے متخالف و متصادم ہو کر ترقی کی لہٰذا وہ بالکل ہی بے نتیجہ ثابت ہوتی

(جیسے استقاط شدہ بچہ خستہ حال ہوتا ہے) اور زندہ دُنیا میں کسی کو بھی اس کے وجود کا یقینی علم نہیں۔ پھر ہمارے ہاں ایک سائینس کی دُنیا ہے۔ جس نے ثقافت کے تمام دوسرے اجزا سے علیحدہ اور منفک رہ کر اور حقارت و دُشنام کا شکار ہو کر نشو و نما حاصل کی ہے۔ اُس نے صرف روا داری پیدا کی ہے۔ اور کسی قدر اثر و نفوذ اس وجہ سے حاصل کیا ہے۔ کہ اس کی سرگرمیوں کے نتائج نے اس کو ایک جنّ غلام بنا دیا ہے۔ جس نے مادی دُنیا کی صورت تبدیل کر دی ہے۔ اور یہ سائینسی دُنیا بحیثیت مجموعی آس پاس کے فلسفے کے مقابلے میں خلوت نشینی۔ خاموشی اور اجنبیت کے گوشے میں مصروف عمل رہی ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے ہاں عام پسند ادبیات روزناموں۔ افسانوں۔ رسالوں اور رنگا رنگ کی مطبوعات کا موجیں مارتا ہوا سیلاب ہے۔ یہ وہ ادب ہے۔ جسے "ادبیاتِ جہالت" کے نام سے موسوم کرنا چاہیئے جس کا مقصد اول صرف چھپنا اور بک جانا ہے۔ لہٰذا وہ سنسنی پیدا کرنے اور جذبات کو تسکین بہم پہنچانے کی وجہ سے زندہ ہے۔ اور اُس انبوہِ عام کی ذہنیت کی نمایندگی کرتا ہے۔ جس کی ذہنی غذا مہیا کرنا اس کا کام ہے۔ یہ ہماری یورپی ثقافت کی کیفیت ہے۔ کہ اس کے مختلف اجزا اپنے اپنے دوائر کے اندر مُقیّد ہیں۔ اس کی دینیات فلسفے۔ سائینس اور ادب سے تغافل کر رہی ہے اس کا بے نتیجہ فلسفہ سائینس سے بے خبر ہے۔ اس کی سائینس فلسفے سے جاہل ہے۔ اور ادب سے نفرت کرتی ہے۔ اس کے تعلیمی نصاب یونانیوں کے علم نحو اور قُدما کی "دانش" کے سوا اَور ہر چیز سے بے خبر ہیں۔ اس کا عام ادب دلالی اور قرم ساقی کے فنون کے سوا اَور ہر شئے سے جاہل ہے۔ مَیں کہتا ہوں۔ کہ یہ قدرتی حالت و کیفیت نہیں۔ بلکہ غیر معمولی شکل ہے۔ اور ہمارے موجودہ ذہنی نشو و ارتقا کی ایک نکروہ بدصورتی ہے۔

اگر مختلف ثقافتی افکار کا امتزاج اور تنوع مفید اور ضروری ہے۔ تو اس کا پورا انحصار اس شرط پر ہے۔ کہ وہ سچ مچ ممزوج متحد اور متشابہ ہو کر ایک ہم آہنگ مجموعے کی صورت اختیار کر لیں۔ یونان نے تمام گزشتہ تہذیبوں کو جذب کر لیا تھا۔ اور یہ عمل انجذاب نہایت کامیاب ثابت ہوا۔ کیونکہ اس نے انھیں ہضم و جذب کر کے ایک حیرت انگیز ہم جنس مجموعے کی صورت میں تبدیل کر دیا تھا۔ جو اس کے نقد و نظر سے منقطر اور اس کی منطقی رُوح کے چھینٹے سے مزین تھا۔ ہماری تہذیب اور ہماری ذہنی ثقافت اپنے بے شمار اجزاء عناصر اور اپنے تجربے کے تنوع کی وجہ سے بھرپور ہے لیکن اس پر اس اساسی حادثے کا گہرا اثر ہے۔ کہ وہ عناصر زیادہ تر غیر ممزوج اور غیر متحد رہے ہیں۔ ہماری ثقافت بلکہ مجھے کہنا چاہیئے کہ ہماری ثقافتیں اب تک باہم جذب و ہضم نہیں ہو سکیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہماری تہذیب اپنی ساخت میں مختلف الاجزاء، غیر متوازن۔ غیر منظم اور غیر مساوی رہی۔ اور اس میں تعادل کا فقدان اس حد تک رہا۔ کہ اس کے عناصر اور اصول عدمِ مطابقت کی ابتری کے عالم میں متواتر ایک دوسرے پر گرتے پڑتے رہے ہیں۔

ہم لکھ چکے ہیں۔ کہ آغاز کار میں دینیاتی فکر کی دُنیا ہر چیز پر حاوی اور مقتدر تھی۔ کتب الہامی اور مقتدایانِ قدیم کی تحریریں خیالات اور فکر و علم کا واحد قابلِ قبول سرچشمہ سمجھی جاتی تھیں۔ یورپی فکر کا رویّہ وہی تھا۔ جو کتب خانہ اسکندریہ کی تباہی کے مُشتبہ[۱] افسانے میں عمر سے منسوب کیا جاتا ہے۔ یعنی "اگر یہ علم پہلے ہی قرآن میں موجود ہے۔ تو ہمارے لئے بیکار ہے۔ اور اگر یہ قرآن کے خلاف ہے۔ تو باطل ہے"۔ یورپ کو

[۱] غنیمت ہے کہ مصنف اس افسانے کو مشتبہ قرار دیتا ہے۔ اور اس مفروضقول کو اصلیت کے لحاظ سے نہیں بلکہ محض ادبی ضرورت سے استعمال کرتا ہے (مترجم)

یونان اور روما کی غیر مذہبی تہذیب کی قوت نے اس مہلک صورت حالات سے بچا لیا۔ غیر مذہبی فکر کے اخراج کو اس اثر کے خلاف قائم نہ رکھا جا سکتا تھا۔ غیر مذہبی فکر جو اکثر دینیاتی فکر سے متصادم تھا۔ اور اکثر اس کے ہاتھوں اپاہج ہو رہا تھا۔ علیحدہ نہیں رہ سکتا تھا۔ اسی چیز نے یورپ کی ترقی کو ممکن بنا دیا۔

لیکن یہ ترقی اپنے دماغی پہلو میں دنیائے قدیم کی ترقی سے کاملاً مختلف تھی۔ غیر مذہبیت نے اصلی دینیاتی فکر کا استیصال نہیں کیا بلکہ اس کے پہلو بہ پہلو مطابقت اور تصادم دونوں حالتوں میں نشو و نما پاتی رہی۔ مزید براں بالکل ایک غیر عنصر یورپی ذہن میں داخل ہوا جس نے اس کے اور تمام سابق فکر کے درمیان فرق و تفاوت قائم کیا۔

یہ نیا عنصر کلاسیکی ثقافت (سائنسی روح) سے بالکل اجنبی تھا۔ ہم اس کے اثرات کے کلی پہلوؤں سے معمولی طور پر واقف ہیں۔ اس کے ذریعے سے یورپی تہذیب دنیا کے چاروں گوشوں تک وسیع ہو گئی۔ اس کے مادی پہلوؤں میں کامل تغیر پیدا ہو گیا۔ صنعت کاری کے دور کا آغاز ہوا۔ جس سے تمام قوتوں کی جدید تقسیم عمل میں آئی۔ رسل و رسائل اور فکر کی نشر و اشاعت کے ذرائع روز افزوں ہو گئے۔ یہ وہ نتائج ہیں۔ جو عام طور پر ظاہر ہیں۔ اور ان کی اہمیت بہت عظیم ہے۔ اسی طرح افکار انسانی کی تشکیل سائنس سے ہوتی۔ کائنات میں انسان اور اس کی دنیا کے مقام کا انکشاف ہوا۔ قانون قدرت، بقائے توانائی اور ارتقا کے تصورات قائم ہوئے۔ جنھوں نے ذہن انسانی کے نظریات کی قلب ماہیت کر دی۔ اور تمام قوتی نظام اور اقتدار کی بنیادوں کو اس طرح کھوکھلا کیا۔ کہ کوئی دوسری طاقت نہ کر سکتی تھی۔

لیکن اس نئے اثر کے عمل نے یورپی ذہن کی فطرت اور اس کی

نشوونما کو اَور بھی زیادہ عمیق اور دقیق طریقے سے متاثر کیا۔ جب یورپ تاریک صدیوں کی رات کے خاتمہ پر بیدار ہوا۔ اور تجربی تحقیق تفصیلات کے مشاہدے اور صحیح پیمائش سے فطرت کی تفتیش۔ ریاضیاتی تجزیہ۔ اور ارسطو کی منطق کے ماتحت عالمانہ مباحثے شروع ہوئے۔ اور انھوں نے یورپ کے ذہن پر قابو پالیا۔ تو اس کو ایک نئی شکل اور نیا رُخ عطا ہوا۔ جس نے اس کو یونانی و رومی ذہنیت سے کاملاً علیحدہ اور ممیّز کردیا۔

انسانی فکر کی نوعیت کے اس فکر و تفاوت کی اصل کا بہترین ثبوت یوں مل سکتا ہے۔ کہ فلسفیانہ فکر کے تصورات کے متعلق اس کی فعالیت کی بلندتر اور دقیق تر تصورتوں پر غور کیا جائے۔ یونانیوں میں فلسفیانہ فکر کی بنیاد تجربے کے نہایت ضعیف اور سرسری تجزیہ اور تحقیق پر رکھی گئی تھی۔ اور اس کا ابتدائی اور براہِ راست مقصد یہ تھا۔ کہ دُنیا کی توجیہہ و تفہیم کی جائے۔ کائنات کا ایک کامل اور ہم آہنگ تصور قائم کیا جائے۔ جو ایک باقاعدہ اور معقول نظریہ مہیا کرے۔ اور جس کے طول و عرض کا پیمانہ اطمینان بخش ہو منطقی اور متکلمانہ فکر کی نفاستوں اور نزاکتوں کا مقصد یہ تھا۔ کہ ایسے نظام کے مختلف اجزا کی ہم آہنگی اور مطابقت کو محفوظ کیا جائے۔ اور جانچا جائے۔ یہ کام یونان کے مفکرین نے اس قدر ذکاوت و فراست سے انجام دیا۔ کہ بعد میں آنے والے تمام جادہ ہائے فکر کا پیشتر ہی سے احاطہ کرلیا۔ ازمنہ متوسطہ کے دوران میں دُنیا کی توجیہہ و تفہیم کی کوئی ایسی کوشش نہ ہوسکتی تھی۔ کیونکہ ادعائیت اور اذعان نے اس کو خارج از بحث قرار دے دیا تھا۔ متکلمانہ فکر نے جو اس مسئلہ تفہیم کے حدود سے محدود تھا۔ علیحدہ کیفیات و مسائل پر بحث

کا کام اختیار کرلیا۔ اور مسیحی دینیات میں ہیلانی اور نو فلاطونی عقائد و اصول کے دخل و اختلاط کی وجہ سے اس بحث کی کافی گنجائش مہیا ہوگئی تھی۔ متکلمانہ فکر نے استناد کے ان معیاروں پر بھی غور کیا۔ جن پر عقائد اساسی کے مختلف اشکال و اجزا مبنی تھے۔

نئے یورپ میں پہلا شخص جو حکیم و فلسفی کہلانے کا مستحق قرار پایا۔ رینی ڈیکارٹ تھا۔ یہ شخص دنیائے جدید کا اور سائنس کے اسالیب کا نہایت سرگرم طالب علم تھا۔ جو پیڈوا کے مکتب میں ارسطو کی منطق کی الجھنوں سے نجات حاصل کر رہے تھے۔ وہ تشریح اعضا اور افعال الاعضا کے علوم کا محقق تھا۔ اور ریاضیات کا بھی ماہر تھا۔ اس نے تجزیاتی ہندسہ میں جو ترقی کی۔ اس کی وجہ سے کیپلر اور کیویلری کی آزمائشی مساعی لائب نٹز اور نیوٹن کے علم الاحصا (کیلکولس) تک پہنچ گئیں۔ وہ کوپرنکس کے اصول سے اس قدر گہرا شغف رکھتا تھا۔ کہ اس نے اس موضوع پر ایک کتاب بھی لکھی تھی۔ لیکن جب گیلیلائی کے معتوب و ملزم ہونے کی خبر سنی۔ تو مایوس ہوکر اس کتاب کے مسودے کو تلف کر دیا۔ فلسفیانہ فکر جس انداز سے یورپ کے پہلے فلسفی کے سامنے آیا۔ اس سے فکرِ جدید اور فکرِ یونانی کے درمیان کُلّی اختلاف بالکل واضح ہوگیا۔ ڈیکارٹ لکھتا ہے:" جو مختلف اشیا مجھے سکھائی گئی تھیں۔ اور جن کے متعلق میرا خیال تھا۔ کہ میں انھیں جانتا ہوں۔ ان کی نسبت معلوم ہوا۔ کہ حقیقت میں میں ان میں سے کسی کا بھی علم نہیں رکھتا۔ میری معلومات اور میرے خیالات محض اعتماد کی بنا پر تسلیم کر لئے گئے ہیں۔ اور میرے پاس ان کی صحت اور ان کے جواز کی کوئی

ضمانت نہیں۔ جب مجھے معلوم ہوا۔ کہ میرے مفروضہ علم کی کوئی ایک شق بھی تنقیدی جانچ کی تاب نہیں لا سکتی۔ تو میں نے عزم کر لیا۔ کہ میں اس کو کاملاً مسترد کر دوں گا۔ اور از سر نو اس امر کے دریافت کرنے کی کوشش کروں گا۔ کہ کون کون سی ایسی چیزیں ہیں جن کو درحقیقت میں "معلوم" سمجھنے کا حق رکھتا ہوں۔ لہٰذا میں نے فیصلہ کیا۔ کہ میں کسی صداقت کو تسلیم نہ کروں گا۔ جب تک کہ مجھے اس کی صحت اور اس کے جواز کے متعلق کامل اطمینان نہ ہو جائے اور میں اسے ایسی صفائی اور وضاحت سے نہ سمجھ لوں۔ جو شک وشبہ سے بالکل بالا ہو۔"

فلسفیانہ فکر کے منطقے کا یہ تصور قدما کے تصور سے کاملاً مختلف ہے۔ اب مفکر کا مقصد یہ نہ رہا۔ کہ کائنات کا ایک مکمل اور سالم نظام تعمیر کرے۔ اور ہر قیمت پر اس کے ہم آہنگ تصور کا منشا پیش کر دے۔ بلکہ اب یہ ضروری ہوا۔ کہ اس نے عمل فکر کے دوران میں جس علم کو استعمال کیا ہے۔ اس کی صحت اور جواز کے متعلق خود تیقن حاصل کرے۔ اپنی کرنسی کی قیمت کو جانچے۔ ذہن سے ان تمام سکوں کو خارج کر دے۔ جو محک و معیار پر پورے نہ اترتے ہوں اس کا ذہن تعمیری نہ ہو۔ بلکہ تنقیدی ہو۔ یہ سوال خارج از بحث ہے کہ ڈیکارٹ اپنے افکار کے نشو و ارتقا میں ان اصول و قواعد کی پوری پابندی نہ کر سکا۔ جو اس نے خود ہی قائم کئے تھے۔ کیونکہ فکر کے حاصلات و نتائج سے بھی زیادہ بے انتہا اہمیت اس خواہش کو اور اس کے مقصد و اسلوب کو حاصل ہے۔ فکر کے ثمرات میں حقیقت اور غلطی کے درمیان ہمیشہ اور ہر جگہ لازمی تصادم اور اختلاف کوئی اہم شئے نہیں۔ بلکہ دیکھنا یہ ہے کہ مقصد فکر میں اور اس کی

تصدیق وجواز کی نوعیت میں حقیقت اور غلطی کے درمیان کیا فرق و
تفاوت ہے۔

اب گویا ڈیکارٹ اور اس کے بعد کے یورپی مفکرین لاک۔ بارکلے
ہیوم۔ کانٹ کے نزدیک فلسفیانہ سرگرمی کا مقصد قدما کی طرح ہم
آہنگی حسن اور تکمیل تعبیر کو مطمئن کرنا نہ تھا۔ بلکہ اُن کے پیش نظر صرف
"صحت فکر" تھی۔ فلسفے کا وظیفہ تعمیر نہیں بلکہ جانچنا ہے۔

فلسفہ اور مابعد الطبیعیات کو ہم نے یہ سمجھ رکھا ہے۔ کہ یہ انسانی
دُنیا کی دُور دست اور منقطع خلیجیں ہیں۔ یورپ کی دھڑکتی ہوئی زندگی
اس کے ہیجانات و حوادث اور اس کی سیاسی و معاشری ترقیات
کا سراغ اُن غبار آلود کتابوں میں نہیں مل سکتا۔ جو اُونچے طاقوں میں
پڑی ہیں۔ یہاں اس امر پہ بحث کرنا ضروری نہیں۔ کہ کانٹ کے
فلسفے کے رواج۔ ہالینڈ اور پیرس اور آکسفرڈ کی یونیورسٹیوں کے
علمی مباحث و مشاغل اور فنون لطیفہ سے لارڈ Von Zeitlichens
ایلزبتھ۔ شہزادی Palatine یا ملکہ سویڈن کرسٹینا جیسے شائستہ خواتین
وحضرات کی پُرجوش دلچسپی نے دُنیا کی رفتار کو کس حد تک متاثر کیا
اور تمام فلسفیانہ تصورات نے جو فکر کے تمام طبقات میں سے چھن
چھن کر نکلے۔ اُن اہل بازار کے فکر کو اپنے چھینٹوں سے کس حد تک
رنگین کیا جن کے نزدیک فلسفہ اور فلسفی بالکل بیگانہ اور اجنبی چیزیں
تھیں۔ فلسفیانہ فکر اگر ماخذ و رہبر نہ ہو۔ اور فلسفی اگر رہنما نہ ہوں۔ تو
کم از کم دوسروں کی مانند اپنے وقت کے مظہر و مخلوق اور اپنے رنگ
طبیعت اور کرداروں کا آئینہ ہوا کرتے ہیں۔

فلسفیانہ فکر کا حوالہ دے کر جو کچھ ثابت کیا گیا ہے۔ وہ تمام
یورپی فکر کی خصوصیت ہے۔ او۔ پشینر کے تفکر سے مختلف ہے جن

حالات میں اس کی تشکیل و ترقی واقع ہوتی۔ اُنھوں نے اس پر اسی تنقیدی استفساری۔ اور امتحانی نوعیت کا ٹھپہ لگا رکھا ہے۔ جو اس کی ترقی و توسیع کے ہر رجحان میں نمایاں رہا ہے۔ اس تنقیدی رویئے میں روز افزوں اضافہ اس سے ظاہر ہے۔ کہ فلسفیانہ فکر کا گہوارہ پہلے پہل الٰہیاتی تھا۔ جس میں صرف مقتدر اسناد کا اضافی استناد مابہ النزاع تھا۔ پھر اس نے سند سے آزادی حاصل کرنے کے لئے مختلف مرحلے طے کئے۔ پھر وہ غیر مذہبی بنا دیا گیا۔ اور غیر مذہبی فکر کی حیثیت سے اُس نے تمام جوازوں کو متواتر چیلنج کیا۔ مثال کے طور پر ایک سلسلۂ فکر میں آگسٹائن یا ایکو یناس کے ذہنی رجحان کا مقابلہ ھُوکر سے کرو۔ پھر اس کا مقابلہ ھُوبز کے ذہن سے کرو۔ پھر ھُوبز سے مانٹیسکیو تک۔ مانٹیسکیو سے مل یا بینتھم تک اور پھر اسی سلسلۂ فکر میں آج کل کے ذہنی رجحان کا پتہ چلاؤ۔ اس سے معلوم ہوگا کہ نوعیتِ فکر میں پیہم تغیر و استحالہ واقع ہوا ہے۔ وہ کسی نوعِ حیوانی کی قلب ماہیت سے کم حیرت انگیز نہیں۔ زمانہ حاضر میں شروع سے لے کر آخر تک ذہنی رجحان کے ہر دائرے میں ایک ہی روح جاری وساری ہے۔ بالآخر اس کا کام یہی ہے۔ کہ عقلی واستدلالی وجوہ کی بنا پر اپنے آپ کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے ہر موجودہ حقیقت اور تخمینے کو چیلنج کرے۔ درجہ بدرجہ ہر مقدس رائے۔ ہر نظریے۔ ہر قطعی فیصلے اور ہر واجب الاحترام ادارے کو زیر بحث لایا جاتا ہے۔ ہر قائم شدہ قوت۔ ادارے۔ رائے اور تصور کے متعلق روایتی موثق۔ اور ناقابل اعتراض تقدس کا پردہ نہایت بے دردی سے چاک کر دیا گیا ہے۔ سوال کیا جاتا ہے۔ کہ فلاں چیز اور فلاں قوت کس حق پر مبنی ہے؟ فلاں حقیقت۔ فلاں عقیدہ۔ فلاں تصور۔ فلاں دعوے۔ فلاں تخمینہ

کس بنا پر اور کس سند سے تسلیم کیا جا رہا ہے؟ اگر کوئی چیز عقل و دلیل کے واضح الفاظ میں اپنے دعوے کو ثابت کر دے۔ تو سبحان اللہ۔ لیکن اگر اس سے بہتر کوئی حق پیش نہ کہہ سکے۔ کہ اس کو واجب الاحترام قدامت، قائم شدہ رواج۔ قدیمانہ روایت اور تسلیم و تقدیس کی سند حاصل ہے۔ تو ہم اس کا کوئی احترام کرنے پر مجبور نہیں ہیں۔ قدیمانہ مقبولیت بجائے خود اس زمانے میں کوئی وجہ جواز نہیں سمجھی جاتی۔ کیا آج کل اس کو عقلی اعتبار سے حق بجانب ثابت کیا جا سکتا ہے؟ کیا ہم کسی تخمینے کو آج قابل فہم عقلی وجوہ کی بنا پر تسلیم کر سکتے ہیں۔ کیا ہم اس کو نظم امور کا بہترین طریقہ مان لیں گے۔ یا اس سے بہتر طریقہ ایجاد کرنے کی کوشش کریں گے؟ اگر کوئی بات عقلی طور پر قابل تسلیم ہے۔ تو اس کا کوئی مضائقہ نہیں۔ کہ وہ نئی ہے یا پرانی ہے۔ اور اگر وہ عقلی اعتبار سے ناقابل تسلیم ہے۔ تو اسی طرح اس کی قدامت اور اس کے ماخذ کا سوال غیر متعلق ہے محض رسم۔ محض موثق تقدس کی مسلسل اور قدیم شہرت کو اصل مسئلے سے کوئی تعلق نہیں۔ اور اس سے کوئی دعوے۔ کوئی استحقاق۔ کوئی جواز قائم نہیں ہوتا۔ یہی وہ رد عمل ہے۔ جس سے زمانہ معاصر نے انسانی دنیا کے مروجہ نظام اشیا کا سامنا کیا ہے۔ خواہ وہ فلکیاتی خیالات ہوں یا مذہبی آرا۔ سیاسی ادارے ہوں یا اخلاقی اندازے۔ افکار و اشیا ہوں یا نظریات و حقوق ہوں۔ درجہ بدرجہ اس عہد نے ہر قدیم مفروضے اور ہر مقدس عقیدے اور ہر بدیہی اصول مسلمہ کو رد کر دیا ہے۔ تنقیدی عمل کا دائرہ عشرہ بعد عشرہ اور صدی بعد صدی وسیع ہوتا چلا گیا ہے۔ جو چیزیں سترھویں صدی کے صنم شکن معائنہ کے بعد غیر ممنوع رہیں۔ ان کو اٹھارھویں صدی کی عدالت کے سامنے متہم کیا گیا۔ جن چیزوں کو اٹھارھویں صدی کی تنقید نے از راہ حرمت تسلیم کر لیا تھا۔

اُن کو اُنیسویں صدی نے قابلِ مواخذہ قرار دیا۔ غرض کوئی ایسا اصول یا کوئی انسانی حقیقت خواہ نسلِ انسانی کے آئین و نظام کے اندر کتنی ہی جڑ پکڑ چکی ہو۔ یا زمانہ قدیم سے مقدس و مستحکم چلی آ رہی ہو۔ ایسی نہیں رہی جس کو آج کل آزادانہ بحث و تحقیق کے اکھاڑے میں گھسیٹ کر لا کھڑا نہ کیا گیا ہو۔

فکر کی اس نوعیت نے یورپی ترقی کی ساخت اور اُس کی اندرونی قدر و قیمت کو کس طریقے سے معیّن کیا ہے۔ اس پر آئندہ ابواب میں بحث کی جائے گی۔

حصّۂ سوم

نظامِ اخلاق کا اِرتقا

پہلا باب

قانونِ اخلاق "قانونِ قدرت" کی حیثیت سے

۱

اخلاقیات کی برتری کے معنی

یہ امر بلا شک وشبہ ظاہر و باہر ہے۔ کہ ایک زمانے کے غار نشین انسان نے اپنے لئے جو حیرت انگیز مادی دُنیا تعمیر کی۔ اور پھر اپنے لئے علم کے قصر و محل اور فن و آسائش کے شاندار ایوان ہائے عشرت کھڑے کئے۔ وہ سب اس کی ذہنی قوت کی ہوشیاری و طباعی کی فتوحات ہیں لیکن بہت سے لوگ فوراً کہہ اٹھیں گے۔ کہ یہ تمام اشیا یعنی انسانی ترقی کے مادی پہلو۔ حیاتِ انسانی کے وسائل اور اس کی آسائشیں صنعت۔ تجارت۔ فنون۔ ثقافت۔ ذہنی نشو و نما بالکل قشر اور ظواہر کا حکم رکھتے ہیں۔ بلاشبہ یہ وہ چیزیں ہیں۔ جن کو نہایت فخر سے "تہذیب" اور "ترقی" کی فتوحات سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ایسے لوگ بھی موجود ہیں۔ جو محض اسی بنا پر ان تصورات کو کھوکھلے مغالطوں سے تعبیر کرتے۔ ان کی ہنسی اُڑاتے ہیں۔ بادلوں کے اُدپر اُڑنے سے یہ ثابت نہیں ہوتا۔ کہ انسانیت کسی

بلند تر سطح پر پہنچ گئی ہے۔ نہ ایک سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے معنی "ترقی" ہیں اگر انسان ستاروں کا وزن معلوم کرنے اور علم کے وسیع تر دائروں میں ذہنی تفریح کرنے کے قابل ہو گیا ہے۔ تو اس میں فی نفسہ کوئی تغیر و انقلاب پیدا نہیں ہو گیا۔ انسانی امور و مسائل کا ایک عمیق تر پہلو بھی ہے۔ کسی مادی یا ذہنی قوت یا اقتدار فطرت یا ذہنی فراست کی ترقی کے مقابلے میں ایک اور چیز بھی ہے۔ جو انسانی قدر و قیمت کے جوہر سے قریب تر ہے۔ اگر قوت و اقتدار۔ تہذیب اور "ثقافت" اخلاقی بدی" کے ساتھ ربط رکھتے ہوں۔ تو اُن کی کوئی حیثیت نہیں حقیقی معیار جس سے انسانی دُنیا کی قدر و قیمت جانچی جا سکتی ہے۔ صرف اخلاقی معیار ہے۔ جب لفظ "نیک" کا اطلاق انسانی چیزوں پر کیا جاتا ہے۔ تو اس کے لازمی معنی یہی ہوتے ہیں۔ جو اخلاقیات میں سمجھے جاتے ہیں۔ اور ارتقائے انسانی کا کوئی عمل حقیقی نہیں سمجھا جا سکتا۔ جو ہر چیز سے پہلے "نیکی" کا ارتقا نہ ہو۔

اس قسم کا فیصلہ جن رواجی اور روایتی وجوہ کی بنا پر کیا جاتا ہے ان پر شک و اعتراض وارد ہو سکتا ہے لیکن یہ عجیب بات ہے۔ کہ یہ فیصلہ بالکل صحیح ہے۔ اخلاقی معیار سب سے برتر ہے۔ یہ انسانی ترقی کا پیمانہ ہے۔ اور اس کی کامیابیاں دوسری تمام اقدار پر فوقیت رکھتی ہیں۔

اخلاقی فیصلوں پر ہمارا یقین و اعتماد آج کل بُری طرح متزلزل ہو چکا ہے۔ کوئی "مطلق قطعیت" اب قابلِ یقین نہیں سمجھی جاتی۔ ہمیں کسی جگہ بھی حقیقت کی کوئی ٹھوس کھونٹی نظر نہیں آتی۔ جس پر ہم راستی اور راستبازی کے اُن "مقدس ترین" تصورات کو لٹکا سکیں فطرت میں ہمیں کوئی ایسی چیز نہیں ملتی۔ کیونکہ فطرت بے رحم اور

سرد مہر ہے۔ اور دیوتا (جیسا کہ ہرقلیوتس نے مدتوں پہلے کہا تھا) نیکی اور بدی سے ورا الورا ہیں۔ پوری کائنات میں اس عظیم شے، اس برتر و اعلیٰ اخلاقیت کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ ہم کتنا ہی تلاش کریں۔ ہمیں قوانین قدرت میں اس اخلاقی قانون کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ صرف انسانوں کی روایات میں اس کا نشان دستیاب ہوتا ہے۔ لیکن اس کا تشکل غیر یقینی ہے۔ اور وقت اور گنجائش کے مطابق اس میں ہمیشہ مختلف قسم کی ترتیب کر لی گئی ہے۔ ہم یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہیں۔ کہ یہ قانون محض انسان کی بنائی ہوئی روایت ہے۔ نہ یہ قانونِ قدرت ہے۔ اور نہ کوئی مقدس اور حیرت انگیز شئے ہے۔ بلکہ زیادہ سے زیادہ پولیس کے کسی قانون سے مشابہ ہے۔ اور کوئی اس قسم کا اعلان ہے۔ کہ "یہاں سے گزرنے والے گرفتار کر لئے جائیں گے"۔

پھر یہ کیونکر ہوا۔ کہ اس قانون نے انسانی فکر اور انسانی زندگی میں اس قسم کی جابرانہ حیثیت زبردستی حاصل کر لی۔ بلاشبہ اس کے بھی بہت سے ناجائز وجوہ موجود تھے لیکن ایک نہایت جائز اور حقیقی وجہ بھی یقیناً موجود تھی۔ بہرحال قانونِ اخلاقی درحقیقت ایک قانونِ قدرت ہی ہے۔ اخلاقیات کی یہ برتری حقیقت میں انسانی ترقی میں اہم ترین اور حقیقی صداقت سے تطابق رکھتی ہے۔

اور یہ حقیقت وہ ہے۔ جس کا ذکر ہم کر چکے ہیں یعنی انسانی ترقی کے مخصوص ذرائع و احوال کا تقاضا ہے کہ یہ ترقی افراد تک محدود نہ ہو۔ بلکہ پوری نسلِ انسانی پر حاوی ہو جائے۔ ہر فرد کا درجۂ ارتقا اس عالمگیر ترقی کا نتیجہ اور حاصل ہو۔ صرف نسل ہی اس ارتقا کے حاصلات کے موروثی انتقال کی حامی ہو۔ انسان پر جو لازمی فرض اس کے ارتقا کے احوال و شروط سے عائد ہوتا ہے۔ وہ گویا ایک نئی عضویت یعنی

انسانیت کی مخلوق ہے۔ اس کے انفرادی قوا کی ترقی صرف اُس وسیع تر عضویت ہی کی نسبت سے واقع ہو سکتی ہے۔ یہ اسی ضرورت سے پُر زور طور پر متشکل ہوتی ہے۔ لہٰذا ایک ناگزیر شرط اولیں کی حیثیت سے اس کے مطابق بنانی ہوگی۔ اور یہ کام اس قدر عظیم اور دشوار ہے۔ کہ انسانی ترقی کے دوسرے تمام مسائل و امور اس کے مقابلے میں بے حقیقت رہ جاتے ہیں۔

تشکیلِ انسانیت یہی ارتقائے انسانی کا بوجھ اور "ٹیپ کا بند" ہے۔ اور یہی وہ ٹھوس اور شدید حقیقت ہے۔ جس کی دُھندلی سی شعوری تصریح "قانونِ اخلاقی" سے ہوتی ہے۔ یہ بے غرضانہ ایثار کا کوئی دھڑکتا ہوا جذبہ نہیں۔ نہ بجائے خود اور بر اسے خود فیاضی کا کوئی محرک ہے۔ بلکہ ضرورت کا ایک وزنی بوجھ ہے۔ اور ان بے لوچ حالات نے جو انسانی ترقی پر حاوی ہیں۔ اس کو ترقی کے کندھے پر رکھ دیا ہے۔ اور اخلاقیت کی برتری اور اعلیٰ نوعیت اس ارتقائی عمل کی ہمہ گیر عظمت سے (جس کا اُس سے اظہار ہوتا ہے۔ اور ان مشکلات سے جو اس کے راستے میں حائل ہیں) بالکل مطابق ہے۔ جو سوالات اور مسائل "اخلاقیات" اور "اخلاقیت" کی اصطلاحات کے ماتحت آتے ہیں۔ وہ بالکل وہی ہیں۔ جو اس عمل سے پیدا ہوتے ہیں۔ اخلاقیاتی مصالح کی ضرورت کا مطلب صرف یہ ہے۔ کہ حقائق کے ساتھ اس کے تطابق کی ضرورت ہے۔ انسان اور انسان کے درمیان روابط میں بعض ایسے احوال ہوتے ہیں۔ جو حقائق اصلیہ سے مطابقت رکھتے ہیں۔ اور بعض نہیں رکھتے۔ مطابقت نہ رکھنے والوں کا انجام ناکامی پر ہوتا ہے۔ اور مطابقت پیدا کرنے والے ارتقائی نشو و نما اور زندگی میں معاون ہوتے ہیں۔

انسان اپنی نشو و ارتقا کے قانون سے بنی نوع پر اقتدار حاصل کرنے کا طالب ہوتا ہے۔ لیکن اس میں ایک مخصوص انسانی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔ استحصال کا شکار ہونے والا مدِ مقابل بھی ایک بشر اور دُنیائے انسانی کا ایک عنصر ہوتا ہے۔ اس صورت حال کا ناگزیر نتیجہ یہ ہے کہ "شکار استحصال" کی حالت کا ردِ عمل خود "استحصال پیشہ" پر ہوتا ہے۔ "استحصال پیشہ" شخص اپنے مدِ مقابل پر قوت و اقتدار کا استعمال صرف اسی صورت میں کر سکتا ہے۔ کہ اپنی اور نوعِ انسانی کی قوتِ ارتقا کا نقصان برداشت کرے۔ ایک انسان دوسرے انسان پر جو اقتدار استعمال کرتا ہے۔ اس کا ضروری لازمہ "قوتی فکر" ہے۔ اور "قوتی فکر" کا بطلان جتنا گہرا اخلاقیاتی اقدار کے دائرے میں ہوتا ہے۔ اتنا کہیں اور نہیں ہوتا۔ قوتی فکر کا اہم ترین حاصل صرف باطل اقدار اور باطل اخلاقیاتی نظاموں پر مشتمل ہوتا ہے۔ لہٰذا اس سے انسانی دُنیا اپنے ارتقا کے بنیادی اور اہم ترین پہلوؤں کی نسبت بطلان کا شکار ہو جاتی ہے۔ چنانچہ یہ ارتقا اپنے سرچشمے ہی پر ناگزیر طور سے فاسد ہو جاتا ہے۔

خود فرد کے معاملے میں مکافات کا عمل بد قسمتی سے جاذبِ توجہ اور فوری طور پر نمایاں نہیں ہوتا۔ یہ کم حقیقی نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس کی پوری ترقی اس کے نصب العین اور اس کے اقدار باطل اور فرومایہ ہوتے ہیں۔ اور زندگی کی بلند ترین اقدار اس میں پورے طور پر جلوہ گر نہیں ہو سکتیں۔ لیکن اس حقیقی زندگی میں مثالی پاداش ظاہر نہیں ہوتی۔ نہ وہ شاعرانہ عدل نمایاں ہوتا ہے۔ جو کسی زمانے میں تمثیل نگاروں اور ناول نویسوں کا عام موضوع ہوتا تھا۔ نہ بد عملی کی کوئی سزا ملتی ہے۔ نہ نیکی کی جزا ہی سامنے آتی ہے۔ بلکہ اس کے برعکس ناانصافی دھوکے اور ظلم کو عام طور پر فتح حاصل ہوتی ہے۔ اور وہ حق پر حملہ آور ہونے کے نتائج و ثمرات لے

خوب بہرہ اندوز ہوتے ہیں۔ حق آخر تک بدحال و مظلوم رہتا ہے۔ اور آخر میں ایک عام فرسودہ قول کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اصل میں ہوتا یوں ہے۔ کہ معاشرے کی شکل صورت اور وہ نظام اشیا جس میں حق سے تغافل ایک عادت اور مسلمہ اصول بن جاتا ہے۔ بالآخر زوال پذیر ہو کر تباہ ہو جاتا ہے۔ فرد ظلم سے خارجی طور پر کتنا ہی تمتع حاصل کرے۔ لیکن وہ معاشری نظام جس کا وہ ایک جزو ہوتا ہے۔ اور وہ طبقہ جو اس ظلم کے ثمرات سے بہرہ اندوز ہوتا ہے۔ اس کے عمل سے ناگزیر زوال اور تباہی کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے ماحول کے حقائق سے مطابقت پیدا نہیں کر سکتا۔ انتخاب طبعی کے ناگزیر عمل کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ "گناہ کا بدلہ موت ہے۔"

اس حقیقت سے گریز نہیں کیا جا سکتا ۔ کہ انسان کا اپنے ماحول کے حقیقی احوال و شروط کو تسلیم کرنا اور ان کا خوگر ہو جانا ہی اس ترقی اور حقیقی قوت کا واحد ذریعہ ہے۔ جو انسان کی تقدیر میں ہے۔ اگر وہ ارتقائے انسانی کے قوا و حالات کو بالائے طاق رکھ دے گا۔ اور ان کی جگہ قوت غلط عقائد۔ ڈنڈے اور ذہنی اور اخلاقی "کلوروفارم" پر بھروسا کرے گا۔ تو نتائج بالکل وسائل کے مطابق ہی ہوں گے۔ یہ ارتقا نہیں۔ یہ انسانی قوت کی ترقی نہیں۔ اور اس کو نشوونما نہیں کہتے۔ اگر وہ انسانی قوت کے تنہا ذریعے کو چھوڑ کر وحشیانہ قوت کا طریقہ اختیار کرے گا۔ تو اس کی ترقی انسانی قوت کی طرف نہ ہو گی۔ بلکہ وحشت کی طرف رجعت قہقری کرے گی۔

نیٹشے نے مروجہ اخلاقیاتی تصورات کی "انارکی" اور ان کے عدم جواز کو دیکھا۔ تو یہ نتیجہ نکالا۔ کہ وہ واحد اصول جس کی حقیقی بنیاد حقائق قدرت پر ہے۔ صرف انسانی قوت کی نشوونما اور اس کا استعمال ہے۔ اور یہ بالکل صحیح ہے۔ ہر قسم کے انسانی ارتقا کا مطلب یہ ہے۔ کہ انسان اپنی

زندگی کے حالات پر قابو پانے کی قوت میں اضافہ کرے لیکن ان حالات سے جو مخصوص صورت پیدا ہوتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ جس لمحے سے فرد کا "عزم اقتدار" دوسروں کو نقصان پہنچانے اور تباہ کرنے سے اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ اسی وقت سے خود اپنی کوشش کے مقصد کو شکست دے دیتا ہے۔ انسانیت نے جس بے اندازہ قوت کو پیدا کیا ہے۔ اور ترقی دی ہے۔ وہ انفرادی دستبرد کو روکنے ہی سے حاصل ہوئی ہے۔ نوع انسانی کی تاریخ میں انفرادی قوت کی جتنی دستبرد ہوئی ہے۔ اس نے انسانی قوت کے حقیقی نشو ونما کو روک دیا ہے۔ آج کل کے اوسط انسان کی قوت قطعی طور پر اور ہر مقابلے اور موازنے کے اعتبار سے سکندر اعظم۔ سیزر بلکہ نپولین کی قوت سے بھی زیادہ ہے۔ اس کے قبضۂ اقتدار میں زمانۂ قدیم کے "سلاطین عالم" کی نسبت حقیقۃً مادی۔ ذہنی اور روحانی طاقتیں زیادہ ہیں۔ اس کی زندگی (سوائے اس حالت کے کہ وہ اپنے بنی نوع پر حقیقی اور مطلق غلبہ رکھتا ہو) ہر معنی میں زیادہ مکمل۔ زیادہ بھرپور اور زیادہ قوی ہو سکتی ہے۔ درحقیقت وہ بنی نوع سے بے حد زیادہ مؤثر خدمت حاصل کر سکتا ہے۔ اور ایسی خدمت کسی پہلے مطلق العنان حاکم کو کبھی نصیب نہیں ہوئی۔ قوت میں یہ بے اندازہ اضافہ صرف پیدا ہونے انفرادی اقتدار کو ختم کرنے سے حاصل ہوا ہے۔ جس تناسب سے اس فضول اور بے نتیجہ قوت کو مختصر اور ناممکن بنایا گیا۔ اسی تناسب سے فرد بشر کی حقیقی اور معقول قوت میں اضافہ ہوا۔ جس دنیا کے مالک اور آقا غلاموں کے ایک انبوہ پر مکمل غلبہ واقتدار رکھتے ہوں۔ وہ کامل جمود کی دنیا ہو گی۔ جو قوت انتقال سے محروم اور نہایت مہلک طور پر نامرداور آختہ ہو گی۔ یہ دنیا (جیسا میں پہلے کہہ چکا ہوں) "انسان کامل" کی طرف نہیں۔ بلکہ "انسان آدم خور" کی طرف لے جائے گی۔

اگر اس قسم کی دُنیا عہدِ حجری میں پوری طرح قائم ہو جاتی۔ تو ہم اب تک عہدِ حجری ہی میں زندگی بسر کر رہے ہوتے۔ آقاؤں کو اس سے جو فائدہ پہنچتا۔ وہ ضرور کسی قدر قابلِ اعتراض ہوتا۔ اگر سولھویں صدی کے آغاز میں میکیاولی کے شاگرد نیٹشے کے اصولوں پر مستقل طور سے اپنی قوت قائم کرنے میں کامیاب ہو جاتے۔ تو ہم اب تک سولھویں صدی کے آغاز ہی میں ہوتے۔ جس زمانے میں ہسپانیہ کے حکمران فخر سے یہ کہا کرتے تھے۔ کہ اُن کی قلمرو کے اندر ایک بھی مُلحد یا ایک بھی باغی موجود نہیں۔ اگر انہی اصولوں کا کامیاب اطلاق مکمل ہو جاتا۔ تو ہم اب تک اُسی حالت میں ہوتے۔ جو کارلوس ثانی کے زمانے میں ہسپانیہ کی تھی۔ جب ملک ویران اور غیر آباد ہو رہا تھا۔ اور ایسی انتہائی مصیبت اور پستی کی عمیق ترین گہرائیوں میں غرق تھا۔ جس سے کسی مہذب قوم کو کبھی واسطہ نہ پڑا تھا۔ اور جس کے نامرد بادشاہ کو خود بھی پیٹ بھر روٹی نہ ملتی تھی۔ قوت کے آخری ثمرات اسی قسم کے ہوتے ہیں۔

قانونِ اخلاق ہی قانونِ قدرت ہے۔ جسم ہائے نامی پر جتنے قوانین حکومت کرتے ہیں۔ اُن کا یہی حال ہے۔ کہ حقائق سے مطابقت کی شرط ضروری ہے۔ یہ اس امر میں قانونِ طبیعی سے مختلف ہے۔ کہ اس کی خلاف ورزی کی جا سکتی ہے۔ لیکن اس سے تجاوز کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ نسلِ انسانی خطرے میں پڑ جائے گی۔ اس کے انتہائی گہرے اور اہم مفادات قربان ہو جائیں گے۔ اور اس کا ارتقا ختم ہو جائے گا۔ انسانی زندگی کے حقائق سے انسانی مطابقت کی شرط "انصاف" ہے۔ یہ محض خود غرضی کا مطالبہ نہیں۔ حفاظت کے لئے کمزور کی فریاد نہیں۔ یہ نسلِ انسانی کے بہتر مفادات کی دعوت ہے۔ یہ اُس رُوح کا اور اُس قوتِ عاملہ کا اظہار ہے۔ جو اس کے ارتقا کو

راستہ دکھاتی ہے۔ اور یہ اتنا ہی عقلی مطمحِ نظر ہے (یعنی موجودہ حقائق کے مطالبات کے مطابق) جتنا کوئی ایسا انسانی منصوبہ ہو سکتا ہے۔ جس سے ہستی کے احوال پر بہتر اختیار و اقتدار حاصل کرنا مقصود ہو۔

(۲)

اخلاقی اور مادّی ترقی

ایک جبلّی اخلاقی حس اور قطعی تحکّم کے تصوّر کے ساتھ ہی ساتھ یہ ناقابلِ یقین مغالطہ بھی قائم رہتا ہے۔ کہ اخلاقی دائرے میں کوئی لازمی ترقی واقع نہیں ہوتی۔ نیک و بد کے اصول مدت دراز سے بدیہی ہو چکے ہیں۔ اور ان میں کوئی تغیّر نہیں ہوا۔ یہ مغالطہ جزوی طور پر اس کیفیت کا نتیجہ ہے۔ کہ اخلاقی ہدایات غیر محدود طور پر لچکدار واقع ہوتی ہیں۔ جب تک کسی قسم کے اخلاقی تصورات موجود تھے۔ ایک ایسا قانون تسلیم کیا جاتا تھا۔ کہ "آدمی کو نیک ہونا چاہئے" اور یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ اس قانون میں کوئی بنیادی اضافہ کبھی نہیں ہوا لیکن بلاشبہ اس جذبے کے حدود کے اندر اخلاقیاتی معیار کا ہر ممکن نمونہ شامل ہے۔ یعنی زمانۂ قدیم کے عبرانی اور "ٹھگ" سے لے کر افلاطون اور آج کل کے انسان تک اس میں شامل ہیں۔ اور دنیا کے بدترین مظالم کا ارتکاب ان لوگوں نے کیا ہے۔ جن کا مقصد و منشا "نیک" بننا تھا۔ یہ اخلاقی اصول بلاشبہ بہت پرانا ہے۔ کہ قتل کا ارتکاب بُرائی ہے۔ لیکن قدیم جُوڈیا میں پہلوٹھے کی قربانی دینا قتل نہیں تھا۔ اور سترھویں صدی میں کسی ساحرہ کو مار ڈالنا قتل نہ تھا۔ بیسویں صدی میں جنگ بھی قتل نہیں ہے۔ یہ اخلاقی اصول قدیم ہے۔ کہ چوری کرنا بدی

ہے۔ لیکن فوجی سلطنتوں کے لئے ایک دوسرے کے مال کی چوری کرنا ہمیشہ قابلِ فخر سمجھا گیا ہے۔ ہر طاقتور طبقے کے لئے اپنے سے کم رتبہ طبقے کا مال چھپانا بالکل جائز و مناسب ہے۔ اور بعض لوگوں کے ذہن میں یہ شبہ اب تک جاگزیں ہے۔ کہ آیا موجودہ معاشری نظام کی بنیاد "جائز و مباح" چوری ہی پر تو نہیں۔ ہر اخلاقیاتی اصول پہلے پہل صرف ایک خاص اور محدود دائرے کے اندر جائز اور قابلِ اطلاق سمجھا جاتا تھا۔ لیکن دوسرے حالات میں اس کی براہِ راست خلاف ورزی نہ صرف جائز سمجھی گئی۔ بلکہ اس کو صحیح اور قابلِ تعریف خیال کیا گیا۔ بعینہ جس طرح مذہبی رواداری کی نیکی جب پہلے پہل منکشف ہوئی۔ تو یہی فرض کیا گیا۔ کہ اس کا کامل اطلاق غیر مسیحیوں ہی پر ہو سکتا ہے۔ نوع انسانی کی اخلاقیاتی تاریخ میں مجرد اصول بہت ہی کم اہمیت رکھتے ہیں۔ اور ان کی عملی تعبیر ہی میں تنوع ہوتا رہا ہے۔ محض اخلاقی پیش پا افتادہ جملوں کا اظہار اور اعادہ اخلاقی ارتقا کے عامل یا اشاریہ کی حیثیت سے قطعی طور پر غیر متعلق ہے۔ لوگ تیرھویں صدی میں بھی اخلاق کے متعلق وہی چکنی چپڑی باتیں کرتے تھے۔ جو آج کل کہتے ہیں۔ وہ لوگ بھی اپنے اِردگرد کی سنگین بداخلاقیوں کی طرف سے اسی طرح اندھے تھے۔ جس طرح آج کل کے اخلاق فروش اُن واضح بداخلاقیوں سے غافل ہیں۔ جو اُن کے روبرو ہو رہی ہیں۔ اخلاقی ارتقا کا پیمانہ حقائق ہی ہیں، محض خوش آیند جملے نہیں۔ اصول اسی حالت میں اہم ہوتے ہیں۔ جب وہ نئے ہوں۔ اور جب صحیح قسم کے اخلاقی انکشافات مروجہ و مسلّم ضوابط کو زیرِ بحث لا کر حقیقی ذہنی بیداری کا ثبوت دے دیں۔

انصاف کی تبلیغ ظلم کے نام پر کی جا رہی ہے۔ آزادی کا پرچار تشدد کے نام پر کیا جا رہا ہے۔ جن لوگوں کے ایک ہاتھ میں انجیل تھی۔

اُنھوں نے دوسرے ہاتھ سے یورپ کو تہ تیغ کرنا شروع کر دیا۔ بالکل اسی طرح جیسے علمائے دینیات نے ریاضیاتی استدلال کی قطعیت پر بے اطمینانی کا اظہار کیا تھا۔ اور اطالوی پادریوں نے اوہام پرستی کی مخالفت کی تھی معلمین اخلاق نے نسبتہً اخلاقیت کی بہتر خدمت کی ہے۔ اس کی ترقی بالکل دوسرے عوامل کی شرمندۂ احسان ہے۔ جو بظاہر اخلاقیت کے دعویدار نہ تھے۔ اخلاق کو جامد اور غیر متحرک سمجھا جاتا رہا ہے۔ کیونکہ اُس نے جب کبھی ترقی کی ہے۔ اس کو کسی دوسرے نام سے موسوم کیا جاتا رہا ہے۔

آج کل تقریباً عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ کہ اخلاقی خیالات اور اخلاق میں بھی ترقی اور پیش قدمی کا اظہار ہوتا ہے۔ اور ان میں ارتقا اور ترقی کے وہی پہلو جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ جو مادی نشو و نما۔ ذہنی ترقی۔ علم اور ارتقا کے دوسرے شعبوں میں واقع ہوتے ہیں۔ یہ امر تو کسی دشواری کے بغیر تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ کہ ترقی کے دوسرے پہلو عقلی فکر کے نتائج ہیں۔ لیکن اگر یہی بات اخلاقی ارتقا کے متعلق کہی جاتے۔ تو بالکل بعید از قیاس اور لغو قرار دی جائے گی۔ اس کے برعکس یہ عام عقیدہ ہے۔ کہ اخلاقی عمدگی اپنی نوعیت اور اپنے ماخذوں کے اعتبار سے ذہنی نشو و ارتقا کی ہر شکل سے کاملاً مختلف اور ممتاز ہے۔ یہ امر بالکل بدیہی طور پر فرض کیا جاتا ہے۔ کہ اخلاقی عمدگی اور ذہنی ترقی دونوں میں کسی قسم کا تعلق نہیں۔ اور یہ ایک دوسری سے بالکل الگ رہ کر ہی ترقی کر سکتی ہیں۔ ہو سکتا ہے۔ کہ ایک معاشرہ ذہنی حاصلات کے اعتبار سے متموّل اور اخلاقی لحاظ سے نادار ہو۔ یا ثقافت و تہذیب کی نظر سے اکھڑ اور اجڈ لیکن اخلاق کے نقطۂ نگاہ سے بلند ہو۔ ان دونوں اوصاف تہذیبات کے درمیان کوئی براہِ راست تعلق موجود نہیں۔ بلکہ یہ تصوّر

بھی خاصا عام ہے۔ کہ یہ دونوں خوبیاں ایک دوسرے سے متضاد ہیں اور اخلاقی عمدگی ہمیشہ فروتر ذہنی حالت کے پہلو بہ پہلو چلتی ہے۔ اور بلند ثقافتی اور ذہنی ترقی اس کو بگاڑ دیتی ہے۔ ترقی یافتہ تہذیب اس کے لئے عموماً ناسازگار ہوتی ہے۔ اور یہ چیز زیادہ تر فروتر ذہن کے لوگوں اور معاشرے کی سادہ۔ قدیم اور بھولی بھالی منزلوں میں پائی جاتی ہے۔

میرا دعویٰ یہ ہے۔ کہ یہ خیالات صحیح نہیں ہیں۔ اخلاقیاتی ترقی انسانی ترقی کے دوسرے پہلوؤں کی طرح نہ صرف عقلی فکر کی نشو ونما اور پھیلاؤ کے پہلو بہ پہلو چلتی ہے۔ بلکہ براہِ راست اُسی کا نتیجہ ہے۔

اس روشن حقیقت سے نہ تغافل کیا جاسکتا ہے۔ اور نہ اس پہ کوئی مُوثر اعتراض ہوسکتا ہے۔ کہ موجودہ زمانے میں اخلاق کے ہر مسلمہ ضابطے کے مسلسل انحطاط کے باوجود اخلاقی بصیرت کے متعلق ذکاوتِ حِس پہلے کی نسبت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اور ان لوگوں کے لئے بے حد پریشان کن ثابت ہوئی ہے۔ جو اُن کے پرانے اور مروجہ نظریات کے علمبردار ہیں۔ جن پر پورے نظام ہائے فکر کی بُنیاد قائم ہے۔ چونکہ عقلی فکر میں بے نظیر نشوونما ہوئی ہے۔ اور ہر دائرے میں تنقیدی روح وسیع ہوگئی ہے۔ اور ہر قطعی مفروضے کو نہایت جرأت سے چیلنج کیا گیا ہے۔ اس لئے گزشتہ تین صدیوں کے اندر تشکک روز افزوں رہا ہے۔ اور یہ تشکک صرف عقاید مذہبی کے متعلق نہیں بلکہ اُن تمام باتوں کے متعلق ہے۔ جن کا کوئی واضح عقلی جواز پیش نہیں کیا جاسکتا۔ آج نہ صرف اِدّعائی مذاہب غائب ہو رہے ہیں۔ بلکہ اخلاق کے ہر روائتی ضابطے اور معیار کو نہایت بیدردانہ تنقید کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ جہاں کہیں براہِ راست انکار کے ساتھ کردار

اخلاق کی پرانی بنیادوں اور معیاروں کو کاملاً مسترد نہیں کیا جاتا۔ وہاں انتشار۔ شک و شبہ اور تذبذب کی حکمرانی ہے۔ لیکن عبوری دور کے تمام پہلوؤں کے ساتھ جو عدم یقین شامل ہے۔ اس کے باوجود یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے۔ کہ اخلاق کے کامل ترین اور صحیح ترین مفہوم کے اعتبار سے جتنا موجودہ زمانہ اخلاق کا پابند ہے۔ ویسا پہلے کبھی نہیں ہوا۔ اس زمانے کے خلاف جتنے اتہام چاہئے۔ لگا لیجئے۔ لیکن یہ یقینی بات ہے۔ کہ عدل۔ انصاف اور انسانیت کے جذبات کو اپیل کرنا جتنا آج کل عام اور قوی الاثر ہے۔ اتنا اس سے پیشتر کبھی نہ تھا۔ بدی۔ ظلم اور بے انصافی کے خلاف آج کل احساس جتنا بیدار ہے۔ ایسا کبھی نہ تھا آج جہاں کہیں تکلیف و مصیبت۔ بدی اور بدعنوانی موجود ہے۔ وہاں معاشرے کے ضمیر کو جس طرح برانگیختہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کی نظیر زمانۂ قدیم میں نہیں۔ بلاشبہ بے انصافی۔ بدعنوانی۔ جرائم و عیوب ازمنۂ سابقہ کی طرح آج بھی موجود ہیں لیکن اس سے قبل ان خرابیوں کو عالمگیر رائے عامہ نے اتنا ملعون و مردود قرار نہیں دیا جس کے مناظر ہمیں آج کل کے زمانے میں نظر آتے ہیں۔ پہلے درجے کی پرہیزگار قوموں میں بھی راستی اور راستبازی اور حیات و کردار کے بلند ترین معیاروں کی اتنی رعایت مدنظر نہ تھی۔ جتنی آج کل ہے۔ ہر موجودہ بدی خواہ وہ کتنی ہی مکروہ ہو۔ نفرین کرنے والی رائے عامہ کا احساس پہلے سے کہیں زیادہ رکھتی ہے۔ یہاں تک کہ انفرادی اور طبقاتی مفادات کی قوی ترین ترغیبات بھی تشدد۔ تکلیف اور بدعنوانی کی کسی صورت سے بھی بے پرواہ ہونے کی جرأت نہیں رکھتیں۔

زمانے کی اخلاقیاتی نشو و نما میں تمام دوسرے جذبات و آرا کے مقابلے میں تعلقاتِ انسانی کے حقائق ثابتہ کا اظہار زیادہ سچائی اور وضاحت

کے ساتھ ہو رہا ہے۔ ہم اکثر آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے کی یورپی تہذیب کا مقابلہ اپنی موجودہ تہذیب کے مادی عجائبات سے کرتے ہیں۔ اور ریلوں اور تیز رفتار جہازوں کے جال۔ تار برقی اور لاسلکی اپنی برقی روشنی اور طاقت۔ اپنی موٹرکاروں اور طیاروں۔ فاصلوں کی فتح۔ صنعت کی حیرت انگیز ترقیات اور روزانہ زندگی کی آسائش کے ساز و سامان پر فخر کرنے کے عادی ہیں۔ لیکن موجودہ مشینری کے عظیم ترین عجائبات اور اٹھارھویں صدی کی کھڑکھڑاتی ہوئی گاڑیوں۔ دھندلی موم بتیوں۔ راٹیوں اور کرگھوں اور ان گھڑ دستی اوزاروں میں اتنا بڑا فرق و تفاوت نہیں۔ جتنا زمانۂ حاضر میں انصاف و انسانیت کے عام تصوّرات و اعمال اور یورپ کے ماضیٔ قریب کے رُجحانات میں پایا جاتا ہے۔ غلاموں کی تجارت پورے زوروں پر تھی۔ غلاموں کے صدہا جہاز لورپول سے روانہ ہوتے تھے چھوٹی قسم کے چور امریکی نوآبادیوں کے ہاتھ پانچ شلنگ فی کس کے حساب سے فروخت کئے جاتے تھے۔ ٹائی برن میں برسرعام مجرموں کو سزائے قتل دی جاتی تھی۔ جو اکثر دکانوں پر چوری کرنے والی عورتیں ہوتی تھیں۔ اور یہ مناظر قتل عوام کے لئے تفریح کا موقع بہم پہنچاتے تھے۔ ملحدانہ کتابیں شائع کرنے والوں کو چیرنگ کراس ٹمپل بار اور رائل ایکس چینج پر کاٹھ مار دیا جاتا تھا۔ اور عوام کو اجازت دے دی جاتی تھی۔ کہ ان کو سنگسار کریں۔ بیگاریں پکڑنے والے ملک میں گھومتے پھرتے تھے۔ مردوں کو بازاروں سے۔ اُن کے گھروں سے اور اُن کی شادی کی مجلسوں سے گرفتار کیا جاتا تھا۔ اور زنجیریں ڈال کر بادشاہ یا انڈیا کمپنی کے جہازوں میں روانہ کر دیا جاتا تھا۔ نیم عریاں عورتیں اور بچے کوئلے کی کانوں میں کام کرتے تھے۔ سکاٹ لینڈ کے کوئلے اور نمک کی کانوں میں کام کرنے والے قانوناً مستقل غلام سمجھے جاتے تھے۔

انگریز شرفا کی ریزانہ تفریح اکھاڑوں اور انعامی مقابلوں سے مہیا ہوتی تھی۔ انگریزی حکومت نے پیٹ (کلاں) کے زمانے میں غیر سرکاری مسلح جہازوں کو اجازت نامے دے دیئے۔ کہ ہالینڈ کے جہازوں کو لوٹ لیں حالانکہ انگلستان اور ہالینڈ کے درمیان کوئی لڑائی نہ تھی۔ برّاعظم یورپ کی حالت اس سے بھی بدتر تھی۔ جاگیرداری نظام اپنے تمام مظالم کے ساتھ نافذ تھا۔ پیرس میں ظلم و تشدد عام تھا۔ اندھا دھند اجازت نامے جاری کئے جاتے تھے۔ آزاد خیال انسانوں کو اُن کی ہر تصنیف پر مظالم کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ بیگاریوں کے جہاز بھرے ہوتے تھے۔ ہسپانیہ میں عدالتِ احتساب (انکوئیزیشن) بیٹھی تھی۔ اور مُلحدوں کو جلانے والی چتائیں ابھی تک چل رہی تھیں۔

یہ نفرت انگیز حالات جن سے ہم کا ملاً نجات پا چکے ہیں۔ یہاں تک کہ اب ان کا واضح تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔ ابھی صرف ماضیٔ قریب ہی میں موجود تھے۔ اور میرا دعوئے ہے۔ کہ یہ حالات موجودہ مہذب یورپی ممالک کے کوائف سے اس قدر متفاوت واقع ہوئے ہیں۔ کہ شائد موجودہ زمانے کی ایکسپرس ٹرین اُن بگھیوں سے اتنی مختلف نہیں۔ جن میں ہمارے آباؤ اجداد سفر کیا کرتے تھے۔ اور یہ بے اندازہ اخلاقیاتی نشو و ارتقا، اُن تمام اثرات کے انحطاط کے پہلو بہ پہلو جاری رہا ہے۔ جن کے سر حسِ اخلاقی کی پرورش کا سہرا ہے۔ اور اُن تمام تنقیدی اور عقلی قوتوں کا عمل بھی جاری ہے۔ جن کے متعلق یہ فرض کیا جاتا ہے۔ کہ حسِ اخلاقی کی نشو و نما کے لئے ناسازگار ہیں لیکن سچ یہ ہے۔ کہ اخلاقی ترقی کا تعلق زمانہ حاضر کے تنقیدی رویے سے ہے۔ اور یہ تعلق محض اتفاقی یا کیفیاتی نہیں۔ بلکہ اُتنا ہی بلا واسطہ ہے جتنی اس زمانے کی سائینسی دریافتیں اور آلیاتی کامیابیاں ہیں۔ مادّی تغیر اور اخلاقی تغیر دونوں ایک ہی سبب کے

اثمات اور ایک ہی علت کے معلول ہیں۔ جاگیرداری کی ہولناکیوں کا خاتمہ اور خلافِ انسانیت ظلم و جور کا سدباب بھی اسی طرح عقلیت کے تنقیدی رویے کے نتائج ہیں جس طرح بطلیموسی نظام اور نظریۂ تنزل کی تنسیخ اس رویے کا نتیجہ ہے۔ بدی اور ظلم کو برداشت نہ کرنا اور عدل و انسانیت پر شدید اصرار کرنا آج کل کے زمانے کو اخلاقی نقطۂ نگاہ سے ادوارِ سابقہ پر فوقیت دیتا ہے۔ یہ اسی فکری و ذہنی عملیات کے نتائج ہیں۔ جن سے ہمیں سٹیم انجن اور ڈائنیمو حاصل ہوتے ہیں۔

(۳)

قوت اور عدل

یاد رکھنا چاہئے کہ زمانۂ حاضر کی اخلاقیاتی روح ہر چیز سے زیادہ عدل و انصاف اور رواداری کے خیالات سے مالا مال ہے۔ اس کی بنیاد خودانکاری۔ ایثار اور جذبات پر مبنی نہیں۔ یہ خصوصیت صرف مذہبی ازمنہ کے اخلاق ہی کو حاصل تھی۔

اولین امر یہ ہے۔ کہ عدل کا عمل اور رویہ لازماً صحیح و درست فہم و تمیز سے وابستہ ہے۔ انصاف و عدالت کے رویے کا تقاضا یہ ہے۔ کہ کہ تمام متعلقہ حالات کا جائزہ لیا جائے۔ ہر معاملے پر معروضی نقطۂ نگاہ سے نظر ڈالی جائے۔ ہر قسم کی جانب داری اور تعصب کو خارج از بحث قرار دیا جائے۔ ذاتی میلان کو کم سے کم دخل ہو۔ یہی ذہنی رویہ ہے۔ جو تنقیدی تمیز کا تقاضا ہے۔ عدالتی ذہن صرف جج ہی کا نہیں۔ بلکہ سائنس دان کا بھی لازمی وصف ہے۔ جب ہمیں منصفانہ سا یک، بے خوف دیانت اور غیر جانب دار فیصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تو ہم اس شخص کی

طرف رجوع کرتے ہیں۔ جو ہمارے نزدیک مُقدمے کے متعلق فراخ دلانہ۔ غیر متعصبانہ اور منطقیانہ زاویۂ نگاہ اختیار کرنے کے قابل ہو۔ اور مفروضہ تاثرات سے مغلوب نہ ہو۔ فوری جذبے سے متاثر نہ ہو۔ رسوم و رواجات سے اندھا نہ ہو جائے۔ اور جذبات کا محکوم نہ ہو سکے۔ یہ فکری ذہن کے وہ اوصاف ہیں۔ جو علمِ صحیح کی تکمیلیت اور اُس کے تنقیدی اور تمیزی استعمال کے لئے ضروری ہیں۔ یہ وہ اوصاف ہیں۔ جو ذہنی دیانت اور مہارت کا سرو سامان ہیں۔ اور عقلی فکر کی لازمی و بنیادی شروط ہیں۔

لیکن تعلق اس سے بھی زیادہ گہرا ہے۔ عدل کے تمام تصوّرات کی بنیاد اس اصولِ اساسی پر ہے۔ کہ تمام افراد کا دعویٰ مساوی ہے؟ لیکن اگرچہ یہ اصولِ اساسی اپنی صورت میں ایجابی واقع ہوا ہے۔ لیکن حقیقت میں اس کے اندر سلبی عناصر کا ایک سلسلہ بھی موجود ہے۔ یہ اُن تمام دعاوی کے استرداد پر مبنی ہے۔ جو محض استحقاقی کردار اور استحقاقی کاروبار سے تعلق رکھتے ہوں۔ ان دعاوی کے پاس اپنے جواز کو ثابت کرنے کے لئے روایات۔ مستحکم مفروضات اور قائم شدہ قوت کے سوا اَور کوئی سَنَد نہیں ہوتی۔ یہ دعاوی تنقیدی امتحان کی ہرگز تاب نہیں لا سکتے اور عقلی جواز و صحت کی بنا پر اپنے اِدّعا کا ثبوت بہم نہیں پہنچا سکتے۔ تنقیدی رُوح کی نشو و نما کا براہِ راست نتیجہ یہ ہے۔ کہ اس قسم کے تمام غیر عقلی دعاوی قطعی طور پر مسترد کر دیئے گئے ہیں۔ اسی تنقیدی انکار و استرداد کا نتیجہ ہے۔ کہ مساواتِ حقوق کا نصب العین قائم ہو گیا۔ اور اسی استرداد پر زمانۂ حال کی رُوحِ عدل اور اس کے اخلاقیاتی نتائج مبنی ہیں۔

مجرد اور منقطع طور پر غور کیا جائے۔ تو فرد کو کوئی حقوق حاصل نہیں ہیں۔ "حق" کے لئے "معاہدہ" ضروری ہے۔ اور اس قسم کا کوئی رسمی یا غیر

تحریری معاہدہ موجود نہیں۔ جو کسی ایسے حق کو ثابت کرے۔ جو زندگی کے متعلق یا عمل۔ فکر یا تقریر کی آزادی یا جائداد کے متعلق پیش کیا گیا ہو۔ یا کوئی ایسا مطالبہ تسلیم کیا جا سکے۔ جو افراد یا طبقات نے حق و انصاف کے نام پر معاشرتی تنظیم سے کیا ہو۔ انسان کے حقوق کا اظہار محض ایک افسانہ اور اَدعائی دعوٰے ہے۔ حق کا وجود صرف باطل کے وجود سے لازم ملزوم ہے۔ اس کیفیت سے الگ کہ بدعنوان لوگ موجود ہیں۔ انفرادی حق کا تصوّر بالکل بے معنی ہے۔ چونکہ اس قسم کے انسان موجود ہیں۔ جنھوں نے اپنی قوت و طاقت کو استعمال کر کے ظلم و تشدد کیا۔ اور دوسروں سے ناجائز فائدہ اُٹھایا۔ اور چونکہ دُنیا میں قاتل۔ ڈاکو۔ لٹیرے اور جابر لوگ موجود ہیں۔ جو بنی نوع انسان کو زیردستی غلام بناتے ہیں۔ اور ان لوگوں کی زندگیوں اور اُن کے ذہنوں کو کچلتے ہیں۔ لہٰذا انہی سے "حقوقِ انسانی" کا تصوّر ظہور میں آیا۔ یعنی یہ حقوق کہ انسان قتل نہ کئے جائیں۔ لُوٹے نہ جائیں۔ استحصال کا شکار نہ ہوں۔ اور پامال نہ کئے جائیں فرد کا حق صرف یہ ہے۔ کہ اُس کے ساتھ زیادتی نہ ہو۔ یہی وجہ ہے۔ کہ سارا اخلاقیاتی قانون کم از کم اپنی ابتدائی اور قدیم شکل میں سلبی اور منفیانہ ہے "تو ایسا مت کرنا"۔ ...... انسانی حق کی توثیق کا مطلب حقیقت میں یہ ہے۔ کہ زیادتی کرنے کے حق سے انکار کر دیا جائے۔ نیٹشے نے بالکل صحیح کہا۔ کہ اخلاقیات اور اخلاقی عمل کا نعرہ کمزوروں یعنی مظلوموں ہی سے شروع ہوتا ہے۔ یہ نعرہ حفاظتی اور احتجاجی ہے۔ "تو ایسا مت کرنا" کا مطلب یہ ہے۔ کہ "مجھے نقصان نہ پہنچانا"۔ ظاہر ہے کہ یہ نعرہ ظالم و جابر کی طرف سے نہیں ہو سکتا تھا۔ کہ وہ اپنے ہی عمل کے خلاف احتجاج کر کے کہے۔ کہ "مَیں ایسا نہ کروں گا"۔ ..... یہ اُن ناانصافیوں اور زیادتیوں کا اظہار ہے۔ جو طاقتور لوگ کمزوروں سے روا رکھتے ہیں۔

مظلوم اور کمزور لوگ اخلاقی اعتبار سے ہمیشہ حق پر ہوتے ہیں۔ جب وہ قوت کے خلاف احتجاج کرتے ہیں۔ تو یہ احتجاج اخلاقی بدی کے خلاف ہوتا ہے جب وہ اپنے مفادات اور اپنے مطلق "حقوق" کا دفاع کرتے ہیں۔ تو یہ دفاع "اخلاقی حق" اور حق پرستی کا دفاع ہوتا ہے۔ اُن کے اور مجرد اخلاق کے مفاد لازماً یکساں ہوتے ہیں۔ معاملے کی نوعیت کے اعتبار سے باغی ہمیشہ حق پر ہوتے ہیں۔ بادشاہ۔ پوپ اور شہنشاہ کے خلاف حق پر تھے۔ نواب اور پادری بادشاہوں کے خلاف حق پر تھے۔ متوسط طبقہ نوابوں اور پادریوں کے خلاف حق پر تھا۔ اور غریب عوام (پرولتاری) متوسط طبقے کی مخالفت میں حق پر ہیں۔ کمزور لوگ اخلاقی اعتبار سے ہمیشہ ہی حق پر ہوتے ہیں۔

تمام اربابِ قوت ہمیشہ اخلاقی لحاظ سے باطل پر ہوتے ہیں۔ بنیادی طور پر قوت اور بدی دونوں ہم زمان وہم مکان ہیں۔ ہر وہ اقتدار جو انسان دوسرے انسانوں پر رکھتا ہے۔ جارحیت ہے۔ یہ اقتدار جو انسانی مسابقت کا مقصد ہے۔ کمزوروں کو نقصان پہنچا کر طاقتوروں کو نفع پہنچانا چاہتا ہے۔ ہر قسم کی قوت عدل و مساوات میں مداخلت کرتی ہے۔ اور غیر منصفانہ اور جابرانہ ہوتی ہے۔ قوت کا استعمال بعض اوقات نظمِ حکومت کے کاروبار میں ضروری ہوتا ہے۔ اور قیادت کو بھی مفید و مبارک بنانے کا موجب ہوتا ہے لیکن ان حالتوں میں بھی وہ اپنی فطرت کو ترک نہیں کر سکتا۔ اور لازماً بدعنوانی اور جبر و تشدد کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

یہ امر مُدّت دراز سے واضح ہو چکا ہے۔ کہ غیر محدود قوت فی نفسہٖ بُری چیز ہے۔ خواہ اس کا استعمال کرنے والا کوئی ہو۔ انگریزوں پر قطعی طور پر روشن ہو چکا ہے۔ کہ اگر غیر محدود اقتدار کسی قوقلی کو بھی دے دیا

جاتے۔ تو اس کا مطلب یہ ہوگا۔ کہ جہنم کے دروازے کھل جائیں گے۔ غیر محدود قوت اس لئے منسوخ نہیں کی گئی۔ کہ حکمران بُرے تھے۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ مطلق اور غیر محدود قوت ہی لازماً بُری چیز ہے۔ لارڈ ایکٹن نے صحیح کہا۔ کہ "قوت بد اطواری پیدا کرتی ہے۔ اور مطلق قوت مطلق بد اطواری پیدا کرتی ہے۔ عظیم انسان (یعنی طاقتور انسان) تقریباً ہمیشہ بُرے انسان ہوتے ہیں۔ خواہ وہ محض اپنا اثر ہی استعمال کر رہے ہوں اور طاقت سے کام نہ لے رہے ہوں۔ اور اگر اس میں اختیار و اقتدار کی بد اطواری کے رُجحان یا تیقن کو بھی شامل کر لیا جائے۔ تو معاملہ اَور بھی زیادہ خراب ہو جاتا ہے۔" انگلستان کی تاریخ میں ولیم اول سے لے کر جارج اول تک شاید ہی کوئی ایسا بادشاہ گزرا ہو۔ جس کے خلاف اگر قتل کے الزام میں عام مجرموں کے معیار کے مطابق مقدمہ چلایا جاتا۔ تو وہ پھانسی کی سزا سے بچ سکتا۔

یہ جان بوجھ کر قوت کے غلط استعمال کا سوال ہرگز نہیں۔ "نہ قوت کی ترغیبات سے متاثر" ہو جانے کا مسئلہ ہے۔ اس میں کسی شخص کے بد اطوار ہونے کا بھی سوال نہیں۔ یہ ایک ناگزیر نتیجہ ہے اس حقیقت کا۔ کہ قوتی فکر کو استعمالِ قوت سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ اور صاحبِ قوت کا ذہن عقلی فکر کے مدار میں حرکت ہی نہیں کرتا۔ اور اس کے ذہنی عملیات قوتی فکر کے بُطلان کی بیماری سے لازماً متاثر ہو جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے۔ کہ وہ نہایت نیک نیتی اور خلوص سے اپنی قوت کو انسانیت کی خدمت میں صرف کرے لیکن تاہم وہ یہ کام محض قوتی فکر کی مدد ہی سے انجام دے سکتا ہے۔ چونکہ وہ قوت کا حامل ہے۔ اس لئے وہ جس طریق سے بھی اس کو استعمال کرے۔ وہی حق ہے۔ قوت کے بے روک استعمال میں بہترین نیک نیتی بھی محض اس لئے باطل ہو جاتی ہے۔ کہ

قوت ایک فرد کی راستے کا آلہ کار ہوتی ہے۔ اور اس حقیقت کا جزو لاینفک ہے۔ کہ راستے اور فیصلے کی قوت باطل ہو جاتی ہے۔ اولیا اور فلسفی بھی مطلق قوت و اختیار حاصل کرنے کے بعد ایک ہذیان بکنے والے مستبد حاکم کی طرح مضر اور ایذا رساں بن جاتے ہیں۔ فرانس کے شہنشاہ لوئی نہم کو نہ صرف کلیسیا نے ولی قرار دیا۔ بلکہ راستے عامہ نے بھی اسے ایسا "تاجدار اولیا" قرار دیا۔ جس کا مقصد وحید حق پرستی اور مفادِ عوام تھا۔ لیکن حقیقت میں وہ پہلے درجے کا ظالم اور جابر انسان تھا۔ اور ہم اس سے قبل اس کے اپنے الفاظ ہی میں بیان کر چکے ہیں۔ کہ خود اپنے فرائض کے متعلق اس کا تصور کتنا دل آویز تھا۔ نشاۃ الثانیہ کے دور میں جو ہستی اپنی پُرسکون دانشمندی۔ مثالیت پرستی اور حلیمانہ جرأت و شجاعت کے اعتبار سے نہایت قدر و احترام کی مستحق تھی۔ وہ سر طامس مور کی شخصیت تھی لیکن جب وہ مختصر سے زمانے کے لئے انگلستان کے چانسلر منتخب ہو گئے۔ تو اُن کا زمانہ نہایت خونیں اور نفرت انگیز جبر و تشدد سے لبریز رہا۔

جو کچھ مطلق قوت کے متعلق صحیح ہے۔ بالکل وہی ہر قسم اور ہر درجے کی قوت کے متعلق صحیح ہے۔ خواہ وہ استحقاق کی قوت ہو۔ خواہ قوت بازو۔ یا دولت یا محض ذہنی و دماغی برتری کی قوت ہو۔ اور خواہ کسی حکمران یا کسی اہلکار۔ یا پادری یا کسی شورہ پشت خطیب کی قوت ہو۔ اس کا نتیجہ ہمیشہ ناانصافی ہوتا ہے۔ اس لئے نہیں۔ کہ انسان بد اطوار اور بدنیت ہیں۔ بلکہ اس لئے کہ قوت اخلاقی راستے اور فیصلے کو فاسد کر دیتی ہے کسی مطلق العنان حاکم کی قوت کو کسی اعتبار سے بھی بدترین خرابی نہیں کہا جا سکتا۔ کسی طبقے کی قوت اس سے بہت زیادہ ایذا رساں قوت ہوتی ہے۔ کیونکہ اس سے مسلمہ اخلاقیت کی جو سند مل جاتی ہے۔ وہ اس طبقے

کی تعدادی طاقت سے متناسب ہوتی ہے۔ بدترین اور اخلاقی اعتبار سے مکروہ ترین ظلم وہ ہے جو اکثریت کا ظلم ہو۔

آئرلینڈ کے باشندوں کا یہ کہاوتی رویہ کہ "حکومت ہر حال میں قابلِ الزام ہے"۔ اس عالمگیر قانون کا اظہار ہے۔ کہ ہر قسم کی قوت خواہ اس کا استعمال کرنے والا کوئی ہی ہو۔ غلط کاری اور ناانصافی کی طرف مائل ہوجاتی ہے۔ لہٰذا حق کی حمایت پر رہنے کے لئے ("دس اور ایک" کے تناسب سے مواقع ہیں) بہترین رویہ یہی ہے کہ "حکومت کے خلاف" رہو۔

(۴)

قوت کا "جبلّی شعور"

بنیادی طور پر اخلاقیت صرف قوت کے خلاف احتجاج اور مزاحمت کا نام ہے۔ محض فطری حالت میں طاقتور آدمی کو کمزور کو پیٹنے بدسلوکی کرنے۔ چھیننے۔ لوٹنے اور مارنے کی قوت حاصل ہوتی ہے۔ کون سی چیز ہے۔ جو اس کو ان حرکتوں سے روک سکتی ہے؟ کوئی جذبہ کوئی مطلق تحکم یا ہمدردی اس کام کو انجام نہیں دے سکتی۔ جب تک اخلاقی روایت نشو و ارتقا حاصل نہ کرلے۔

فطری اور جبلّی اخلاقی شعور کوئی چیز نہیں۔ شعور ایک معاشرتی پیداوار ہے۔ طاقتور آدمی کسی قسم کے شعور سے مجبور نہیں ہوسکتا۔ بلکہ اس کے برعکس اس کے احساسات اپنی طاقت کے شعور اور اس کی نمائش پر بیحد مسرور ہوتے ہیں۔ وہ اپنے مظلوموں کی کھوپڑیاں اپنے خیمے کے باہر لٹکا دیتا ہے۔ اور اپنی تباہ کاری کے نتائج کی کھلم کھلا نمائش کرتا ہے۔

اُس کے شاعر اُس کی قصیدہ خوانی کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔ کہ اس کی طاقت کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ وہ "ہیرو" بن جاتا ہے۔ شعراء ایکین دربار سے "آئس لینڈک ہال" تک اس کی تعریفیں گاتے ہیں۔ مورّخ اس کو نجیب و اشرف قرار دیتا ہے۔ پھر ایک اور زمانہ آتا ہے جس میں اُسے "کامیاب انسان" قرار دیا جاتا ہے جس کو سر سیموئل سمائلز "اپنی مدد آپ کرنے والا" کہتے ہیں۔ ساگا کی داستان میں جادل کی شرمیلی بیٹی آینجل کی طرف سے شادی کی درخواست پر حقارت سے طعنہ زن ہوتی ہے۔ کہ "تو نے کبھی بھیڑیوں کو گرم گوشت مہیا نہیں کیا۔ پورے موسم خزاں میں کوئی گدھ تیرے مقتولوں کی نعشوں پر منڈلاتا ہوا نہیں دیکھا۔ لیکن اینجل نہایت غرور سے یہ نغمہ گا کر اُس کو جیت لیتا ہے "میں اپنی خون آشام تلوار ہاتھ میں لے کر آگے بڑھا۔ اور گدھ میرے پیچھے پیچھے اُڑتے گئے۔ ہم نہایت غضب ناکی سے برسرِ پیکار ہوتے۔ اور انسانوں کے گھروں کو آگ چاٹ گئی۔ جو انسان دروازوں پر پاسبانی کر رہے تھے اُن کو ہم نے خاک و خون میں سُلا دیا" اٹلی کی چودھویں اور پندرھویں صدیوں کے اورسفورزا۔ وسکونٹی۔ بیگلیونس اور ملاطستا کے وحشی درندوں کی انتہائی ستم پیشگی اور غداری صرف اُن کی اپنی نظروں ہی میں شجاعانہ اور عظیم الشان نہ تھی۔ بلکہ بیگلیونی کے مؤرخ ماتا رازو نے ان بدمعاشوں کی مدح و ثنا میں تمام تعریفی الفاظ ختم کر دیئے ہیں۔ گریفانیٹو نے محض ناموری کی خواہش کے ماتحت اپنے تمام رشتہ داروں کو نیند کی حالت میں قتل کر دیا۔ ایسٹور کا مقابلہ مریخ (جنگل دیوتا) سے کیا جاتا ہے۔ اور گیان پاؤلو جس نے دوسروں کی طرح اپنے بہت سے اقارب کو اور اپنی بیوی کو "قتل کے گھاٹ اتار دیا"۔ ایک ایسا دلیر و شجاع نائٹ سمجھا جاتا ہے۔ جس میں خدائی قابلیتیں تھیں"۔ اب اخلاقیت کے اتنے دُور گزر جانے

کے بعد بھی کیا کرو پتی استحصال پیشہ انسان ضمیر کے وسوسوں سے متاثر ہوتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ اس کے برعکس وہ اپنے اعمال پر حد سے زیادہ فخر و ناز کرتا ہے۔

قوت اور اس کے ہر غلط استعمال اور ہر بدکاری کا جبلّی و نفسیاتی لازمہ صرف فخر و غرور ہے۔ کوئی حِس ندامت یا "مجرم ضمیر" کا احساس نہیں۔ غرور قوت کا لازمہ ہے۔ غرور و پندار اور نمود و نمائش کی ہر شکل قوت اور بے انصافی کی نمائش ہے۔ مطلق العنانی کا غرور۔ اشرافیت کا غرور۔ فوجی غرور۔ عالی نسبی کا غرور۔ دولت کا غرور۔ یہ سب قوت کے غلط استعمال کی تجلیل و تعظیم ہے۔ کیا یہی پندار صاحبِ قوت کا آخری اور مستقل ترین وصف نہیں؟ کیا یہ اس کی آخری کمزوری نہیں؟ جب صاحبِ قوت سے سب کچھ چھن جاتا ہے۔ اور وہ انصاف کا تختۂ مشق بنتا ہے۔ تو پھر بھی اُس کے سر پر شان و شوکت کا ایک سُنہری ہالہ آخر تک قائم رہتا ہے۔ وہ شاندار ادائے ناز سے اپنے آس پاس کے انسانوں سے کہتا ہے: "مَیں نے تم سے کُتّوں کا سا سلوک کیا تھا!"

قوت کا "جبلّی شعور" اسی قسم کا ہوتا ہے۔

دوسرا باب

اخلاقیت کی ابتدائی اور ثانوی پیدائش

۱

اخلاقیات کی ابتدائی پیدائش

جو انسانیت قوت کے استعمال سے مسرور و مطمئن ہو جس کا شعور ظلم و تشدد کے افعال پر سرشار ہو جاتا ہو۔ جو ہر قسم کی فطرت اور ہر قسم کی حیوانیت کی طرح بیدرد ہو۔ اور قوت اور عیاری کو قابل تعریف قرار دے۔ ایسی انسانیت میں اخلاقی شعور پیدا ہی کیونکر ہو سکتا ہے؟ یہ کیسے ممکن ہے۔ کہ کوئی امتناع آموز تصور فطرت کو جھٹلا کر اور قوتی فکر کے ناگزیر فیصلوں اور قدروں کا ابطال کر کے اپنے آپ کو ظاہر کرے۔ وجود میں آئے۔ اور نشو و ارتقا حاصل کر سکے۔

اس عجیب منظر کے دو الگ الگ ماخذ ہیں۔ جو ایک دوسرے کے جدا سامنے آتے ہیں۔ ایک ابتدائی ہے۔ جو زمانۂ قدیم کے "گلے" میں نمودار ہوا۔ اور ایک ثانوی جو تقسیم شدہ معاشرے میں ظاہر ہوا۔

اخلاقیت کی ابتدائی پیدائش قدیم انسانی گلے کے اندر ایک نہایت

تو دکا ما ورنا گزیر طریقے سے ہوئی ۔ طاقتور انسان میں تشدد اور قتل کا جو رجحان تھا ۔ وہ بہت جلد ا زقدرتی طور پر تمام کمزور انسانوں کے لئے خطرہ سمجھا گیا ۔ اور راستے یہ ہوئی ۔ کہ وہ شخص سب کے لئے خطرہ ہے اس کو روکنا اور اُسے "سزا دینا" چاہئے ۔ اگر طاقتور آدمی دیوانہ ہو جائے ۔ اور اندھا دھند مار دھاڑ شروع کر دے ۔ تو اُس کو بھی بہت سے لوگ جمع ہو کر مغلوب کر سکتے ہیں ۔ اور چونکہ قبیلے کا ہر فرد خواہ وہ کتنا ہی طاقتور ہو کسی وقت دوسرے کے مقابلے میں قاصر و عاجز ہو سکتا ہے ۔ لہٰذا بہت جلد یہ اصول مسلّم قرار پا گیا ۔ کہ قبیلے کا کوئی فرد دوسرے فرد کو نہ مارے پیٹے اور نہ قتل کرے ۔ تورات کا چھٹا "حکم" ۔ اسی طرح ساتواں (کیونکہ عورت زمانۂ قدیم میں جائداد ہی سمجھی جاتی تھی) اور آٹھواں بل جل کر زندگی بسر کرنے والے حالات میں خود بخود نافذ العمل ہو گئے ۔ یہ احکام محض حالات و کوائف کی وجہ سے قائم ہو گئے ۔ اور اُس زمانے میں قائم ہوئے ۔ کہ ابھی نہ تقریری زبان پیدا ہوئی تھی ۔ نہ فکر میں کوئی ضابطہ نمودار ہوا تھا ۔ بلکہ ابھی انسانیت بھی معرض ظہور میں نہ آئی تھی

جب اپنی حفاظت کی غرض سے کسی خطرناک فرد کی سرکوبی مدنظر ہو ۔ تو قدرتی طور پہ پہلے تو خوف و احتیاط کا احساس ہوتا ہے ۔ پھر وہ خفگی اور "حق پرستانہ غیظ" میں مبدل ہو جاتا ہے ۔ خطرناک آدمی "بدکار اور بدنیت آدمی" بن جاتا ہے ۔ دوسری طرف قوم کی ناراضی کا خوف یہ اثر پیدا کرتا ہے ۔ کہ افراد اس کی خفگی کو برانگیختہ کرنے سے اجتناب کرتے ہیں ۔ یعنی جس شخص کو یہ "ترغیب" بھی ہو ۔ کہ اپنی طاقت سے کام لے کر دوسرے کو مغلوب کرے ۔ وہ بھی نتائج کے خوف سے باز رہتا ہے ۔ کیا وہ باقی قبیلے کے ساتھ دوسروں کی مطلق العنانی کے افعال کے خلاف "حق پرستانہ غیظ" کا اظہار نہیں کر چکا تھا ؟ نتائج کے خوف کے

کے ساتھ ہی ایک بااصول شرم کا احساس بھی شامل ہو جاتا ہے۔ یہ امتناعی اصول ضمیر، عزتِ نفس اور وقار کا سوال بن جاتا ہے۔ جب کوئی طاقتور انسان محسوس کرتا ہے۔ کہ میں کمزور کے ضعف سے فائدہ اٹھانے کی قابلیت رکھتا ہوں۔ تو اس کی خود پسندی اور اس کی نیک نامی کی خواہش[2] (ایک قسم کا احساس جو قدیم انسان میں اسی طرح شدید تھا۔ جس طرح بچوں میں ہوتا ہے) اس کو اس سے باز رکھے گی۔ وہ بُرا نہیں کہلانا چاہتا۔ وہ عوام کے غیظ کا نشانہ بننے سے پرہیز کرے گا[1]

برسبیل تذکرہ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ وقار و سوال (بحیثیت ایک اخلاقی مقصد کے) ہمدردی اور انسانیت کے ہر احساس سے بہت زیادہ پرانا۔

---

[1] دیکھو ویسٹر مارک کی کتاب Origin of moral Ideas جلد دوم صفحات ۱۳۸-۱۳۹۔

[2] میں یہ تسلیم کرنے کو تیار ہوں۔ کہ اخلاقی امتناع کے قدیم ارتقا میں بعض دوسرے عناصر بھی شامل ہیں۔ میرا مقصد یہاں صرف اس امر کو بیان کرنا ہے۔ جس کو میں اس ارتقا کا لازمی اور بنیادی خاصہ سمجھتا ہوں۔ مذہبی خیالات اس عمل میں ابتدائی اور ممتاز پارٹ ادا کرتے ہیں۔ فریزر (Psyche's task) نے ثابت کیا ہے۔ کہ کسی مقتول کے بھوت کا خوف بھی احساسِ امتناع کی ایک عام اور وسیع الاثر شکل ہے اور یہی اثر ان (taboo) ممنوعات کا ہے جو مملوکات اور جنسی تعلقات پر عائد ہیں۔ لیکن یہ دیکھنا مشکل نہیں۔ کہ یہ مذہبی خیالات حقیقت میں برادری کے اس خود حفاظتی اور مخالفانہ رویے کا اظہار و اعلان ہی ہیں۔ جو اس نے تشدد کے خلاف اختیار کر رکھا ہے۔ مذہبی خیالات دراصل ثانوی اور ماخوذ ہیں۔ یہ تو انہی چیزوں پر سزا دیتے ہیں۔ جو انسانوں کو ناپسند ہوتی ہیں مذہبی احساسات سے اخلاقیت کو زبردست مدد تو ملتی ہے۔ (لیکن وہ اس کو پیدا نہیں کرتے) مثلاً "برے" آدمی کو محض غیظ و غضب ہی سے نہیں دیکھا جاتا۔ بلکہ وہ اوہام پرستانہ خوف و ہیبت کا باعث بھی سمجھا جاتا ہے۔

قدیم اور ابتدائی ہے۔ مثلاً سامی نسل کے لوگوں میں وقار کے مناسبطے پر سختی سے عمل کرنا مہمان نوازی کے قاعدوں کی طرح ضروری تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی بیدردانہ درندگی بھی شامل ہوتی تھی۔ مثلاً جب یعقوب ڈاکو نے شہزادہ سیستان کے خزانے پر رات کے وقت چھاپا مارا۔ اور ایک نمک کے ڈھیلے سے ٹھوکر کھائی۔ (نمک مہمان نوازی کی علامت ہے) اور اتفاقاً اس کو چکھ بیٹھا۔ تو کسی قسم کا مال لئے بغیر واپس چلا گیا۔ اگر کوئی شخص خیمے کی کسی طناب سے ٹھوکر کھا جائے۔ تو خواہ وہ اجنبی کسی ایسے قبیلے سے ہو جس کے ساتھ "خونی جنگ" جاری ہو۔ ضروری ہے کہ اس کے ساتھ مقدس مہمان کا سا سلوک کیا جائے وغیرہ وغیرہ [1] اسی طرح یورپ کے بربری عہد میں متواتر اس قسم کی مثالیں ملتی ہیں۔ کہ ایک ہی انسان سے فیاضی و فراخدلی کے افعال بھی سرزد ہوتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی پہلے درجے کی اندھا دھند شیطانی حرکات بھی صادر ہوتی ہیں۔

اخلاقیات کی ابتدائی پیدائش کی سادہ اور قدرتی ساخت کا واضح ثبوت اس حقیقت سے ملتا ہے۔ کہ جہاں جہاں ایسے تعلقات اور اسباب معرض عمل میں نہیں آتے۔ وہاں کوئی اخلاقیت۔ کوئی تصور اخلاقیت اور کوئی شعور پیدا ہی نہیں ہوا۔ جن اسباب نے کسی برادری کے افراد پر مؤثر ہونے وقت خودبخود ان تصورات کو پیدا کیا ہے۔ وہ قبیلوں اور قوموں کے باہمی روابط میں موجود نہ تھے۔ اور نہ مصروف عمل ہوتے لہٰذا ایسی کوئی شے نہیں۔ جسے "بین الاقوامی اخلاقیت" کہا جا سکے۔ یہاں طاقتوروں کے خلاف کمزوروں کا ارتباط بہت زیادہ مشکل اور غیر یقینی ہے۔ ایک قبیلے یا ایک ریاست کو واضح طور پر اس امر کا احساس

[1] مزید مثالوں کے لئے دیکھو ڈبلیو رابرٹسن سمتھ کی کتاب *Kinship & marriage*

نہیں ہو سکتا تھا۔ کہ کسی دُور کے قبیلے کے خلاف جو چیرہ دستی ہو رہی ہے وہ خود اُس کے لئے خطرہ ہے۔ وہ سمجھتی تھی۔ کہ مصیبت کو خود دعوت دینا اور تصادم کے امکان کو یقین میں بدل دینا میرا کام نہیں خطرے میں مبتلا ریاستوں کو کسی امکانی حملہ آور کے خلاف متحد کرنا نہایت پیچیدہ ڈپلومیٹک عمل تھا۔ اور اکثر حالات میں اس امر کی کوئی ضمانت نہ تھی۔ کہ وہ اتحاد حصولِ مقصد کے لئے کافی مضبوط ہو گا نتیجہ اس کا یہ ہُوا۔ کہ کوئی ایسی چیز معرض وجود میں نہ آئی۔ جسے" بین الاقوامی اخلاقیت" کہا جا سکے۔ لہٰذا یہ انسانی تعلقات اب تک (یا ماضی قریب تک) قطعی طور پر نہایت قدیمانہ اور وحشیانہ بداخلاقی کا مظہر رہے ہیں۔ وہی افعال جو اخلاقِ معاشری کے اعتبار سے سخت ناپسندیدہ سمجھے جاتے ہیں۔ بین الاقوامی تعلقات میں اُن کی بڑی تکریم و تعظیم کی جاتی ہے۔ ضمیر یا شعور کا کوئی سراغ کہیں نظر نہیں آتا۔ غداری۔ چوری اور قتل جس طرح قوت کی قدیم نفسیات میں عیب نہ تھے۔ بلکہ محاسن سمجھے جاتے تھے۔ وہی کیفیت اب تک قائم ہے۔ اٹلی اور یورپ میں" توازنِ طاقت" کا جو عقیدہ قائم ہُوا۔ اس کی وجہ سے ایک ایسا اصول نافذ العمل کیا گیا۔ جو عملاً زمانۂ قدیم کے" گلّے کے توازن" سے مشابہ تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا۔ کہ بین الاقوامی حق اور بین الاقوامی قانون کے بعض تصورات وجود میں آ گئے۔ لیکن یہ چیز اپنے عمل میں واضح طور پر نہایت خام اور غیر مؤثر تھی۔ آج ایک مجلس اقوام قائم کی جا رہی ہے۔ تاکہ اُسی ساخت کو مجموعی طور پر تعمیر کرنے کی کوشش کی جائے۔ جس نے دُنیا میں سب سے پہلے خود بخود اخلاقیت کا تصور قائم کیا تھا۔

(۲)

اخلاقیت کی ثانوی پیدائش

ایک حقیقت جو اخلاقی ترقی کے تصور میں دشواری کا باعث ہے۔ یہ ہے۔ کہ بہت سے ادنیٰ ترین قومیں اور نہایت وحشی قبائل مہذب برادریوں کے مقابلے میں زیادہ پابند اخلاق ہیں۔ اور یہ ایک معنی میں بالکل صحیح ہے۔ وہ اس لئے پابندِ اخلاق ہیں۔ کہ ان میں بد اخلاقی کے حالات مفقود ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے حیوان انسانوں کے مقابلے میں زیادہ پابندِ اخلاق ہوتے ہیں۔ ابتدائی حالت میں مل جل کر رہنے والوں کے قوانینِ اخلاق کے خود کار عمل ہی میں مکمل اخلاقیت محفوظ رہتی ہے۔ جب تک یہ حالت قائم ہے۔ اخلاقیت بالکل محفوظ ہے۔

لیکن جونہی کسی شکل میں شخصی یا طبقاتی قوت معرض وجود میں آ گئی۔ اور جونہی کوئی فرق و تفاوت پیدا ہوگیا۔ (مثلاً فاتح اور مفتوح۔ پادری اور عامی۔ مالک اور غیر مالک کا تفاوت) فی الفور اخلاقی پرہیزگاری کی ابتدائی حالت کی پوری بنیاد قطعاً تباہ و برباد ہو جائے گی۔ اس لئے ایسا کوئی اصول موجود نہیں۔ کہ طاقتور آدمی اُن لوگوں کے ساتھ جو اس کی گرفت میں ہیں۔ کیوں اپنی مرضی کے مطابق سلوک نہ کرے۔ اس کے ہم مسلک آقاؤں کے عمل یا رائے سے تو کوئی امتناع وجود میں نہیں آئے گا۔ اس کے برعکس اُن کا مفاد اسی میں ہے۔ کہ اُن کی قوت اور اُن کے استحقاق کی حمایت ہو۔ اور ہر تصور۔ ہر تخمینہ اور اخلاقی اقدار کا ہر نظام جو اُن کے ہاں رائج ہوتا ہے۔ بڑی شدت سے اُن کی حمایت کرتا ہے۔ مروجہ رائے یعنی مقتدر طبقے کی اخلاقیت جارح

اور جبیرہ دست کی پُرزور تائید کرتی اور اُس کو حق بجانب قرار دیتی ہے۔

اب ہمیں گویا اخلاقیت کی دوسری پیدائش سے سابقہ پڑتا ہے۔ جو اس وقت اخلاقیت سے بالکل علیحدہ اور ممیّز ہوتی ہے۔ جو مِل جُل کر رہنے والے معاشرے میں خود بخود پیدا ہو گئی تھی۔ جب مقتدر قوتوں اور استحقاقوں کا نظام بالکل اُسی قسم کی منظم آرا سے حمایت و حفاظت حاصل کر کے مخلوط اور مساواتی معاشرے کو نابود کر دیتا ہے۔ تو باہم احتراز و اجتناب کا قدیم قانون بے عمل اور بے اثر ہو جاتا ہے۔

لُطف یہ ہے کہ مخلوط معاشرے کی ابتدائی اخلاقیت درحقیقت اُس بداخلاقی کے لئے سازگار ہوتی ہے۔ جو قوت کی تفریق و تقسیم سے پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ یہی اُسے اخلاقی اقدار مہیا کرتی ہے۔ اور "نیک و بد" اور "صحیح و غلط" کے وہ عجیب و غریب الفاظ جو اُس نے خود پیدا کئے تھے اُس کے حوالے کر دیتی ہے۔ تو قوتی فکر ان اقدار کو فی الفور اخذ کر کے اُن کو نئے سانچے میں ڈھال دیتا ہے۔ چنانچہ یہی الفاظ فی الحقیقت اس کے آلۂ کار کا کام دیتے ہیں۔ اور اس کی بداخلاقی کو جائز قرار دینے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ قائم شدہ قوت فی الفور "نیک اور صحیح" بن جاتی ہے۔ اور اس کے مزاحم۔ سرکش اور باغی کو "بد اور غلط کار" قرار دیا جاتا ہے۔ "ضمیر کی بدی" کا شکار وہی ہوتا ہے۔ ظالم و جابر نہیں ہوتا۔

یہ وہ صورت حالات ہے۔ جو اخلاقی ترقی کے امکانات کے لئے بہت مایوس کن ہوتی ہے۔ یہ صورت حالات نہایت ابتدائی مرحلوں کے بعد انسانی روابط کی متعین دُنیا میں پیدا ہوتی ہے۔ نہ صرف لازماً بداخلاق قوت خود اقتدار پر متمکن ہوتی ہے۔ اور اسے اپنے دفاع کے کسی عمل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بلکہ اخلاقی اقدار خود بھی اس کے قوتی فکر سے بالکل متغیر ہو جاتے ہیں۔ اور اپنی ابتدائی اہمیت سے منحرف ہو کر بداخلاقی کے حامی

بن جاتے ہیں۔ وہ بالکل منقلب ہو جاتے ہیں۔ غلط صحیح ہو جاتا ہے اور صحیح غلط۔ یہ دروغ باقی اپنے آپ کو راستی کیوں کر بنا سکتی ہے؟ ابتدائی اقدار دوبارہ کیونکر قائم ہو سکتے ہیں؟ اور اخلاقیت کی دوسری پیدائش کس طرح معرض ظہور میں آسکتی ہے؟

آخر یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ اس کا ایک ہی طریقہ ہے۔ وہی طریقہ جس سے قدیم اخلاقیت نے اپنے آپ کو عائد کیا تھا۔ وہی طریقہ جس سے اہل قوت نے اپنے منشا اور اپنی اخلاقیت کو نافذ کیا تھا۔ اور وہ ایک ہی طریقہ ہے۔ کہ جسمانی قوت سے کام لیا جائے۔ جس طرح انسانی تعلقات کا موجودہ نظام اپنی بد اخلاقی میں ظلم و جور کی فولادی قوت کا نمایندہ ہے۔ اسی طرح اپنے اخلاقی پہلو میں بغاوت و انکار کی فولادی قوت کا ترجمان ہے۔ ہر انسانی حق اور انسانی روابط میں انصاف کے نشوو ارتقا کا ہر قدم اہل قوت کی گرفت سے بالکل جسمانی قوت ہی کے بل پر چھینا جا سکتا ہے۔

لیکن یہاں ایک بہت بڑی دشواری پیش آتی ہے۔ قائم شدہ قوت کی حفاظت ایک ایسے عظیم نظام دفاع سے کی جاتی ہے۔ جس کا مقابلہ جسمانی طاقت سے نہیں ہو سکتا۔ یہ حفاظت قوتی فکر اور اس کے جھوٹے اقدار کی ہوتی ہے۔ اور یہ ہتھیار اتنا مہیب ہے۔ کہ جسمانی طاقت اس کے سامنے تقریباً بے اثر ہو کر رہ جاتی ہے۔ ظالم و جابر لوگ کبھی اس امر کو تسلیم نہیں کرتے۔ کہ ان کی قوت کی حقیقی بنیادیں جسمانی قوت ہی پر کھڑی ہیں بلکہ ہمیشہ اس قوت کو جائز اور حق بجانب قرار دینے پر مصر ہوتے ہیں۔ اور اسے حق اور حق پرستی پر مبنی سمجھتے ہیں۔ بالکل یہی حالت مظلوموں کی ہے۔ وہ جتنی مدت تک قوتی فکر کے زیر اثر ہوتے ہیں۔ اپنے جابروں کے وفادار رہتے ہیں۔ اور ان کی خاطر مشقت کرنا۔ لڑنا اور جانیں دینا ایک مقدس فرض

اور عزو وقار کا باعث سمجھتے ہیں۔ غلام۔ مزارع اور مشرقی یا جاگیردارانہ نظام کا حلقہ بگوش تکلیف بھی اٹھاتا ہے۔ اور فریاد بھی کرتا ہے لیکن نہ اپنے حاکم جابر کے اقتدار سے انکار کرتا ہے۔ نہ اُس کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرتا ہے۔ بلکہ اس کے برعکس اگر آقا کی طاقت پر کوئی حملہ ہو تو نہایت شرم و ندامت محسوس کرتا ہے۔ وہ اپنے مصائب پر نوحہ خوانی کرتا ہے۔ تو اُس کا انداز بالکل ویسا ہی ہوتا ہے۔ جیسے کسی زلزلے یا طوفان کی مصیبتوں پر فریاد کی جاتی ہے۔ اور اس میں کسی انکار یا سرکشی کا خیال بھی نہیں ہوتا۔ ظالموں اور جابروں کو جو جسمانی طاقت حاصل ہوتی ہے۔ وہ مظلوموں کی وفاداری ہی نے ان کو مستعار دی ہے۔ انھوں نے اپنی آقائی استعمال کرنے میں ذہنی و اخلاقی نظریات کی قوت ہی سے کام لیا ہے۔ کسانوں کی فوجیں اپنے اپنے زمینداروں کے خاندانی جھگڑوں میں ایک دوسرے کو قتل کرتی ہیں۔ اور "محبّتِ وطن" سے سرشار ہوتی ہیں۔ آوبندی کا کسان اُن لوگوں کے خلاف غیظ و غضب کا پیکر بن جاتا ہے۔ جو اُس کو اُس کے ظالم آقاؤں سے آزاد کرانا چاہتے ہیں۔ روسی مزارع اپنے "چھوٹے باپ" کی پرستش کرتا ہے۔ ظالموں کے ساتھ مظلوموں کی وفاداری سے زیادہ الم انگیز اور دردناک کوئی چیز نہیں۔

آج جب کہ پرولتاری طبقے کی بغاوت کی گرج واضح طور پر سنائی دے رہی ہے۔ ہمیں بعض اوقات باغیوں کی دریدہ دہنی اور بے ادبی۔ اُن کی وحشیانہ بے احترامی اور اُن کی "بداخلاقی" سخت ناگوار گزرتی ہے۔ لیکن اصلی حیرت انگیز چیز یہ ہے۔ کہ غریب لوگ بدستور عاجز اور مؤدب ہیں۔ وہ بدبخت جانتے ہیں۔ کہ اُن کا مقام کیا ہے۔ اور انھیں اپنے سے بہتر انسانوں کے ساتھ کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ وہ بدستور شرفا و امرا کے شکرگزار اور تابع ہیں۔ باغی کے وحشیانہ طرز سے ہمارے احساسات مجروح

ہوتے ہیں لیکن ہم یہ کیونکر برداشت کرسکتے ہیں ۔کہ غریبوں اور جاہلوں کے احترام سے دولتمندوں اور تعلیم یافتہ لوگوں کے سروں پر الگارے برسائے جائیں ۔کیا اس کا مطلب یہ ہے :کہ اُن کی ناداری اور جہالت لائقِ ملامت نہیں ہے ؟

جب تک استحقاق کی وہ بُنیادیں جو عقل و ادراک سے بالاتر تھیں ۔بلا اعتراض تسلیم کی جاتی رہیں ۔مساوات اور حق و انصاف کے دعاوی نہ پیدا ہوسکتے تھے ۔ اور نہ پیدا ہوئے ۔جب تک بادشاہی کے "خدائی حق" سے کوئی انکار نہ کرتا تھا ۔ہر ظلم و ستم بے کھٹکے کیا جا سکتا تھا ۔جب تک جاگیرداری قوت کو ایک مافوق الانسان اور مستقل نظام تصوّر کیا جاتا تھا ۔ہر وہ ظلم جو مطلق العنان اقتدار سے پیدا ہوتا ہے ۔برابر بلا اعتراض جاری رہ سکتا تھا لیکن دردرسیدہ لوگوں نے اُس وقت بغاوت کی ۔جب اُن کو نظر آگیا کہ جس چیز کو وہ "مقدس حق" سمجھتے تھے ۔ وہ باطل تھا ۔اور جس چیز کو انھیں "راستی" سمجھنے کی تربیت دی گئی تھی ،وہ نہایت ظالمانہ ناراستی تھی"۔ غلط کاری" کا خاتمہ اُس وقت ہوتا ہے ۔جب غلط کو صحیح ثابت کرنے والے جھوٹ کی بُنیادی غیر معقولیت کا راز فاش ہو جاتا ہے ۔مظلوموں نے سخت سے سخت ظلم یا ناانصافی کے خلاف صرف اُس وقت بغاوت کی ہے ۔جب اُن پر یہ واضح ہوگیا کہ وہ سلوک غیر عقلی تھا اور کذب و دروغ پر مبنی تھا۔

(۳)

ذہنی تیاری کی ضرورت

وہ ذہنی دُنیا جو طاقتوروں کے حاکمانہ مفاد سے ہم آہنگ ہونے کے لئے تخلیق ہوئی ہے ۔لازماً باطل ہے "لازماً" اس لئے کہ جو چیز قانونِ قدرت

سے ہم آہنگ نہ ہو۔ اور غیر منصفانہ ہو۔ وہ خیالات وواقعات سے حق بجانب قرار نہیں دی جاسکتی۔ چونکہ ایسی چیز خود ہی غیر مطابق ہوتی ہے۔ اس لئے اس کا نظریہ بھی حقائق اشیا کا ہم آہنگ نہیں ہوسکتا۔ غلط کاری کو صرف جھوٹ ہی سے حق بجانب اور جائز قرار دیا جاسکتا ہے۔ غلط کاری اور جھوٹ دونوں بالکل باہم ملے ہوتے ہیں۔ اور جس سے غلط سلوک ہوا ہو۔ وہ خود غلط کار پر حملہ نہیں کرتا۔ بلکہ عقلی فکر ہی ہے۔ جو باطل پر حملہ آور ہوتا ہے۔ جس عمل سے عدل کو قائم کیا جاتا ہے۔ وہ محض طاقت کا مقابلہ نہیں ہوتا۔ یہ عمل غیر عادل کو صحیح راستے پر لانے کا عمل ہے۔ جس نظامِ تصورات کے مطابق "غیر عادل قوت" حق بجانب قرار دی جاتی ہے۔ اس کے خلاف بغاوت کی طاقت تو بعد میں پیدا ہوگی۔ سب سے پہلے یہ ضروری ہے۔ کہ عقلی فکر نے اس کے گرد سفسطہ اور تقدس کا جو ہالہ پیدا کر رکھا ہے۔ وہ نوچ دیا جائے۔ تاکہ وہ اپنی عریاں نامعقولیت میں سامنے آجائے۔

بعض اوقات حقیقی شکایات کی بنا پر بغاوت کی جاتی ہے۔ لہٰذا وہ غرضمندانہ ہوتی ہے۔ اس کا اصلی محرک مفاد ہوتا ہے۔ اصول نہیں ہوتے۔ مظلوم لوگ سب سے پہلے حقیقی مصیبت۔ بھوک یا محض حرص وحسد کی وجہ سے بغاوت پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ ستم رسیدہ دل کی بغاوت اخلاقی ہوتی ہے۔ اس لئے نہیں۔ کہ وہ کسی نصب العین سے حرکت میں آتے ہیں۔ بلکہ اس لئے کہ ان کے مفادات لازماً اخلاقیت کے مطابق ہوتے ہیں۔ مفادات یا ذاتی مقاصد کے تصادم کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ اصول اخلاقیت ارتقا پذیر ہوتا ہے۔

اور چونکہ قطعی طور پر پامال اور مظلوم لوگوں کے لئے کوئی مؤثر بغاوت کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ جب بھی آمادۂ سرکشی ہوتے ہیں۔ تو

اُن کے ساتھ عموماً بعض دوسرے طبقات بھی شریک ہو جاتے ہیں۔ جن کے مقاصد میں ضمیر فروشی اور مفاد پرستی شامل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اس فرومایہ عنصر نے آزادی کی اکثر اہم تحریکات میں نمایاں حصّہ لیا ہے مطلق اقتدار رکھنے والے اور ہر چیز کو نگل جانے والے کلیسا کے اختیارات کو سب سے پہلے ضرور تمند اور حریص اُمرا نے کم کیا۔ سلاطین و اُمرا کی قوت کو (یعنی اُس قوت کو جو استحقاق پر مبنی تھی) ایک اور قوت یعنی قوت زر نے مسلسل و متواتر روکا اور نقصان پہنچایا۔ اور بالآخر ختم کر دیا۔ تجارتی طبقات نے اور لومبارڈو۔ فلورینٹائن۔ فلیمش۔ ہنسیاٹک۔ اور انگلستانی تاجروں نے ازمنۂ متوسطہ کے اواخر میں اور نشاۃ الثانیہ کے وقت شاہی جاگیرداروں۔ امیروں اور بادشاہوں کے مطالبات و محاصل کی جو مخالفت کی۔ وہ ظلم و ستم کو روکنے کا ایک بڑا باعث ہوئی۔ اور آزادی کا پہلا بیج اسی نے بویا۔ "اصلاحِ دین" کی تمام تحریکات میں خالص حرص و ہوا کے ماتحت بعض ہمہ گیر اغراض و مفادات نے جو وسیع حصّہ لیا۔ وہ سب کو معلوم ہے۔ جرمنی میں روما سے الحاق توڑا گیا۔ تو اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ حکمران کلیسا کی اراضی پر قبضہ کرنے کے لئے بے چین تھے۔ سویزرلینڈ میں زونگلی کی کامیابی کی وجہ یہ تھی۔ کہ زیورچ اور بعض دوسرے شہروں نے کلیسا کی قلمرو پر قبضہ جما لیا تھا۔ اینگلیکن کلیسا کی بُنیاد کیونکر رکھی گئی۔ یہ انتہائی کمینہ حرص و ہوا اور خالص لالچ اور رشوت کی ایک طویل داستان ہے۔ اور ہر جگہ، اور آزادی کی ہر تحریک میں ہمیں یہی خود غرضانہ۔ حریصانہ اور معاوضہ طلب رُوح کارفرما نظر آتی ہے۔ امریکی انقلاب یوں پیدا ہوا۔ کہ دکاندار ٹیکس ادا کرنے پر آمادہ نہ ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ انقلاب فرانس بھی لاکھوں بھوکے اور دردرسیدہ لوگوں نے شروع نہیں کیا تھا۔ بلکہ

اس کے بانی وہ منافع پرست تاجر اور سٹہ باز تھے۔ جو ٹیکس ادا کرنا نہیں چاہتے تھے۔

لیکن ان حقائق سے بعض گہری غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ اقتصادی جبریت کے شارحین ان حقائق کو بآسانی استعمال کر کے ثابت کر دیتے ہیں۔ کہ ان تمام تحریکات میں صرف حرص و طمع اور مفاد پرستی ہی کارفرما تھی۔ لیکن یاد رکھنا چاہئے۔ کہ یہ محرکات بھی کبھی آمادۂ عمل نہیں ہوتے تھے۔ جب تک ذہنی تنقید اپنا کام نہیں کر چکی تھی۔

جب تک دُنیا پر آتش دوزخ کے عذاب کا خیال لرزہ طاری کرتا رہا۔ کلیسا یورپ کی پوری مادی دولت کو اپنے حاضر و ناظر محصلین کے ذریعے چوستا رہا۔ کوئی احتجاج نہ تھا۔ کوئی مزاحمت نہ تھی۔ یہاں تک کہ بارھویں صدی میں جب یہ جمود ٹوٹنے لگا۔ اور اندھا دُھند ایمان و عقیدہ عالمگیر نہ رہا۔ اور یورپ نہایت سرعت سے الحاد و زندقہ کے حملوں سے چھلنی ہو گیا۔ تو پادریوں اور راہبوں کی جوع الارض کی مخالفت شروع ہوئی۔ اور سلاطین و اُمرا نے اُن کو استحصال سے جبراً روک دیا۔ جرمن حکمرانوں کو کلیسا کا مال ہتھیانے اور روما کے اقتدار سے اپنے علاقوں کو بچانے کا اُس وقت تک خیال نہ آیا۔ جب تک ہس اور لوتھر اور زونگلی نے پاپائے روما کے ریاکارانہ دعاوی کی شرمناکی کو واضح طور پر ظاہر نہ کر دیا۔ ہنری ہشتم کچھ بھی نہ کر سکتا۔ اگر ارامس اور کولیٹ نہ ہوتے۔ اور لولرڈزم عوام میں سُلگ نہ رہی ہوتی۔ شہزادوں کے مفادات اور اُن کی طماعی آزادی کی لڑائیوں میں صرف طاقتور مددگار کا کام دیتی تھی۔ اور حصول فتح میں اکثر معاون ہوتی تھی۔ لیکن وہ خود ذہنی قوتوں کے آلۂ کار تھے۔ حقیقی مصیبت زدہ اور مظلوم لوگ جب ظلم۔ تشدّد۔ اور ناانصافی کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ تو انھیں مفاد کا خیال

تو ہوتا تھا لیکن وہ نظریاتی اعتبار سے مجرد اصولوں سے متاثر نہ ہوتے تھے۔ تاہم مفاد کے محرکات عمل میں نہیں آ سکتے تھے۔ جب تک غیر معقول حقوق و دعاوی کو تنقید کے ذریعے سے بے نقاب نہ کر دیا جاتا۔ جب تک یہ کیفیت وارد نہیں ہوتی۔ انصاف کی تمام قوتیں مفلوج رہتی ہیں۔

ہر شخص کو معلوم ہے۔ کہ انقلاب سے پیشتر فرانسیسی عوام کی مصیبتوں کا کیا حال تھا۔ ناقابل برداشت محاصل۔ جاگیردارانہ موجب چندے۔ جرمانے۔ کلیسیا کے ٹیکس اور خراج اُن کے تمام اثاثوں اور آمدنیوں کو کاملاً نگل جاتے تھے۔ اور متواتر قحط و افلاس کی وجہ سے اُن بدبختوں کے لاغر بھوت ویران سرزمین پر آوارہ پھر رہے تھے۔ ان واضح حالات کو دیکھ کر ہم یہی سوچتے ہیں۔ کہ ایسی حالت ہمیشہ نہ رہ سکتی تھی۔ اور اس کا ناگزیر نتیجہ بغاوت تھا۔ لیکن لوئی پانزدہم کی موت سے پہلے لوئی چہاردہم کی وفات کے وقت بھی حالات ایسے ہی خراب تھے۔ تاہم کوئی بغاوت نہ ہوئی تھی۔ جرمنی کے حالات فرانس سے بھی زیادہ ناگفتہ بہ تھے۔ ایک سو سال قبل کوہ پیری نیز کی دوسری جانب عوام کی مصیبتیں اور مظالم اس سے بھی زیادہ شدید تھے۔ ملک کی آبادی قحط کی وجہ سے غائب ہو چکی تھی۔ پہلے درجے کی ابتری اور طوائف الملوکی اور مواجب کی گراں باری سے سارا علاقہ ویران ہو رہا تھا۔ عام لوگ نہایت ذلیل قسم کے غلام تھے۔ فاقہ کش آبادی کسی محصّل کی آمد پر دیہات سے بھاگ کھڑی ہوتی تھی۔ اور محصّل اُن غریبوں کے جھونپڑوں کو گرا کر اُن کا سامان بیچ دیتے تھے۔ مسلح انبوہ نانبائیوں کی دکانوں کے سامنے روٹی کے لئے اس شدت سے لڑتے تھے۔ کہ پیرس میں بھی اس لڑائی کی کوئی مثال نہ تھی۔ جن نجی فوجیوں کو تنخواہ نہ ملتی تھی۔ وہ گلی کوچوں اور خانقاہوں کے

دروازوں کے سامنے بھیک مانگتے پھرتے تھے۔ تاہم میڈرڈ میں صرف وزرا کے خلاف کچھ مظاہرے ہوتے۔ اور اس کے سوا کچھ بھی نہ ہوا۔ بلکہ ایک نہایت غیر معمولی بات برابر جاری رہی یعنی فاقہ کش لٹے ہوئے اور ستائے ہوئے عوام اپنے ظالموں اور جابروں کی وفاداری سے سرشار ہو کر تخت اور قربانگاہ کے لئے جانیں دینے کو تیار رہتے تھے۔ چند سال بعد جب جرمنی، فلینڈرز اور اٹلی میں مارلبرو اور پرنس یوجین نے بوربون خاندان کی طاقت کو نیچا دکھایا۔ اور جب پیٹربورو اور سٹین ہوپ نے ہسپانیہ کی ذلیل فوجوں کو منتشر کر دیا۔ تو وہی لوگ جو اس ناقابل حکومت کا شکار ہو رہے تھے۔ ہر جگہ اپنے بادشاہ کے حفظ و دفاع کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے۔ لٹے ہوئے دیہاتی جتنا روپیہ ادھر ادھر سے فراہم کرتے۔ وہ سارے کا سارا لا کر جذبۂ عقیدت و وفاداری کے آنسوؤں کے ساتھ بادشاہ کی حضور میں پیش کر دیتے۔ قسطالہ اور اندلسیہ کے کسانوں نے اپنی شوریدہ سرانہ شجاعت سے بلائن ھیم اور راملیز کی فتوحات کو بے اثر کر دیا تھا۔

کوئی عقلی فکر اور کوئی تنقیدِ حالات اور کوئی روشنی کی شعاع ایسی نہ تھی جس سے اِن لوگوں کی خرابیوں کے ماخذ و منبع کو صحیح صورت میں سمجھا جا سکتا۔ صرف روشن فکری اور تنقید کا خالص ذہنی عمل ہی ہے۔ جو مظلوموں کے احتجاج کی ناگزیر شرط ہے۔ ان کی وفاداری، ان کی عقیدت اُن کی قوت برداشت۔ ان کا احترام۔ خدا کے مقرر کردہ نظام کے آگے اُن کی اطاعت و تسلیم۔ اور جس حالت میں اور درجے میں ان کو پروردگارِ عالم نے رکھا ہے۔ اس پر اُن کی قناعت۔ یہ تمام چیزیں خداوندانِ قوت کی بیدردانہ ناانصافی، ظلم و ستم۔ حرص و آز اور بیدردی اور بربریت کا لازمی اور جوابی جُزو واقع ہوتی ہیں۔

(۴)

یورپ کی مخلصیاں

لیکن اگرچہ مظلوموں کی بغاوت کو پہلے پہل ان کے اپنے مفاد کے ناپختہ حقایق ہی اکساتے ہیں۔ لیکن وہ خود زیادہ مدت تک اس کو اس نقطۂ نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ یہ صحیح ہے۔ کہ طبقاتی مفاد اور عمومی اصول کا باہم مطابق ہونا ضروری ہے۔ جبھی انسانوں کے کثیر و عظیم انبوہ پُرزور اور بے باک عمل پر برانگیختہ کئے جا سکتے ہیں۔ جس شخص نے کبھی کسی ایسے مجرّد اصول کی حمایت میں کسی اجتماعی عمل کی تنظیم میں حصہ لیا ہے۔ جس کا کوئی تعلق کسی مرئی اور محسوس افادی مقصد سے نہ تھا۔ وہ خوب جانتا ہے۔ کہ اس کام میں کس قدر جمود اور بے پروائی سے سابقہ پڑتا ہے۔ لیکن یہ ایک نفسیاتی قانون ہے۔ کہ جو مقصد۔ اصول۔ دعوے۔ جنگی نعرہ سب سے پہلے کسی مفادی مقصد کے تقاضے سے اختیار کیا جاتا ہے۔ وہ کچھ وقت گزرنے پر خود مرکز عقیدت بن جاتا ہے۔ مفادی مقصد کی قوت روز بروز معدوم ہوتی جاتی ہے۔ اور اصول و مجرّد دعوے کی قوت بڑھتے بڑھتے ذہنی دائرے پر کاملاً حاوی ہو جاتی ہے۔ غیر عادلانہ اور جابرانہ قوت کے معاملے میں بھی (جیسا میں اشارہ کر چکا ہوں) بالکل یہی ہوتا ہے۔ چوں کہ ظالم ہر وقت ناانصافی کو نظریاتی اعتبار سے حق بجانب قرار دینے کا عادی ہو جاتا ہے۔ اس لئے وہ اس پر یقین بھی کرنے لگتا ہے۔ اور وہ ظالم جو غریباں حرص و طماعی سے پیدا ہوا تھا۔ جب مرتا ہے۔ تو اپنے ایجاد کردہ مقدس اور خدائی حقوق کا شہید ہو کر مرتا ہے۔ یوں گویا متصادم مفادات اخلاقی اصول بن جاتے ہیں۔ جب پراٹسٹنٹ آگ میں ڈالے

جانے کے وقت خدا کی حمد و ثنا کرتے ہوئے آگے بڑھتے تھے۔ اور فلیمش عورتیں زندہ دفن کئے جاتے وقت دعائیں گاتی تھیں جس حالت میں قاتل اُن کے چہروں پر مٹی کے بیلچے بھر بھر کر پھینکتے تھے۔ تو اُن کے اس جذبے کا محرک کوئی ذاتی یا طبقاتی مفاد نہ تھا۔

مذہبی جوش (یعنی اصلاح پسند ملحدانہ مذہبی جوش) عقلی فکر کی وہ صورت تھی جس نے مدت دراز سے عوام الناس میں صرف وہ شکل اختیار کر رکھی تھی۔ جو وہ کر سکتا تھا۔ یورپی تاریخ میں مذہبی مخلصی کی تحریکیں معاشری اور سیاسی آزادی کی تحریکوں کے ساتھ اس قدر پیچیدہ طریق سے اُلجھی ہوئی ہیں۔ کہ مؤرخین کے لئے اس اُلجھاؤ کو سُلجھانا بے حد دشوار ہے۔ موٹلے نے چارلس پنجم کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

" وہ نہایت زیرک سیاست دان تھا۔ اور مذہبی آزادی اور سیاسی آزادی کی خواہشوں کے تعلق کو خوب سمجھتا تھا۔ مصلحین مذہب دُنیاوی قوت کے متعلق ادعائی عقیدے۔ روایت اور فوق الفطرت تصدیق کے خلاف نہایت سرکش تھے۔ اور اُن کی اس سرکشی میں " سیاسی الحاد " پوشیدہ تھا۔ لہذا چارلس نے عزم کر رکھا تھا۔ کہ اس کا مقابلہ مرتے دم تک کرے گا "۔ جس مُتبادیہ مطلق العنانی اپنے نظریے کو حق بجانب قرار دیتی ہے۔ اس کی (اگرچہ تنہا نہیں) اہم ترین اور عام شکل " مذہبی تصدیق ہی ہے "۔ خدائی حق شاہی " اسی تصدیق کا نمونہ ہے۔ لہذا مذہبی الحاد اور تنقید نے ہمیشہ ظلم کے خلاف مزاحمت کی رہبری کی ہے۔ ملحدانہ فکر ہمیشہ قائم شدہ قوت کے خلاف بغاوت کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ یا اس کے فوراً بعد بغاوت ہو جاتی ہے۔ آیبے لارڈ کی جرأت آموز تعلیمات کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ اُس کے شاگرد آرنلڈ دابریشیا نے بغاوت کر دی۔ اور روما میں جمہوریہ کا اعلان کر دیا۔ وائیکلف

کے بعد جان بال اور لولرڈ آ گئے۔ جان ہس کے بعد بوہیمیا میں بغاوت ہوگئی۔ اور لوتھر کی تحریک "اصلاح دین" نے تو معاشری بغاوت کی تمام قوتوں کو آزاد کر دیا۔ جرمنی میں کسانوں کی جنگ اور ڈچ بغاوت اسی کے فوری نتائج تھے۔

نیدرلینڈز کی ایک شاندار مثال کے سوا یورپ اعظم یورپ کی ان تمام مساعی مزاحمت کا کوئی خاص نتیجہ نہ نکلا۔ جبر و تشدد کی طاقتیں بہت قوی تھیں۔ جس بغاوت کو آگ اور خون سے فرو کیا جاتا تھا۔ اس سے ظلم و استبداد کی زنجیریں اور بھی زیادہ کڑی ہو جاتی تھیں۔ جاگیردارانہ نظام کے اکثر خراب ترین خد و خال جیکیوری اور کسانوں کی جنگ ہی سے شروع ہوتے۔ صوبجات متحدہ نے ہسپانیہ کے ظلم اور ظلمت پسندی سے نجات پانے کی خوشی میں لائیڈن اور یوٹریخ میں یونیورسٹیاں قائم کیں۔ جہاں خوشباش روئیمر واشیر اور اس کی ذہین اور خوش سلیقہ بیٹیوں کے گرد اکابر کی ایک صحبت آراستہ ہوگئی جس میں ووسیئس۔ گروشیئس (بین الاقوامی قانون اور "آزادی بحر" کا مصنف) بریڈ ورو (ظریف شاعر) فان فونڈل (ڈرامانگار) ڈیکارٹ۔ بروچ سپنیوزا سوامرڈم (پہلا ماہر حیاتیات) فان لوفنھوک (علم خوردبین کا بانی) هیوجنز (ماہر طبیعیات) ریمبرنٹ اور فرینز هالس جیسے لوگ شامل تھے۔ اس اجتماع نے ہر قسم کے آزادانہ فکر کی تخم ریزی کی۔ اور انگلستان اور دوسرے ملکوں کی سیاسی ترقیات کا راستہ ہموار کیا۔ چونکہ غیر مسلح انگریز حکمران "امن و انتظام" قائم کرنے کی قابلیت نہ رکھتے تھے۔ اس لئے انگلستان کے قوانین اور انگلستان کا سیاسی نظام دنیا بھر کے لئے موجب رشک مثال بن گیا۔ انگلستان میں آزادیوں کی جدوجہد کے تقریباً ہر قدم نے مذہبی صورت اختیار کر

لی۔ لیکن جدوجہد کی ان تمام تحریکات کا ثمر آور اور نتیجہ خیز ہونا اس وجہ سے نہ تھا۔ کہ وہ مذہبی تھیں۔ بلکہ اس کا سبب یہ تھا۔ کہ وہ پراٹسٹنٹوں کے ہاتھ میں تھیں۔ فرانس۔ ہسپانیہ اور انگلستان میں کیتھلک لیگوں کے مذہبی جوش نے آزادی نہیں بلکہ ظلم و ستم پیدا کیا۔" دولت مشترکہ (کامن ویلتھ) اور "اعلانِ حقوق" نہیں۔ بلکہ سینٹ بارتھولومیو "رکیو میڈ روس" اور بلڈی میریز کی بلائیں نازل کیں۔ پراٹسٹنزم کا مطلب عملاً یہ تھا۔ کہ تنقید کی جاسکے۔ ادعائی عقائد کے خلاف عقلی بغاوت کی جائے۔ ذاتی قیاس و بصیرت کی مدد سے قائم شدہ اباطیل پر حملے کئے جائیں۔ خواہ وہ اصولاً مُسلّم ہوں یا نہ ہوں۔ اس عقیدے کا روتیہ یہ تھا۔ کہ پاپائی اپنے تمام ادعائی عقائد اور مذہبی تعصبات کے ساتھ ختم کر دی جائے۔ اور قدیم تقلید کی بےباکانہ دروغ بافیاں۔ پادریوں کا نظام۔ اور شعبدہ بازیاں نابود کر دی جائیں۔ یہ رویہ بالکل ویسا ہی تھا۔ جیسا عقلی تنقید کے ماتحت ہو سکتا تھا۔ لولرڈ اور انڈی پینڈنٹ لوگ بھی مُسلّمہ مذہب کی تمام پاک و مقدس چیزوں کے ساتھ اسی بےادبی اور بےحرمتی کا سلوک کرتے تھے۔ پراٹسٹنٹ کیتھلک کا ذکر کرتے تھے۔ تو اسے "نہایت مبتذل" اور "مکروہ" دہریہ قرار دیتے تھے۔ ناانصافی اور مطلق العنانی کو شکست دینا اور اس کے لازمی نتیجے میں انسانیت پرورانہ اصولوں کو وسعت دینا انگلستان میں پراٹسٹنٹوں ہی کا کارنامہ تھا۔ خصوصاً پراٹسٹنٹوں کی اُن جماعتوں کا مُسلّمہ مذہبی اقتدار سے دُور اور بعید تھے۔ (مثلاً آزاد خیال۔ غیر مقلد۔ پیورٹین اور انجیلی فرقے کے لوگ) وگ اور لبرل پارٹیاں روایتی طور پر عدم تقلید ہی کے ساتھ وابستہ ہیں۔ آج کل کے (Pietism) تحریک تقوٰی کے حامی کہتے ہیں۔ کہ انگلستان کو

بائبل ہی سے عظمت حاصل ہوتی ہے۔ اُن کا یہ خیال کاملاً غلط نہیں۔ لیکن اس عظمت کا راز بائبل کی اس حیثیت کو تسلیم کرنے میں ہے۔ کہ اس کی تفسیر و تاویل کا حق ہر شخص کو حاصل ہے۔ دنیاوی اقتدار مطلق اس عظمت کا باعث نہیں جس زمانے میں یورپ ابھی ازمنۂ متوسط کی بربریت میں غرق تھا۔ عین اُس وقت انگلستان آزادی کی سرزمین کا منظر پیش کر رہا تھا۔ اور بجا طور پر اپنی حق پرستانہ فوقیت و برتری کا شعور رکھتا تھا۔

لیکن پراٹسٹنٹزم کی مخلصی دینے والی قوت جو ۱۶۴۹ء عیسوی کے انقلاب کا باعث ہوئی تھی۔ اُس حالت کو پہنچ گئی جو اس کی فطری اور ناگزیر تجدیدات کا لازمی نتیجہ تھی۔ لیکن اس اثنا میں ذہنی نشو و ارتقا اُس مرحلے پر آکر رُک نہیں گیا تھا جس کا اظہار پراٹسٹنٹوں کی تحریک "اصلاح دین" میں ہوا تھا۔ غیر مذہبیت (سیکولرازم) کا عمل برابر جاری رہا۔ اب مسائل دنیاوی نہیں۔ بلکہ خالص غیر دینی سمجھے جاتے تھے پیڈوا کے بلند پایہ مدرسے میں چودھویں صدی کی ارسطاطالیسی روایت اور عربوں کی تجرباتی سائنس اور ریاضی آپس میں مخلوط ہو کر کشمکش کر رہی تھی۔ جس کا نتیجہ بالآخر عربوں کی سائنس کی فتح میں برآمد ہوا۔ اور علم کے دوائر اور اسالیب کا ایک نیا تصور پیدا ہو گیا۔ وہیں سے یورپ میں ایک لہر موجزن ہوئی۔ جس نے ڈیکارٹ اور گیسنڈی کو پیدا کیا۔ ولیم ہاروے نے وہاں صرف Fabricius of Aquapendente کے اسباق ہی سے استفادہ نہ کیا۔ بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ طبیعیات کے معلم گیلیلی سے نفع اُٹھایا۔ پاسکل نے جو گیلیلی کے شاگرد ٹوری سیلی کی تحقیقات کو مکمل کر رہا تھا۔ ہوا کا وزن دریافت کر لیا تھا۔ جب بیکن کا سکرٹری پیوریٹین انقلاب کے

ہنگاموں سے بھاگ کر برِ اعظم یورپ میں پناہ گزیں تھا۔ تو اُس نے گیلیلیو، گیسنڈی اور مارسین سے ملاقات کی۔ اور جب "عیش پرست بادشاہ" پیوریٹین ظلم وستم کے خلاف ردِ عمل میں دوبارہ لندن آیا۔ تو سب سے پہلے اس نے جس شخص کی آؤ بھگت کی۔ وہ اس کا بوڑھا اتالیق تھا جس نے اُسے deviathan میں اپنی قدرتِ مطلق کا عقیدہ بتایا۔ بلکہ تجربی فلسفے کی نئی نشوونما کے ساتھ بے انتہا شغف پیدا کر دیا یہ شغف عام ہو گیا۔ اور صرف بادشاہ ہی نے نہیں۔ بلکہ بکنگھم کے رہنے والوں۔ لارڈوں اور پادریوں نے اپنی اپنی کیمیکل لیبارٹریاں قائم کر لیں۔ مکالے لکھتا ہے۔ کہ "اُس زمانے میں ہر شریف۔ نجیب آدمی کے لئے ضروری تھا۔ کہ ایئر پمپوں اور دُوربینوں کے متعلق گفتگو کرے۔" وہائٹ ہال کی خوشبودار خواتین گاڑیوں میں سوار ہو کر گریشیم کی لیبارٹریوں میں جاتی تھیں۔ تاکہ جادبرقیات اور مقناطیسیت کے تجربے دیکھیں۔ فنونِ لطیفہ کا شوق تو صرف خارجی اظہار تھا۔ درحاصل انگلستان میں شاہی کے عود کے زمانہ میں زیادہ عمیق اور مہتم بالشان ترقیات ظاہر ہو رہی تھیں جن کے مظہر رائل سوسائٹی۔ رابرٹ بوئل۔ ہُوک ہیلے اور نیوٹن تھے۔ سترھویں صدی میں انگلستان کی سائنس نے جو فروغ حاصل کیا۔ وہ حقیقت میں تمام دوائرِ فکر کی مشترک روحیت کے عمل کا صرف ایک پہلو تھا۔ رائل سوسائٹی کے ممبروں میں سے ایک سر ولیم پیٹی تھا جس نے "سیاسی علم الحساب" ایجاد کیا۔ جو علم سیاستِ مدن کا پیشرو ثابت ہُوا۔ سر ولیم نے بتایا کہ زرعی مزدور کی اُجرت اگر چار شلنگ فی ہفتہ مقرر کر دی جائے۔ تو یہ بالکل مناسب ہو گی۔ جس طرح پیوریٹین پراٹسٹنٹزم نے ١٦٤٩ء کا انقلاب پیدا کیا تھا۔ اسی طرح جدید غیر مذہبی حقیقت پسندی سے ١٦٨٨ء کا وِگ انقلاب ظہور میں آیا تھا۔ اس کا فلسفی حامی جان لاک تھا جس طرح

ملٹن کا من و یلیتھ کا موئید تھا۔

انگلستانی فکر کی ان عظیم ترقیات نے اور ان معاشری نتائج نے جو انگریزوں کی آزادی نے حاصل کر لیے تھے۔ بر اعظم کے ذہن پر نہایت گہرا اثر ڈالا۔ جہاں مانٹیسکیو نے انگلستان کے آئین کو اور والٹیر نے انگریزی سائینس اور انگریزی فکر کو ایسے بلند مقام پر پیش کیا۔ کہ تمام اہل فکر ان کی تحسین و تقلید کرنے لگے۔ گویا بیج زرخیز زمین میں پڑا تھا۔

پراٹسٹنٹوں کی آزادی نے شمالی نشاۃ الثانیہ کے کناروں پر گھر کر لیا تھا۔ اور عقلی فکر کا ارتقا اپنے راستے پر گامزن تھا۔ بالکل اسی طرح "وگ انقلاب" کے اہل فکر اپنی ناقابل فراموش کامیابیوں اور اپنے شاندار آئین (جس کی عمدگی میں کوئی اضافہ ممکن نہ تھا) کے روحانی تصوّرات اور ان کے خوابِ شیریں میں مزے سے مست پڑے تھے۔ اس اثنا میں انسانی فکر کی نشو ونما برابر جاری رہی۔ اور اس کے انگریزی بیج فرانس کی نئی بہاریں خوب برگ و بار لے آئے۔

فرانس کی اٹھارھویں صدی انسانی تاریخ میں پختہ عمری کا ایک شاندار دور ہے۔ تمام وہ بیج جو بارھویں صدی سے یورپ میں پھوٹ رہے تھے۔ وہ اُگے۔ اور پختہ و ثمردار ہو گئے۔ ایک نیا عہد شروع ہو گیا۔ جو اپنی اہمیت کے اعتبار سے نسلِ انسانی کے ارتقا میں نہایت شوکت و عظمت کا دور تھا۔ اس کے متعلق ہمارے مروّجہ خیالات و تفتیش کا جو حال پہلے تھا۔ بڑی حد تک آج کل بھی وہی ہے۔ یعنی اُن میں اس عمیق حقارت کا رنگ موجود ہے۔ جو اس کے بعض رجحانات کے خلاف ظاہر کی گئی۔ یہی وجہ ہے۔ کہ ہم اس کی قدر و وقعت کا پورا اور صحیح اندازہ نہیں کر سکے۔ ہماری توجہ ایک سو سال سے اس کے نقائص و اسقام ہی کی طرف

رہی ہے"۔ "متفلسفین" (کارلائل نے فلسفی کی محترم اصطلاح کے احترام کو خرابی سے بچانے کے لئے یہی لفظ استعمال کیا ہے) کے نظریات کا اکثر حصہ خام اور قیاسی ہے۔ اور استقرا کے لئے کافی بنیاد نہیں رکھتا ان کی تعمیمات سطحی، ان کے فرسودہ کلمات اور تجریدی تصورات بے حقیقت اور ان کی بلاغت محض خطیبانہ ہے۔ یہ بات بالکل صحیح ہے۔ کیونکہ یہ نشو ونما حقیقۃً زندہ اور مفید تھی۔ ان لوگوں کا فکر اس کی ترقی کے مقابلے میں بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ اور متروک ہو گیا تھا۔ ہم علی العموم اس سے توفیق عمل حاصل کرنے نہیں جاتے۔ کیونکہ وہ ایک زندہ فکر کی حیثیت سے ہمارے اپنے خون کے اندر تجدید پا چکا ہے۔ ترقی کے خلاف صرف روایت پرستی ہی جنگ کرتی ہے۔ جو غیر متغیر اسناد سے توفیق عمل طلب کرتی ہے۔ جب ہم کو منجمد اشیا کی تلاش ہوتی ہے۔ تو ہم اپنی درسی کتابوں کے لئے عہد حجری کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ جب ہم طبیعی سائینس کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔ تو پریووسٹ۔ فوریئر کولوم یا لاووسیئر کے پاس نہیں جاتے۔ ہم پریووسٹ کا نظریۂ مبادلات۔ فوریئر کے تھیورم۔ کولوم کی میزان۔ اور لاووسیئر کے انکشافات کو زمانۂ حاضر کی سائینسی زبان اور جدید درسی کتابوں میں پڑھتے ہیں۔

سترھویں صدی کے انگلستان کی طرح فرانس میں سائینس اٹھارھویں صدی میں پھیلی۔ وسیع پیمانے پر سرگرمی سے سیکھی گئی۔ کالجوں کے پُر ہجوم کمروں میں مقبول عام ہوئی۔ اور وہیں سب سے پہلے اس نے علم اور باضابطہ تحقیقات کی منظم ہیئت اختیار کی۔ جو انیسویں صدی کی فتوحات میں فوری طور پر ثمر ور ہونے والی تھی۔ اس فعال زمانے کی تمام تر ذہنی سرگرمی میں (اس میں بھی جو بظاہر نہایت بے حقیقت۔ عارض اور سطحی معلوم ہوتی ہے) ایک نئی نوعیت اور ایک نہایت خطرناک خوبی پیدا ہو گئی۔ جب

بومارشا کے طربیہ ڈراما "فگارو کی شادی" کو کھیلنے کے لئے بادشاہ کی اجازت طلب کی گئی۔ تو اس نے کہا "لیکن حضرات! اگر اس ڈرامے کے کھیلنے کی اجازت دی جائے۔ تو معقولیت کا تقاضا یہ ہوگا۔ کہ بسٹیل کے قید خانے کو مسمار کر دیا جائے"۔ "فگارو" ۶۸ دفعہ کھیلا گیا۔ اور بالآخر بسٹیل مسمار ہو کر رہا۔ یہ بیل۔ مانٹیسکیو۔ والٹیر۔ ڈیڈروٹ۔ ڈالمبرٹ۔ ڈی ولنے۔ ہولباک۔ کونڈارسے اور ان کے معاصرین ہی تھے۔ جنہوں نے روایتی اصول بالائے طاق رکھ دیئے۔ نو چنے کا عزم کر لیا۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ جو کچھ سوچا۔ اسے جرأت کے ساتھ بیان کیا۔ اور عقل و فکر کے سوا اور کسی سند یا اصول موضوعہ کی پروا نہ کی۔ یہی وجہ تھی۔ کہ دنیا کا نقشہ بدل گیا۔ ان کے عقب میں اور ان کے گرد ازمنۂ متوسطہ کی تمام ذہنی و فکری جہالت، ظلمت اور جفاکاری پھیلی ہوئی تھی۔ اگرچہ اس پر نشاۃ الثانیہ نے نفاست کا سطحی سا نقاب ڈال رکھا تھا۔ ان لوگوں کے بعد دنیا بدل گئی۔ اور زمانۂ حاضر کا جہانِ نو ظاہر ہو گیا۔ یقیناً یہی لوگ تھے۔ جنہوں نے ایک دنیا سے دوسری دنیا میں داخل ہونے کے دروازے کھول دیئے۔

انقلاب فرانس (جو عظیم ذہنی جنگ کی پیداوار اور اس کی انتہائی صورت تھی) تاریخ انسانی کے واقعات میں بالکل تنہا واقعہ ہے۔ اس کو جس مخالف کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ خالص جاگیرداری اور مطلقیت تھی جو اپنی ناانصافی میں منظم اور بدترین صورت اختیار کر چکی تھی۔ اور اس کو کسی قسم کے ارتقا نے چھوا بھی نہ تھا۔ تاریخ کے اس واحد موقع پر احتجاج کے نعرے اور اصلاح کے کام میں کوئی دفع الوقتی۔ کوئی پوشیدہ مسائل۔ کوئی مفاہمت۔ کوئی مصلحت آمیز فارمولے اور کوئی نیم منطقی عذرات شامل نہ تھے۔ صرف ۸۹ میں اور ۹۱ کے آئین میں ایک

ایسا لمحہ آیا تھا جس میں بُرائی کا مقابلہ کرنے کے لیے کچھ "شائستگی ۔ نرم زبانی اور خوش اطوارانہ ضبط" سے کام لینا پڑا لیکن اس لمحے کے گزر جانے کے بعد ہر چیز کو اُس کے نام سے موسوم کیا گیا ۔ اور اسی کے مطابق اُس سے سلوک کیا گیا ۔ نہایت آزاد خیالی اور شدید ہمہ گیری سے کام لے کر (جس نے ازمنۂ آیندہ میں دائمی ہول پیدا کر دیا) نہ صرف شرمناک تجاوزات اور بے انصافیوں کو اور جاگیرداری "خدائی حق" ظل اللہ المقدس کو بلکہ دروغ بافیوں اور بناوٹوں اور خلافِ عقل چیزوں کو بھی جڑ بنیاد سے اُکھیڑ کر پھینک دیا گیا ۔ یہاں تک کہ احمقانہ اوزان اور پیمانوں اور کیلنڈروں تک کو بھی ایک اشارے سے معدوم کر دیا گیا جن غلاموں نے جاگیرداروں سے نئی نئی آزادی حاصل کی تھی ۔ وہ "شاندار آئین" "ووٹ ڈالنے کے بکسوں" "عملی سیاسیات کے دائرے کے اندر وسیع اصلاحات" سے بالکل مطمئن نہ تھے ۔ وہ صاف ۔ واضح اور گونجتے ہوئے الفاظ میں اُن چیزوں کا مطالبہ کرتے تھے ۔ جو عقلی فکر کے آخری نتائج ہیں ۔ وہ چاہتے تھے ۔ کہ قطعی انصاف و مساوات قائم ہو ۔ ہر طرح کی بیہودگیوں اور ناانصافیوں کو ہر قسم کی شروط و تحفظات کے بغیر کاملاً اور آخری طور پر منسوخ و موقوف کر دیا جائے ۔ اور نہ صرف "سلطنت" اور فرانس بلکہ پوری نسل انسانی کا تقاضا تھا کہ ایسا ہو ۔

بلاشبہ وہ لوگ ناکام رہے ۔ ہر یورپی حکومت انگلستان کی رہنمائی میں (جو اپنی پیوریٹن اور وگ آزادیوں اور بے مثال آئین پر فخر کرتا تھا) مسلح ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی ۔ کہ اس ناقابل بیان فضیحت کو شکست دے دے ۔ انقلاب کے مارے ہوئے لوگوں نے ان سب کے خلاف ، اُن کسانوں کے خلاف جو پادریوں کی رہنمائی میں اُٹھے تھے ۔ اور اُن ذلیل غداریٹروں کے خلاف جو اُن کے درمیان موجود تھے ۔ جس پامردی

سے مقابلہ کیا۔ اور جس طرح اُنھیں خاکِ مذلت پر سرنگوں کیا۔ وہ تاریخ کے عجائبات میں سے ہے۔ لیکن آخر میں ماضی کے بہت سے "بھوت" آکر قابض ہوگئے۔ (اور اب تک ہیں) جنھوں نے تاریخ کے صفحات پر زہر چکانی کی۔ اور اپنی آنکھوں کے ڈھیلوں کو گھما گھما کر "انقلاب فرانس کی ہولناکیوں" کو بیان کیا (حالانکہ پورے انقلاب ستمبر کے قتل عام اور ایام دہشت میں اتنے آدمی قتل نہیں ہوئے۔ جتنے سینٹ بارتھولومیو کے دن "تختِ شاہی اور قربان گاہ" کے حکم سے خاک و خون میں ملا دیئے گئے تھے) ان گستاخ شوریدہ سروں اور مارٹ اور Hebertist کا جو کچھ مقصد تھا۔ وہ اب تک خیالی دُنیا ہی میں ہے۔ لیکن اس کے باوجود جس دنیا کو وہ اپنے پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ اگر اُس کا مقابلہ اُس کا پس سے کیا جائے جس کو انھوں نے ہمیشہ کے لئے نابود کر دیا۔ تو یہ دُنیا بھی ایسی "خیالی دُنیا" ہے۔ جو حاصل ہو چکی ہے۔

(۵)

اخلاقیات اور سیاسیات

یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ سیاسیات کو اخلاقیات سے اور معاشری مسائل کو اخلاقی مسائل سے خلط ملط کرنا ٹھیک نہیں لیکن اصلی خلط ملط یہ ہے۔ کہ اس قسم کا اعتراض کرنے اور امتیاز پیدا کرنے کی وجہ کیا ہے۔

نوعِ انسانی نے اُس ماضی سے نجات پائی ہے۔ جو ظلم و ناانصافی سے لبریز تھا۔ اور جس میں یورپ کی ⅘ آبادی نے ظالموں کے چنگل میں میں ایسا سلوک برداشت کیا تھا۔ کہ اگر آج ویسا سلوک کُتّوں کے ساتھ بھی کیا جائے۔ تو دُنیا میں غیظ و غضب کا طوفان برپا ہو جائے۔ اُس زمانے

میں ہزارہا انسانوں کی (قانون کے ماتحت) کھال کھینچی جاتی تھی۔ اُن کے ہاتھ پاؤں میں میخیں ٹھونکی جاتی تھیں۔ اُن کے ٹکڑے کئے جاتے تھے۔ اُن کو آگ پر بھونا جاتا تھا۔ اور پانی میں اُبالا جاتا تھا۔ لندن "پھانسیوں کا شہر" کہلاتا تھا۔ ظالم و جابر شہزادوں اور پادریوں کے سوا کسی کو انسانی حقوق حاصل نہ تھے۔ غذائی اجناس پیدا کرنے والوں کو اپنے آلات کے استعمال کا کرایہ دینا پڑتا تھا۔ بے نام ناانصافی کی ذلت کو قانون نے بے تکلف جائز اور مقدس قرار دے رکھا تھا۔ ادب اس کو گوارا کرتا تھا۔ اور مذہب اس کا حامی تھا۔ اس صورت حال کے خلاف اگر کوئی زیرلب بھی احتجاج کرتا۔ تو شہید کر دیا جاتا۔ لیکن اس کے باوجود انصاف کی اس فتح عظیم کے ساتھ جس نے اس خوفناک کابوس کو بے نشان کر دیا۔ کسی اخلاقی تفصیل و تشریح کا کوئی تعلق نہ تھا۔ ٹیوڈروں کے زمانے اور ملکہ وکٹوریا کے عہد کے درمیان نہ کسی عظیم و جدید اصول اخلاقیت کا اکتشاف کیا گیا اور نہ اس کا اظہار و اعلان ہوا۔ بعد کے زمانے میں ہیگل نے اس قدیم و مقدس اصول کو حقیقۃً قائم کیا۔ کہ اخلاقیت کبھی نہیں بدلتی۔ کوئی نیا ضابطہ۔ کوئی نیا اخلاقی قانون۔ کوئی نیا عقیدہ مُونیا پر ظاہر اور منکشف نہ ہوا۔ بلکہ پُرانے ضابطوں۔ پُرانے اخلاقی قوانین اور پُرانے مسلکوں کی بُنیادیں بھی متزلزل ہوگئیں۔

جو تغیرات واقع ہوتے۔ وہ ذہنی۔ معاشی اور سیاسی تغیرات تھے۔ وہ اخلاقی ارتقا جس کی مسلسل ترقی صدیوں سے ہو رہی تھی۔ اور حق و انصاف اور عام عدل و انسانیت کے بلند معیار قائم ہو رہے تھے۔ ہمارے حافظے کی مدت کے اندر ہی یہ ترقی اُن تحریکات کی وجہ سے رونما ہوئی۔ جو بدی کی مزاحمت کے لئے برپا کی گئیں۔ اور جن کو سیاسی اور معاشری "تحریکات" کہتے ہیں۔ قوت کے عقلی جواز کو چیلنج کیا گیا۔ اور اس

کو ناجائز قرار دیا گیا۔ خود مختارانہ استحقاق کی طرف سے انفرادی حقوق پر جو حملہ ہو رہا تھا۔ اُس کی مزاحمت کی گئی۔ بے بنیاد عقیدوں کو بلا تنقید تسلیم کرنا ختم ہو گیا۔ ان سب کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ بے انصافی کو شکست ہوئی۔ اور دُنیا بہتر صورت اختیار کر گئی۔ کیونکہ انسانوں کے باہمی تعلقات زیادہ عادلانہ ہو گئے۔ انسانی روابط کی نئی ترتیب اخلاقی جذبوں کی کسی پُر اسرار نشو و نما یا بدکاروں کے ضمیر میں کسی اصلاح سے پیدا نہیں ہوئی۔ بلکہ مظلوموں کی مزاحمت ہی اس کی ذمہ دار ہے۔ یہ عقل کی بغاوت ہی تھی۔ جس نے "بینر اور بارود" کو اپنے دلائل سے مغلوب کیا۔ اور اسی سے اخلاقی شائستگی کا وہ پیمانہ حاصل ہُوا۔ جو آج تہذیب حاضرہ میں جلوہ گر ہے۔ اور جو یورپ کو دوا ھومی سے اور بیسویں صدی کو سولھویں صدی سے ممیز کرتا ہے۔ انصاف اور انسانیت کی ترقی ضوابط اخلاقی یا مکالمات افلاطون سے نہیں ہوئی۔ بلکہ اُن اختیارات کی تخفیف سے (جو عقل و فکر کے فقدان پر مبنی تھے) اور آزادی اور جمہوریت سے رونما ہوئی ہے۔

جمہوریت حکومت کی بدترین شکل ہے۔ یہ نہایت بدسلیقہ۔ نہایت بھدی اور نہایت غیر عملی واقع ہوئی ہے۔ اب تک کوئی ایسی مشینری دریافت نہیں ہوئی۔ جو اس کے اصولوں کو نہایت مضحکہ خیز طریق سے نافذ العمل نہ کرتی ہو۔ یہ دانشمندی کو نامردی بنا دیتی ہے۔ اور حماقت جہالت۔ ٹیپ ٹاپ اور بازاری لیڈری کو فتح مند بناتی ہے۔ جمہوریت کے نکتہ چین نہایت آسانی سے اس نظام حکومت کی بدسلیقگی کو واضح کر سکتے ہیں۔ لیکن ایک چیز سلیقے اور مصلحت اندیشی سے بھی زیادہ اہم ہے۔ اور وہ ہے انصاف۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جمہوریت ہی صرف ایک ایسا قابل قبول معاشری نظام ہے۔ جو انصاف سے مطابقت

رکھتا ہے۔ اخلاقی مصلحت سب پر فوقیت رکھتی ہے۔ سلیقہ مصلحت بلکہ عملی دانشمندی اور کامیابی بھی بالائے طاق رکھی جاسکتی ہے۔ کیونکہ انصاف کے قطعی تحکم کے سامنے ان چیزوں کی کوئی حقیقت نہیں۔ انصاف صرف اُسی حالت میں ممکن ہے۔ کہ ہر شخص کو مزاحمت کا حق و اختیار حاصل ہو۔ اور ہر شخص ظلم کے تدارک کا دعوئے کر سکے۔ اس کو جمہوریت کہتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے۔ کہ اگرچہ یہ بھدی ہے۔ بدسلیقہ ہے۔ بے ترتیب ہے۔ کمزور ہے۔ اور آسانی سے گمراہ ہوسکتی ہے لیکن صرف یہی طرز حکومت ہے۔ جو اخلاقی اعتبار سے جائز قرار دی جا سکتی ہے۔ حکومت کی مثالی شکل تو روشن خیال اور فیض رساں مطلق العنانی ہی ہے۔ لیکن یہ ایک ایسا خواب ہے جس کی قطعی طور پر کوئی تعبیر نہیں۔ اور جمہوریت کی کسی خیالی دُنیا سے بھی زیادہ موہوم ہے۔ کوئی ایسا مطلق العنان شخص وجود میں نہیں آسکتا۔ جو کافی روشن خیال بھی ہو۔ اور عدل و انصاف سے فیض رسانی کرے" فلسفی بادشاہ" کا نظریہ بھی عملاً کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ایک سرتاسر مور کو مسندِ اقتدار پر بٹھا دو۔ اس کا نتیجہ Torque made کی صورت میں بر آمد ہوگا۔ غیر مؤثر مارکس اور بلیس کا جانشین کو موڈس ہوتا ہے۔ عدل و انصاف صرف قوت کے پھیلاؤ ہی سے ممکن ہے۔ اور درحقیقت جمہوری قوت ہی کی ترقی کا نتیجہ ہے۔ کہ انصاف کی ترقی وجود میں آئی ہے۔

اور انصاف "سالم و کل" اخلاقیت ہے۔ ظلم کرنا اور نقصان پہنچانا بدکاری ہے۔ ناانصافی سے بڑی بداخلاقی کوئی نہیں۔ یہ سچائی اس قدر واضح ہے۔ کہ قدما کو اپنے بہترین ایام میں بھی کبھی یہ خیال نہیں آیا۔ کہ اس سچائی کو ظاہر یا ہر نہ سمجھیں۔ اور ان کے نزدیک "عدل و انصاف" کے الفاظ بالکل ہماری اصطلاحات "نیکی۔ راست بازی اور اخلاق" کے

مترادف تھے۔ مشرقی اخلاقیات نے صدیاں صرف کرکے اس سادہ صداقت کو دھندلا کر دیا ہے۔

اخلاق کی تمام شکلیں اور تمام پہلو جو محض رسمی اور اپنی من گھڑت اور خلافِ اخلاق جعلی اخلاقیت سے تعلق نہیں رکھتے۔ حقیقت میں انصاف ہی کے پہلو ہیں۔ یہ وہ حقوق ہیں۔ جن کو قوت کی دستبرد اور غلط کاری سے محفوظ رکھنا ہے۔ اور یہ وہ حقوق ہیں۔ جن کو خلافِ عقل باتوں اور دروغ بافیوں نے مظلوم بنا رکھا ہے۔ انسانیت کے جذبات، انسانی زندگی کا احترام اور مصیبت زدوں پر تلطف دراصل روحِ انصاف ہی کی شکلیں ہیں۔ اور تمام وہ غلط کاریاں جو ان احساسات کو ٹھیس پہنچاتی ہیں۔ ناانصافی کے افعال ہیں۔ جن کی اولین حمایت قوتِ مقتدرہ کی اخلاقیت ہی کی طرف سے ہوتی ہے۔

عام طور پر فرض کیا جاتا ہے۔ کہ کسی قوم کی اخلاقی حالت اُس کے اخلاقی حالات کا نتیجہ اور اظہار ہوتا ہے۔ لیکن یہ علت ومعلول کی ترتیب حقیقت میں بالکل اُلٹ ہے۔ اصل بات یہ ہے۔ کہ اخلاقی خیالات اخلاقی حالات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ جب تک مقتدر قوت اور مقتدر مفادات بلا مزاحمت ظلم کرنے میں آزاد رہیں۔ ظلم لازماً ایک حق کی حیثیت سے جائز اور بجا سمجھا جاتا ہے۔ کسی قوم کی پوری اخلاقی زندگی لازماً اس معیار سے معین ہوتی ہے۔ جس کو اخلاقیات کے ایک محسوس نظام کی حیثیت سے قابل قبول راستے سے جائز و مقدس قرار دیا ہو۔ اور حقیقت میں نافذ العمل ہو۔ اگر کسی معاشرے کی تنظیم غیر عادلانہ ہو۔ اور اُس کی بنیاد قوت کے مالک طبقوں کے مفاد پر رکھی گئی ہو۔ تو وہاں انصاف کے قطعی معیاروں کی تلاش بے کار ہوگی۔ خواہ ان مفادات مقتدرہ کا براہِ راست تعلق نہ بھی ہو۔

جو ذہنی قانون قائم شدہ نظام پر اپنی مُہرِ تصدیق ثبت کر کے اس کو اخلاقی قرار دیتا ہے۔ وہی اس نظام کے ماتحت ہر اخلاقی تخمینے کی تشکیل کرتا ہے۔ خدائی قانون ہمیشہ قائم شدہ انسانی قانون کے نمونے کے مطابق ہوتا ہے۔ بعض بربریتیں براہِ راست کسی قوتِ متقندرہ کے تجاوز کا نتیجہ اور اُس کے فوری مفاد کی ممد و معاون نہ تھیں۔ لیکن اُن تجاوزات کی نوعیت نے ان بربریتوں کی تائید و حمایت کی۔ اور یہ عقلی تنقید ہی کا عمل ہے۔ کہ بربری رسوم۔ خلافِ انسانیت حرکات اور قوت کے (قانونی طور پر جائز) تجاوزات ختم ہو گئے۔

تیسرا باب

اخلاق اور ثقافت

(۱)

جذبہ۔ ہمدردی اور عقل

ایک مقبول عام عقیدہ یہ ہے۔ کہ اخلاقی جذبات ہمدردی یا دردمندی کے فطری احساس سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور شوپن ہاور اور ڈارون نے بھی اس عقیدے کو اخلاقیات کی ابتدا کا سب سے بڑا عامل قرار دیا ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ عقیدہ بالکل غلط ہے۔ اور اصل بات یہ ہے۔ کہ ہمدردی دردمندی اور انسانیت کے احساسات اخلاقی بصیرت کا سرچشمہ نہیں ہیں۔ بلکہ اس کی پیداوار ہیں۔ اخلاقی "احساس" اخلاقی عمل کے بعد ہی پیدا ہوتا ہے۔ رحم اور ہمدردی کے احساسات اُس وقت نشوونما پاتے ہیں۔ جب ایک طرزِ عمل صحیح اور درست قرار پا جاتا ہے۔ اور کوئی ناانصافی یا خلافِ انسانیت حرکت منسوخ ہو چکتی ہے۔ جس چیز کو صحیح و مناسب یا محض رواجی ہی سمجھا جاتا ہے۔ وہ دردمندی و ہمدردی کے جذبات کو پیدا نہیں کرتی۔ جب کوئی داد و ستد مسلمہ طور پر قابلِ تعریف قرار پا جاتی ہے۔

تو یہ احساسات (اگر ان کا کوئی جزتو مہ موجود بھی ہو) نظر انداز کر کے دبا دیئے جاتے ہیں۔ جب ہسپانیہ کی ایک یہودی لڑکی اور اس کے متعدد ساتھیوں کو شاہی شادی کے ہنگاموں کے درمیان چتا پر جلانے کے لئے لے گئے۔ اور اس نے ملکہ ازبیسا سے نہایت دل خراش انداز میں رحم کی استدعا کی۔ تو ملکہ نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اگر اس وقت ملکہ کے دل میں رحم کا جذبہ پیدا ہو جاتا۔ تو اس کو نہایت سختی سے گناہ قرار دیا جاتا۔

اس سلسلے میں سب سے زیادہ نمایاں یہ حقیقت ہے۔ کہ جادوگرنیوں کو آگ میں جلانے کی رسم برابر جاری رہی۔ اور اس کے خلاف اخلاقی بنا پر کبھی ایک دفعہ بھی آواز بلند نہ کی گئی۔ تاریخ انسانی میں قاتلانہ وحشت کی جتنی خوفناک شکلیں دیکھنے میں آتی ہیں (مثلاً روما میں "گلیڈی ایٹروں" کے جان لیوا تماشے یا مذہبی تعذیبات) ان سب سے زیادہ بیدردانہ یہی سزا تھی۔ لیکن چونکہ اس کے کشتے نہایت ہی بے یار و مددگار انسان تھے۔ اس لئے اس ظلم عظیم کے خلاف کوئی صدائے احتجاج سنائی نہ دی۔ اور یہ ہولناک واقعات سکاٹ لینڈ۔ پیورٹین انگلستان۔ اور نیو انگلینڈ میں حدِ انتہا تک پہنچ گئے۔ حالانکہ اس وقت اخلاقیاتی ریاکاری کا اثر انتہائی عروج پر تھا۔ یہ واقعات خاصی سرعت کے ساتھ متروک ہو گئے۔ اس لئے نہیں کہ انسانیت کے نام پر کسی نے ان کے خلاف غیظ و غضب کا اظہار کیا تھا۔ بلکہ محض اس لئے کہ جادوگری پر لوگوں کو اعتقاد باقی نہیں رہا تھا۔ جب تک یہ چیز ختم نہیں ہو گئی۔ اس کی مکروہیت کا کسی نے احساس ہی نہ کیا۔ عدالتی تعذیب پر عام طور پر رحم کے احساسات پیدا ہی نہ ہوتے تھے۔ جان ایویلن[۱] نے اپنی کتاب کے ایک

---

[۱] Diary of John Evelyn ۱۱ مارچ ۱۶۵۱ء

فقرے میں ایک مشتبہ چور کی تعذیب کا پورا حال لکھا ہے۔ جس کو وہ پیرس کے قید خانے "شاتیلے" میں بچشم خود دیکھ چکا تھا۔ اگرچہ وہ اس منظر کو تکلیف دہ "ضرور بتاتا ہے۔ لیکن اس پر غیظ یا ملامت کا ایک لفظ بھی نہیں کہتا۔ اور اس عجیب منظر پر صرف اس قدر تبصرہ کرتا ہے:۔

"اس کو دیکھ کر مجھے اس امر کا احساس ہوا۔ کہ ہمارے مقدس نجات دہندے (مسیح) کو اس وقت کتنی نا قابل برداشت تکلیف ہوئی ہوگی۔ جب اس کا جسم اپنے پورے وزن کے ساتھ صلیب کی میخوں سے لٹک رہا تھا"

ہم ذکر کر چکے ہیں۔ کہ وہ پرانا خیال محض مغالطہ ہی نہیں ہے۔ کہ بہت قدیم برادریاں اعلیٰ درجے کی مہذب قوموں کے مقابلے میں کئی اعتبار سے زیادہ پابند اخلاق تھیں لیکن اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ بد اخلاقی کا سرچشمہ (یعنی استحقاقی قوت کا وجود) اُن برادریوں میں مفقود تھا۔ بلاشبہ وحشی انسان اخلاقی اعتبار سے زیادہ ترقی یافتہ نہیں تھا۔ لیکن اخلاقیت کا اب تک موقع ہی پیدا نہ ہوا تھا۔ وحشی انسان کی قدیم اخلاقیت کسی نازک انسانی احساس پر مبنی نہ تھی۔ اس کا نمایاں ثبوت یہ ہے۔ کہ وہی قدیم برادریاں جن کی بھولی بھالی اخلاق پرستی ہمارے لئے بے حد دلفریب ہے۔ تقریباً تمام مردم خور تھیں۔ پرانے سیاحوں کے لئے یہ معاملہ ناقابل فہم تھا۔ کہ بحر جنوب کے جزیرہ نشین دیہاتی جن کا بھولا پن۔ جن کی دیانت داری۔ مہمان نوازی۔ اور امن پسندی بے حد دلکش تھی۔ عادتاً آدم خور واقع ہوتے تھے۔

ایک زمانے میں انسانی قربانی بڑے پیمانے پر عام تھی۔ بعد میں انسان کی جگہ حیوان قربان کئے گئے۔ اور اس کے بعد رسمی قربانی باقی رہ گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ تشکک کی ایک نیم شعوری ابتدا ہو گئی تھی۔ اور لوگ

قربانی کے حقیقی فائدے کے قائل نہ رہے تھے۔ جس وقت تک یہ عقیدہ کسی شک وشبہ کے بغیر قلوب میں راسخ تھا۔ کہ ایک انسان کو عوام کی خاطر مرجانا چاہیئے۔ کیونکہ اس سے مقصد و مدعا (یعنی قبیلے کی سلامتی و خوشحالی وغیرہ) کا حصول یقینی ہوجائے گا۔ لوگ اہم مقاصد کے حصول کے اس براہِ راست طریقے کو چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوسکتے تھے۔ اور اگر ہوجاتے۔ تو بڑے احمق ہوتے۔ چونکہ ایک انسانی جان جیسی عظیم چیز بطور قیمت طلب کی جاتی تھی۔ اس لئے ہی امر معاوضے اور انعام کی ضمانت تھا۔ وہ قدیم عبرانی باپ جس نے اپنے پہلوٹھے کو آگ میں سے "مولوک" (ایک کنعانی بت) پر بھینٹ چڑھا دیا تھا۔ غالباً ایک شفیق باپ تھا۔ اور فیجی کے جس شخص نے اپنی بوڑھی ماں کا بھیجا پھوڑ دیا تھا۔ وہ بڑا ہی فرمانبردار بیٹا تھا۔ ہر حالت میں اوہام پرستی کا نظریہ ہی کسی جذبے یا احساس پر مقدم رہتا تھا۔ انسانی قربانی اور آدم خوری کو انحطاط ہوا۔ تو اس کی وجہ یہ نہ تھی۔ کہ جذبۂ اخلاقی میں کوئی بیاسرار اور بلاوجہ نشو ونما پیدا ہوگئی تھی۔ بلکہ یہ مذہبی تشکک کی ابتدا کا اثر تھا۔

اخلاقی ترقی ہر پہلو میں احساس کی نشو ونما پر نہیں۔ بلکہ فکر کی نشو ونما پر مشتمل ہوتی ہے۔ سب سے پہلے عقلی ارتقا پیدا ہوتا ہے جس نے اخلاقی ارتقا کو پیدا کیا ہے۔ بلاشبہ جب کسی خاص معاملے میں عقلی بغاوت کے دباؤ سے ناانصافی متروک قرار پا جاتی ہے۔ تو ایک نظیر قائم ہوجاتی ہے ایک اصول پیدا ہوجاتا ہے۔ اور ایک جذبہ جنم لیتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ظلم وجور کی جسمانی قوت "حق پرستی"۔ وفاداری اور ظالموں کے اخلاق کے تمام دوسرے اصولوں میں منتقل ہوجاتی ہے۔ جہاں کامیاب مزاحمت مسلسل طور پر ناانصافی کے خلاف مصروف کار ہوتی ہے۔ خود اصولِ عدل ہی ایک نعرۂ جنگ بن جاتا ہے۔ اور اخلاقی جذبہ طبعاً وسیع ہوجاتا ہے۔

لیکن سب سے نمایاں بات یہ ہے۔ کہ مجرد اخلاقی جذبہ نہایت ہی ضعیف کمزور اور بے نتیجہ ہوتا ہے۔ محض اصولِ اخلاق نے دُنیا کی فلاح و بہبود میں کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں کی۔ جب تک اس اصول کے اندر کوئی حقیقی مادی مفاد پوشیدہ نہ تھا۔ یا اس سے کسی واضح عقلی عمل کا اظہار نہ ہوتا تھا۔ پوری تاریخ شاہد ہے۔ کہ خالص اور مجرد اخلاقی اصول دردناک طور پر بے سود و بیکار رہے ہیں۔ جس اخلاقیت نے محض اخلاق کے نام پر اور بغیر اپنے اتحادیوں کی مدد کے بدی کا سامنا کیا ہے۔ وہ ہمیشہ غیر متعلق۔ غیر عملی۔ محض خیالی اور خلاف مصلحت قرار دے کر رد کر دی گئی ہے۔ اور وہ کبھی عملی سیاسیات کے دائرے میں داخل ہونے میں کامیاب نہیں ہوئی۔ اگرچہ انگلستان میں آزادی مذہب کے جھنڈے تلے حاصل کی گئی تھی۔ لیکن حبشیوں کی غلامی کے خلاف جو احتجاج کیا گیا۔ وہ مدت دراز تک ناکام رہا۔ اور جن جوشیلوں نے اس احتجاج کو آگے بڑھایا تھا۔ وہ قریب قریب دل شکستہ ہو رہے تھے۔ یہاں تک کہ حبشیوں کی غلامی موقوف کر دی گئی۔ اور یہ اٹھارھویں صدی کے فرانسیسی فلسفیوں کے عقلی فکر کا ناگزیر منطقی نتیجہ تھا۔ چنانچہ ولبر فورس نے دارالعوام میں نہایت تلخکامی سے فریاد کی۔ کہ جس کام کے لئے اُس نے مدت دراز تک ناکام کوشش کی تھی۔ اس کی تکمیل "دہریت نواز اور بدنظم فرانس" کے حصے میں آئی۔ یک یکی بازی (یعنی ڈوئیل لڑنا) انگلستان میں اخلاقی وجوہ کی بنا پر موقوف نہیں ہوئی۔ بلکہ اس لئے کہ اس حرکت کو احمقانہ اور لغو سمجھا جانے لگا۔ یہ امر بالکل ظاہر اور روشن ہے۔ کہ بالآخر جنگ بھی منسوخ ہو کر رہے گی۔ اس وجہ سے نہیں۔ کہ جنگ ایک نفرت انگیز جرم ہے۔ بلکہ اس لئے کہ یہ ناقابلِ برداشت وبالِ جان ہے۔

اگر میں ایک خاص قسم کی اخلاقیت پر بحث نہیں کر رہا (جو ایک خیالی رواج و استعمال کی وجہ سے عام زبان میں اخلاق کی اصطلاح پر پورا اجارہ قائم کئے ہوئے ہے) یعنی اخلاق جنسی پر۔ تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ یہ موضوع اپنے شاخ در شاخ مسائل کے اعتبار سے اتنا گہرا اور دور رس ہے۔ کہ یہاں اس پر کافی غور و بحث کی گنجائش نہیں۔ بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ اس کے متعلق کسی ارتقا کا سراغ نہیں مل سکا۔ اس کا سادہ سا باعث یہ ہے۔ کہ قدیم ترین زمانے سے لے کر آج تک جنسی اخلاقیت پر اس تصور کا غلبہ رہا ہے۔ کہ عورت ایک شئے مملوکہ ہے۔ جو جائداد و ذات کے وارثوں کو پیدا کرنے کا کام دیتی ہے۔ عورتوں پر بے شمار سختیاں کی گئیں۔ جذبات سے پیدا ہونے والی ہر خیالی آفت کا بوجھ اسی کے کندھوں پر لاد دیا گیا۔ اور پھر جذبات کی غیر طبعی تحریک کی خاطر بناوٹی شرم و حیا "پاک دامنی"۔ پابندیوں اور ملبوسات کے پورے ساز و سامان مہیا کئے گئے۔ یہ تمام بالکل اسی مطلق مالکانہ قبضے کی پیداوار ہیں۔ جو ہمارے معاشری نظام کا بنیادی پتھر بھی ہے۔ ہمسائے کی بیوی کو حاصل کرنے کی طمع ایسی ہی معیوب ہوئی۔ جیسے اس کے بیل یا اس کے گدھے یا اس کی کسی اور چیز کا لالچ۔ بلکہ اس سے زیادہ معیوب قرار پائی۔ کیونکہ ہر عورت جائداد کے وارث کی ماں ہو سکتی ہے۔ لہٰذا اس کے جسم کو گناہ کا آلہ اور شئے حرام سمجھنا چاہیئے۔ اور اس کو نہایت احتیاط سے چھپانا اور پوشیدہ رکھنا چاہیئے۔ چونکہ بنیادی بے انصافی میں کبھی کوئی تغیر پیدا نہیں ہوا۔ لہٰذا ایک زمانے کی جنسی اخلاقیت اور دوسرے زمانے کی جنسی اخلاقیت میں کوئی فرق و امتیاز نہیں۔ پاکیزگی اور عصمت کے ہنگاموں اور حد سے بڑھی ہوئی شہوانیت کے ہنگاموں کے درمیان طبعاً تبادل ہوتا رہا۔ لیکن عقلی ارتقا کے کسی عمل کا ثبوت مہیا نہیں کیا جا سکتا۔ اب چونکہ اس مہتم بالشان

مسئلے کے ہر پہلو پر غور و بحث کے دروازے کھل گئے ہیں۔ اور عورت بھی مرد کی طرح احتجاج اور مزاحمت کے اختیار کا مطالبہ کر رہی ہے۔ کم از کم اتنا تو واضح ہوتا ہے۔ کہ بدی۔ ناانصافی اور معصیت کے اس پہلو کو (جو اس مسئلے سے پیدا ہوا ہے) درست کرنے کی ہر امید صرف اس امر سے وابستہ ہے۔ کہ حقائق کا نہایت عزم سے سامنا کیا جائے۔ اور روایت رسم و رواج۔ تعصبات اور جعلی و مصنوعی اقدار کو خواہ وہ کتنے ہی قدیم و مقدس ہوں۔ نہایت بیدردی سے بالائے طاق رکھ دیا جائے۔ اور اُن پر مبنی حقوق و اختیارات کی مزاحمت کی جائے۔ اخلاقی ترقی کا قانون یہاں بھی وہی ہے۔ جو دوسرے معاملات میں مؤثر ہے۔ یعنی عقلی فکر سے کام لے کر دروغ بافیوں کو تباہ کیا جائے۔ اور ناانصافی کو موقوف کیا جائے۔

(۲)

اخلاق اور تہذیب

عام خیال یہ ہے۔ کہ ذہنی نشو و ارتقا اور اخلاقی نشو و ارتقا دونوں انسانی ترقی کے دو ممتیز اور کلّا غیر مربوط پہلو ہیں۔ اور ایک دوسرے سے بالکل بے نیاز و بے تعلق رہ کر اپنے اپنے راستے پر گامزن رہتے ہیں۔ لیکن یہ درست نہیں۔ بلکہ اس کے برعکس یہ دونوں ہر جگہ اور ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ اُستواری سے مربوط نظر آتے ہیں۔ بربریت کا مطلب صرف ایک اُجڈ سی مادی زندگی۔ کپڑوں۔ گھروں کے قدیم رنگ ڈھنگ۔ بھدے اوزار جہالت۔ ناخواندگی اور اوہام پرستی ہی نہیں۔ بلکہ اس کے معنی یہ انسانیت ظلم و ستم اور ناانصافی بھی ہیں۔ تہذیب و ثقافت کے مظاہر صرف فنون۔ مادی آسائشوں۔ علم اور ذہنی مصروفیتوں اور کارناموں ہی تک محدود نہیں

بلکہ انسانی زندگی اور انسانی روابط میں بڑے پیمانے پر حق و انصاف اور انسانیت پر بھی مشتمل ہیں۔ تمام زمانوں میں کسی قوم کا اخلاقی نشوو ارتقا بالکل اس کی ذہنی مہارت اور عقلیت کے درجے سے متناسب ہوتا ہے۔ جہاں کہیں بھی قوت ذہنی نشوو نما واقع ہوتی ہے۔ وہاں بہ اوری کے اخلاق و کردار میں انصاف پسندی اور رحم دلی نمایاں ہو جاتی ہے۔ جو اس کے بربری اور اوہام پرست ہمسایوں میں بالکل مفقود ہوتی ہے۔

اولین مذہبی سلطنتوں کی ثقافت بالکل خام اور عقیم تھی۔ اور یہی حال ان کے اخلاق کا تھا لیکن وہ ابتدائی وحشیانہ زندگی سے واضح طور پر آگے بڑھ چکی تھیں۔ چنانچہ بابل اور ہیلیوپولس کے ذہنی کارناموں سے اس کا پتہ چلتا ہے۔ جب مادی اور ذہنی ثقافت طلوع ہوگی۔ تو اخلاقی نصب العین بھی قائم ہوئے۔ سامی اور مصری تہذیب نے اپنی طفولیت کے پہلو یعنی انسانی قربانی اور آدم خوری سے شرمسارانہ نجات پالی تھی۔ یہ لوگ دھندلے اور گڈ مڈ نقطۂ نگاہ سے لیکن نہایت جوش و سرگرمی کے ساتھ اخلاقی نصب العینوں کا اعتراف و اعلان کرتے تھے۔ اُن کے پاس کوئی واضح اصول نہیں تھا۔ وہ نیکی اور بدی کی نوعیت اور اُن کے وجود کو معین کرنے کے قابل نہیں تھے۔ اُن کے اخلاقیاتی تصورات کی شکل ابھی زیادہ تر وحشیوں کی سی تھی۔ حرام (ٹابو) اشیا کیا ہیں۔ رسوم عبادت کی ترتیب کیا ہے۔ جائز و ناجائز کون کون سی چیزیں ہیں۔ احکام عشرہ کیا ہیں۔ یہ تمام خدائی احکام تھے۔ عدل و انصاف اور بعض رسوم کو عجیب و غریب طریقے سے گڈمڈ کر دیا گیا تھا قتل سے اجتناب اور سبت کی پابندی دونوں مساوی اہمیت کے احکام تھے۔ اور انسان دوستی اور تعویذ پوشی اخلاقی ذمہ داری کے اعتبار سے ایک ہی سطح پر رکھی جاتی تھیں لیکن اس کے باوجود اُن میں اخلاقیت کا خیال اور حق کا تصور پیدا ہو

تھا۔ جس کا اظہار پتاح ہوتیپ، حمورابی کے قانون۔ بابل کے مذہبی گیتوں اور مختلف مذہبی اشعار و نغمات میں ہوتا ہے۔

لیکن یہ یونان کا کارنامہ تھا۔ جو نوع انسانی کا مجدد ہے۔ اور جس نے انسانی ارتقا کو ایک نئی اور بلند سطح پر پہنچایا۔ کہ اس کی عقلیت پسندی نے اخلاقیاتی نشو و ارتقا کی بنیادیں استوار کیں۔ یونان کی جس فعالیت نے ذہنی تحقیق و تجسس کے تمام دروازے کھول دیئے تھے۔ اس کا بہت بڑا حصہ اخلاقی فکر، مسائل سیرت و کردار پر غور و خوض اور مثالی حق کے تصور کی تعمیر کے لئے وقف تھا۔ اس عظیم ذہنی انکشاف کے تمام مظاہر کا جزو لازمی یہ تھا۔ کہ انسان کی قدر و قیمت کا نصب العین قائم کرے۔ اس کے مقصد اور کردار کے حسن اور اس کے جسم کا جمال واضح کرے۔ جس نے Praxiteles اور Polycleitos میں تخلیقی روح پھونکی تھی۔

یونان کے اخلاقی فکر نے (اپنے دوسرے کمالات کی مانند) اپنے بعد میں آنے والوں کے فکر کی پرورش کی۔ فن و ادب کی طرح اس شعبے میں بھی یونان ہی کے قائم کردہ اساسات و اصول وہ معیار قرار پا گئے۔ جنھوں نے دنیا کے فکر کی تشکیل کی۔ بلکہ فن و ادب کی نسبت بہت زیادہ وسعت کے ساتھ یہ ہوا۔ کہ حسنِ عمل اور عادلانہ زندگی کے مسائل پر جن کو سب سے پہلے یونان ہی نے موضوع بحث بنایا۔ اس کے فکر کے نتائج اس مضمون پر علم کے نئے احوال کے ظہور تک انسانی فکر کا نقطۂ اوج بنے رہے۔ اور جس اہلیت کو انسان نے بے شمار ادوار میں حاصل کیا۔ وہ حقیقت میں یونان کو پیشتر ہی حاصل ہو چکی تھی۔

لیکن ہمارا یورپی فکر یونانی ورثے کے اس پہلو کی فرسودگی سے اتنا متاثر ہوا۔ اور سامی نصب العین کی تکریم و تعظیم کے نقطۂ نظر کا اتنی مدت قائل رہا۔ کہ ہیلاس کی اخلاقیاتی کامرانی ہمارے افق پر اس شان و شوکت

سے برتری حاصل نہ کر سکی جس سے یونان کی تخلیقی قوت کے دوسرے ثمرات غالب آ گئے تھے۔ یہاں تک کہ میتھیو آرنلڈ اور سیکے جیسے بھی اسی اثر کے کابوس کے ماتحت یونان کی اخلاقیاتی روحیت پر عبرانی اخلاقیات کی برتری کو تسلیم کر کے ابلہ فریبی کرتے رہے ہیں۔ ہم عنقریب ثابت کریں گے کہ یہ روائتی تجزیہ کس قدر قطعی طور پر جھوٹ تھا۔

میں ذکر کر چکا ہوں۔ کہ اخلاقی فکر جو اپنے آپ کو اصول و عمل میں ظاہر کرتا ہے۔ اخلاقی نشو و ارتقا کا صحیح پیمانہ نہیں ہے۔ لیکن جب ہمارا واسطہ عمدہ جذبات کی چکنی چپڑی باتوں سے نہیں۔ بلکہ اُن اصولوں سے پڑتا ہے جو پہلی دفعہ پیش کئے جاتے ہیں۔ اور حقیقی نشو و نما کا زندہ مظہر ہوتے ہیں۔ تو معاملہ کسی قدر مختلف ہو جاتا ہے۔ ہیلانی اخلاقیاتی فکر اپنے فلسفیانہ اور سائینسی فکر کی مانند فیصلہ کن نہ تھا۔ اور اس کی وجہ صرف یہ تھی۔ کہ دنیائے قدیم کے حالات دگرگوں تھے۔ اور سائینسی معلومات مفقود تھیں۔ صرف زمانۂ حاضر ہی ان مسائل کی جڑ تک پہنچنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اس کو منضبط تجربہ حاصل ہے۔ اور عالمگیر عملیات و روابط کا کافی ادراک میسّر ہے۔ یونانی مفکر سے یہ توقع رکھنا کہ علم الانسان کے حقائق و معلومات۔ ارتقا کے تصوّر اور وسیع علمِ فطرت کے بغیر ہی اخلاقیات کے بنیادی معانی اور تعلقات پر حاوی ہو جائے گا۔ بالکل ایسا ہی ہے۔ جیسے فیثاغورث یا ارشمیدس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ برق کی منفی شعاعوں کا پتہ چلا لیں گے۔

لیکن ان تمام توضیحات و تجدیدات فکر کو الگ رکھئے۔ جن کا امکان صرف ابھی شروع ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ وہ تمام نصب العین یونانی فکر ہی نے پیدا کئے تھے۔ جو آج تک یورپ کی حسِّ اخلاقی کا سرو سامان بنے رہے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا چاہئے۔ کہ یہ فکر صدیوں تک یورپی اخلاقیت کے مستند اور نظریاتی اظہارات سے بھی آگے بڑھا ہوا تھا۔ ہم اپنے نزدیک

جن چیزوں کو گھٹیا اور عامیانہ سمجھتے ہیں۔ اُن کے ارتقا کی قدر و قیمت کو محسوس نہیں کرتے۔ اور ہمارے ذہن میں نہیں آتا۔ کہ دُنیا میں ان چیزوں کا لانا کتنی بڑی کامیابی تھی۔ یونان نے صرف یہی نہیں کیا۔ کہ تمام انسانی چیزوں پر اخلاقی حق کی فوقیت و برتری کا اعلان کیا۔ بلکہ ایک ایسی دُنیا میں جو آنکھ کے لئے آنکھ اور دانت کے لئے دانت کے انتقامی اصول پر پورا یقین اور ایمان رکھتی تھی۔ یہ دعویٰ کیا۔ کہ "ناانصافی کا جواب ناانصافی سے دینا اور کسی شخص سے بدی کا سلوک کرنا خواہ ہمیں اس سے کتنی ہی تکلیف پہنچی ہو۔ بالکل غلط ہے"۔ پریکلیس نے مرتے وقت اپنے اعزاز کے تمام دعاوی سے زیادہ اس دعوے کو پیش کیا۔ کہ "ایتھنز کا کوئی شخص میری وجہ سے ماتم پر مجبور نہیں ہوا"۔ اور سقراط نے مرتے وقت یہ کہا۔ کہ "مجھے اُن لوگوں پر کوئی غصّہ نہیں۔ جنھوں نے میری سزائے موت کی رائے دی ہے"۔ اس کے علاوہ مثال کے طور پر سزا و تعزیر کے تصوّر کے متعلق یونانی فکر کے رویے پر غور کرو۔ کہ چونکہ ہر بُرائی جہالت و حماقت سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے اسے بیماری سمجھنا چاہیئے۔ اور اس کا علاج اخلاقی طبیب سے کرانا چاہیئے۔ بے معنی تعزیر و تعذیب سے اس کا علاج نہیں ہو سکتا۔ تعزیر کے لئے یونانی زبان میں جو الفاظ ہیں۔ وہ "تندیل" کے مترادف ہیں۔ مسیحی یورپ کو حکمت و دانش کی اس سطح پر پہنچنے میں بیس صدیاں لگ گئیں۔ یہ تمام تصوّرات انسان کی فطری اچھائی کے یقین پر مبنی تھے۔ مطلب یہ تھا۔ کہ "کوئی انسان فطری طور پر بدکار نہیں"۔ اور اس تصوّر کے پیشِ نظر کوئی خارجی شدہ نہ تھی۔ بلکہ صرف انسانیت کا اعزاز تھا۔ یعنی "خود احترامی۔ خود علمی اور خود ضبطی" کی تعلیم تھی۔

یونان کا اخلاقیاتی فکر بھی اپنی دوسری پیداواروں کی طرح حد سے

زیادہ تجریدیا اور منقطع قسم کی عقلیت سے متاثر تھا۔ وہ ہر شئے سے پہلے خالص اور سادہ فکر تھا۔ ایسا فکر نہیں۔ جس نے تجربے اور زندگی کے کامل تماس سے اپنی شکل اختیار کی ہو۔ اس فکر نے کچھ عرصہ گزرنے کے بعد رومیوں کے ٹھوس ذہن کے عالمی اتصالات کی وجہ سے پوری پختگی۔ چمک دمک اور زرخیزی حاصل کی۔ تاہم اصلاً چونکہ یونان ذہنی اعتبار سے رومیوں پر فوقیت رکھتا تھا۔ اسی طرح اس کو رومیوں پر اخلاقیاتی برتری بھی حاصل تھی۔ روما کی درشتی۔ اس کے گھٹیا مذاق اس کے گلیڈی ایٹروں کے تماشے کسی یونان کی سرزمین پر پھل پھول ہی نہ سکتے تھے۔ عقل و ادراک نے یونانیوں کی اخلاقی فطرت کو ناگزیر طور پر متاثر کیا۔ حالانکہ اس کی اخلاقیاتی روح لازماً فکر کا ایک مجرد ثمرہ تھی۔ زندگی سے اس کا تعلق نہ تھا۔ اخلاقی فلسفی نمایندہ یونانی۔ ایک سقراط۔ ایک پیریکلیس۔ ایک یوری پیڈیز اپنے تمام انقطاع فکری کے ساتھ ہیں ایک داؤد یا ایک سلیمان جیسے پارسا نظر نہیں آتے۔ یونانی فکر کی بھرپور نشوونما کے ساتھ ساتھ ایک خاموش۔ عظیم اور حقیقی اخلاقی نجات کا عمل بھی جاری تھا۔ ڈریکونی ضابطہ حقیقت میں پرانی رسوم اور قدیم یونانی قبائل کی اخلاقیت کا ایک نرم اور دھیما سا ترمیم شدہ نسخہ تھا۔ لیکن جب یونان سن بلوغت کو پہنچا۔ تو یہی ضابطہ خونخواری اور درندگی میں ضرب المثل بن گیا۔

لاطینی سرزمین پر ذہنی ثقافت اور انسانیت پروری کی روح دونوں یونان ہی کے اثر سے پروان چڑھیں۔ یہ دونوں اس دن سے یک جا ہوئیں۔ جب کارنیاڈیز نے ایک سفارتی مشن کے دقفے میں عدل و انصاف پر لکچر دیئے۔ اور روما پر یونان کی فتح کی بنیاد رکھ دی۔ روما کی اصلی اور دیسی نیکیاں (جن کی تواناتی کشمکش۔ غلبہ اور تنظیم میں جذب تھی) شجاعت اور وطن پرستی۔ فرزندانہ اور شہری انضباط تھیں۔ اور دشمنوں اور مفتوح

لوگوں کے ساتھ سلوک کرنے میں بڑے اہتمام اور تکلف کے ساتھ اُن کا اظہار ہوتا تھا۔ مثلاً ایک قاعدہ یہ تھا۔ کہ پہلے اعلان جنگ کئے بغیر حملہ نہیں کیا جاتا تھا۔ قول وقرار کی پابندی سختی سے کی جاتی تھی۔ اور بعض اوقات اس کے لئے جان پر کھیل جاتے تھے۔ ہیلانی اثر روز بروز زیادہ مکمل ہوتا گیا۔ مگر اتنی ہی رُوما کی ذہنی ثقافت اور خیال انگیزی یونانی ہوتی چلی گئی۔ جس سے جنگجو کی جبلّی درشتی بے اثر ہوگئی۔ اور اہل روما کو تنظیم۔ حکومت "قانون فطری سنجیدگی اور روایت کی جو صلاحیتیں پہلے ہی سے حاصل تھیں۔ اور پھر انہیں متصادم دعاوی میں توازن پیدا کرنے کی جو عادت تھی۔ ان تمام خوبیوں کی بنا پر روما کی اخلاقیت۔ انسانیت پروری اور قانون سازی کا شاندار نشو وارتقا جاری رہا۔ اس اثر اور اس آمیزش سے دُنیا میں اخلاقیاتی نصب العینوں کی نہایت اہم بار آوری ظاہر ہوگی۔ اگرچہ ہم اس سے پیشتر ذکر کر چکے ہیں۔ کہ وہ نصب العین اکثر پہلوؤں سے ناقص تھے۔ اور ان کی بیخ و بن میں ایک مُرتا اور ناقابل علاج انحراف موجود تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ کئی زمانوں تک دُنیا میں اخلاقی حیثیت سے چراغ راہ بنے رہے۔ کیونکہ حقیقت یہ ہے۔ کہ اخلاقی قانون کے یہ مفروضہ و مسلّمہ معیار جو یورپ کے نشو وارتقا کے پورے دور میں اخلاقی اعتبار سے ضمیر کے حکم آخر کا کام دیتے رہے۔ خاص طور پر روما ہی کی پیداوار تھے۔ بنیادیں اور بار آور کرنے کے جذبے یونان سے آئے۔ بلکہ مذہب کی قدیم مشرقی روح یونان کی وساطت سے بھی اور براہِ راست بھی اثر انداز ہوئی۔ لیکن اخلاق نے جو آخری شکل اور نوعیت اختیار کی۔ اور جس میں وہ دُنیائے جدید تک پہنچا یعنی راست بازی اور حق پرستی کے "واجبی اور قطعی" قوانین و عدل وانصاف کے متقاضی تھے۔ اُن کے لحاظ سے یورپ کے روایتی اخلاقی تصوّرات کا پورا احاطہ رومن ہے۔

اسلام کی ذہنی ثقافت جو بڑے بڑے نتائج کی حامل تھی۔ ایک ایسے اخلاقی نشو و ارتقا کا باعث ہوئی۔ جو اپنے اثر کی وجہ سے قابل ذکر ہے۔ جب مسیحی یورپ نے دیکھا۔ کہ ایک فراخ دلانہ رواداری بلا امتیاز عقیدہ و مسلک مسیحیوں اور یہودیوں کو یکساں حیثیت سے عہدہ و اعزاز دے رہی ہے (اور جس کے اصولوں کو بوکاشیو اور لیسنگ نے "تین انگشتریوں" کے مشہور اخلاقی قصے میں بیان کیا ہے) تو مسیحی یورپ ذلت محسوس کرنے کے بجائے غیظ و غضب میں آگیا۔ بہرحال جن غور و فکر کرنے والے انسانوں کو مُوروں کی تہذیب کے ساتھ رابطہ پیدا کرنے کا موقع ملا۔ ان پر اس رواداری کا نہایت دُور رس اثر پڑا۔ لیکن بربری زمانے کا یورپ اس بلند عالی ہمتی اور شجاعانہ غیرت کے نصب العین سے بے انتہا متاثر ہوا۔ اور اس کی تقلید پر آمادہ ہو گیا۔ جو ہسپانیہ کے بہادروں سے ظاہر ہوئی۔ مثلاً المنصور جیسے تند خو سپاہی سے جس نے یہ دعویٰ کیا۔ کہ اگرچہ میں نے جنگ و پیکار میں بہت سے دشمنوں کو تہ تیغ کیا ہے۔ لیکن آج تک کسی کی ہتک نہیں کی"۔ بہادرانہ روش اور سپاہیانہ وقار کا یہ وہ نمونہ تھا۔ جس پر بیسویں صدی کے انگلستان کو بھی غور کرکے نفع اُٹھانا چاہیئے۔ اُجڈ اور اکھڑ صلیبی مجاہدین صلاح الدین کی فیاضی اور رواداری اور شجاعت کو دیکھ کر شرم سے پانی پانی ہو گئے ۱؎ چنانچہ بہادرانہ نیکیوں کو اختیار کیا گیا۔ اور شرافت کی ذمہ داریوں کی روایت قائم ہو گئی۔

۱؎ اگرچہ اس فرق و تفاوت کے بہت سے ثبوت فراہم کئے جاسکتے ہیں۔ لیکن یہاں ایک ہی مثال کافی ہوگی۔ میں اسے بیسنٹ اور پامر کی کتاب "یوروشلم" سے پروفیسر پامر کے الفاظ ہی میں نقل کرتا ہوں۔ "اس امر پر اتفاق ہو گیا۔ کہ عکہ کے مدافعین کا جان مال محفوظ رکھا جائے گا۔ بشرطیکہ وہ دولاکھ دینار ادا کریں۔ پانچ سو قیدیوں کو رہا کر دیں۔ اور صلیب اصلی کا قبضہ چھوڑ دیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

صرف وہی شاعری اور وہی رومانی ادب شائع ہو کر عوام میں مقبول ہوتا تھا۔ جس میں عربی خیالات کا رنگ گہرا ہو۔ یورپ میں عورت کے مقام اور وقار کا ایک نیا تصور پیدا ہو گیا۔ جو موری دنیا اور پراونس کے درباروں سے آیا تھا۔ جہاں عورتیں مردوں کے ذہنی مشاغل اور مسرتوں میں پورا حصہ لیتی تھیں۔

جس چیز کو "دورِ شجاعت" کہتے ہیں۔ وہ کبھی حقیقتہً موجود نہ تھا "دورِ طلائی" کی طرح وہ بھی کسی خیالی ماضی کے دھندلے فاصلوں میں سراب کی طرح تھا۔ شاعروں کے تخیل نے اس کو شارلمین کے وحشیانہ اور بربری

بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۰۹۔ ایک لاکھ دینار کی پہلی قسط دے دی گئی لیکن صلاح الدین نے باقی رقم ادا کرنے یا قیدیوں کو حوالے کرنے سے انکار کر دیا تاوقتیکہ اس امر کی کوئی ضمانت نہ دی جائے۔ کہ عیسائی معاہدے کے ماتحت اپنی ذمہ داریوں کو پورا کریں گے۔ اور عکہ کے قیدیوں کو آزادانہ پھرنے کی اجازت دے دینگے۔ . . . . . روپیہ تولا گیا۔ اور سلطان کے آگے رکھ دیا گیا۔ قیدی بھی رہا کئے جانے والے تھے۔ اور صلیب اصلی بھی منظر عام پر رکھ دی گئی۔ رچرڈ (شیردل) مرج العیون کے پاس کیمپ لگائے بیٹھا تھا۔ اور پاس کی پہاڑی پر اس کے پیچھے عکہ کے قیدی جمع تھے دفعتہً بادشاہ نے اشارہ کیا مسیحی سپاہی ان ناشاد اور بے بس قیدیوں پر جا پڑے اور نہایت بے دردی سے سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ لیکن ایسے نازک موقع پر بھی صلاح الدین نے اپنی کریم النفسی اور اپنے شاہانہ کردار کو نہ چھوڑا۔ اس کے پاس جو غیر مسلح قیدی موجود تھے۔ ان کو اپنا نشانۂ انتقام ہرگز نہ بنایا۔ اور اپنے عزو وقار کو داغدار نہ کیا۔ اس نے صرف یہی کیا۔ کہ روپیہ اور صلیب انکو حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ اور قیدیوں کو دمشق بھیج دیا۔ اب اس کا خود فیصلہ کر لو۔ کہ مسلمان کا رویہ صحیح تھا یا مسیحیوں کا۔"

زمانے سے یا کسی کنگ آرتھر یا کسی پارسیفال کی افسانوی شخصیتوں سے وابستہ کر دیا تھا۔ لیکن شجاعت۔ خوش اطواری اور وقار و غیرت کی خوبیاں ہی تھیں۔ جو ظالم اور جاگیردار یورپ کی بے انصافیوں اور مکروہ سختیوں کے درمیان ٹھوس اخلاقی اوصاف کا تنہا سرچشمہ تھیں۔ صرف "شرافت اور نجابت کا اظہار" جس پر شوروں کی اخلاقی برتری نے یورپ کے ڈاکو نوابوں اور امیروں کو مجبور کر دیا تھا۔ عیسائیت کی تنہا اخلاقی خوبی بن گئی اور یہی روایت ہمارے زمانے تک چلی آئی ہے۔ اور ہم "جنٹلمین" (شریف و نجیب انسان) کے اس تصور کے قائل ہیں۔ جو انگریزوں کو بیحد عزیز ہے۔ اگرچہ یہ حقیقت باطل نما "ہمارے روایتی تصورات کو کتنا ہی صدمہ پہنچائے لیکن غالباً حقیقت ثابتہ یہی ہے۔ کہ یورپ کی حقیقی۔ عملی اور ٹھوس اخلاقیت میں مسلمانوں کی ثقافت کا بھی اتنا ہی بڑا حصہ ہے۔ جتنا کسی زیادہ بلند اور روحانی اخلاقی عقیدے کا ہو سکتا ہے۔

نفاست و انسانیت کا وہ اثر جس کو انسانوں نے ہمیشہ ثقافت سے منسوب کیا ہے۔ خوش ذوقی اور جمالیاتی نسائیت کا کوئی بڑا اسرار۔ نازکی اور دھندلا ثمرہ نہیں۔ بلکہ ذہانت۔ علم اور عقلیت فکر کا تمام اخلاقیاتی تخمینوں کی بنیادوں پر براہ راست اور ناگزیر نتیجہ ہے۔ جو لوگ جاہل۔ غیر ناقد اور غیر عقلی ہوتے ہیں۔ وہی غیر منصف اور بے درد بھی ہوتے ہیں۔ اور غیر محتاط اور خود مختارانہ قوت و اختیار کے غلط استعمال کے مرتکب اور روادار بھی ہوتے ہیں۔ جب ان کے اذہان روشن ہو جاتے ہیں۔ تو وہی مظالم۔ وہی ناانصافیاں اور وہی بے دردیاں اتنی ہی ناقابل برداشت ناممکن اور ناقابل تسلیم بن جاتی ہیں۔ جیسے بربریوں اور وحشیوں کے بے حقیقت تصورات اور توہم نظریات قابل رد ہوتے ہیں۔

(۳)

بدعنوانی

یہ سوال اُٹھایا جاتا ہے۔ کہ اعلیٰ درجے کی ترقی یافتہ ثقافت کے بعض پہلو بھی نہایت اخلاق سوز ہوتے ہیں۔ اس سوال کو سنتے ہی انحطاط پذیر روما اور اطالوی نشاۃ الثانیہ کی متبرک مثالیں نظر کے سامنے آجاتی ہیں۔ لیکن جب ان مناظر کا تجزیہ کیا جاتے۔ تو صاف معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ وہ کونسا قانون تھا جس کی وہ خلاف ورزی کر رہی تھیں۔ ان اُدوار میں جس بد اخلاقی جس تشدّد اور جس بے باکی کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ وہ حکمران طبقات کی عظیم قوت و دولت کا نتیجہ تھی۔ یہ طبقات ثقافت کے ثمروں پر اقتدار تو رکھتے تھے۔ اور انھیں اپنے عیش و عشرت کا آلۂ کار بھی بناتے تھے۔ لیکن اُن کی تخلیقی تحریک یا اُن کی ترقی پذیر فعالیت کی کسی شکل سے کوئی تعلق نہ رکھتے تھے۔ یہ بدعنوانی ذہنی نشو و نما کا نہیں۔ بلکہ قوت کا نتیجہ تھی۔ ان اُدوار میں جو اُمور ہمیں سخت ناگوار ہوتے ہیں۔ وہ مسینکا یا لیونارڈو میں منظر نہیں آتے۔ بلکہ آقاؤں کے اُن پُرغرور طبقات میں پائے جاتے ہیں۔ جو قوت و اختیار کی اُس حد تک پہنچ گئے تھے۔ کہ شاہی اور پاپائی روما میں اپنی خواہشات اور عیاشیوں میں مصروف رہتے تھے۔ یہ صورت حالات ترقی پذیر ثقافت کی پیداوار نہ تھی۔ بلکہ سلطنت اور پاپائی میں شخصی قوت و اقتدار کے کمال کا کرشمہ تھی۔

ثقافتی سیہ کاری کا یہ منظر عبوری اُدوار کی امتیازی خصوصیت ہے ثقافت اور ذہنی ترقی اسباب قوت کے ذرائع قوت اور مسرت اندوزی اور تن پروری کے مواقع میں بہت بڑا اضافہ کر دیتی ہے۔ اور انھیں عیش و

عشرت اور نمود و نمائش کے وسیع وسائل مہیا کرتی ہے۔ لہٰذا جب کبھی بڑی قوت و دولت رکھنے والا طبقہ اُس بلند ثقافت کا ہم وجود ہوتا ہے۔ جو اُس نے پیدا نہیں کی۔ تو اس کا نتیجہ یہی نکلتا ہے۔ یہ ایسی صورتِ حالات ہے۔ جو قطعی طور پر غیر مستقل توازن کی مظہر ہوتی ہے۔ یہ ثقافت یا تو روما کی طرح ذہنی فعالیت کے کسی سابقہ دَور کی ورثہ ہوتی ہے۔ یا نشاۃ الثانیہ کی طرح ان نئے حالات وکوائف کا اولین ثمرہ ہوتی ہے۔ جو ثقافت کی ریل پیل کی طرف لے جاتے ہیں۔ جو طبقہ اخلاقی اعتبار سے بدعنوان ہو اُس میں یہ ثقافت کبھی حقیقی ذہنی فعالیت سے متعلق نہیں ہوتی۔

مختلف اَدوار میں کچھ ایسی ہی صورت حال پیدا ہوتی رہی ہے۔ مثلاً فرانس میں انقلاب سے پیشتر ثقافت حاضرہ کے بیج پھوٹ رہے تھے۔ لیکن جاگیرداری (جس کا انجام ظاہر ہے) ابھی پوری قوت سے موجود تھی۔ یہاں تک کہ آج بھی غیر ذہنی دولتمند طبقوں میں کچھ اسی قسم کی کیفیت نظر آتی ہے (جو ماعقلوں کو "اس دَور کی مادیت پرستی" کے خلاف غل مچانے کا موقع دیتی ہے) جو بہت بڑی حد تک بدعنوانی کے اُن اثرات پر مشتمل ہے۔ جو عام طور پر تہذیب حاضرہ سے منسوب کیئے جاتے ہیں۔ یہ منظر جہاں کہیں بھی ظاہر ہوتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ حقیقی ذہنی عناصر (خواہ حکمران طبقے سے اُن کا کیسا ہی تعلق ہو) اس کے مخالف ہوتے ہیں۔ اور اس کے زوال کے لئے مصروف کار رہتے ہیں۔ اور ہمارے سامنے بدعنوانی کی تصویر نہایت شوخ رنگوں میں نظر آتی ہے۔ اس لیئے کہ وہ اسی غیظ آلود ذہنی طبقے کی کھینچی ہوئی ہوتی ہے جس طرح نشاۃ الثانیہ میں "حریص و طماع" پاپائیوں کے خلاف یہی طبقہ بلند آہنگ تھا۔ ژد دینال نے اپنے زمانے کے دولتمندوں کی حکومت کی عیاشیوں پر ملامت کی۔ فرانسیسی فلسفی نے وارسائی کے اخلاق کی مذمت کی۔ اور آج کل کا اشتراکیت پسند بھی آرام

طلب دولتمندوں" کو موردِ الزام قرار دیتا ہے۔ بدعنوان حکمران طبقے اپنے قوت و اختیار کی فربہی کو بڑھانے کے لئے جن طاقتوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ وہی طاقتیں ہیں۔ جو بالآخر انھیں مغلوب کر لیں گی۔ یہ زیادہ تر اس اخلاقی احتجاج کی قوت ہی کا اثر ہے۔ جو اعلیٰ ثقافت کے ادوار میں کیا گیا تھا۔ کہ ان لوگوں کے تمام مظالم اور بدعنوانیاں لعنت و ملامت کی تیز روشنی میں ٹکٹکی پر بندھی ہوئی نظر آتی ہیں۔

خود یہ بُرائی لازماً نہایت محدود دا درجزدی منظر کا حکم رکھتی ہے۔ یہ ایک خاص مخصوص نقطۂ نگاہ ہے۔ جو کسی دشواری کے بغیر تقریباً ہر دور میں منظرِ عام پر لایا جا سکتا ہے۔ پروفیسر ڈل نے صحیح لکھا کہ "اگر ہمارے زمانے کا کوئی ہجو گو طنز لکھنا چاہے۔ تو اُس کے لئے نہایت آسان ہو گا کہ ڈزدو نیال ہی کے ہر طنز اور ہر چوٹ کو دُہرا دے۔

رومیوں کی بدعنوانی کا "مقدس" تصور جو رواُتی اعتبار سے ہمارے نظام تاریخ کے ایک لازمی جزو کا حکم رکھتا ہے۔ اب بالکل اس قابل ہو چکا ہے کہ بے خبر لوگوں کی اطلاع کے لئے شائع کر دیا جائے۔ رومن دُنیا کی جو خیالی تصویر عام طور پر کھینچی جاتی ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ اس میں نیرو کے عیاشانہ ہنگامے ہیں۔ جو مسیحی شہیدوں کی تشکلوں کے لئے ایک بھیانک پس منظر مہیا کرتے ہیں۔ اس تصویر میں خود اتنے تضاد ہیں۔ کہ اس کی تردید کے لئے کسی خاص تاریخی علم کی ضرورت نہیں۔ خدا کے لئے یہ بتاؤ کہ وہ مسیحی شہدا، وہ پارسا بشپ۔ وہ شریف عورتیں۔ وہ کلیمنٹ۔ وہ سپلیبا، وہ لیٹرانی کون سے تھے؟ کیا وہ رومن نہ تھے؟ کیا اُن کا اخلاقی جوش و خروش ایک ایسی زمین سے برگ و بار لایا تھا۔ جو اخلاقی بدعنوانی سے متعفن اور ناپاک ہو رہی تھی؟

بدعنوانی کا یہ تصور خود رومن مصنفین ہی سے شروع ہوا تھا۔ اُن

کا مطلب "بدعنوانی" سے یہ تھا۔ کہ پرانی کاشتکار برادری جس سادگی اور پرہیز گاری سے زندگی بسر کرتی تھی۔ اس سے انحراف کیا جائے۔ فیبریو لکھتا ہے۔ کہ "بدعنوانی کی جن مثالوں کو وہ لوگ نہایت مکروہ و مہیب سمجھتے تھے۔ ان میں بہت سی ایسی ہیں۔ جو ہمیں تو بے حد معصومانہ معلوم ہوتی ہیں؛ مثال کے طور پر پونٹس سے بعض اقسام کے سالیج (گوشت کے سموسے) اور نمکین مچھلی درآمد کی گئی۔ جو کھانے میں لذیذ ہوتی تھی۔ یا مرغوں کو موٹا کرنے کا فن یونان سے اٹلی میں لایا گیا۔ یہاں تک کہ یونانی شرابوں کا پینا بھی کئی صدیوں تک تعیش سمجھا گیا۔ جو صرف سنجیدہ تزین موقعوں ہی پر روا رکھا جاتا تھا۔ ۳۸ ۃ قبل مسیح میں آگسٹس نے ایک ضیافتی قانون نافذ کیا۔ جس کے رو سے عام دنوں کی ضیافت پر دو پاؤنڈ۔ کیلنڈ اور ایڈ کے ایام کی ضیافت پر تین پاؤنڈ اور شادیوں کی ضیافت پر دس پاؤنڈ سے زیادہ صرف کرنا خلافِ قانون قرار پایا۔ اگر اس بات کا بھی خیال کیا جائے۔ کہ اُس زمانے میں روپے کی قیمت زیادہ تھی۔ جب بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ رومۃ الکبریٰ کے آقایانِ عالم کی ضیافتوں پر جو کچھ صرف ہوتا تھا۔ وہ ہمارے نزدیک نہایت ہی قلیل اور بے حقیقت تھا . . . .
سلطنت کے نہایت خوشحال زمانوں میں بھی ریشم پہننا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اور اس کو قابل اعتراض قسم کی عیاشی سمجھتے تھے۔ کیوں کہ اس سے جسم کے خطوط بہت نمایاں ہو جاتے ہیں۔ لولیا پاولینا کا نام آج تک مشہور ہے۔ جس کے جواہرات کی مالیت چار ہزار پاؤنڈ تک پہنچتی تھی۔ آج کل کے زمانے میں بے شمار "لولیا پاولینا" ہوں گی۔ جن کو اس رقم کی وجہ سے تاریخ میں ہرگز جگہ نہیں مل سکتی . . . . . . نیرو اور ایلیوگیالوس اگر آج زندہ ہو کر پیرس۔ لنڈن یا نیویارک کے کسی بڑے ہوٹل میں آنکلیں۔ تو اُن کی آنکھیں خیرہ ہو جائیں۔ انھوں نے زیادہ

خوبصورت چیزیں ضرور دیکھی ہوں گی۔ لیکن، یہی اندھا دھند عشرت تو کبھی ان کے تصور میں بھی نہ آئی ہو گی۔ روما اپنی شان و شوکت کے معراج کمال پر بھی ہمارے شہروں کے مقابلے میں غریب تھا۔ وہاں اتنے تھیٹر اور اتنے تفریح کے مکان کہاں تھے۔ بہت سے عیوب جو آج وسیع طور پر پھیلے ہوئے ہیں۔ قدما اُن سے بالکل بے خبر تھے۔ وہ چند شرابوں کو تو جانتے تھے لیکن الکوہل۔ چائے۔ کافی تمباکو سے بالکل محروم تھے۔ وہ جب اپنے نزدیک عیاشی کر رہے ہوتے تھے۔ جب بھی ہمارے مقابلے میں پارسا اور زاہد ہی تھے۔ رومن لوگوں میں یہ معمولی احتیاط تھی کہ کسی شہری کے گھر کی دیواروں کے اندر اُس پر نگاہ رکھیں۔ تا کہ وہ شراب نہ پیئے یا زیادہ نہ کھائے یا قرضے نہ اٹھائے یا زیادہ خرچ نہ کرے۔ یا اپنے ہمسائے کی بیوی کا لالچ نہ کرے۔ آگسٹس کے زمانے میں یہ کیفیت تھی۔ کہ زانی اور زانیہ رومن شہری کو زنا کی پاداش میں جلاوطنی اور ایک تہائی جائداد کی ضبطی کی سزا دی جاتی تھی۔ اور ہر شخص آزاد تھا۔ کہ زانیوں کے خلاف عدالت میں مقدمہ دائر کر دے۔ یہ قانون صدیوں تک نافذ العمل رہا۔

بیکار اور جاہل دولتمند اور مختل الدماغ مطلق العنان لوگ شہنشاہی روما میں بھی اخلاقی کس مپرسی کی حالت میں تھے۔ جس طرح ہر جگہ اور ہر زمانے میں رہے ہیں لیکن اگرچہ ہر ملک کی تاریخ میں نیرو اور ڈومیشین تو کثرت سے مل جاتے ہیں۔ لیکن کتنے ہیں۔ جو ٹراجن یا مارکس آوریلیس کے برابر ہو سکیں۔ ہم پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں کہ رومن تہذیب جس کو عام طور پر بد اخلاقی بدعنوانی کا نمونہ قرار دیا جاتا ہے۔ حقیقت میں دنیا کی تاریخ کے اندر نہایت فعال اخلاقیاتی جوش اور اخلاقی نشو و نما کا دور تھا۔ اور رومن عبقریت نے عالم انسانی کو جو سب سے ممتاز ورثہ عطا کیا ہے۔ وہ اخلاقی تحریک اور نجات و مخلصی ہی کا ہے۔

میں نے اطالوی نشاۃ الثانیہ کی نوعیت کے متعلق بہت کچھ لکھ کر یہ واضح کر دیا ہے۔ کہ اس میں حقیقی ثقافت کم تھی اور بدعنوانی زیادہ تھی۔ اس کے معاشرتی پہلو کی خصوصیت یہ تھی۔ کہ قوم کے مادی اور ذہنی ورثے پر درندے جھپٹ رہے تھے۔ اور اگر اس کے ساتھ ہی ارتقائے انسانی میں اہم ترقیات بھی شامل تھیں۔ تو اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ اس زمانے میں اُس جدوجہد کا تند ترین مرحلہ بھی شروع ہو گیا تھا جس میں نسل انسانی اس ورثے کو غاصبوں سے واپس چھیننے کی کوشش کر رہی تھی۔ لہٰذا ہمیں اس امر پہ تعجب نہ ہونا چاہیئے۔ کہ یہ دَور شدید اخلاقی بدعنوانی۔ بیباکی اور خودغرضانہ وحشت کا دَور تھا جس کی کوئی مثال تاریخ انسانی میں موجود نہ تھی۔ اور اس باطل بے حقیقت اور جھوٹی ثقافت کے مُربّی کون تھے؟ لیو دہم۔ الیگزنڈر ششم۔ سیزر بورجیا۔ لوڈوویکو سفرزا۔ لورینزو (عظیم الشان) فنون کا حامی۔ والیٹرا کو تاخت و تاراج کرنے والا یتیموں کو لوٹنے والا۔ قاتل۔ غدار اور ظالم ؎ۂ

ایک خاص امتیاز جس نے اطالوی نشاۃ الثانیہ کو غالباً سب سے زیادہ مسحور کُن بنا دیا ہے (اور جو اس کے ذہنی نتائج کی بناوٹی چمک دمک سے متفاوت ہے) یہ ہے کہ اس کی سیاہ کاری دلیرانہ اور طبعی و قدرتی تھی۔ اس کی بے نقاب بدمعاشی ہر احتیاط اور ریاکاری سے متنفر تھی۔ اور پرانی بدمذہبی کے زیادہ نفسانی پہلوؤں سے ہم تنگ و ہم آہنگ تھی۔ ہم کو سیسلینی کے شوریدہ سرانہ غنڈے پن میں اور وضع دار شہدپن کی اس دُنیا میں جس کا وہ نمایندہ تھا۔ ایک خاص دلکشی ضرور نظر آتی ہے۔ اس پہلو میں کم از کم خلوص تو بالکل واضح ہے۔

ؔۂ اکثر مصنفین نے لورینزو کی بدنامی پر لیپ پوت کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن میرے نزدیک اُن کے ثبوت اطمینان بخش نہیں ہیں۔

چوتھا باب

آرا کی مجرمیت

۱

عارضی اخلاقیت کی دوھری شکل

نام نہاد علوم اخلاقیات کے ماہر ہماری یونیورسٹیوں کی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے اپنے کمزور سے عقائد ادعائیہ کو بیان کرتے ہیں۔ اور ان کے لہجے سے ظاہر ہے۔ کہ انھیں ان عقائد کے غیر صحیح ہونے کا شعور بھی ہے۔ ان کی ناقابلیت اُس وقت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ جب ہمارے فلسفہ اخلاق کے اصولوں کو تاریخ کے متعلق فیصلے دینے کا کام درپیش ہو جاتا ہے۔

جب ہم تاریک زمانوں کے مجرمانہ افعال پر غور کرتے ہیں (مثلاً رچرڈ اوّل نے پندرہ فرانسیسی نائٹوں کی آنکھیں نکلوا دیں۔ یا جیمز اوّل نے جادو گری کے مجرم کا اقبال کرانے کے لئے تعذیب و اذیت کے طریقے تجویز کئے) تو ہماری رائے یہ ہوتی ہے۔ کہ اگر یہ حضرات ہمارے زمانے میں ہوتے۔ تو کبھی اس قسم کا طرزِ عمل اختیار نہ کرتے۔ یعنی اُن کے افعال کی خباثت اُن کی شخصی کمینگی اور سیہ کاری کا نتیجہ نہ تھی۔ بلکہ اُس زمانے کی پیداوار تھی۔ جس میں وہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان میں جو طبعی بدنہادی

تھی۔ وہ ہمارے زمانے میں شاید مختلف اور کم وحشیانہ صورت اختیار کرتی جو بیہودہ حرکتیں اُن لوگوں نے کیں۔ اُن کو ہر حال اُس زمانے کے خیالات رسوم اور آرا کی نوعیت کے مطابق ہی رکھنا پڑے گا۔ اگر رچرڈ شیردل آج زندہ ہوتا۔ تو یقیناً اپنے آپ کو ایک شجاع انسان ثابت کرتا۔ اس کے سینے پر بہت سے تمغے اور اعزاز بجا طور سے درخشاں نظر آتے۔ اور جب وہ صبح کے اخبار میں جرمن مظالم کی کیفیت اور جرمن کیمپوں میں ہمارے قیدیوں کے ساتھ نفرت انگیز سلوک کا حال پڑھتا۔ تو ہرگز اپنے غیظ وغضب کو ضبط نہ کرسکتا۔ وہ ارفع و اعلیٰ شہزادہ جیمز جو بفضل خدا۔ حامی دین واقع ہوا تھا اور کلیسا کا ایک رکن اور مذہبی تعلیم کا پُرجوش حامی ہوتا لیکن جان فیان کی انگلیوں میں میخیں ٹھونکنے کا ہرگز حکم نہ دیتا۔ پلانٹا جنیٹ کے زمانہ میں انگلستان کی رائے عامہ اور اس کے اخلاق شاہ رچرڈ کے مظالم سے زیادہ بدتر نارمن شدائد کے عادی ہو چکے تھے۔ جو نارمن بادشاہ یا نواب کوئی زیادہ ہولناک بے رحمی یا غداری ایجاد نہ کرتا۔ اس پر لوگوں کو بے انتہا تعجب ہوتا۔ اور شاہ فرانس فلپ آگسٹس کو اس امر سے کوئی خیال روک نہ سکتا تھا۔ کہ وہ بھی پندرہ انگریز نائٹوں سے وہی سلوک کرے جو رچرڈ نے فرانسیسی نائٹوں سے کیا تھا۔ سولھویں صدی میں انگلستان کی رائے عامہ اس بات کو مستحسن سمجھتی تھی کہ جن لوگوں پر جادوگری کا شبہ ہو اُن کو اذیت دی جائے۔

تاہم ایک طرف تو ہم اس امر کے عادی ہیں۔ کہ زمانۂ ماضی کے انسانوں کے مظالم اور اُن کے نفرت انگیز اخلاقی فیصلوں کو اُن کے زمانے کے مروجہ خیالات کی بربریت اور جہالت کا نتیجہ سمجھیں۔ اور دوسری طرف اس عقیدے کے بھی پابند چلے جاتے ہیں۔ کہ اخلاقی نیکی اور اخلاقی بدی انفرادی کردار کے اصلی اور شخصی اوصاف ہیں۔ اور ذہنی فیصلوں اور آراء

کو اخلاقی اقدار کے دائرے سے کاملاً باہر سمجھتے ہیں۔ یہ دونوں تصورات بلاشبہ ایک دوسرے سے قطعی طور پر متضاد ہیں۔ یہ گویا اُن اصولوں کی تذلیل و توہین ہے۔ جو ہمارے اخلاقی فیصلوں پر حکمرانی کرتے ہیں۔ اگر ایک زمانے میں لوگوں نے ذلیل ترین ناانصافیاں کیں۔ اور وہ کسی دوسرے زمانے میں ہوتے۔ تو کبھی اُن کا ارتکاب نہ کرتے۔ تو اخلاقی بدی کو اُن کے ذاتی کردار کا وصف نہیں۔ بلکہ اُن کی آرا کا وصف سمجھنا چاہئے۔ سرطامس براؤن عارضی اور انتقال پذیر اخلاقیت" کی مخالفت کرتا ہے۔ اور سرمیتھیو ہیل اخلاقیاتی نظریے پیش کرتے ہیں کسی سے پیچھے نہیں۔ لیکن دونوں آدمی بوڑھی عورتوں کو جادوگری کے جرم میں ماخوذ کرنے کے حامی تھے۔ پھر شیکسپیئر بھی بیدردانہ جون آف یارک کی یادکو ٹکٹکی پہ باندھنا گوارا کر لیتا ہے۔ تو سرطامس براؤن۔ سرمیتھیو ہیل اور شکسپیئر اخلاقی اعتبار سے گمراہ نہ تھے۔ بلکہ یہ ذمہ داری اُن مروّجہ غیرمعقول آرا پر تھی۔ جن کو وہ تسلیم کرتے تھے۔ عورتوں کو زندہ جلانے والے بُرے آدمی نہ تھے۔ بلکہ سولھویں صدی کی مسیحیت اس کی ذمہ دار تھی۔

دونوں باتیں تو صحیح نہیں ہوسکتیں۔ یا وہ اصول پرستانہ نیت خراب تھی۔ یا وہ رائے خراب تھی۔ جو اس کو جائز قرار دیتی تھی۔ یا سرطامس براؤن اخلاق دشمن تھا۔ یا کتاب خروج کی آیت اور اُس کو سند ماننے والی جہالت اخلاق سوز تھی۔ یا تو بدکار لوگ اخلاقی اعتبار سے قابل ملامت ہیں۔ اور کوئی مسلّمہ رائے اخلاقی اعتبار سے مستحق مذمت نہیں ہوسکتی۔ اور یا اخلاقی نیکی کا سہرا اور اخلاقی بدی کا دھبا اُن آرا سے تو وابستہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان پہ عمل کرنے والے انسانوں سے منسوب نہیں کیا جاسکتا۔

یہاں گویا ہمارے مروّجہ اخلاقیات بے اثر و بے نتیجہ رہ جاتے ہیں۔

ایک طرف ہمارے اخلاقیاتی نظریے ہر اُس طرزِ عمل کو حق بجانب قرار دیتے ہیں۔ جو نیک نیتی۔ نیک ضمیری اور اصولِ ثابتہ کے ماتحت سرزد ہو۔ ہمارے روایتی اخلاقی تخمینے تعزیر یا انعام کی بنا پر افعال کا اندازہ کرتے ہیں۔ ان تصورات کے اعتبار سے عملِ بد کا مطلب "عمل مستلزم سزا" ہے۔ اور کسی تعزیر یا انعام (یا اس کے مترادف "الزام یا تعریف") کا اندازہ کرنے میں موزوں و متعلق مصالحِ فکری فرد کی نیت۔ اس کا شعور۔ اس کی ذمہ داری اور اس کے عزائم ہیں۔

دوسری طرف مروجہ عقیدہ یہ ہے۔ کہ آرا اخلاقیاتی اعتبار سے بالکل غیر متعلق ہیں۔ ان کی نوعیت کچھ بھی ہو۔ وہ احترام کی مستحق ہیں۔ بشرطیکہ وہ مخلصانہ ہوں۔ پھر وہ نجی اور ذاتی معاملات ہیں۔ جن سے تعلق رکھنے والا کسی انسان کے آگے جواب دہ نہیں۔ اور چونکہ اُن کا تعلق ذہنی قلمرو سے ہے۔ لہذا وہ اخلاقیت کی قلمرو سے بالکل باہر واقع ہوئی ہیں۔ اور کسی رائے پر جو نیک نیتی سے قائم کی جائے۔ اخلاقی نفرین و ملامت سے کلنک کا ٹیکا نہیں لگایا جا سکتا۔

(۲)

آرا کے متعلق موجودہ رائے

ایک زمانہ تھا۔ جب عقلی اعتبار سے غیر ذمہ دارانہ ادعا اور سند کو عقیدے کی بنیاد سمجھا جاتا تھا۔ اور اس سے قطعی منافی اصول کا رواج تھا۔ یورپی دنیا کو جن پست ترین بدیوں سے تکلیف پہنچی ہے۔ وہ اُن کوششوں کا نتیجہ تھیں۔ جو بدکارانہ اور خلاف اخلاق سمجھی جانے والی آرا کی سرکوبی کے لئے کی گئی تھیں۔ ادعائی عدم رواداری کے مظالم و شدائد سے جو بغاوت

پیدا ہوئی۔ اس کے ساتھ مصلحۃً ہر تسلیم ختم کر دیا گیا۔ اس طرح گویا آلِ طے عقیدے کو قطعی منظوری حاصل ہو گئی۔ یعنی یہ کہ ہر قسم کی آرا مساوی طور پر احترام اور غور و فکر کی مستحق ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہنا چاہیئے۔ کہ جب یہ بالکل ممکن نہ رہا کہ قطعی اور مطلق سند کے معیار کو عقل کے برابر قرار دے کر نافذ کر دیا جائے۔ تو اس مفروضہ کی حمایت کی گئی۔ کہ رائے صحیح کا کوئی معیار موجود ہی نہیں۔ یوں گویا ممکن ہو گیا۔ کہ کسی وقت عقلی فکر اور ذہنی دیانت کو بھی رائے صحیح کے حقیقی معیار کی حیثیت سے تسلیم کرنے کی ضرورت سے گریز کیا جا سکے۔ ازمنۂ متوسطہ کا ظالمانہ عقیدۂ عدم رواداری اور زمانۂ حاضرہ کا غیر منطقیانہ عقیدۂ رواداری اس اعتبار سے دونوں یکساں ہیں۔ کہ دونوں ہی عقلی فکر کو رائے کی واحد اور جائز سند تسلیم نہیں کرتے۔ جب غیر عقلی اقتدار نے عدم رواداری کو مؤثر طور پر استعمال کرنے کی طاقت کھو دی۔ تو رواداری کے فوائد کا دعویٰ کر دیا۔ جب اس نے دیکھا۔ کہ غیر عقلی اسناد کی قطعی برتری اور عالمگیر اعتراف کو قائم رکھنا ناممکن ہے۔ تو اس نے ہتھیار تو ڈال دیئے لیکن بہ شرائط یہ منوائی۔ کہ اسے بھی عقلی اسناد کے مساوی حیثیت حاصل رہے گی۔ لیکن اس نے اس نفرت انگیز عقیدے کو بھی صحیح منوا لیا۔ کہ غیر عقلی آرا بھی اخلاقی اعتبار سے عقلی آرا ہی کے برابر حیثیت رکھتی ہیں۔ چونکہ غیر عقلی اقتدار کے حامیوں نے اپنے مخالفین کی آرا کو اخلاقی لحاظ سے قابلِ ملامت قرار دیا تھا۔ اس لئے اب یہ عقیدہ قائم کر لیا گیا۔ کہ اخلاقی اعتبار سے کسی قسم کی آرا بھی قابلِ ملامت نہیں ہیں۔ یوں گویا اس متبادل نتیجے سے بچ کر نکل گئے۔ کہ غیر عقلی آرا خود ہی اخلاقی طور پر قابلِ ملامت ہیں۔

غرض آرا کے متعلق جدید دور یہ یوں پیدا ہوا۔ چونکہ عقلی اور غیر عقلی آرا کی حیثیت بالکل ایک سی ہے۔ اس لئے صحیح رائے۔ ذہنی اخلاقیات

اور درست فیصلے کا کوئی معیار تسلیم نہیں کیا جاتا۔ آرا کو مقدس اور ناقابل رد انفرادی حقوق سمجھا جاتا ہے۔ اُن کے تقدس کی حفاظت یوں کی جاتی ہے۔ جیسے لوگ اپنی جائدادوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ اس حفاظت کے زیر سایہ پست ترین عقلیت بھی محفوظ رہتی ہے۔ ہر حماقت اور ہر واضح بے دقوفی اسی "احترام" کی مستحق سمجھی جاتی ہے جو کسی صحیح ترین عقلی نتیجے کو حاصل ہو سکتا ہے۔ معاوضہ لے کر بچوں کو پالنے والا جیل میں بھیج دیا جاتا ہے لیکن "مسیحی سائنس دان" پوری مدارات کا حقدار سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ اس کی "دیانتدارانہ آرا" میں اس کی حفاظت کی جاتی ہے۔ اُس کے اس حق کا انکار کرنا نہایت قبیح سمجھا جاتا ہے۔ کہ وہ اپنی آرا کی اشاعت کرے۔ اور ان کو کم عمر بچوں پر عائد کرے۔ اگر کوئی شخص یہ کہنے کی جرأت کرے۔ کہ اس "مسیحی سائینس دان" کو بچے کے بے بس ذہن کو دانستہ اور لاعلاج طور پر بگاڑنے۔ اُس میں غیر عقلی تعصبات داخل کرنے۔ اس کو دروغ بافیاں سکھانے۔ اس کی عقلی قوتوں کو کامل اور مؤثر طور پر اپاہج بنانے۔ اُس کی عقل کے سرچشموں کو مسموم کرنے اور اُس کے انسانی ورثے کو لوٹنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ تو اس خیال پر حق بجانب غیظ و غضب کا طوفان برپا ہو جائے گا۔ اور احتسابی عدالت کے ہائی کمشنروں کے جانشین چلا اٹھیں گے۔ کہ ضمیر کے مقدس حقوق کو چیلنج کیا جا رہا ہے۔ تشدد اور عدم رواداری کا زمانہ واپس لایا جا رہا ہے۔ اور تعلیم و تدریس کی آزادی اور عوام کے نہایت پختہ اور غیر منفک حقوق کو تباہ و پامال کرنے کی تیاری کی جا رہی ہے۔ یہ کہنا کہ ماں باپ کو اپنے بچے کے ذہن کا گلا گھونٹ دینے کا قطعی حق حاصل ہے۔ اتنا ہی خوفناک اور اہانت آمیز سمجھا جائے گا۔ جتنا کسی زمانے میں خود بچے کا گلا گھونٹ دینے کا حق ناقابل تسلیم اور خوفناک سمجھا جاتا تھا۔ دیانتدارانہ رائے میں مداخلت کرنا بدذوقی سے بھی بدتر ہے۔ تمام مخلصانہ آرا

"دیانت" پر مبنی ہوتی ہیں۔ اُن کی صداقت یا اُن کے بطلان پر مناسب حالات کے ماتحت بحث تو کی جا سکتی ہے۔ لیکن ان پر اخلاقی فیصلوں کا اطلاق بہت بڑی بد اخلاقی اور بحث کے قوانین کی خلاف ورزی ہے۔ لہٰذا آرا کو اب حقیقۃً کوئی اخلاقیاتی اہمیت حاصل نہیں۔ ان کو صرف اتفاقی۔ عارضی اور غیر متعلق فرض کیا جاتا ہے۔ اخلاقی اعتبار سے ہم انسانوں کو نیک اور بد کہہ سکتے ہیں۔ آرا کو نہیں۔ آرا پر بہت زیادہ توجہ کرنے پر اصرار کرنا نہایت مبتذل کوتاہ نظری اور عدم رواداری کی علامت ہے۔ بُرائی کو برداشت نہ کرنا چاہیے۔ لیکن ہر قسم کی رائے کا یہ مقدس حق ہے۔ کہ اس کو روا رکھا جائے۔ رواداری کی یہ افرا تفری لازماً ہماری تاریخی فیصلوں تک بھی وسیع ہو گئی ہے۔ ہم "نیک" اور "بد" کی صرف تعریف یا تنقیص ہی کر سکتے ہیں۔ آرا اخلاقی لحاظ سے غیر جانب دار ہیں۔

۳

نیکوں کی بد اطواری

لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ انسانی تاریخ میں نیکی اور بدی کا تصور انسانوں کی "اچھائی یا بُرائی" سے قائم نہیں ہوا۔ بلکہ اُن کے خیالات و آرا سے قائم ہوا ہے۔ جن انسانوں نے نسلِ انسانی پر بدترین آفات نازل کیں۔ اپنی پوری طاقت سے کام لے کر انسانی رفاہ کی مخالفت کی۔ انسان کی ترقی کو روکا۔ اُس کی تقدیروں سے غداری کی۔ دُنیا کو خون میں نہلا دیا۔ اور ناانصافی سے پامال کیا۔ گویا انسانیت کے دشمن ثابت ہوئے۔ وہ بد نیت یا بُرے آدمی نہ تھے۔ وہ صرف ایسے انسان تھے۔ جو غلط یعنی غیر عقلی آرا کے پابند تھے۔ کسی کو نقصان یا اذیت پہنچانا تو درکنار۔ وہ زیادہ تر

نوع انسانی کے متعلق اپنے فرض کا مخلصانہ اور بے غرضانہ احساس رکھتے تھے۔ ٹور کومیڈا جو اس عقیدے کے ساتھ مرا۔ کہ "اُس نے اپنی بہترین بلکہ تمام قوتیں خدا کی راہ میں صرف کر دی ہیں۔" ایک نیک آدمی تھا۔ وہ انسانیت سے محبت کرتا تھا۔ وہ کسی ذاتی یا خود غرضانہ مقصد سے نہیں۔ بلکہ پُرجوش احساس فرض سے سرشار تھا۔ اُس نے دس ہزار زندہ مردوں اور عورتوں کو بھون کر رکھ دیا۔ اور اُس کا مقصد نیک نیتی سے یہ تھا۔ کہ ان کو اور نسل انسانی کو فائدہ پہنچائے۔ اور یہ معقول بات بھی تھی۔ کالون نے سر ویٹس کو مہیب غداری اور ظلم کے حالات میں قتل کر دیا۔ جان ناکس نے سکاٹ لینڈ کے ہر کیتھالک کے قتل کا مطالبہ کیا۔ لیکن یہ دونوں وہ انسان تھے۔ جن کی زندگیاں ایک اعلیٰ اور برتر اخلاقیاتی نصب العین کے لئے وقف تھیں۔

چارلس پنجم نے ایک فرمان جاری کیا۔ کہ ہر ملحد و زندیق کو قتل کیا جائے۔ جلایا جائے یا زندہ دفن کر دیا جائے۔ اُس نے صرف ہالینڈ میں پچاس ہزار سے لے کر ایک لاکھ انسانوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ لیکن اُس کا مقصد اولیٰ یہ تھا۔ کہ سچا مذہب محفوظ و قائم رہے۔ اور وہ "معافی اور رحم کے معاملے میں عدیم المثال" تھا۔

رومن کیتھولک پادریوں کی آرا کا مطالعہ کرو۔ جنہوں نے ھیوجوناٹ لوگوں کے قتل عام کی ترغیب اور تحسین کی۔ اس شاندار اور قابل تعریف کارنامے پر بے حد مسرت آمیز جوش و خروش کا اظہار کیا۔ اور یہ امید ظاہر کی۔ کہ آیندہ اس سے بھی زیادہ قتل کئے جائیں گے۔ چنانچہ مسیحی حکمرانوں میں اپنے بہترین اخلاقی فرض کا احساس پیدا ہو گیا۔ یہ سب انسان اس طرح بات کرتے تھے۔ گویا اخلاقی عقیدے کے ستون ہیں۔ اور اُن کی زبان شعوری راستی اور حق کے باوقار احساس کی زبان ہے۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے کوئی "ٹائمز" کا افتتاحیہ پڑھ رہا ہے۔ ہم اُنھیں قاتل اور خونی اور ذلیل و مہیب عفریت

کہتے ہیں لیکن وہ خود اپنی نظر میں بے انتہا نیک اور راستباز تھے۔ جب گریگوری سیزدہم نے سینٹ بارتھولومیو پر جشن منایا۔ تو اس کا ذہن ایسی انتقامانہ فخر و مسرت سے سرشار تھا جس سے طامس کا رکس لبریز ہوگا۔ جب اس نے غلاموں کی تجارت کے ممنوع ہونے کی خبر سنی ہوگی۔ یہ بھی مشتبہ ہے۔ کہ ہم ان لوگوں کو بے درد اور بے رحم کہہ سکتے ہیں۔ ایک فرانسیسی بشپ کو جب اس سازش کی خبر ملی۔ تو اس پر اس قدر خوف چھایا۔ کہ تقریباً بے ہوش ہوگیا۔ لیکن آخر اس نے اخلاقی فرض کے احساس سے سر تسلیم خم کر دیا۔

جاگیرداری کے حامی بھی انہی نصب العینوں سے سرشار تھے۔ جن کو وہ بے انتہا بلند اور مقدس سمجھتے تھے۔ اُن کی یادداشتیں پڑھو۔ اور دیکھ لو۔ کہ اُن کا مکروہ و مہیب مقصد خود انہیں کس روشنی میں نظر آتا ہے۔ اور جب انسانیت کو مہیب ترین ظلم اور ناانصافی سے خلاصی دلانے کی کوشش کی گئی۔ تو وہ لوگ کس تجیبانہ شان سے آزادی کی قوتوں کے خلاف برسرپیکار ہوگئے۔ اُن کی رومان پرست نوجوان عورتیں بھی شجاعت و بہادری کے جذبات سے مشتعل تھیں۔ اور اپنا خون گرانے کو تیار تھیں۔ تاکہ کمتی بیسٹیل کا جیل خانہ مصیبت۔ قحط اور غارت واپس آجائیں۔ وہ اپنے بادشاہ کے لئے جانیں دینے پر بالکل آمادہ تھیں۔

جتنے ظالم اور بیدرو بادشاہوں اور پادریوں۔ ارکانِ احتساب اور ہر زمانے کے رجعت پسندوں نے انسانی نشو و نما کو روکنے۔ بدنما ماضی کو قائم رکھنے اور نوع انسانی کو پامال کرنے کی کوششیں کیں۔ اور ہر طرح کی ناپاکی اور ملعونیت کا ارتکاب کیا۔ وہ سب اپنے اذہان میں بلند ترین احساسات رکھتے تھے۔ اور اُن کی زبانوں پر وہی الفاظ تھے۔ جن کو وہ مقدس ترین سمجھتے تھے۔ یعنی سچائی۔ مذہب۔ اخلاق۔ غیرت۔ جاں نثاری۔ اور جن چیزوں کے خلاف وہ سرتوڑ جنگ کر رہے تھے۔ وہ اُن کی زبان میں بدترین

الفاظ کی حامل تھیں۔ یعنی خطاکاری۔ کفر۔ بغاوت۔ عدم وفاداری۔ غداری۔ بے وفائی۔ بدنظمی۔ دہریت۔ یہ بگڑی ہوئی اصطلاحات محض خطیبانہ حیلوں یا مباحثانہ مقولوں کا حکم نہ رکھتی تھیں۔ بلکہ عمومی قاعدے کی حیثیت سے ان لوگوں کے نقطۂ نگاہ کی نمایندہ تھیں۔ جو ان کو استعمال کرتے تھے۔ شاید ہی کوئی ایسے آدمی گزرے ہوں۔ جو یہ جانتے ہوئے کہ اُن کے پیش نظر قبیح مقصد ہے۔ اس قدر جوش و خروش سے، اپنے مقصد کی حمایت میں کوشاں ہوتے ہوں۔ انھوں نے نسل انسانی پر جتنی بدیاں اور آفتیں نازل کیں۔ وہ نہایت واضح اور مستحسن فیصلۂ ضمیر کے ماتحت تھیں۔ تاریخ کی تقویم میں جو جرائم سب سے زیادہ پست و ذلیل اور بیدردانہ سمجھے جاتے ہیں۔ وہ سب کے سب نیک عزائم اور روبانہدارانہ مقاصد سے وابستہ تھے۔ یہ "نیک" آدمی ہی ہیں۔ جو ہمیشہ سے سچے "بدکار" و بداطوار نسل انسانی کے نہایت مکروہ اور خطرناک دشمن اور اُس کے بلندترین اور اہم ترین مفادات کے تاریک ترین غدار رہے ہیں۔ اور انھوں نے غلط آرا کے اعضا و آلات کی حیثیت سے دُنیا میں جتنی بدی پھیلائی ہے۔ وہ اُن کی "نیکی" اور اُن کی سرگرمی۔ اخلاصمندی اور دیانت داری کے ساتھ پورا پورا تناسب رکھتی ہے۔

انسانی مصائب۔ قبائح اور مظالم کے جہنم کا فرش عزائم حسنہ ہی سے پٹا پڑا ہے۔ جن انسانوں نے انسانیت کو سب سے زیادہ ضرر پہنچایا۔ نشانہ جفا کاری بنایا۔ اور اس پر ظلم کر کے گنہگار ہوئے۔ وہ اپنے معیاروں اور اپنے ضمیر کے فیصلے کے مطابق "نیک انسان" تھے۔ اُن میں جو کچھ بدی تھی۔ جس چیز نے اخلاقی بُرائی اور بیداری پیدا کی۔ اور سچائی اور ترقی کا راستہ روکا۔ وہ ہرگز اُن کے عزائم۔ اُن کے مقاصد یا اُن کے ذاتی کرداروں کی بدی نہ تھی بلکہ اُن کی آرا کی بُرائی تھی۔

صاف اور سیدھی سچائی یہ ہے۔ کہ خیالات و آرا ہی اخلاقی اعتبار سے

اہم ہیں۔ اور یہی دراصل اخلاقی اور غیر اخلاقی ہیں۔ دُنیا میں بنی بد اطواری اور نا انصافی بڑے پیمانے پر قابل جواب وہی ہے۔ وہ یہ نہیں۔ کہ انسان بدی اور بداطواری کا احساس کر کے کیا کچھ کرتا ہے۔ بلکہ سوال یہ ہے کہ جس چیز کو وہ بلند اخلاقی کا تقاضا سمجھتا ہے۔ اور جس کو دیانت داری سے نیکی خیال کرتا ہے۔ اس کے متعلق کیا کرتا ہے۔ جو مصیبتیں نسل انسانی پر نازل ہوتی ہیں۔ اور تاریخ میں جن جرائم کا ارتکاب کیا گیا ہے۔ وہ خبیثانہ عزائم کی پیداوار نہیں۔ بلکہ قابل تعریف اور غلط عزائم کا نتیجہ ہیں۔ اخلاقیت کا صحیح احتسابی وظیفہ بُرے آدمیوں کو قابو میں رکھنا نہیں۔ بلکہ اسے نیکوں کو روکنا چاہیئے جو شریر انسان، نہایت سکون سے بدی کا مرتکب ہوتا ہے۔ اور عادتاً اور اتفاقاً وہ کچھ کرتا ہے۔ جس کو وہ خود بدی سمجھتا ہے۔ وہ نہایت نایاب اور نادر عفریت ہے۔ ایسا شخص یا تو کوئی ذلیل اور بونا آدمی ہوتا ہے۔ یا گمراہ قسم کا مریض۔ ایسا شخص بالکل مخصوص اور مستثنےٰ حیثیت رکھتا ہے۔ شعوری دانستہ اور مردُود بالذات نا انصافی۔ دیانت دارانہ اور مسلمہ نا انصافی کے سمندر میں محض ایک قطرے کا حکم رکھتی ہے۔

اخلاقی زیادتی ہمیشہ دیانتدارانہ اور مُسلّمہ ہوتی ہے۔ اس لئے کہ وہ غلط آرا پر مبنی ہوتی ہے۔

جو اخلاقی مُصلح کسی شدید نا انصافی اور جس اخلاقی کی بے راہ روی پر حملہ کرتا ہے۔ اس کو ہمیشہ یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُس کا حقیقی مدِمقابل کوئی جھوٹا جذبہ یا بگڑا ہوا احساس ہرگز نہیں۔ بلکہ کسی امرواقع کے متعلق کوئی غیر عقلی دروغ بیانی ہے۔ وہ لوگوں کی بدنیتی اور بے انصافی کی مذمت کرتا ہے لیکن یہ دیکھ کر سخت پریشان ہوجاتا ہے۔ کہ وہ لوگ اپنے عزائم و مقاصد میں ہرگز شریر یا غیر منصف نہیں ہیں۔ وہ اپنے آپ کو حق پر سمجھتے ہیں۔ اور حقیقت میں ظلم و سیہ کاری کی ذمہ داری کسی ایسی رائے یا ایسی ذہنی لغویت

پر عائد ہوتی ہے۔ جس کی بنا پر وہ اپنے آپ کو کالاحق بجانب خیال کرتے ہیں صحیح بات یہ ہے۔ کہ قابلِ مذمت جرائم صرف آرا ہیں۔ وہ جتنی زیادہ غیر عقلی ہوتی ہیں۔ اُسی قدر مستلزم سزا ہیں۔ کوئی جھوٹی یا غلط رائے ایسی نہیں (خواہ وہ کتنی ہی لنظر باقی ہو) جس پر اخلاقی بدی کا الزام نہ لگایا جاسکے۔ اور جس کا نتیجہ ناانصافی نہ ہو۔ مثال کے طور پر غور کیجئے۔ کہ ایک پارسا کیتھلک خاتون کی نسوانی جذباتیت کا تقاضا اسی طرح پورا ہوتا ہے۔ کہ وہ اپنے مذہب کی رسوم و عبادات میں نہایت جوشِ عقیدت سے منہمک رہے۔ اس کی یہ حماقت کتنی بے ضرر اور کتنی محبوب معلوم ہوتی ہے۔ اور کونسا جنونی عقلیت پسند ایسا بے درد ہو سکتا ہے۔ کہ اس غریب اور شیریں مزاج خاتون کے احساسات کو صدمہ پہنچائے۔ جو اپنے جذباتِ رقیقہ کے خزانوں کا لٹانا یا قربانی اور حُسنِ عمل میں صرف کرتی ہے لیکن ذرا اس بے ضرر اور نرم مزاج خاتون کو اقتدار کی مسند پر بٹھا دیجئے۔ نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ ازابیل اور ہسپانوی احتساب۔ خونی میری اور انگلستانی احتساب (Inquisition —) مادام دامین تینو اور تنسیخ فرمان۔ مظالم و شدائد اور ایک سلطنت کی تباہی معرضِ ظہور میں آجائے گی ۵۱

۵۱ اب یہ رائے رواج عام کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ کہ نیکنٹس کے فتوے کی تنسیخ سے مادام دامین تینو کا کوئی تعلق نہ تھا لیکن ضرورت ہے کہ ہم یہ امور ذہن میں رکھیں۔ کہ لوئی چہاردہم پر اس عورت کے اثر کی نوعیت کیا تھی۔ بلاشبہ بادشاہ ہر اُس شخص کو بدگمانی کی نظر سے دیکھتا تھا۔ جو کسی لحاظ سے اس کی رہبری کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اُس کی ملکہ اس قدر ہوشیار اور پُرفن عورت تھی۔ کہ اُس کی رہنمائی بھی کرتی تھی۔ لیکن اُس کو معلوم نہ ہونے دیتی تھی۔ اور بادشاہ قبول مذہب کے بعد "جنونِ مذہب" تک جو پہنچ گیا۔ وہ اسی عورت کے اثر کا نتیجہ تھا۔ ان تمام امور کو پیشِ نظر رکھنے کے بعد کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔ کہ اس کی مذہبی پالیسی کا منبع اور سرچشمہ کون تھا۔

ہم یہ سوچنے کے عادی ہو گئے۔ کہ ذہنی تحقیق اور تلاش صداقت تجسس کی پسندیدہ شکلیں ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ کوئی غلطی ایسی نہیں جس کا نتیجہ خونریزی نہ ہوا ہو۔ اور کوئی جھوٹی رائے ایسی نہیں جس نے ناانصافی کو جنم دیا ہو۔ اور نہیں جو آزادی اور امنیت حاصل ہے۔ وہ کسی نہ کسی ذہنی صداقت کا ثمر ہے۔ ذہنی اور اخلاقی امور کے درمیان مفروضہ حد فاصل محض ایک فسانہ ہے۔ اخلاقی اقدار کا اطلاق ذہنی حاصلات ہی پر ہوا کرتا ہے۔

یہ امر انفرادی آرا کے متعلق تو صحیح ہے ہی۔ لیکن ان آراء کے متعلق اور بھی زیادہ المناک طور پر صحیح ہے۔ جو وسیع سطح پر پھیلی ہوئی ہوں۔ جن پر کسی قوم۔ کسی زمانے یا کسی جماعت کے قائم شدہ معیاروں کی بنیاد کھڑی ہو۔ اخلاق ان معنوں میں رواج کا حکم رکھتے ہیں۔ کہ ان کا انحصار مسلمہ و مروجہ آرا کی نوعیت پر ہوتا ہے۔ انفرادی نیکی۔ عزائم حسنہ۔ شعوری حق پرستی اور پاکیزہ ضمیر کا مطلب صرف یہ ہے۔ کہ انھیں زمانے کے منظم خیالات و آرا سے مطابقت حاصل ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ مختلف ازمنہ کی قائم شدہ آرا نے دنیا کے ہر جرم کی امداد و حمایت کی ہے۔ اگر وہ آرا قبیح۔ غیر منصفانہ اور غیر عقلی ہوں۔ تو کتنی ہی دیانت داری۔ نیک نیتی اور نیکی کا جوش ہو۔ ان سے کسی فرد کے طرز عمل اور رویے کو اخلاقی قرار نہیں دیا جا سکتا۔

تمام زمانوں میں ایسے بداطوار لوگ موجود ہوتے ہیں۔ جو اپنے اپنے زمانے کے مسلمہ معیاروں کے ماتحت قابل مذمت قرار دیئے جاتے ہیں لیکن یہ سوال علیحدہ ہے۔ کہ ان کی بداخلاقی کس حد تک اس زمانے ہی کی غیر عقلی شروط و احوال کی شرمندۂ احسان ہوتی ہے۔ لیکن اس بداخلاقی سے بدی کا جو اخلاقیاتی پیمانہ قائم ہوتا ہے۔ وہ اس پیمانے کے مقابلے میں

کچھ بھی نہیں۔ جو زمانے کی مسلمہ اور پسندیدہ آرا کے اندر مضمر ہے۔

"دنیا کو خونریزی اور ناانصافی سے معمور کر دینے کی ذمہ داری ہرگز انفرادی کردار اور قبیح عزائم پر عائد نہیں ہوتی بلکہ اس کے ذمہ دار اخلاق عامہ۔ رائے عامہ۔ مسلمہ خیالات و عقائد اور فیصلے کے منظور شدہ معیار ہیں۔ اور قطعی طور پر بد اطوار یہی ہیں۔ اصلی مجرم یہی ہیں۔ اور حقیقی بدمعاش یہی ہیں جس بد اخلاقی نے انسانیت کو مبتلائے مصائب کیا ہے۔ وہ جذبات یا خلاف ورزی احکام یا اخلاقی عدم احساس کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ وہ ذہنی جہالت اور ایسی شبہ تشکیک کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ کہ برائی کی بنیادیں تعریض و تنقید سے محفوظ ہو جاتی ہیں۔ یہی وہ مفروضہ ذہنی میدان ہے جس میں حقیقی اخلاقی اصلاح ظہور پذیر ہوتی ہے۔ اخلاق کی ترقی کسی ایسے خیال یا نظریے کی شکست سے پیدا ہوتی ہے۔ جو بجائے خود اخلاقیت سے بالکل بے تعلق سمجھا جاتا ہے۔ ہم کسی ایسے اخلاقی ضابطہ کے زیر اثر نہیں ہیں۔ جو ہمارے آبا و اجداد کے نظریے سے بلند تر ہے۔ ہمارا محرک اس اخلاق مقصد سے زیادہ شدید اور رفیع نہیں۔ جو سر طامس براؤن یا میلنک تھون یا جان کالون کے پیش نظر تھا لیکن عقلی فکر کا دائرہ یقیناً وسیع تر ہو چکا ہے۔ اگر آج ڈومینیکن ملحدوں کو زندہ نہیں جلاتے۔ جج "سوالات" کا طریقہ استعمال نہیں کرتے اور ظالم لوگ تعذیب و اذیت کے عجیب و غریب طریقے اختیار نہیں کرتے۔ تو اس کی وجہ یہ نہیں۔ کہ ہمیں کوئی بلند پایہ اخلاقی تنویر حاصل ہو گئی ہے۔ ہماری اخلاقیت محض اس لئے بہتر ہو گئی ہے۔ کہ ہماری عقلیت اور ذہنی نشو و ارتقا میں اضافہ ہو گیا ہے۔

(۴)

ناقابلِ معافی گناہ کے متعلق ہمارا تخمینہ

ہمارے اخلاقیات کی انارکی اور ہمارے اخلاقی فیصلوں کی بے اثری نے اس امر کو ناممکن بنا دیا۔ کہ مؤرخین نے بڑے بڑے شہدوں کو عظمت کا سرمایہ دار قرار دے دیا (مثلاً کارلائل نے فریڈرک ثانی کو اور فرُوڈ نے ہنری ہشتم کو) یہ انارکی اور بے اثری اس وقت خاص طور پر واشگاف ہو جاتی ہے۔ جب یہ مجرم اُن آرا کے طبعی نتائج کی وجہ سے مجرم قرار پاجاتا ہے۔ جن پر آج تک بھی کوئی اخلاقی کلنک کا ٹیکا نہیں لگا۔

مثال کے طور پر ملکہ ماری انتوانت کے معاملے پر غور کیجئے۔ یہ بے حد دلکش عورت تھی۔ اس میں شک نہیں۔ کہ اُس کا ذاتی کردار کمزور تھا۔ وہ نہایت جاہل اور غیر سنجیدہ عورت تھی۔ جو لوگ اُس کی تعلیم پر مقرر کئے گئے تھے۔ انھوں نے مجبور و مایوس ہو کر اس کام کو ترک کر دیا۔ وہ نہایت پست قسم کے ناولوں کے سوا کوئی کتاب نہ پڑھ سکتی تھی۔ اور اُن ناولوں کو "دُعا کی کتابوں" کی طرح بستے میں ڈال کر گرجا لے جایا کرتی تھی۔ تاکہ عبادت کی ناگواری کو دُور کریں۔ وہ خود پسند اور عشرت پرست تھی لیکن کیا یہ معمولی سے نقائص نہیں۔ اور کیا یہ زمانۂ سابق میں بھی اور آج کل بھی اکثر فیشن ایبل عورتوں میں عام طور پر نہیں پائے جاتے؟ جو دربار اپنی جنسی اخلاقیت کے اعتبار سے بہت ہی بدنام و رُسوا تھا۔ اُس میں اس خاتون کا کردار یقیناً اتنا بلند تھا۔ کہ ایسے حالات میں اس کی توقع نہ کی جا سکتی تھی بدگوئی اُس کے نام کو رُسوا کرنے میں برابر مصروف رہی۔ اور اُس پر ایسے ایسے الزام لگائے گئے۔ جو یقیناً توہین آمیز تھے۔ لیکن یہ بھی اس امر کا

ثبوت ہے۔ کہ اس کا رویہ رسوا کن زبانوں کو بہت کم موقع دیتا تھا۔ لاؤزون اور فرسان اس کے عاشق بتائے جاتے ہیں۔ لیکن اس کا کوئی ثبوت اب تک نہیں ملا۔ آزمائش کے دنوں میں اس ملکہ نے اپنے آپ کو نہایت فرض شناس بیوی اور مہربان ماں ثابت کیا۔ اس کی نجی زندگی کی کمزوریوں میں کوئی ایسی چیز نہیں جس کی وجہ سے وہ جذبۂ رحم و ہمدردی کم ہو جائے جو تخت سے لے کر قتل گاہ تک اُس کی زندگی کے حالات سے پیدا ہوتا ہے۔ یا اس امر سے کہ اُس نے اپنی تکالیف کو نہایت وقار و استقلال سے برداشت کیا۔

لیکن اگر ہم ملکہ کے متعلق رائے قائم کرنے کے لئے یہ دیکھیں کہ جن حالات میں قدرت نے اُس کو پیدا کیا تھا۔ اُن میں اُس نے اپنی طرف سے کیا حصّہ ادا کیا (اور ظاہر ہے۔ کہ کسی تاریخی فیصلے کی یہی بنا ممکن و جائز سمجھی جا سکتی ہے) تو ہمارے خیالات لازماً اُن تیز و تند دشنام طرازیوں کے مطابق ہوں گے۔ جو فرانس کے ری پبلکن لوگوں نے رجعت پسند لیڈروں کے خلاف استعمال کیں۔ وہ اُن تمام قوتوں کی رُوح اور مرکز تھی۔ جو انقلاب کے خلاف صف آرا تھے۔ حالانکہ یہ انقلاب نسلِ انسانی کی تاریخ میں احیا و تجدید۔ کفارہ و تلافی اور نجات و آزادی کی عظیم ترین اور سیر حاصل تحریک تھی۔ اور اُن تمام خوبیوں کا سرچشمہ تھی۔ جو گزشتہ صدی کے اندر نسلِ انسانی کو آزادی اور انصاف کے دائرے میں حاصل ہوئیں۔ ملکہ اس تحریک کے خلاف انتہائی نفرت و مخالفت کے جذبے سے سرشار تھی۔ اور اس کو شکست دینے کے لئے ہر طریقہ اُس کے نزدیک جائز اور حق بجانب تھا۔ اُس نے بادشاہ کو اپنے عہد و پیمان توڑنے کی ترغیب دی۔ اُس نے انتظام کیا۔ کہ بادشاہ اپنے ملک کو چھوڑ کر مُلک کے دشمنوں سے جا ملے۔ اُس نے دشمنوں کو اس

ملک کے خلاف پے درپے اکسایا۔ جس کی وہ نمائندہ تھی۔ اور اُس کی قوم نے جو آزادیاں حاصل کی تھیں۔ اُن کے خلاف بھی یہی رویہ اختیار کیا۔ وہ دشمن کو ہر قسم کی معلومات اور امداد مہیا کرتی رہی۔ فرانس کی وہ ساری دولت جو اُس کے ہاتھ آسکتی تھی۔ اُس نے آسٹریا اور روشیا کے جنگی خزانوں میں منتقل کر دی۔ اگر کسی اور فرد سے ان غداریوں کا عُشرِ عشیر بھی سرزد ہوتا۔ تو ہر موجودہ قانون کے مطابق اُس کو گولی ماردی جاتی۔ جس کاریگر نے آہنی صندوق بنایا تھا۔ اگر اُس کی بات پر اعتبار کیا جائے۔ تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ خاتون اپنے ہاتھ سے بھی قتل کا ارتکاب کرسکتی تھی۔ اور مطلق العنانی کے مقاصد کی خاطر یہ جُرم بھی اُس کے نزدیک جائز تھا۔ اگر فرانس کا کوئی دشمن تھا۔ تو یہی خاتون تھی۔ اور اگر نسلِ انسانی کے ارتقا کے اہم ترین اور مقدس ترین مسائل کا کوئی شدید ترین اور غیر مصالحانہ مخالف تھا۔ تو وہ بھی یہی ملکہ تھی۔ ہمارے تمام نہاد اخلاقیاتی اصول کا اطلاق جب ایسے معاملات پر کیا جاتا ہے تو ان اصول کی بے بسی نہایت دردناک اور ناقابلِ رحم معلوم ہوتی ہے سمجھا یہ جاتا ہے۔ کہ ہمیں صحیح اور غلط کے امتیاز کا واضح تصور حاصل ہے۔ تاہم ہم سے اس قسم کی عورت کے متعلق فیصلہ کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے جس نے اپنے آپ کو "غلطی" کی حمایت اور "صحیح" کی مخالفت کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ گویا ہمارے اخلاقیاتی تخمینے کو خالص انفرادی ذوق کا معاملہ قرار دے دیا جاتا ہے۔ جیسے مثلاً کوئی کسی ہندوستانی سالن کے متعلق رائے ظاہر کرے۔ ہمارے معیاروں میں کوئی ایسی چیز نہیں۔ جس کی رُو سے ہم یہ کہہ سکیں۔ کہ ماری انتوانت کو اولیا و شہدا میں شامل نہ کیا جائے۔ ہمارے مؤرخین کہتے ہیں۔ کہ بہرحال وہ محض ایک بے وقوف عورت تھی۔ آج کل کے اشرافیہ کی کسی عالی قدر خاتون کو بھی اگر

اُنہی حالات سے سابقہ پڑتا۔ تو وہ بھی وہی کچھ کرتی۔ جو ماری انتوانت نے کیا۔ اُس کا رویّہ اور کردار اُن خیالات کا طبعی نتیجہ تھا جو اُس کے نزدیک بہترین اخلاقی خیالات تھے۔ یہی عذر ٹارکیومیڈا۔ میری ٹیوڈر۔ گائیز۔ ولیم ہوھن زولرن اور تاریخ کے ہر "مدعی حق پرستی" بدمعاش کے متعلق پیش کیا جا سکتا ہے۔

ہم نے ابھی تک غیر اخلاقی آرا کی پستی کو کسی اعتبار سے بھی ترک نہیں کیا۔ ہم اب تک اُن منظورہ و مُسلّمہ آرا پر قائم ہیں۔ جو ظلم و ناانصافی کی ویسی ہی معاون ہیں۔ جیسی مثلاً سر طامس براؤن یا شاہ جیمز کی آرا فن جادو گری کے متعلق تھیں۔

مذہبی احتسابی عدالت۔ ظلم و ستم۔ جلاد کا کُندا۔ جلانے کی چتا۔ تعذیب و اذیت کے ایوان اور اسی قسم کے جذبات فروشانہ مظالم کا زمانہ ہم سے اتنا بعید ہو چکا ہے۔ کہ ہم بعض اوقات یہ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ کہ یہ چیزیں کبھی واقعی موجود تھیں۔ یہ اب نیم فسانوی اور اپنی خباثت میں مضحکہ خیز چیزیں بن چکی ہیں (جیسے پُرانے زمانے کے عفریت اور بھیڑیا نما انسان) اور اس کی متروک اور قدیم ہولناکیوں کا ذکر ہمیں زیادہ متاثر نہیں کرتا لیکن جن امور کو ہم حقائق حاضرہ کے قابل بحث نقاط اور دُنیا کے حقیقی نظام میں مابہ النزاع تصوّرات و آرا سمجھتے ہیں۔ اُن کے متعلق نفسیاتی اور منطقی ربط بجنسہٖ وہی ہے۔ ظالموں اور احتسابیوں نے اپنے نام اور اپنے کام بدل لئے ہیں۔ اب وہ زیادہ سنسنی پیدا کرنے والے اسلحہ استعمال نہیں کرتے۔ لیکن وہ اب تک ہم میں موجود ہیں۔ اور انسانی تقدیرات کے مقاصد کے متعلق اُن کا رویّہ وہی ہے۔ جو زمانہ قدیم میں تھا۔

او یہی بات اُن اخلاقی مسائل پر صادق آتی ہے۔ جو آج دُنیا میں مابہ النزاع ہیں۔ اور اُن کے متعلق انسانوں کا رویّہ اور طرزِ عمل بھی ویسا ہی

ہے۔ جیسا نہایت تشدد آمیز اعمال کے متعلق تھا۔ تاریک ترین جفا کاری کے زمانوں میں قائم شدہ بد اخلاقی کو متعین کرنے والے عوامل آج بھی وہی ہیں۔ لیکن بظاہر اور محض بظاہر پہلے سے بے ضرر صورتیں اختیار کر چکے ہیں۔ آج بھی ہمارے درمیان ایسے ضابطے موجود ہیں۔ کہ ذلیل بد اخلاقی اپنے آپ کو دیانت دارانہ طور پر اخلاقی خیال کرتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے احتساب مذہبی اور جادوگروں کو جلانے کے زمانے میں سمجھتی تھی۔

قتل اور تعذیب مروجہ رائے کے مطابق کتنے ہی جائز اور مسلمہ قرار دیئے جائیں۔ لیکن جونہی وہ رائے اپنی قوت کھو بیٹھتی ہے۔ یہ شیوے قطعی طور پر عیب تسلیم کر لئے جاتے ہیں۔ لیکن قتل انسان اور ذلیل ترین ظلم و تعذیب کے علاوہ بھی انسانیت پر بعض بدیاں عائد کی جا سکتی ہیں۔ اور بعض ظلم ڈھائے جا سکتے ہیں۔ لارڈ ایکٹن نے اخلاقی تاریخی فیصلے کا مستقل معیار تلاش کرتے ہوئے قتل انسان کو معیاری اصول قرار دیا۔ لیکن اگر ہم انسانی امور پر ان حقیقی قوانین فطرت کے نقطۂ نگاہ سے نظر ڈالیں۔ جو ان پر حکمران ہیں۔ تو انسانی زندگی بھی بہت زیادہ اہم مسئلہ معلوم نہیں ہوتی۔ بہت سی انسانی زندگیوں کی قربانی بھی اتنی بڑی خرابی نہیں۔ جتنی بڑی برائی یہ ہے۔ کہ انسانی ارتقا کو صدیوں تک پیچھے ہٹا دیا جائے۔ انسانیت کے نشو و ارتقا میں ظاہر ہونے والے عمل کے نتائج۔ اس کی تقدیروں کی تکمیل اور عدل و انصاف کا اتمام ایسے مقاصد ہیں۔ جو انسانی زندگی سے بھی زیادہ مقدس ہیں۔ افراد ان چیزوں کے لئے جانیں قربان کر دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں نسل انسانی ان مقاصد کی خاطر ہزاروں لاکھوں جانیں (بلکہ پوری نسل کی جانیں) دے ڈالنے میں بھی تامل نہیں کرتی۔ اگر انسانیت کو جو خون کے بہنے سے

موت کے قریب پہنچ چکی ہے۔ یہ یقین ہو۔ کہ اس کی مساعی کی منزلِ مقصود اس قربانی سے قریب تر آ رہی ہے۔ اور دُنیا کو قربانی دے کر بہتر بنایا جاسکتا ہے۔ تو وہ بھی سمجھے گی۔ کہ اس کا خون نیک لگا۔

لیکن اس کے باوجود شخص کھلم کھلا اور علی الاعلان اُن مسائل کی بھی مخالفت کرے۔ جو انسانی زندگی سے زیادہ مقدس ہیں۔ تو وہ بھی اپنے اخلاقی کردار کو ہرگز ضائع نہیں کرتا۔ یہاں تک کہ خدائے بزرگ و برتر کے خلاف واحد ناقابل معافی گناہ۔ بدعنوانی۔ اور غداری بھی ایک محترمانہ اختلاف رائے کا مسئلہ ہوسکتا ہے۔ اور اس کو سیاسیات مسلک و مذہب اور مصلحت پر مبنی کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس کو کوئی اخلاقی مسئلہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔

ہم اب لوگوں کو زندہ نہیں جلاتے۔ اب ہمارے درمیان ٹارکیومیڈا اور ایزلین موجود نہیں ہیں۔ لیکن قدرتی اخلاقی اقدار کے ضابطے میں قتل انسان سے بھی زیادہ خوفناک جرائم شامل ہیں۔ جس شفیق و کہن سال بزرگ کے ساتھ آپ نے رات کھانا کھایا تھا۔ وہ ارتقائے انسانی کو ناکام رکھنے اور نسلِ انسانی کے مقصد کو شکست دینے کا عزم کرچکا ہے۔ انسانیت کی (ڈیو این کا میڈی) "طربیہ خداوندی" میں اصلی شریر اور بدمعاش کردار اسی قسم کے شفیق و کہن سال بزرگ ہیں۔

جس جدوجہد اور کشمکش کا نتیجہ انسانی رفاہ اور انسانی ترقی کی صورت میں برآمد ہوا ہے۔ اور جو اب تک انہی مقاصد کے لئے جاری ہے۔ وہ حقیقت میں انسانوں کے خلاف نہیں۔ بلکہ آرا کے خلاف پیکار ہے۔ مسلمہ بد اخلاقی کے خلاف جنگ کرنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ مسلّمہ اخلاقیت کو نیچا دکھانا چاہئے۔ وہ چیز جو غلط مشہور ہے۔ انہی

زیادہ بُری نہیں۔ جتنی وہ شئے جو صحیح مشہور ہے۔ اور حقیقت میں ایسی نہیں۔ اس بد اخلاقی اور غلط کاری کی بنیاد ایک ایسی ساخت ہے جو عقل سے نہیں۔ بلکہ "قوتِ فکر" سے طاقت حاصل کرتی ہے۔ اخلاقی ترقی کی طاقتوں کا کام ذہنی و دماغی ہے۔ یہ کام اتنا پاکیزگیٔ مقصد کا متقاضی نہیں۔ جتنا بہتر تنقیدی ذہنی اصابت کا طالب ہے۔

پانچواں باب

اخلاق اور عقیدہ

۱

اخلاق بحیثیت موجبِ تسلّی

اخلاقیاتی فکر آغاز ہی میں ایک بنیادی انتشار کا شکار رہا جس نے اس کے عمل کو تقریباً بالکل ہی باطل کر دیا تھا۔ اور وہ انتشار اب تک موجود ہے۔ یہ اُس وقت باطل اور عقیم ہو گیا۔ جب اُس کا نقطۂ نگاہ انسانیت سے انسان کی طرف منتقل ہوا یعنی عام انسانی روابط سے اور ایک معاشری مسئلے کے طور پر اُن کی اہمیت سے گزر کر صرف شخصی اور انفرادی کردار پر غور و تامل کرنے لگا۔ جب یونانی متفکرین نے عقلی فکر کے اولین ذوق و شوق کے عالم میں حُسنِ عمل کے مسئلے پر غور کرنا شروع کیا۔ تو اُن کا اولین تصوّر "انصاف" تھا۔ اور اُن کی اولیں مثالی ہستی "منصف اور عادل انسان" کی تھی۔ بعد میں جب بحیرہ روم کی دُنیا میں یونانی عقلیت مشرقی اثرات کی وجہ سے ہلکی۔ پھیکی۔ آمیختہ اور بالآخر مغلوب ہو گئی۔ تو رواقیین اور ایپکوری فلسفیوں کے ماتحت وہ مثالی

ہستی"خردمند انسان" کی صورت میں بدل گئی۔ یعنی وہ انسان جو زندگی کی تکالیف و مصائب سے بچنے کے لئے اپنے آپ کو ذہنی احاطوں میں محصور کرنے کی عقل رکھتا ہو۔ تہذیب یافتہ رومی اور یونانی دُنیا کے دونوں حقیقی مذاہب یعنی رواقیت اور اپیکوریت، دونوں کا مقصد یہ نہ تھا۔ کہ انسان اور انسان کے درمیان روابط کو منضبط کریں۔ بلکہ اُن کے پیش نظر یہ منصوبہ تھا۔ کہ انفرادی کردار کی تشکیل ایسے طریقے سے کریں۔ کہ فرد بجائے خود زندگی کی آزمائشوں اور نشیب فراز سے نسبتہً محفوظ و مامون رہ سکے۔ یہ دونوں مذہب اسے یہ سکھاتے تھے۔ کہ حالات سے بہترین فائدہ اُٹھائے۔ اور اس کو تسکین و تسلی مہیا کرتے تھے۔ یہ عمل ایک قدم اور آگے بڑھا۔ اور مروجہ فلسفیانہ مذاہب کا مثالی انسان (یعنی دانشمند انسان) ترقی کرکے "ایشیائی ولی" بن گیا۔ اس سے فرد کو مزید تسکین و تسلی حاصل ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ اخلاقیات کا ابتدائی اور بنیادی مقصد جس کے کچھ معنی بھی تھے۔ اور جو انسانوں کے درمیان روابط کو منضبط کرنا چاہتا تھا۔ اور بدیوں کو حذف اور نیکیوں کو قائم کرنے کا خواہاں تھا قطعی طور پر آنکھوں سے اوجھل اور نذرِ فراموشی ہوگیا۔ یہ مقاصد اخلاقیاتی فکر کے دائرے سے خارج ہو گئے۔ اور اُن کی جگہ نام نہاد اخلاقیت کا مقصدِ آخریں یہ قرار پاگیا۔ کہ انفرادی ذہن کی حالت، اس کی تسکین و تسلی۔ نیک ضمیر اور نیک عزائم پیشِ نظر رہیں۔ جس طرح "منصف و عادل" انسان کی جگہ "ولی" نے لے لی تھی۔ اسی طرح بدی اور بے انصافی کی جگہ "گناہ" نے پائی۔ گویا محض عدل اور صرف انصاف اخلاقِ حسنہ کے ادنیٰ اجزا سمجھے جانے لگے۔ ان کی جگہ اخلاقی نیکی جذبات و احساسات کے بعض عالی پایہ احوال کے تصور سے وابستہ ہوگئی۔ اور اُن کا اندازہ فرد کے اعمال کے اثرات سے

نہیں۔ بلکہ اس کے ذہن کے احوال سے لگایا جانے لگا۔

یونانیوں کے اصلی اور بنیادی تصورِ اخلاقیت کی یہ نئی تشکیل جو رواقی اور اپیکوری فکر نے کی۔ حقیقت میں ایسی عمیق گمراہی ہے جس سے انسان کے اخلاقیات کو اس سے پہلے کبھی سابقہ نہ پڑا تھا۔ اخلاقیت اور انسانوں کے درمیان حسن ربط کا نتیجہ اگر نوع انسانی کے حقیقی رفاہ کی صورت میں نہ نکلے۔ تو اس کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی۔ اس طریقے سے اخلاقیت اپنے وظیفے ہی سے محروم ہو جاتی ہے۔ اس کا وظیفہ محض فرد کی اپنی بہبود اور نجات نہیں (گو حقیقت میں یہ اس بہبود کی بلند ترین شکل ہے) بلکہ اصل شئے یہ ہے۔ کہ فرد جس وسیع تر نظام کا ایک جزو ہے۔ اس کے تعلق میں اس کا رویہ کیا ہے۔ اس حقیقی اخلاقی تعلق کا اصل جوہر اور اس کی بنیاد "عدل و انصاف" ہے۔

اور عدل کوئی روحانی اور لطیف نصب العین نہیں۔ نہ کوئی تعمیری تصور ہے۔ جس کو کسی کشفِ روحانی نے جنم دیا ہو۔ بلکہ یہ تو محض بدی اور بے انصافی کی نفی ہے۔ اس کا مطالبہ یہ ہے۔ کہ کوئی شخص ظلم و ستم میں خود مختار نہ ہو۔ انسان پر انسان کو اندھا دھند تشدد کا اختیار نہ ہو۔ بلا استحقاق اور بلا وجہ کسی کو جفا کاری اور بیدردی کا نشانہ نہ بنایا جائے۔ اور کسی شخص کو یہ موقع نہ دیا جائے۔ کہ محض قوت۔ استحقاق کہنہ۔ اور کسی سچی یا جھوٹی سندِ اختیار کے بل پر دوسرے انسان کی زندگی۔ اس کی فعالیت اور اس کے فکر پر کوئی ظالمانہ پابندی عائد کرے۔ ہم لفظ "بدی" کو جب تک کوئی معنی پہناتے رہیں گے۔ اور جس روشنی میں اسے دیکھتے رہیں گے۔ یہ حرکات و افعال بدی (اور خالص اور کامل بدی) ہی رہیں گے۔ جو شخص ان آفات سے محفوظ رہنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ وہ محض اپنا "حق" طلب کرتا ہے۔ اگرچہ یہ حق کسی میثاق یا معاہدے کی قوت پر مبنی نہیں

کسی قانونی فارمولا سے اس کا ثبوت بہم نہیں پہنچایا جا سکتا۔ اور اگر چاہیں۔ تو اسے "دعوئے بلا ثبوت" قرار دے سکتے ہیں لیکن یہی بنیادی مطالبہ ہے۔ جو اخلاقیت کی اہمیت کے جوہر اور بیخ و بن کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ "حق" ہے۔ اور اس کا مقابل "باطل" ہے۔ اخلاقیت کا اقل قلیل مطالبہ یہی ہے۔ کہ باطل اور بدی کو بے نشان کر دیا جائے۔ اس اقل قلیل مطالبہ پر شاندار اخلاقی جذبے کی کتنی ہی اونچی عمارت کھڑی کر دی جائے۔ لیکن جب تک حق کے ابتدائی لوازم محفوظ نہ کئے جائیں اور بدی کی حمایت جاری رہے۔ اس عمارت کی کوئی حیثیت نہیں۔ اس قسم کی بلند عمارت ہرگز منشائے اخلاق کے مطابق نہیں۔ جو فرد یا معاشرہ اخلاق پسند کہلانا چاہتا ہے۔ اُس کا فرض ہے کہ بدی سے کامل احتراز کرے۔ انسان خواہ کتنے ہی رفیع و برتر جذبات کی پرورش کرے۔ اور متصوفانہ جوش سے کتنے ہی وجد و حال اُس پر طاری رہیں۔ لیکن جب تک وہ متذکرہ بالا ابتدائی شرط پوری نہ کرے گا۔ اور بے انصافی سے مجتنب نہ رہے گا۔ یہ روحانی اشغال و اذکار اُسے کوئی فائدہ نہ پہنچائیں گے۔

شخصی اور راہبانہ نصب العین کا یہی اثر نہیں ہوتا۔ کہ اخلاقیت کا وظیفہ اوّلی تاریک اور دھندلا ہو جاتا ہے۔ بلکہ اس کی جگہ ایک ایسا وظیفہ قائم ہو جاتا ہے۔ جو اس سے کاملاً متضاد و متبائن ہوتا ہے۔ رواقیت کا نصب العین نیکی نہیں۔ بلکہ ترکِ دنیا ہے۔ بدی سے پرہیز نہیں۔ بلکہ بدی کے اثرات سے فرد کی حفاظت مقصود ہے۔ اخلاقیت کا مقصد بدی کی مزاحمت کرنا نہیں۔ بلکہ اُس کے آگے سر جھکا دینا ہے انصاف کو ترقی دینا مقصود نہیں۔ بلکہ بے انصافی کے آگے جھکنا اور اس سے تغافل کرنا ہے۔ اس سے ہر قسم کی اخلاقیت کا بنیادی وظیفہ

مقلوب و منقلب ہو جاتا ہے۔ اور اس کا مقصد حقیقت میں یہ ہو جاتا ہے۔ کہ بدی کی مزاحمت نہ کرو۔" اس بے راہ روی کی وجہ سے اخلاقیاتی جذبے کا نتیجہ نسل انسانی کے نشو و ارتقا کا اہتمام نہیں۔ بلکہ اس کے بالکل اُلٹ ہوتا ہے۔ اس کو انسانی مستقبل، ذرائع حصول اور مساعی ترقی سے کوئی واسطہ باقی نہیں رہتا۔ وہ ان سب چیزوں کو رد کر دیتا ہے۔ اور اُن کو دُنیا وی قرار دیتا ہے۔ وہ اپنے نصب العین کو اُن تمام حرکات و افعال سے کاملاً علیحدہ و منفک کر لیتا ہے۔ جو ارتقائی قوت اور حیاتِ انسانیت کے اجزا ہیں۔ یہ نہ صرف اُن کی ترقی میں حصہ نہیں لیتا۔ بلکہ ان سے نفرت کرتا ہے۔ اور ان کا مزاحم ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے۔ کہ جن ادوار اور جن معاشروں میں اس نصب العین کی حکمرانی رہی ہے۔ وہ اپنی ظاہری انسانیت پرورانہ نوعیت اور راہبانہ زہد کے باوجود صرف ظلم و بے دردی ہی کے مرکز نہیں بنے رہے۔ بلکہ ان ادوار میں انسانی ترقی بالکل ساکن و جامد رہی۔ اور انھوں نے کسی آزادی یا عدل کو تقویت نہیں پہنچائی۔

عام طور سے عیسائیت پر یہ الزام عائد کیا جاتا ہے۔ کہ پوری تاریخ میں اُس نے مسلسل و متواتر قوت اور ظلم کا ساتھ دیا ہے۔ صرف شاذ و نادر ایسی مثالیں ہیں۔ کہ جب کبھی مظلوموں کی تحریک کے مقصد اور کلیسا کے سیاسی مفاد میں اتفاق سے مطابقت پیدا ہو گئی۔ تو کلیسا نے (عام طور پر اناڑی طریقے پر) اپنی قوت کو آزادی کے لئے طبقات کی مخلصی اور ترقی کے لئے اور ناقابل برداشت بدیوں کی اصلاح کے لئے استعمال کیا۔ لیکن اس کے برعکس کلیسا ہمیشہ استحقاق مطلق العنانی اور قائم شدہ مظالم کا مؤید و حامی رہا۔ یہ پرانا دعویٰ اب دُہرایا نہیں جا سکتا۔ کہ مسیحیت نے غلامی کو موقوف کر دیا۔ کیوں کہ

دُنیائے قدیم میں غلامی محض اس لئے غائب ہوگئی تھی۔ کہ غلام مہیا نہیں ہو سکتے تھے۔ اس بھرمانی کے رُک جانے سے مسیحیت کا کوئی تعلق نہ تھا۔ مثال کے طور پر اگر آج کل خانگی ملازم دستیاب نہیں ہو سکتے۔ تو اس میں مسیحیت کا کیا کرشمہ ہے؟ لیکن بہرحال مسیحیت پر یہ الزام شائد کاملاً درست نہیں۔ کہ اُس نے شاہوں کے "خدائی حق"۔ جاگیرداری اور دوسرے قائم شدہ قواد مظالم کی حمایت کی ہے۔ اس میں مسیحیت کی رُوح کا کوئی تصور نہ تھا۔ بلکہ انسانی حرص و آز اور طاقت کے لالچ نے پالیسی کے مقاصد پر اثر ڈالا۔ مذہبی عہدیداروں کی بدعنوانی۔ کلیسیائی حکومت کے شہزادوں اور طاقتور راہبوں کے نصب العینوں کی خرابی (خود وہ نصب العین نہیں) حقیقت میں اس امر کی ذمہ دار ہیں۔ کہ مسیحی کلیساؤں نے آزادی اور ترقی کے ہر اظہار کی مخالفت کی۔ اگرچہ اس امتیاز کو ذہن میں رکھنا چاہیئے۔ لیکن اس کے باوجود اس امر کا اعتراف کرنا چاہیئے۔ کہ اس مخصوص امتیازی رویّے کا امکان بھی محض اس لئے پیدا ہُوا۔ کہ راہبانہ اور زاہدانہ نصب العین انصاف کے تصوّر کو لازماً پس پُشت ڈال دیا کرتے ہیں۔

میرے دوست ڈاکٹر فالٹا داگریشیا تو اپنی کج نظرانہ اور توہین آمیز عادت کے مطابق ایک قدم اور آگے بڑھ کر اپنی رائے ظاہر کرتے ہیں۔ اس مشہور ہسپانوی پروفیسر کا خیال ہے۔ کہ رُوحِ مسیحیت عدل و انصاف کے تصوّر سے اسی قدر بیگانہ اور اجنبی ہے جس قدر ذہنی دیانت سے محروم ہے۔ وہ اپنے اخلاقیاتی تصور کے دائرے سے کامل باہر رہی ہے۔ مَیں یہاں مسیحیت کی اُن تفسیروں اور توجیہوں کی طرف اشارہ نہیں کر رہا ہوں۔ جن کے متعلق یہ الزام لگایا جا سکتا ہے۔ کہ وہ جعلی اور خود ساختہ ہیں۔ مَیں ان اطلاقات کا ذکر بھی نہیں کرتا۔ جو ضعف و خطا پر مبنی

بتائے جا سکتے ہیں۔ بلکہ میں مسیحیت کی روح کے بلند ترین مظاہر اور نہایت مثالی تصورات کو پیش نظر رکھ کر کہتا ہوں۔ کہ اصلی دین مسیحیت نے اُن لوگوں تسکین و تسلی دی۔ جو نا انصافی کا شکار ہوئے۔ لیکن جہاں تک نا انصافی کا تعلق ہے۔ اس سے بالکل تغافل اختیار کیا۔ اس دین نے تھکے ماندوں۔ بھاری بوجھ اُٹھانے والوں۔ مصیبت زدوں اور درد رسیدوں کو خطاب کیا۔ اُن کو محبت کا قانون سُنایا۔ اُن کو رحم اور عفو کا فرض یاد دلایا۔ اور خطا کے آپ ہونے پر زور دیا۔ لیکن مذہبی اور اخلاقیاتی جوش و جذبہ کی اس لہر میں جو انسان کو رفیع و برتر روحانیت سے متاثر کرتی تھی۔ اور تمام دوسرے اخلاقیاتی نصب العینوں سے بلند تر معلوم ہوتی تھی۔ اور اس تمام مذہبی تواجد میں "عاقہ عدل و انصاف" ا "عامہ و دیانت" کو کوئی مقام حاصل نہ تھا۔ مسیحیت کا مثالی "ولی" آسمان سے فرشتے کی طرح اُترتا ہے۔ اور مصیبت زدہ اور مظلوم انسانوں کے ہجوم میں جا کر انجیل فارقلیط اور "مذہب رنج و غم" کا پیغام تسکین و تسلی سُناتا ہے۔ لیکن اس مصیبت کا سرچشمہ اُس کے دائرۂ شعور سے بالکل خارج ہے۔ اس کے منظر پر "نیک و بد" کے تصور کی کوئی شعاع چمکتی نظر نہیں آتی۔ اس کے نزدیک دُنیا میں ایک قائم شدہ نظام ہے۔ یہاں کی حکومتیں خدا کی مقرر کی ہوتی ہیں۔ اور گناہ گاروں کو خدائی حکم ہی کے ماتحت آزمائش میں ڈالا گیا ہے سینٹ ونسنٹ دا پال فرانسیسی جہازوں کو چلانے والے غلاموں کے زندہ جہنم کو دیکھتا ہے۔ محبت کا پیغام سُناتا ہے۔ اور گناہ گاروں کو توبہ و پشیمانی کی تلقین کرتا ہے۔ لیکن جس ظلم و نا انصافی نے اس جہنم کو پیدا کیا اور جاری رکھا۔ اُس سے وہ بالکل غافل اور بے پرواہ رہتا ہے وہ بادشاہِ مسیحیت پناہ" کا جہنم خیرات خانہ مقرر کر دیا جاتا ہے۔ دُنیا ظالموں کی مطلق العنانی کے تلے نالہ و فریاد کرتی رہے گی۔ انسانوں

کی زندگیاں اور اُن کے اذہان غلام بنائے جاتے رہیں گے۔ ان کو پامال کیا جاتے گا۔ اور اُن کو آفت زدہ بنایا جائے گا۔ رُوحِ مسیحیت اُن کی تسکین و تسلّی میں برابر کوشاں رہے گی۔ لیکن اُسے ان مظالم میں سے کسی ایک کے تدارک کا بھی خیال نہ آسکے گا۔ وہ اب تک اُن کی طرف سے بالکل غافل و بے خبر رہی ہے۔ ظلم ہوتے رہے۔ اور لوگوں کو اُن سے نجات حاصل کرنے کا حق بھی حاصل رہا۔ لیکن مسیحیت فطرتاً ان حقائق کی طرف سے بالکل اندھی رہی۔ مسیحیت کی رُوح انصاف اور نیکی اور بدی کے اعتبار سے اتنی "بد اخلاق" نہیں۔ جتنی "بے اخلاق" ہے۔ یہ تصوّر اُس کے لئے اُتنا ہی اجنبی ہے۔ جتنا سچائی کا تصوّر۔ بحث و اختلاف کرنے والے کہیں گے۔ کہ مسیحیت کے ضابطہ میں ایک "زرّیں قاعدہ" "ایک سنہری اصول" موجود ہے۔ جو اکثر ادبیات میں پیش پا افتادہ اصول ہے۔ اور جو مشرق میں چین سے لے کر ایشیائے کوچک تک زبان زدِ عام تھا۔ لیکن اس منقطع اور منفک ہدایت کو کبھی "حسِ انصاف" کا مترادف قرار نہیں دیا گیا۔ اس کا مطلب عفو۔ تحمّل اور مرمت تو تھا۔ لیکن محض "انصاف" اور "عامِ عدل" کبھی نہیں سمجھا گیا۔ کیونکہ یہ نیکیاں نہایت غیر جذباتی قسم کی تھیں۔ اور مذہبی جوشیلوں کو زیادہ پسند نہ آتی تھیں۔ زندگی اور اس کی تمام "بے حقیقت" چیزوں کو ترک کر دینا۔ اس کے قیام کے تمام فرمایہ تفکّرات کو خارج از بحث قرار دینا۔ خواہشات کو دبانا۔ بے دریغ خیرات تقسیم کرنا۔ اس ہیچ اور بیکار زندگی کو خیرات اور محبت کے لئے وقف کر دینا۔ مزاحمت نہ کرنا۔ اطاعت مجہول اختیار کرنا۔ دشمن کا تمانچا کھا کر دوسرا گال بھی پیش کر دینا۔ یہ تمام مبالغہ آمیز اخلاقیاتی جذبات تو مسیحی شعور کو مشتعل کر سکتے تھے۔ لیکن ظلم حق تلفی اور ناانصافی کی کوئی شکل بھی اس شعور کو حرکت نہ دے سکتی تھی۔"

اخلاقی مقاصد کے تمام رواقی ۔ زاہدانہ شخصی اور انفرادی مغالطوں اور
انسانی نشو و ارتقا میں اخلاقیت کے قدرتی وظیفے کے درمیان جو بنیادی
اختلاف ہے ۔ وہ ان ناقابل برداشت اور ناپسندیدہ مبالغوں کو بظاہر
صحیح رنگ دے دیتا ہے ۔

میتھیو آرنلڈ نے اپنے ایک دل کش مقالے میں اس فرق و تفاوت
پر تفصیل سے اظہار رائے کیا ہے ۔ کہ "کفر" تو مسرت کا مذہب سمجھا
جاتا ہے ۔ اور "مسیحیت" مذہب رنج و غم" خیال کیا جاتا ہے ۔ اس کا نقطۂ
استدلال یہ ہے ۔ کہ چونکہ نوعِ انسانی کی زندگی زیادہ تر مصیبتوں سے بھرتا
ہوتی ہے ۔ اور دنیا میں تکلیف کی مقدار بہت زیادہ ہے ۔ اس لئے
"مذہبِ غم" کا اطلاق "مذہبِ مسرت" کی نسبت بہت زیادہ ہے لیکن
جس تکلیف و مصیبت سے انسانی زندگی لبریز ہے ۔ اس کا $\frac{9}{10}$ حصہ
نا انصافیوں اور غلط کاریوں اور اخلاق سوزیوں کی براہِ راست پیداوار
ہے ۔ کیونکہ تکلیف و مصیبت کا سرچشمہ یہی چیزیں ہیں ۔ اور میں اس
حقیقت کا اعادہ کرتا ہوں ۔ کہ اخلاقیت (اگر اس کے کچھ معنی ہیں) کا
سب سے پہلا واسطہ نیکی اور بدی ہی سے ہے ۔ تسکین و تسلی قابلِ تعریف
اور مبارک چیزیں ہیں (گو یہ سوال کیا جا سکتا ہے ۔ کہ بالآخر دھوکے کی تسلی
کس حد تک مفید ہوتی ہے ۔ یا جھوٹی تسکین کس حد تک مصلحت آمیز
ہو سکتی ہے) لیکن ان کا اخلاقیت سے کوئی تعلق نہیں ۔ اور جب تک
نیکی اور بدی ۔ حق اور باطل کا سوال قطعی طور پر متروک اور بالائے طاق
رہتا ہے ۔ تسکین و تسلی بطور خاص اخلاقیت سے بے تعلق رہتی ہیں ۔
تسکین و تسلی عفو کوشی اور لطف و مرحمت اگرچہ قابلِ تعریف ہوں ۔
لیکن اخلاق سے اُن کا کوئی واسطہ نہیں ۔ اور وہ بالکل اُن خواب اور
اور نشے کی چیزوں کی طرح ہیں ۔ جو بعض اوقات مقدس مذہب کے حکم

سے نکلنگی یا چنا پر جانے والوں کو دبا کرتی تھیں۔ ہمیں آپ شوق سے تسکین تلطف و مرحمت اور رحم سے سرفراز فرمایئے۔ لیکن سب سے پہلے ہمیں انصاف عطا کیجئے۔ اور حق دیجئے۔

بدقسمتی سے مسیحیت پر یہ الزام عائد کیا جاتا ہے۔ کہ وہ قائم شدہ بدیوں اور واضح نیکیوں کے درمیان امتیاز کرنے میں ناکام رہی ہے۔ اس کا تعلق لازماً اس نااہلیت سے ہے۔ جس کا اظہار بعض اوقات غلطی اور سچائی میں تمیز کرتے وقت مسیحیت سے سرزد ہوا ہے۔ حق۔ باطل۔ انصاف اور ابتدائی اخلاقی اقدار کی غیرشعوریت اور ذہنی اقدار کی غیرشعوریت ناگزیر طور پر لازم و ملزوم کا حکم رکھتی ہیں۔

ذہنی دیانت اور انصاف کے درمیان دراصل براہ راست تعلق ہے۔ دونوں ایک ہی ذہنی وصف کے دو پہلو ہیں۔ سچائی کا احساس اور حق کا احساس۔ انسانی روابط کے متعلق عدالتی رویّہ اور حقائق اور ذہنی روابط کے متعلق عدالتی رویّہ۔ یہ سب خفیف طور پر مختلف پہلوؤں کے ماتحت ذہن کی ایک ہی حالت کے مظہر ہیں۔ جو شخص ذہنی دیانت کے احساس سے عاری ہو۔ حقائق پر بے معنی حجت و تکرار کرتا ہو۔ اپنی عقل کو خود دھوکا دیتا ہو۔ اپنی بصیرت کو دانستہ شل کر دیتا ہو۔ صداقت کے حقائق کو نظرانداز کرتا ہو۔ شہادت وضع کر کے جوڑ توڑ بھی کرتا ہو۔ اپنے آپ کو فریب دیتا ہو۔ اور سچائی اور دروغ بافی کی اخلاقیت کا کوئی احساس نہ رکھتا ہو۔ ایسے شخص کے لئے یہ ناممکن ہے۔ کہ نیکی اور بدی۔ حق و باطل۔ انصاف اور بے انصافی کے درمیان کسی قسم کا امتیاز کر سکے۔ اخلاقی سطح پر بھی اس کی رائے اور تجویز لازماً وہی ہوگی جو ذہنی سطح پر ہوگی۔ کیوں کہ ذہنی کجی اور اخلاقی اصابت رائے کبھی یک جا نہیں ہو سکتیں۔

اخلاقی نشو و ارتقا کی ادنےٰ اور پست حالت میں جب دیانتِ فکر کا تصور مفقود ہوتا ہے۔ انسانوں کے درمیان روابط کی دیانت بھی کہیں نظر نہیں آتی۔ انصاف اور مبادیٔ اخلاق کسی کے لئے قابل فہم نہیں ہوتے۔ دیانتِ فکر اور دیانتِ اخلاق جن میں سے ایک کو ہم ذہنی اور دوسرے کو اخلاقی مسئلہ کہتے ہیں۔ دونوں چیزیں قطعاً متحد ہیں۔ اور انھیں حقیقت میں ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔

(۲)

"علم بیزاری" کا مغالطہ

جو غلط تصور اخلاقی طرزِ عمل کو عقل و استدلال سے کاملاً منقطع کر دیتا ہے۔ اس کی جڑ میں ایک نفسیاتی انتشارِ فکر پوشیدہ ہے۔ جو موجودہ مسئلے سے بھی زیادہ وسیع اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اس کا تعلق عقلی فکر کی حیثیت و اہمیت کے متعلق ہمارے پورے تخمینے سے ہے اور یہ اس لئے زیادہ مسرت رساں ہے۔ کہ اس میں صداقت کا ایک مرکزہ بھی شامل ہے۔

صحیح یہ ہے۔ کہ ہر عمل و فعل، خواہش۔ احساس اور ان کے متعلقہ جذبے سے پیدا ہوتا ہے۔ فکر خواہ وہ عقلی ہو یا نہ ہو۔ بجائے خود کوئی محرک عمل مہیا نہیں کرتا۔ بلکہ صرف ایک ایسے مقصد کے حصول کے ذرائع پیش کر دیتا ہے۔ جو مافوق العقل خواہش سے پیدا ہوا ہو۔ عمل کا کوئی بھی راستہ اختیار کیا جائے۔ اس میں ایک آخری مقصد فرض کر لیا جاتا ہے۔ جو ذہنی اور عقلی فکر کے دائرے سے

بالکل باہر ہوتا ہے۔ اگر میں اپنی ٹوپی یا چھتری اُٹھاتا ہوں۔ تو میرا یہ فعل عقلی ہوگا۔ کیونکہ میں جانا چاہتا ہوں۔ اگر میں شہر جانے کے لئے گاڑی روکتا ہوں۔ تو میرے اس طرزِ عمل کا عقلی جواز یہ ہوتا ہے۔ کہ مجھے وہاں اپنے کاروبار کے سلسلے میں کسی سے ملنا ہے۔ لیکن اگر آپ اس کے بعد مجھ سے یہ سوال کریں۔ کہ آخر کاروبار ہی کی کیا ضرورت ہے؟ تو میں صرف یہی جواب دے سکتا ہوں۔ کہ مجھے زندگی بسر کرنی ہے۔ کسی شدید منطقی کو (ایک مشہور کہانی کے وزیرِ خزانہ سے بھی زیادہ معقول طور پر) یہ کہنے کا حق حاصل ہے۔ کہ میں نہیں سمجھتا۔ کہ اس میں ضرورت کا کیا سوال ہے"۔ ہم کسی طرزِ عمل کی بھی تحقیقات کریں۔ جلد یا بہ دیر ہمارے سامنے ایک "آخری مقصد و محرک" کی دیوار کھڑی نظر آئے گی۔ جو بالکل مافوق العقل ہوگا۔

عقلی فکر کا عمل صرف مُطّلع کرنے والے وظیفے تک محدود ہے۔ اس طریقے سے جو ماحول ادراک میں آئے گا۔ اُس کے متعلق جسمِ انسانی کا ردِّ عمل اُس جذباتی رنگ آمیزی اور خواہش پر منحصر ہوگا جس کو وہ ادراک و احساس پیدا کرے گا کسی طرزِ عمل کو صرف اس اعتبار سے عقلی یا غیر عقلی قرار دیا جا سکتا ہے۔ کہ اُس میں ایک مافوق العقل مقصد کے حصول کے لئے مناسب یا غیر مناسب ذرائع اختیار کئے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ کسی طرزِ عمل کی نوعیت کا صحیح اندازہ احساس۔ اشتہا اور عاطفہ کے نقطۂ نگاہ ہی سے کیا جاتا ہے۔ اور اس کو عقلی عملیات کے دائرے سے بالکل باہر سمجھا جاتا ہے۔

لیکن درحقیقت یہ تفاوت بالکل دھوکا ہے۔ کیونکہ محرکات۔ خواہشات اور جذبات کی نوعیت فرد کے دائرۂ مشاہدات ہی سے متعین کی جاتی ہے بنزلان تاثرات سے جو وہ ماحول کے روابط سے اخذ کرتا ہے۔ اگر میں ضمیر

کو دیکھ کر اُٹھ بھاگتا ہوں۔ تو میری حقیقی محرک خود حفاظتی کی مافوق العقل جبلت ہوتی ہے۔ لیکن اس کو آمادۂ عمل کرنے کے لئے مجھے سب سے پہلے خطرے کی نوعیت کا اندازہ ہونا چاہئے۔ اگر وہ جانور جسے مَیں شیر سمجھتا تھا۔ حقیقت میں محض ایک چھوٹا سا کُتّا ہے۔ تو میرا بیہودہ اضطراب گمراہ جبلت کا نہیں۔ بلکہ غلط مشاہدہ کا نتیجہ ہوگا۔ انسان اپنے اردگرد کی دُنیا سے جو نقوش وارتسامات حاصل کرتا ہے۔ اُن کی نوعیت ہی سے اس کے محرک کی رفتار متعیّن ہوتی ہے۔ انسان کا طرزِ عمل اُس کی فوق العقل جبلت۔ اُس کے جذبات وخواہشات پر منحصر ہے لیکن خود یہ چیزیں بھی اُس کے خیالات۔ اُس کے اندازۂ عالم اور اُس کے عقاید وآرا سے متعیّن ہوتی ہیں۔

یہ تاثر اور اس کے مشاہدہ وادراک کا دائرہ اور کثرہ ذہنی نشو وارتقا اور علم پر موقوف ہے۔ دُنیا اس کے لئے کیا معنی رکھتی ہے۔ اس کی خواہشات وتمنّیات کو کون سی چیز متعیّن کرتی ہے۔ یہ اُس کی ذہنی رسائی اور زاویۂ نظر کی پیداوار ہے۔

ایک بہت بڑا مغالطہ یہ ہے۔ کہ لذّت والم ہی وہ سادہ اور قطعی محرک ہیں۔ جو ہر طرزِ عمل کو معیّن کرتے ہیں۔ یہ مغالطہ اب تک مقبول عام ہے۔ اور فلسفیانہ نظریات پر بھی غالب ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ محض انتشارِ فکر کا مظہر ہے۔ یہ کہنا کہ ہم وہی کام کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو ہمیں پسند ہوتا ہے۔ اور اُس سے پہلو بچاتے ہیں۔ جو ناپسند ہوتا ہے۔ محض تکرار بالمعنی ہے لیکن طرزِ عمل مختلف ہوتے ہیں۔ کیونکہ پسند اور ناپسندی کے معیار مختلف ہیں۔ طرزِ عمل کے تنوع کو متعیّن کرنے والی چیز پسند اور ناپسندی کا مشترک عامل نہیں۔ بلکہ وہ چیز ہے جو پسند اور ناپسند میں امتیاز پیدا کرتی ہے۔ خنزیر باورچی خانے کے دھوون کو پینے

کا خواہاں ہوتا ہے۔ مفکر کسی خیال کی قوت کے آگے ہر چیز قربان کرنے پر آمادہ ہوتا ہے۔ دونوں حصولِ مسرت کی خواہش کے محکوم ہیں۔ صرف اُن کی مسرتوں میں اختلاف ہے۔ خنزیر کی خواہش گیارڈانو برونو کے لئے موجب مسرت نہیں ہوسکتی۔ اور برونو کی خواہش عامیانہ خیال کے آدمی کی سمجھ میں نہیں آسکتی۔ جس شخص نے یہ محسوس کر لیا ہے۔ کہ کسی عظیم اور عمیق خیال کی روشنی میں زندگی بسر کرنا۔ اس خیال کی خدمت میں مصروف ہونا اور اپنے آپ کو دُنیا کی تشکیل کرنے والی تخلیقی قوتوں میں شمار کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ وہ اعلان کرتا ہے۔ کہ صرف اسی کا نام زندگی ہے۔ اور اگرچہ اس میں کش مکش کی تلخی۔ گمنامی بلکہ موت تک کا سامنا کرنا پڑے۔ اس مسرت کو دُنیا کی کسی بہتر سے بہتر چیز کے بدلے میں بھی فروخت نہیں کیا جا سکتا۔ یہ سوال کیا جا سکتا ہے۔ کہ "آیا وہ سچ مچ خنزیر کی نسبت زیادہ مسرور ہے"؟ لیکن یہ سوال قطعی طور پر بیکار اور لغو ہے۔ کیونکہ ایک خنزیر۔ اور ایک مفکر کی حاصل کردہ مسرت کی مقدار کا مقابلہ کرنے کا کوئی ذریعہ یا طریقہ موجود نہیں۔

لذت و الم اور مسرت و تکلیف کس حد تک محرکِ عمل ہوتے ہیں۔ اس مسئلہ پر مسلسل بحث کرنا محض بیکار استدلال کے چکر میں پڑنا ہے۔ لذت و مسرت بلاشبہ ہر قسم کے طرزِ عمل کے نصب العین ہوتے ہیں۔ لیکن محض اس لئے۔ کہ وہ ہر قسم کے طرزِ عمل کے مشترک نصب العین ہیں۔ ان کو ایک طرزِ عمل اور دوسرے طرزِ عمل کے درمیان امتیاز کرنے کے مسئلے میں کوئی تعلق یا واسطہ نہیں۔ یہ ممکن ہے۔ کہ مشترک عامل سے کامل تغافل بھی کیا جائے۔ اور پھر بھی نتیجے پر کوئی اثر نہ پڑے۔ ایک قسم کے طرزِ عمل اور دوسرے طرزِ عمل کے درمیان فرق و تفاوت معیّن کرنے والی چیز یہ ہے۔ کہ مسرت و اطمینان کی نوع کیا

ہے۔ اور شئے مطلوبہ کی نوعیت کیا ہے۔ اور یہ فرق و تفاوت اُس طریق پر منحصر ہے۔ جو بیرونی دُنیا سے کسی فرد کے تعلق میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ اس کے مشاہدے۔ اس کے تصور۔ اس کے فکر اور اس کے علم پر منحصر ہوتا ہے۔ ان تعلقات کے ادراک کے لئے جو وسیلے اختیار کئے جائیں۔ اُن کی مقدار ہی فی الحقیقت فرد کی خواہشات اور اُس کے محرکاتِ عمل کو معیّن کرتی ہے۔ پس وہ عقلی فکر جو اپنے وجود کے لئے اسی ضرورت کا شرمندۂ احسان ہے۔ اور جس کا وظیفہ یہ ہے۔ کہ اس فہم و ادراک کو درجۂ کمال تک پہنچادے۔ وہی فرد کے ردّ عمل یعنی طرزِ عمل کو معیّن کرتا ہے۔ فہم و ادراک جتنا زیادہ مکمل ہوگا۔ یقین جتنا زیادہ صادق ہوگا۔ اُتنی ہی خواہش زیادہ مکمل ہوگی۔ اور اتنا ہی طرزِ عمل زیادہ مطابق و موزون ہوگا۔ طرزِ عمل خواہش۔ احساس اور جذبے پر منحصر ہے۔ اور خود خواہش۔ احساس اور جذبہ فہم۔ ادراک کی نوعیت پر منحصر ہیں۔

ازمنۂ متوسطہ کی مسیحیت کا پُرانا عقیدہ یہ تھا۔ کہ انسان کے لئے اہم ترین بات یہ ہے۔ کہ اس کے "عقائد" کیا ہیں۔ انہی عقائد کے مطابق اس کا فلاں مسلک یا اس کی فلاں رائے صحیح ہے یا غلط۔ اُسی کے مطابق اس کو نیک یا بد سمجھا جائے گا۔ اور اس کی اخلاقی قدر و قیمت اور اس کا طرزِ عمل صرف اُس کے ذہنی رویّے کے خارجی عکس ہیں۔ یہ عقیدہ مکروہ و مردود قرار دے دیا گیا۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے۔ کہ یہ عقیدہ صحیح معنی میں اور مسلمہ طور پر صحیح تھا۔ صرف تاریخی صورتِ حالات کا تضاد اور اہمال ہی تھا جس کی وجہ سے لاک۔ بیل اور والٹیر نے آزادی کی "رواداری" اور "عقلیتِ فکر کی رواداری" کی خاص اور پُر زور حمایت کی۔ وہ تمام قسم کی آراء و خیالات کی اقدار و اساسات کو گرا کر ایک ہی سطح پر لے آئے۔ جواز و عدم جواز۔ صحت و عدم صحت۔ حق و باطل کے تمام امتیازات

کو منسوخ کر دیا۔ اور عصر جدید کی اُس مضرت رسان اور ناقابل برداشت رواداری کو جنم دیا۔ جو ہر قسم کی رائے کو مساوی طور پر واجب الاحترام قرار دیتی ہے۔ اسی تضاد و اہمال نے ذہنی و عقلی عقیدے کو اخلاقی وقعت و اہمیت سے محروم کر دیا۔

(۳)

عقلی فکر اور مذہب انکار (نہلزم)

یہ حالات کی عجیب ستم ظریفی ہے۔ کہ جو لوگ اخلاق کو عقلی فکر پر منحصر قرار دینا اخلاقی نصب العین کی توہین قرار دیتے ہیں۔ اور اس کو نہایت غیظ و غضب سے مسترد کر دیتے ہیں۔ وہی یہ شکایت کرتے ہیں۔ کہ اخلاقیت کی بنیادیں عقلی تنقید سے کمزور کی جا رہی ہیں۔ جب وہ یہ کہتے ہیں کہ اخلاقیت کی بنیادیں کھوکھلی کی جا رہی ہیں۔ تو اُن کا مطلب یہ ہوتا ہے۔ کہ حصول ثواب اور آئندہ زندگی کے محرک کو تباہ کیا جا رہا ہے۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ اخلاقیت کو خود مفادی کے کسی فارمولے کی شکل میں عقلی صورت نہیں دی جا سکے گی۔ بلکہ حقیقی واقعات کے فہم و ادراک سے ذہن انسانی کے جذباتی تاثر کو خالص و منفک اخلاقیت پر محدود کر دیا جائے گا۔ ان لوگوں کے نزدیک یہ اخلاقیت کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنا ہے۔ اور اخلاقیت عقلی صورت اختیار نہیں کر سکتی۔ بلکہ وہ ایک روحانی جذبہ ہے۔ یہ گویا متناقض بالذات بے اصولی کی انتہا ہے۔

لیکن پھر بھی ہمیں ان بے اصولوں سے زیادہ سختی نہیں کرنا چاہئیے۔ اُن کے دعوے میں صداقت کا ایک جزو بھی موجود ہے۔ اگر ہم کو پورا یقین ہے۔ کہ ہماری ناپائدار ہستی کو بالآخر کامل فنا سے سابقہ پڑنے والا

ہے۔ اگر ہم متیقن ہیں۔ کہ پوری نسل انسانی اپنی تمام تر جد و جہد کشمکش اور ارتقا کے بعد ایک دن نیستی کے سمندر میں غرق ہو جائے گی۔ ہماری دُنیا ایک "منجمد مُردہ خانے" کی طرح خلا میں چکر لگاتی پھرے گی۔ اور نسل انسانی کی تمام کوششوں۔ سرگرمیوں اور کامیابیوں کے آخری اور قطعی نتائج اسی میں جذب ہو جائیں گے۔ تو اس تیقن سے ضرور کچھ فرق پڑے گا۔ لیکن جتنا کچھ پہلے پہل تخیل میں آسکتا ہے۔ اتنا بڑا فرق تو پھر بھی نہ پڑیگا کیونکہ نسل انسانی کا عزم ہمارے اندر بہت طاقتور ہے۔ اور ہم صرف ایک خاص حد تک ہی "افراد" کہلاتے ہیں۔ اگر نسل انسانی کی تناسلی تحریک محو نہ ہوگی۔ تو اس کی خواہشات اور اس کی نسلی ترقی بھی معدوم نہ ہوگی۔ انسان اپنی حالت کے باوجود انسانیت سے گہرا شغف رکھیں گے۔ وہ پھر بھی وہی کچھ بوتے رہیں گے۔ جس کے کاٹنے کی توقع نہ کر سکیں گے وہ مستقبل کی کشش یعنی ارتقا کے جذب سے برابر مغلوب رہیں گے۔ وہ برابر بجا طور پہ محسوس کرتے رہیں گے۔ کہ نسلی روح میں سرشار ہو کر اپنے انفرادی مقاصد کو ترک کر دینا زندگی کی بہترین شکل ہے۔ اور یہی بہترین بسر کرنے کے قابل زندگی ہے۔ وہ برابر اپنی قربانی دینے پہ آمادہ رہیں گے۔ وہ اس شدت آموز وصف کے لئے جو صرف نسلی نصب العین ہی سے پیدا ہو سکتا ہے۔ اور صداقت کے لئے اور انصاف کے لئے برابر جانیں دیتے رہیں گے جس طرح مائیں اپنے بچوں کی خاطر جان دینے پہ آمادہ رہتی ہیں بعض ایسے انسان بھی جو بقا یا دوام کی کسی شکل پہ اعتقاد نہ رکھتے تھے۔ محض سچائی کی خاطر نہایت جرأت سے قتل گاہ کو چلے گئے۔ اور آج کل بھی یعنی فکر کے اس عبوری انتشار کے دَور میں بھی بہت سے انسان (جو مذکورہ عقیدے پہ قائم ہیں) اپنی زندگیوں کو انسانی ترقی اور بے غرضانہ صداقت کی خاطر مخلصانہ وقف کئے ہوئے ہیں۔ لیکن ان تمام اُمور کے

باوجودیکہ میں تسلیم کرتا ہوں۔ کہ "کامل اور عالمگیر فنا" کے عقیدے کا یقین (کافی منظم تربیت مفقود ہونے کی صورت میں) بعض اذہان کے لئے نہایت قوی محرک کا کام دے گا۔ اور جب وہ دیکھیں گے۔ کہ "آخر فنا" ہے۔ تو وہ قوت وطاقت اور مادی لذتوں کے حصول کے لئے زیادہ اندھا دھند طور پر گیرودار میں مصروف ہو جائیں گے۔

لیکن اس قسم کا یقین بالکل غیر عقلی ہے۔ یہ یقین ہرگز قطعی اور پختہ نہیں ہوسکتا۔ اور ہمارے پاس اس دعوے کا بھی کوئی منطقی جواز موجود نہیں۔ کہ ہم اس کو "اغلب" ہی سمجھ لیں۔ اس امر میں عملاً کوئی شبہ نہیں۔ کہ ہمارے وجود کا موجودہ اسلوب۔ اور ہمارا انفرادی شعور قوتوں کے بعض مجموعوں پر منحصر ہے۔ جو ہماری اعضائی ترکیب کے اجزا ہیں۔ لہٰذا جب یہ مجموعے غائب و معدوم ہو جائیں گے۔ تو وجود یقیناً ختم ہو جائے گا لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں مترتب کیا جاسکتا۔ کہ ہستی کا جو اسلوب ہمیں معلوم ہے۔ صرف وہی موجود ہے۔ اور کوئی دوسری شکل موجود نہیں۔ کائنات کوئی جسمانی عضوئیت نہیں۔ لیکن پھر بھی اس کا وجود ہے۔ اُس کے وجود کی نوعیت کیا ہے؟ ایک بات بالکل واضح ہے۔ مادہ کا تصور۔ آج کل کے زمانے میں اور غیر ناقد انسانوں کے نزدیک لازماً یہی رہا ہے۔ کہ وہ "بے جان شئے" ہے۔ یہ تصور اُتنا ہی فریب آمیز اور لغو و مہمل ہے۔ جتنا کوئی پست ترین اور وحشیانہ صنمیاتی افسانہ بے معنی ہوسکتا ہے۔ یہ کہنا۔ کہ ایک چیز جو مادہ کہلاتی ہے۔ اُس کا وجود ہمارے احساس سے علیحدہ ہو چکا ہے۔ اور اس کے وجود کی نوعیت (جب ہم اسے محسوس نہیں کرتے) یہ ہے۔ کہ وہ وسیع اور ناقابل نفوذ اور عظیم الہیئت وغیرہ ہوسکتا ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں یہ۔ کہ جب ہم اس کو محسوس نہیں کرسکتے۔ تو اس میں سے جو کچھ رہتا ہے۔ وہ خالصتہً اور لازماً "محسوسیت" پر مشتمل ہے۔ یہ کہنا

گویا ایک ہی سانس میں اپنی کامل تغلیط خود کرتا ہے۔ غالباً اس سے زیادہ براہ راست اور آشکارا تناقض بالذات امکان ہی میں نہیں۔ ہم کائنات کو دیکھتے ہیں۔ اس کو محسوس کرتے ہیں۔ لیکن یہ کہہ کر کہ یہ قابل دید اور قابل احساس ہے۔ اور عظیم۔ وزنی اور سخت ہے۔ یہ سمجھنا کہ ہم اس کے وجود کی نوعیت بیان کر رہے ہیں قطعی طور پر "بے معنی" ہے۔ اور کسی نظام الٰہیات کو بھی اس عجیب و غریب بیہودگی سے متہم نہیں کیا جا سکتا۔ "غیر محسوس محسوسیت" کسی امکان کا اظہار نہیں۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے۔ جیسے "سفید سیاہی"۔ یہ متضاد و متباین محمولات کی ایک فکری گڈمڈ ہے۔ اور صرف خالی خولی آوازوں کا ایک سلسلہ ہے۔ جس میں خیالات یا الفاظ کا کوئی دخل نہیں۔ بلاشبہ ہمارے تصور میں مادہ ایک "محسوسیت" اور ایک پھیلی ہوئی۔ سخت اور قابل مشاہدہ چیز ہے۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے ہمیں اس کا عرفان ہوا ہے۔ یا کبھی ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ تسلیم کرنے کے لئے عقلیت کے ابتدائی اصولوں کی نہایت بنیادی اطاعت ضروری ہے کہ جو چیز محسوس کی جاتی ہے۔ اس کے وجود کا کوئی نہ کوئی اسلوب محض "محسوسیت" کے علاوہ بھی ہونا چاہئے۔ یا اگر وہ محسوس نہیں کی جاتی۔ تو اس کا کوئی وجود ہی نہیں۔

ہم وجود کی ایک اور شکل سے بھی واقف ہیں یعنی خود اپنے وجود کا احساس رکھتے ہیں۔ یہ مُردہ وجود نہیں۔ بلکہ زندہ وجود ہے۔ صرف "محسوسیت" نہیں۔ بلکہ احساس ہے۔ اب کوئی ایک درجن مختلف اور الگ الگ خطوطِ فکر و استدلال ہیں (جن کی تفصیل یہاں طوالت کا باعث ہوگی) جن سے یہ ثابت کیا جا سکتا ہے۔ کہ یہ تصور نہایت غیر اغلب اور نارو امفروضہ ہے کہ وجود کی دو کاملاً اور لازماً مختلف شکلیں موجود ہیں۔ ایک بات تو یہی ہے کہ یہ مفروضہ ہر قسم کے سائنٹفک تصور بلکہ خود ارتقا کے تصور کے قطعی خلاف

ہے۔ مَیں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ کہ اس مفروضہ کی تردید کی جا سکتی ہے۔ (اس قسم کا مفروضہ اسی صورت میں رَد کیا جا سکتا ہے۔ کہ ہم ثابت کر دیں کہ اس میں قطعی تضاد بالذات موجود ہے) لیکن یہ دعویٰ بلا دلیل ہے۔ جس سے مُہلک مشکلات پیدا ہوتی ہیں۔ اور جس پہ بارِ ثبوت عائد ہوتا ہے۔ مخصوص تخلیق کا مفروضہ کسی طریقے سے ممکن ہے۔ کہ رد نہ کیا جا سکے۔ لیکن یہ انتہائی کمزور اور بے دلیل مفروضہ ہے۔ جو ہرگز اس قابل نہیں۔ کہ اس پہ نظریۂ ارتقا کے پہلو بہ پہلو غور کیا جا سکے۔

اس سادہ سے قیاس کے لئے اعلیٰ درجے کا سائینسی احتمال اور امکان موجود ہے۔ کہ جن چیزوں کو ہم نسیجی خلیے۔ اعصابی خلیے اور دماغی خلیے (یہ آخر الذکر خلایا نوعیت یا وظائف کے اعتبار سے کسی لازمی پہلو میں دوسرے مُوینی خلایا سے ہرگز مختلف نہیں ہیں) خیال کرتے ہیں۔ اور دوسری طرف جن چیزوں کو ہم احساس یا شعوری وجود کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں اپنے اسلوبِ وجود کے لحاظ سے قطعی طور پہ مختلف نہیں ہیں۔ بلکہ یہ ایک ہی چیز ہے۔ جس سے ہم دو مختلف نقطہ ہائے نگاہ سے آگاہ بنائے جاتے ہیں۔ گویا باہر سے بھی اور اندر سے بھی ہمیں اس ایک شئے سے آگاہی ہوتی ہے۔

گویا ہم دو نتیجوں پہ پہنچتے ہیں۔ جن میں سے ایک تو قطعی طور پہ یقینی ہے۔ اور دوسرا ایک نہایت قریب بہ صحت سائینسی مفروضہ ہے (۱) مادّہ کے متعلق یہ تصور کہ وہ محض مُردہ محسوسیت ہے۔ بالکل لغویات ہے۔ اور عقلی تفکر میں قطعاً ناقابلِ قبول ہے (۲) اس امر کا امکان غالب ہے۔ کہ وہ ہمارے احساس سے علیحدہ جس قسم کا وجود رکھتا ہے۔ وہ ہمارے اپنے احساس وجود سے بہت زیادہ مشابہت رکھتا ہے۔ مُردہ وبے احساس وجود سے مشابہت نہیں رکھتا۔

اب ہمیں اس امر کی احتیاط کرنی چاہئے کہ ان دونوں ٹھوس عقلی نتیجوں کو صرف اسی قدر اہمیت دیں جس کے وہ اپنی عقلی بنیاد پر حقیقۃً مستحق ہوں۔ ایسے سوالات پر اگر تعصبات کا مخصوص غلبہ نہ ہوتا۔ تو یہ نتائج بھی حرکتِ ارض کی طرح عالمگیر طور پر مسلّم قرار پا جاتے۔ ان نتائج کا اس قدر غلط استعمال ہوا ہے کہ عقلی ذہنیت کے لوگ ان سے بدظن ہو گئے ہیں۔ جب آج کل کا کوئی فلسفی مُردہ مادّے کے تصوّر کی تائید کرتا ہے۔ تو اکثر حالات میں آہستہ آہستہ "انتالیس دفعات" کا ثبوت بہم پہنچا دیتا ہے۔ اور وہ لوگ جو "انتالیس دفعات" کو ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ اس فلسفی کو نجات دہندہ اور آزاد کرنے والا سمجھ لیتے ہیں اور نہایت فاتحانہ طور پر اس کے دلائل و براہین کو قابلِ نفرت مادہ پرستوں کے حلق میں اُتار دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے۔ کہ بہت سے لوگ (حالاتِ موجودہ میں وہ معذور بھی ہیں) اس امر کو ترجیح دیتے ہیں۔ کہ صاف اور سیدھی "مادہ پرستی" سے چمٹے رہیں۔ مادّہ کی مابعد الطبیعیات کا تجسّس نہ کریں۔ اور اس قسم کی شعبدہ گری سے کوئی واسطہ نہ رکھیں۔

جب یہ صحیح اور جائز نتیجہ نکالا جاتا ہے۔ تو یہ کائنات حقیقۃً جس چیز کی بنی ہوئی ہے۔ وہ غالباً اپنی نوعیت میں ہمارے اپنے زندہ ذہن کے مواد سے ملتی جلتی ہے۔ اور "مُردہ محسوسیت" جیسے متضاد اور بےمعنی تصوّر سے کوئی واسطہ نہیں رکھتی۔ تو لوگ جھٹ وحدت الوجود کے تصوّر تک جا پہنچتے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔ کہ کائنات بھی ہماری طرح ایک ذہن رکھتی ہے لیکن یہ مفروضہ زیرِ بحث نتیجے سے کلی طور پر مختلف ہے۔ اور اس سے اُس نتیجے کی کوئی تائید نہیں ہوتی۔ ہمیں صرف یہی کہنے کا حق حاصل ہے۔ کہ ہمارا اسلوبِ وجود یقیناً "مُردہ محسوسیت" کی بنا پر ممکن نہیں۔ بلکہ یہ عمومی حیثیت زیادہ صحیح طور پر وجود کے اصلی معنی کا مظہر ہے۔ اور کسی دوسرے موضوع تصوّر سے تعلق نہیں رکھتا لیکن یہ تصوّر کہ کائنات بھی ہمارے ذہن کی

مانند ہے۔ ناقابلِ تائید اور غیر معقول ہے۔ مثال کے طور پہ "جنسی یا ہیجان" کی کیفیت کائنات کے معاملے میں کچھ معنی نہیں رکھتی۔ اور اس کی صاف وجہ یہ ہے کہ کائنات سے خارج میں کوئی ایسی چیز ہی نہیں جسے وہ محسوس کر سکے۔ اسی طرح "فکر" بھی جو ایک تکمیل یافتہ ہیجان کے سوا کچھ نہیں اور اُسی کی مانند ایک مقصد کا ذریعہ ہے۔ کائنات سے منسوب نہیں کیا جا سکتا کوئی تعریف جو ہمارے ذہن کی شکل پہ عام طور پہ منطبق ہوتی ہے۔ کائناتی ذہن پہ صادق نہیں آتی۔

اب گویا ہمارے سامنے دو متبادل ہیں (۱) یا تو کائنات (مادہ) ذہن کی کوئی ادنیٰ اور ابتدائی شکل ہے۔ یا (۲) یہ ذہن کی کوئی بلند تر صورت ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے۔ ہمارے پاس کوئی ایسی وجہ موجود نہیں جن کی بنا پر ایک مفروضے یا دوسرے مفروضے کے امکان و احتمال کی حمایت کی جا سکے۔

مَیں ایک اور مصلحت کی طرف بھی اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ کہ ہم فطرت کی ہم آہنگی کے متعلق "ایک ضرورت" کی حیثیت سے گفتگو کیا کرتے ہیں۔ یہ بالکل غلط ہے۔ "ضرورت" کے تصور کا صحیح اطلاق صرف منطقی اشارات پہ ہو سکتا ہے۔ مثلاً ایک چیز بیک وقت موجود اور غیر موجود نہیں ہو سکتی۔ اور دو اور دو ہمیشہ چار ہوتے ہیں۔ یہ بات جان سٹوارٹ مِل کے قول کے باوجود کسی "کائنات" میں بھی صحیح ہی ہوگی لیکن اس امر میں کسی "ضرورت" کو دخل نہیں۔ کہ پتھر زمین ہی پہ گرنا چاہئے۔ یہ حقیقت ہے۔ کہ ایک خاص علت کے بعد معلول نمودار ہوتا ہے۔ اور یہ تسلسل تا ابد صحیح رہے گا۔ لیکن اس سے اس کا "ضروری" ہونا تو ثابت نہیں ہوتا۔ ہم تو صرف یہ جانتے ہیں۔ کہ شاید یکساں تسلسل یکساں قوتِ ارادی کی کوئی شکل ہوگی۔

مَیں نے اصل موضوع سے ہٹ کر یہ جو مابعد الطبیعیاتی بحث چھیڑ دی۔

اس سے اس امر کا اثبات مقصود تھا۔ کہ یہ تصوّر نہ عقلی طور پہ یقینی ہے۔ نہ ہو سکتا ہے۔ کہ ہماری انفرادیت کی تحلیل و تنسیخ یعنی اُس غیر فانی توانائی کی جدید تقسیم جس سے ہماری ترکیب ہوئی ہے۔ لازماً یہ معنی نہیں رکھتی۔ کہ اس کائنات سے ہمارا کوئی مستقل مفاد وابستہ نہیں۔ لہٰذا عقلی فکر کا نشوو ارتقا، اس کے اسلوب کا پھیلاؤ اور اس کے اقتدار کا تیقن نہلزم (مذہب انکار) کے لئے باعث تقویت نہیں ہو سکتا۔ نہلزم کا نقطۂ نگاہ اس انسانیت کا نقطۂ نگاہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ جو اپنے علم اور اپنی یقینیات کی واحد اور جائز بنیادوں کی اطاعت کا شعور رکھتی ہے۔

۴

اخلاق کی رفتار

آج جبکہ آنے والے تغیر کا پیغام ہر دیوار پر روشن حروف میں ثبت ہے۔ زمانۂ قدیم کی طرح ایک شقت سے کراہتی ہوئی دنیا میں ہم کو پُرانے علاجوں کے اختیار کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ شخصی نیکیوں کی مشق اور ترک اغراض کا مشورہ دیا جاتا ہے۔ یعنی "اپنی اصلاح کرو۔ اسی طریقے سے ساری دُنیا کی اصلاح ہو جائے گی۔"

ایسے علاج تجویز کئے جا رہے ہیں۔ انسانی معاشری عضویت کے بنیادی احوال و ضروریات سے توجہ کو منحرف کیا جا رہا ہے۔ ذہنی اعتبار سے آسان تر اور کاہلانہ اخلاقی مُسکنات کی طرف متوجہ کیا جا رہا ہے۔ ذاتی نیکیوں کی تلقین کی جا رہی ہے۔ تاکہ حفاظتی طور پر انھیں اختیار کر کے اُن پہ اصرار کیا جائے۔ اور عقلی سعی و کوشش اور عدل و انصاف کے عزم کو بالکل خارج از بحث اور مذبذب نظر انداز غافل رکھا جائے۔ یہ تمام چیزیں اُن ناکامیوں کا

تخیقی باعث ہیں۔ جو آج نہایت سختی کے ساتھ ہمیں درپیش ہیں ۔ ہمارے معاشری نظام میں جتنی بھی ترقی رونما ہوئی ہے۔ وہ کسی آسودہ خاطر انفرادی خودمنزلیتی یا پرہیزتِ ترک نفس کشی یا زاہدانہ وجدانہ ترنگ کا نتیجہ نہیں ۔ بلکہ عمیق غور وفکر اور منصوبہ کاری۔ خرابیوں کی بنیادوں کے بیباکانہ مقابلے اور مزاحمت کی پیداوار ہے۔ جس بے انصافی اور حق کشی سے ہمارے آباو اجداد کی دنیا لبریز تھی۔ اور جس فاسقانہ بے راہ روی سے اُن کے مروجہ اخلاقی خیالات متاثر تھے۔ وہ آج ناقابل تصور طور پر لغو و بیہودہ قرار پا چکے ہیں۔ یہ نتیجہ فرد کی اصلاح سے مترتب نہیں ہوا۔ بلکہ دنیا کے فکر کی اصلاح سے اس ذہنی و مادی وسیلے کی اصلاح سے جس میں انسان نشو و نما پاتا ہے۔ اور اس کے احوالِ حیات اور اس کے فکر کی نوعیت کی اصلاح سے معرض ظہور میں آیا ہے۔ "اپنی اصلاح کرو" کی نسبت یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ کہ "دنیا کی اصلاح کرو۔ تمہاری اپنی اصلاح خود بخود ہو جائے گی"۔ انسان اُسی قسم کی دنیا کی پیداوار ہوتے ہیں جس میں وہ زندگی بسر کرتے ہیں اُس دنیا کے اور انسان اور انسان کے درمیان روابط کی جو حقیقی حیثیت ہوتی ہے۔ اور جو افکار و اقدار اس حقیقی دنیا کے مطابق ہوتے ہیں ۔ وہی انسان کی حیثیت کو متعین کرتے ہیں۔ ذاتی و شخصی اخلاقیت اتنی زیادہ اہم نہیں جتنی اجتماعی اور غیر مسلمہ بداخلاقی اہم ہے۔ اور اخلاقی ترقی کا یہ مطلب نہیں۔ کہ وہ زمانے کے اخلاقیاتی نصب العینوں کے مطابق ہو۔ بلکہ اس کا انحصار اس امر پر ہے۔ کہ اُن نصب العینوں کے منافیِ اخلاق ہونے کا پتہ چلایا جائے۔ ذاتی اور شخصی نیکی دنیا میں بے حد قابل تعریف چیز ہے۔ لیکن اس کے باوجود دنیا کی اخلاقیت کو ذاتی نیکی سے ترقی حاصل نہیں ہوتی بلکہ اُن متغیر حالات سے حاصل ہوتی ہے۔ جو انسانی مفادات کی کش مکش میں عقلی تنقید کی قوت کو استعمال کرنے سے پیدا ہوئے۔

ہمارے دَور نے اخلاقیات کی تمام روایاتی اَسناد کو معدوم ہوتے ہوئے دیکھا۔ اس دَور نے ہر جذبے اور ہر رسمِ قدیم کے چہرے کے نقاب نہایت بیباکانہ چاک کر دیئے۔ اس نے عدیم المثال جرأت سے کام لے کر نیکی اور بدی کے اصُول تک کو ہدفِ شُبہ بنایا۔ اس متشکک اور بُت شکن دَور نے پرہیزگاری اور دردمندی کے اُن نصب العینوں کو (جن کا اَدوارِ ماضی نے خواب دیکھا تھا، جن کی ہمیشہ تلقین کی گئی) زیادہ عملی طور پر نتیجہ خیز بنایا ہے اور اُن کے حصول کی بہتر مساعی انجام دی ہیں۔ یہ مخلصی یافتہ اور مُلحد دَور اس سے بھی آگے بڑھ گیا ہے۔ اس نے اُن نصب العینوں کو بلند تر کر دیا ہے۔ نئے نصب العین تخلیق کر رہا ہے۔ اور اخلاقیات کے وسیع تر اور صادق تر تصوّر کے نشوو ارتقا کا جلوہ دیکھ رہا ہے۔ جس سے ایک بلند تر اخلاقیت ارتقا پذیر ہو گی۔ موجودہ دَور اس کام کو صرف رسمی اور قیاسی طریقے سے انجام نہیں دے رہا ہے۔ نہ جدید ضوابط کی نظریاتی ترتیب کر رہا ہے۔ بلکہ اس کے احساس اور جذبے میں اُن خیالات کا زندہ عکس نظر آ رہا ہے۔ جو اس دَور کی ذہنی فضا کو مالا مال اور لبریز کر رہے ہیں۔

اس نشوو ارتقا کا سب سے بڑا عنصر بالکل ارتقائے انسانی کا وُہ ادراک و شعور ہے۔ جس پر ہم اب تک غور کرتے رہے ہیں۔ ہم نے اس سے پیشتر ذکر کیا ہے۔ کہ نسلِ انسانی کی زندگی کا یہ ادراک ایک بالکل نیا تصوّر ہے۔ کہ وہ وحشت و حیوانیت سے نشوونما پاتے ہوئے موجودہ حالت تک پہنچی ہے۔ اس کو ایک زبردست فطری قوت برابر آگے بڑھا رہی ہے۔ اس پر ایسے قطعی اور ناقابلِ انحراف قوانین کی حکمرانی ہے۔ جن پر ماضی کی طرح مستقبل میں بھی اُسی طریقے سے اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ جیسے سیاروں کی گردش پر حکمرانی کرنے والا قانون قابلِ اعتماد

ہے۔ اس سے پیشتر کی دُنیا میں ایسا کوئی عقیدہ موجود نہ تھا۔ جو اس قدر عام
طور پر پھیلا ہُوا ہو۔ بلاشبہ بعض "خیالی دُنیاؤں" کے تصورات موجود تھے
لیکن "خیالی دُنیا" (یوٹوپیا) بھی کیا ہے؟ وہ بھی جا تکمیل کا ایک پُرحسرت
خواب ہے۔ بعض قوموں نے قومی اعتبار سے اپنے ہزار سالہ "دورِ سعادت"
کے تصورات بھی قائم کئے۔ مثلاً یہودیوں نے مسیح کی حکومت کا خواب
دیکھا۔ پھر آگسٹس کے زمانے میں روما الکبریٰ نے بھی "دورِ سعادت"
کا تصور کیا۔ لیکن یہ تمام خیالات اُس ترقی سے کاملاً متفاوت ہیں۔ جو
ایک قانونِ قدرت کی حیثیت سے تسلیم کی جاتی ہے۔ ناگزیر اور لازمی
نشو ونما کا عمل نسلِ انسانی کی زندگی کا لازمی جزو ہے۔ اُسی نے اس کو تخلیق
کیا ہے۔ اس کی تشکیل کی ہے۔ اس کو موجودہ قوتوں سے مالا مال کیا
ہے۔ ناقابلِ مزاحمت رکاوٹوں کو دور کیا ہے۔ کہ انھیں اپنے فائدے
کے لئے استعمال بھی کیا ہے۔ وہ روزانہ ماضی کو پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔ نئے
اُدوارِ مستقبل کے دروازے کھولتا ہے۔ اور وہ اسی صورت میں فنا ہوگا۔
جب روحِ انسانی خود فنا ہو جائے گی۔ نشو ونما کا یہ تصور زمانہ حال ہی
کا انکشاف ہے۔

اور جس قدر یہ انکشاف واضح تر۔ کامل تر اور ہمارے خیالات سے
قریب تر ہوتا جاتا ہے۔ اُسی قدر یہ حقیقت ہم پر زیادہ واضح اور مرتسم ہوتی
جاتی ہے۔ کیونکہ ہم "افراد" ہیں۔ اسی عظیم دریائے زندگی کے قطرے اور
اسی عظیم عمل کے لمحے ہیں۔ ہمارے احساسات۔ ہماری خواہشات۔
ہماری خوشیاں۔ ہمارے غم۔ ہمارے مفادات۔ ہمارے نصب العین
غرض ہماری پوری ہستی ماضی کی تمام نسلوں کی آہستہ آہستہ جمع کی ہوئی
سماوار ہے۔ ہماری زندگی لاکھوں کروڑوں زندگیوں۔ بے شمار
کوششوں۔ خواہشوں اور کشمکشوں کا ایک ثمر ہے۔ ہم علیحدہ اور

منقطع وجود میں نہیں ہیں ۔ بلکہ انسانی وجود کا ایک "پلندا" ہیں ۔ ہماری "خودی" تمام ادوارِ ماضی کا حاصل ہے ۔ ہماری انفرادیت ایک دھوکا ، ایک مغالطہ ہے ۔ یہ صرف نسلِ انسانی کی وسیع تر زندگی کا حاصل اور جزوِ ترکیبی ہے ۔ جو اُسی روح اور انہی خواہشات کے تقاضے سے (جو ہماری محرک ہوتی ہیں) آگے بڑھتی چلی جاتی ہے ۔ ہمارے افکار ہمارے افکار نہیں ہیں ۔ بلکہ انھیں بعید ترین ماضی نے تعمیر کیا ہے ۔ ہمارے انفرادی حدِ اختیار کی طوالت اور ہماری رفتار کی اہلیت ممکن ہے ۔ کہ اس دور کے ظاہر کردہ فکر سے ذرا آگے ہو ۔ لیکن اس کا تعین بھی اسی مرحلۂ ارتقا سے ہوتا ہے ۔ جس پر ہم پہنچ چکے ہیں ۔ خود ہماری خوشیاں بلکہ ہمارے مخصوص احساسات اور ذوق بھی نسلِ انسانی کی زندگی کے مظہر ہیں ۔ کوئی فرد ایک بھی ایسی خصوصیت پیش نہیں کر سکتا ۔ جو اُس معاشری نظام کا براہِ راست نتیجہ نہ ہو ۔ جس کے ماتحت وہ اور اُس کے آبا و اجداد زندگی بسر کرتے رہے ہیں ۔ ہم انسانیت سے الگ کوئی شئے نہیں ہیں ۔

بعض پُرجوش اور ذکی الحس لوگوں پر جب "دُنیا بیزاری" کا دورہ پڑتا ہے ۔ تو وہ عام طور پر اپنے ارد گرد کی انسانی دُنیا ۔ اس کی بدصورتی ۔ اس کے ابتذال اس کے مکر ۔ اس کی ظاہرداریوں ۔ اس کی دروغ بافیوں ۔ اس کی جہالت ۔ اس کی ناانصافی اور اس کی درندگی کو دیکھ کر لامحدود نفرت کے احساس سے لبریز ہو جاتے ہیں ۔ اُن کی رُوحیں اس دُنیا کے بظاہر لاعلاج تعصبات اور اس کی پست جبلتوں سے بیحد اذیت محسوس کرتی ہیں ۔ وہ "وحشیوں ، ناشائستہ انسانوں اور عوام" کے ساتھ جو دُنیا کی آبادی ہیں ۔ رابطہ قائم کرنے سے پرہیز کرتے ہیں ۔ کہ مبادا خود داغدار ہو جائیں ۔ انھیں شرمناک جہالت ۔ دغابازی اور

بظاہر مغزز بدکاری کو مظفر و منصور دیکھ کر سخت کراہت محسوس ہوتی ہے۔ وہ چاہتے ہیں۔ کہ اس بدنما انسانی دُنیا سے بھاگ جائیں۔ اور تنہائی میں قدرت کے مناظر کے درمیان اور اچھوتے پہاڑوں کی پُر جلال بلندیوں پر جاکر پناہ لیں۔ وہاں حُسن فطرت کے حیات بخش اور رفیع و برتر اثرات سے اپنے آپ کو لبریز کرلیں۔ اور اپنی دُنیائے فکر کو دُنیائے انسانی کی پستی اور کمینگی سے کاملاً محفوظ اور بے داغ رکھ کر لُطف اندوز ہوں لیکن اُنھیں علم نہیں۔ یا وہ اس بات پر غور نہیں کرتے۔ کہ یہ تمنائیں۔ یہ اُونچے نصب العین۔ یہ بلند جذبات، ذہن کی یہ تحریکات اور مسرّتیں۔ ان مسرّتوں کے نقائص اور فطرت کے بلند تاثرات اور افکار و تصوّرات کی وہ دُنیا جس میں وہ تنہا زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ حقیقت میں اُسی انسانی دُنیا کی پیداوار ہیں جس سے وہ نفرت و حقارت کے ساتھ اس طرح احتراز کرنا چاہتے ہیں۔ جیسے کوئی پلید اور خبیث چیز سے کنارہ کشی اختیار کرلے۔ یہی وہ دُنیا ہے۔ جس میں اُن کی روحوں کا جوہر نشوونما حاصل کرکے پیدا ہوا۔ یہیں اُن کی تخلیق ہوتی۔ یہی عالمِ انسانی۔ ہے۔ جس نے اپنے تمام نقائص اور جذبوں کے باوجود اپنی روزانہ کش مکش اور جد وپیکار کی زندگی میں سے اس رُوح کو جنم دیا۔ جو ان افراد کو بلند سطح پر پہنچاتی ہے۔ یہی وہ انسانیت ہے۔ جس نے ان کو دیکھنے والا اور فتح حاصل کرنے والا رفیع و برتر ذہن عطا کیا ہے۔ انسانیت کی عام اور مشترک زندگی نے لاکھوں سال کی مُدّت گزاری ہے۔ جو موجودہ زندگی کے مقابلے میں بے انتہا تاریک، مہیب اور بدنما تھی۔ اور اسی زندگی نے اُن تمام خیالات و احساسات کی تشکیل کی ہے۔ جن میں یہ لوگ مفرورانہ پناہ لیتے ہیں۔

اور جس طرح ہم گزشتہ نسلوں کی پیداوار ہیں ۔ اسی طرح ہم نسل انسانی کے آیندہ ارتقا کے معمار بھی ہیں ۔ جس طرح ماضی کا یہ وظیفہ تھا ۔ کہ ہمیں وہ کچھ بنا دے ۔ جو ہم ہیں ۔ اسی طرح مستقبل بھی ہمارے وجود اور عمل پر منحصر ہے۔

ہستی کی عظیم پہیلی ، عظیم معروضی کائنات جو ہمارے گرد پھیلی ہوئی ہے ۔ اس کی نوعیت اور اس کے معنی غالباً ہمیں کبھی معلوم نہ ہو سکیں گے ۔ لیکن اب ہمیں اس امر کا ادراک ہو رہا ہے ۔ کہ یہ نا ممکن علم اتنا لازمی نہیں ۔ جتنا ہم یقین کرتے چلے آتے ہیں ۔ ایک بات کا تو ہمیں پورا یقین رکھنا چاہئے ۔ کہ اگر ہمیں معمے کا لفظ مرکزی معلوم ہوتا ۔ تو ہم جو کچھ اب جانتے ہیں ۔ اس سے زیادہ یقینی کوئی بات نہ ہوتی ۔ کہ اس عظیم کائنات میں ہمارا حصّہ کاملاً ہماری نسل کی زندگی اور تقدیر میں مضمر ہے ۔ ہمیں اب یقین ہے ۔ کہ اگر آخری پردۂ راز چاک بھی کر دیا جائے تو ہم پر یہی منکشف ہوگا ۔ کہ ہمارا کام ۔ ہمارا وظیفہ اور ہمارا فرض صرف نسلِ انسانی سے وابستہ ہے ۔ ہمیں ستاروں کی گزرگاہوں کو تبدیل کرنے یا سحابیوں (نیبولا) کے شعلوں کو روشن کرنے سے کوئی واسطہ نہیں ۔ بلکہ ہمارا کام صرف یہ ہے ۔ کہ دُنیائے انسانی کی تعمیر کریں ۔ اس کو بہتر اور عظیم تر بنائیں ۔ انتھک سعی و کوشش اور مسلسل ترقی کے اُس قانون کی تکمیل کریں ۔ جو نسلِ انسانی کی پوری زندگی پر حُکم رانی کرتا ہے ۔ اور ہماری زندگی جس کا ایک جُزو لاینفک ہے۔

ہماری ہستی کس حد تک اور کن معنی میں عارضی یا پائدار ہے۔ اس کا کتنا حصہ آنی اور وقتی ہے۔ اور ان عالمگیر اور غیر فانی قوتوں کے اتصال میں جن کو ہم اپنی "خودی" کہتے ہیں۔کتنا حصہ غیر فنا پذیر ہے۔ ان چیزوں سے مسئلہ تنقیح طلب پر بنیادی اعتبار سے کوئی اثر نہیں پڑتا۔ جو چیز ہمارے اندر رواں دواں ہے۔ جو چیز ہم ہیں۔ اس کا سرچشمہ ناقابل بیان گزشتہ ازمنہ میں ہے اور یہ چیز برابر رواں رہے گی۔ہم اور یہ چیز دونوں ایک ہی شئے ہیں۔ اس مسلسل رَو کے ساتھ ہمارے انفرادی رابطہ کا صحیح اسلوب ایسا ہے یا نہیں۔کہ ہماری تمام خواہشات کی تکمیل کر سکے۔ اور ہم اسے سمجھ سکیں۔ اس کو چھوڑ دیجئے۔لیکن یہ حقیقت تو واضح ہے۔کہ ہم اس رَو کی رفتار کے باہر (جس کا ہم ایک حصّہ ہیں) نہ کوئی خواہش کر سکتے ہیں۔ نہ سوچ سکتے ہیں۔ نہ عمل کر سکتے ہیں۔ اگر ہماری کوئی غرض ہے۔ اگر ہماری کوئی تمنّا ہے۔ اور اگر کائنات سے ہمارا کوئی مستقل مفاد وابستہ ہے۔تو یہ سب کچھ ہماری نسل ہی کی خواہشات نشو و نما اور تقدیروں کے ساتھ محدود اور بندھا ہُوا ہے۔

اگر یہی کیفیت ہے۔تو "بے غرضانہ ایثار" کا نصب العین جو اب تک اخلاقیت کا نقطۂ کمال تصوّر کیا جاتا رہا ہے۔محض جزوی اور غیر مکمل نصب العین معلوم ہوتا ہے۔نسل انسانی کی زندگی سے ہمارا تعلق (جیسا کہ اس نصب العین کا مفروضہ ہے) صرف موجودہ نسل تک

محدود نہیں ۔ اور صرف ان بنی نوع کے ساتھ ہی نہیں ۔ جن سے ہم کو حقیقتہً سابقہ پڑا ہے۔ بلکہ اس تعلق کی حدود اُن نسلوں تک وسیع ہیں ۔ جو ابھی پیدا نہیں ہوئیں ۔ یہ تعلق انسانیت کے پورے مستقبل پر حاوی ہے ۔ اور لازماً اور نتیجتاً مستقبل ہی سے متعلق ہے ۔ ہمارا تعلق ہمارے معاصرین کے ساتھ ہمارے اخلاقیاتی رابطہ کے صرف ایک قلیل حصے پر مشتمل ہے ۔ نسلِ انسانی جس تقدیر کی تکمیل کر رہی ہے۔ اور اس کے حصول کے عظیم عمل میں ہمارا جو کچھ حصّہ ہے۔ اس میں بہتر اور عظیم تر " بے غرضانہ ایثار" کو دخل ہے ۔ اس عظیم فطری عمل پر حقیقت میں جس قانون کی حکمرانی ہے ۔ اُس کے نزدیک موجودہ نسل محض آیندہ ارتقا کا ایک زینہ ہے ۔ وہی ارتقا اہم ترین مقصد ہے ۔ اور دوسرے تمام مقاصد اُس سے فرو تر ہیں ۔ حال کو اس کے سوا اَور کوئی اہلیت حاصل نہیں ۔ کہ وہ ایک "تخم" ہے ۔ جو مستقبل کو متعین کرتا ہے ۔ حال کو مسلسل طور پر مستقبل کے مقابلے میں قربان کیا جاتا ہے ۔ ہر بعد میں آنے والا لمحہ اُس عمل کا تاج ہے ۔ جس کا وہ صرف ایک عارضی پہلو ہے ۔

جو قانونِ قدرت حقیقت میں انسانی تقدیر پر حکمرانی کرتا ہے ۔ اس میں قدر و قیمت کا یہی معیار رائج ہے ۔ اگر انسانی عمل کے شعوری اصول اور وہ معیار جن سے ہم اُسے جانچتے ہیں ۔ حقائقِ اصلی کی حقیقی بنیاد پر مبنی کرنے ہیں ۔ اگر ہم انھیں مصنوعی اور مستبدانہ رسم و رواج سے

کوئی بہتر حیثیت دینا منظور ہے۔ اگر انھیں اُن قوانین سے ہم آہنگ بنانا ہے۔ جو (ہماری آرا و میلانات سے بے پروا ہو کر) امورِ انسانی کی رفتار پر حکمرانی کرتے ہیں۔ اگر اصول و معیارات کو ان قوانین کی براہِ راست اور بیکار مخالفت نہیں کرنی ہے۔ تو ضروری ہوگا۔ کہ ہم اپنے اخلاقیاتی فیصلوں اور تخمینوں کی تشکیل انہی قوانین کے مطابق کریں۔ نیکی اور بدی اور حق و باطل کا پیمانہ انہی قوانین کے مطابق قائم کرنا ہوگا۔ جن پر ان اخلاقی تصورات کی حقیقی و قطعی اہمیت منحصر ہے۔ جو قدرتی عمل انسانی زندگی کی رفتار پر حکمران ہے۔ وہ انسانی اعمال و حاصلات پر بعض قطعی اقدار کا ٹھپّا لگا دیتا ہے۔ وہی حقیقی اور قدرتی اقدار ہوتی ہیں۔ باقی تمام اقدار مصنوعی اور مستبدانہ ہیں۔ خواہ ہم اسے پسند کریں یا نہ کریں۔ قدرتی پیمانے میں وہی فعل نیک ہے۔ جو انسانی نشو و ارتقا کے عمل میں ممد و معاون ہوتا ہے۔ اور جو فعل اس عمل کو روکتا ہے۔ اُس میں حائل اور مزاحم ہوتا ہے۔ اور اس کی مخالفت کرتا ہے۔ وہ بد ہے۔ جو انفرادی زندگی اس ارتقا میں براہِ راست شامل ہوتی ہے۔ وہ سب سے زیادہ مستحق ہے۔ جو انفرادی زندگی اس ارتقا کی رفتار کے راستے سے باہر ہوتی ہے۔ وہ بے کار و بے سُود ہے۔ اور جو اس ارتقا کی رَو کے خلاف چلنے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ مردود و مطرود ہو جاتی ہے۔ اخلاقی اقدار کا یہی قدرتی۔ قطعی اور حقیقی معیار ہے۔ قدرت تقوے اور خیر کی اُس زندگی

کو جو انسانی نشو و نما میں مد و معاون نہیں ہوتی۔ اُس ایک عمل کے مقابلے میں کوئی وقعت نہیں دیتی۔ جو ارتقائے نسل انسانی کو مستقل فائدہ پہنچا گیا ہو۔ قدرت کے "کراماً کاتبین" سینٹ فرانسس آف اسیساتی (Assissi) کی نیکیاں اتنی زیادہ نہیں لکھتے۔ جتنا گوٹن برگ اور رُوسو کے محاسن کا اندراج کرتے ہیں۔ قدرت صرف ایک ہی "پیمانہ قیمت" کو اہم سمجھتی ہے۔ اور اسی کو دوام دیتی ہے۔ وہ پیمانہ یہ ہے۔ کہ انسانیت کو بلند تر کرنے میں کس حد تک امداد و اعانت مہیا کی گئی ہے۔

جس وقت انسانی انفرادیت کا صحیح رابطہ سمجھ میں آ جاتا ہے۔ اور ہم اس عظیم عمل کی نوعیت کو سمجھ لیتے ہیں جس نے ہمیں بنایا اور جس کی پیداوار اور جس کا "پاندا" ہماری زندگی ہے۔ اور جب ہم اس "انسانیت ساز" عمل کو محسوس کر لیتے ہیں۔ جو ہمارے حدِ ادراک کے اندر رفیع ترین اور مجیر العقول عمل ہے۔ تو بے اختیار یہ خواہش پیدا ہوتی ہے۔ کہ ہماری زندگی بھی اس عظیم رَو کا ایک جُزو بن جائے۔ اور صرف اِنفعالی اور جامد پیداوار نہ رہے۔ بلکہ (خواہ کتنے ہی خفیف درجے میں ہو) ایک سرگرم عامل بن جائے۔ اور اُسی محرّک سے توفیقِ عمل حاصل کرے۔ جس نے ہمیں وہ کچھ بنایا۔ جو ہم ہیں۔ اور جو انسانیت کو نئی شکلوں کو جنم دینے کا بھی باعث ہوگا۔ ہم اس کو اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ کہ جس نشو و نما نے ہم کو وجود بخشا۔ اُس کے ممد و معاون بنیں۔ اور اس رواں

وواں رُوح میں جذب ہو جائیں ۔ جو نسل انسانی کی تقدیروں کی رہنمائی کرتی ہے ۔ ایک نئی اخلاقیاتی حس ، وہ سچی اور قدرتی اخلاقیاتی رُوح جس کے دُھندلے سے شعوری عمل نے نوعِ بشر کو پیدا کیا ہے ۔ برابر ترقی کر رہی ہے ۔ اگر ہم نے حقیقت میں قدرت کے ساتھ اپنے رابطہ کو سمجھ لیا ہے ۔ تو ہم پر یہ ناگزیر فرض عائد ہوتا ہے ۔ کہ ہم انسانی نشو و نما کی طاقتوں کا ساتھ دیں ۔ اور نسلِ انسانی کے تخلیقی جذبۂ محرّک میں (محض مُردہ فضلے کی حیثیت سے نہیں بلکہ) ایک زندہ و فعال جُزو کی حیثیت سے شامل رہیں ۔

حصّۂ چہارم

"یوٹوپیا" (خیالی دُنیا) کی تمہید

پہلا باب

"علم بیزاری"

اگر کوئی بے تعلق اور ناتجربہ کار شخص کسی "ماوراے ارضی" مقام سے اس دُنیا پر نظر ڈالے۔ تو اُس کو نظر آتے گا۔ کہ فکر کو کُلی اعمال کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی خوبی نے فرزندانِ ارض کو ایک عظیم الشان بلندی پہنچا دیا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ فرض کرے گا۔ کہ ایسی عالی مرتبہ قوت نسلِ انسانی کے جذبات وعواطف میں صنم پرستانہ احترام سے محصور ہونی چاہئے۔ ایسی حالت میں ذہنی پندار کم سے کم ناقابلِ معافی معلوم ہوگا عقلی فکر اور اس کے اقتدار سے اگرچہ انسانی کمزوری نے کبھی انحراف وتجاوز بھی کیا ہو۔ لیکن اسے کم از کم نظریاتی اعتبار سے نہایت احترام کے ساتھ مُسلّم اور واجب التمیل قرار دیا جاتے گا۔ نسلِ انسانی کا حقیقی رویہ کسی قدر تفاوت کا مظہر ہے! یہ فکر انسانی کی ایک عجیب "حقیقت باطل نما" ہے۔ کہ انسان نے ہمیشہ اُسی قوت کو شُبہ کی نظر سے دیکھا ہے جس کے طفیل سے اُس نے اپنے تمام محیّر العقول کارنامے انجام دیئے ہیں۔ اور جس کا وہ کاملاً شرمندۂ احسان ہے۔ اُس نے اس قوت کے ساتھ جو جذبات وعواطف روا رکھے ہیں۔ وہ فخر واحترام کے نہیں۔ بلکہ

اس کے برعکس گہری بے اعتمادی۔ تحقیر و استخفاف اور قطعی مخالفت و عداوت کے جذبات ہیں۔ اگرچہ وہ اپنی پوری رفتار زندگی میں اسی قوت کے طفیل سے ناقابل تصور بلندیوں پر فائز ہوا ہے۔ لیکن اس نے ہمیشہ اس کو بدنام و رسوا کرنے۔ اس کو تحقیر و استہزا کا نشانہ بنانے اس کو ذلیل کرنے۔ اس کو اپنا جانی دشمن اور پلید و خبیث قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ اور اس کی آواز کا گلا گھونٹنے میں اپنی پوری قوت استعمال کی ہے۔ آج کل کے زمانے میں (جیسا کہ ہم کر رہے ہیں)۔ اس کو انسان کی زندگی اور نشو و نما کا بہترین آلہ قرار دینا صرف ایک سادہ اور مسلمہ حقیقت کا بیان کرنا نہیں ہے۔ بلکہ اس کو نہایت عذر خواہانہ احتیاط سے پیش کرنا پڑتا ہے۔ دوسری طرف یہ حالت ہے۔ کہ فکر کی عقلیت کے خلاف حقارت کا اظہار کیجئے۔ عوام آپ پر تحسین کے ڈونگرے برسائیں گے۔

اور پھر یہی نہیں۔ کہ صرف عوامی شور و غوغا یا "ایالڈ و بوتھ" (ایک قدیم دیوتا) کی آواز ہی عقل کو "پندار ذہنی" کہہ کر نشانہ ملامت بناتی ہے۔ اور دروغ بافیوں کی مصلحت، افادیت اور خوب صورتی کی حمایت کرتی ہے۔ بلکہ بعض جفاکش اور محنتی فلسفی بھی جو عقل کی دقیقہ سنجیوں کے عادی ہیں۔ عقل ہی کو متہم کرنے اور اس کو نشانہ تحقیر بنانے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں وہ بظاہر معقول دلائل پیش کر کے ثابت کرتے ہیں۔ کہ معقول ہونا غیر معقول بات ہے۔ وہ اپنے اذعانی خواب سے بیدار ہوتے ہیں تو اپنے ہی بالوں کے کھنچاؤ سے آنکھیں کھولتے ہیں۔ وہ عقلی فکر کو عقلی تنقید ہی سے بدنام اور مسترد کرتے ہیں۔ وہ یہ انکشاف پیش کرتے ہیں۔ کہ آج تک کوئی "سچائی" دریافت نہیں ہوئی۔ بلکہ محض بنائی اور

مصنوع کی گئی ہے گویا کولمبس نے امریکہ کو "بنایا" تھا۔ اور لا ڈیئر یر نے یورینس ستارے کو "تخلیق" کیا تھا!

فلسفیوں کے غاروں سے لے کر بازار تک پڑھے لکھوں کی اس علم بیزاری کی گونج مسرت آمیز رد عمل سے پھیلتی جاتی ہے۔ ہر موقع اور ہر بہلانے سے فائدہ اٹھا کر اندازے اور رہنمائی اور طرز عمل کے بعض ایسے منبع تلاش کئے جاتے ہیں۔ جو زیادہ مشقت طلب نہ ہوں ہماری خواہشات کے ساتھ زیادہ لچک گوارا کریں۔ اور پُر اسراری اور غیر مفہوم کیفیت کی نظر فریبی سے مالا مال ہوں۔ یہ سب کچھ گویا اس قوت کا قائم مقام ہے جس نے انسان کو بنایا ہے۔ اور جس کے بل پر وہ حکومت کر رہا ہے۔ انسان نے عقلی فکر کا قائم مقام تلاش کرنے میں کیا کیا پاپڑ بیلے ہیں۔ القا، الہام، جبلت، علم غیب، شعور روحانی، حس استخراج، بلا واسطہ علم، نظریۂ عملیت، غرض بے شمار اور مختلف ناموں اور تعریفوں کو ادعائیت کی زندگی ہے۔ ظریف کی سبک پروائی اور بے ادبی سے جہالت کی ادعائیت سے، اور علمی ساز و سامان کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اور بالکل متضاد طریقوں سے۔ نہایت متصادم آرا و خیالات کے نام پر محتسب یا سائنس دان۔ ظالم یا انقلابی کی حیثیت سے یہی کوشش کی ہے۔ کہ عقلی فکر کو اس کے تخت سے اُتار دیا جائے۔ سب سے زیادہ دردناک منظر یہ ہے۔ کہ وہی سپاہی جو انسانیت کی جنگ آزادی لڑ رہے ہیں۔ اور غیر معقولیت اور نا انصافی کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ ظلمت پسندوں کے ساتھ مل کر "محض عقلیت"، "منطق بگھارنے"، "ذہن پرستی" اور "وضعداری کے بُت" کے خلاف اظہار خیال کر رہے ہیں۔

نہایت لغو اور نامعقول دعویٰ یہ کیا جاتا ہے۔ کہ عقل "خطا کا رہے

یہ قطعی طور پر صحیح نہیں۔ عقل ہرگز "خطاکار" نہیں ہے۔ نہایت مصیبت ناک ناکامیوں، تباہیوں، بربادیوں اور مصائب و نوائب کی ایک دردناک فہرست موجود ہے۔ جو اُن غیر عقلی خیالات و افکار کی وجہ سے پیدا ہوئیں۔ جو عقل کے قائم مقام تھے۔ عقلی فکر کا سب سے بڑا کام ہی یہ رہا ہے۔ کہ ان قائم مقاموں کی وجہ سے انسان کو جن ہولناک مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ اُن سے نوع انسانی کو نجات دلائیں۔

مسلسل خودکشی کے اس بیہودہ رشتے کا غیر معقول منظر ایسا ہی ہے جیسا یہ، ندول کی کوئی نسل قوتِ پرواز کو بُرا بھلا کہنے لگے۔ یا ماہرینِ نفسیات کی کوئی انجمن اپنے شام کے اجلاس بجلی کے بیکار اور فضول ہونے پر اظہار حقارت میں صرف کر دے۔ یہ تناقض دائم ہو جاتا ہے۔ جب ہم یہ سوچتے ہیں۔ کہ غیر عقلی فکر اُس تمام قائم شدہ نظام کا ضروری مظہر ہے۔ جس کی ہستی کا انحصار ہی اس امر پر ہے۔ کہ ہر قسم کے تغیر، ارتقا اور ترقی کا راستہ بند ہو جائے۔ پس چونکہ عقلی فکر ازلی ابدی دشمن ہے۔ لہٰذا تمام ضوابط جنگ کا تقاضا یہی ہے۔ کہ اس کو بدنام و رسوا و ملعون و مطرود قرار دیا جائے۔

غیر عقلی توتی فکر جس کا ہر امر تنقیح طلب عقل کے خلاف صف آرا ہے (جیسا کہ ہمیں یقین دلایا جاتا ہے) تعصب کا وہ بودا پن نہیں ہے جس میں "فطرتِ انسانی" ناگزیر طور پر مبتلا ہے۔ بلکہ یہ اُن تمام قوتوں کا طبعی ذریعۂ دفاع ہے۔ جو دروغ بافیوں کو تباہ کرنے والی قوتوں کے دائمی خطرے کے مقابلے میں قائم شدہ تصورات کے ساتھ چمٹے رہنا اپنی زندگی کا تقاضا سمجھتی ہیں۔ یہ محض ایک "مصنوعی حقیقت" ہے۔ اور اشیا کی نوعیت میں کوئی ایسی وجہ موجود نہیں۔ کہ اس کو دُنیا سے بالکل بے نشان اور معدوم نہ کر دیا جائے۔ لوگ تعصبات کو ساتھ لے کر پیدا نہیں ہوتے بلکہ تعصبات

ان کو سکھاتے جاتے ہیں۔ اور انسانی اذہان کی مصنوعی بدشکلی چینی عورتوں کے پاؤں کی بدصورتی سے زیادہ ضروری اور ناگزیر نہیں۔ دُنیا کو تعصبات سے نجات دلانے کا تصور ہرگز موہوم اور خیالی نہیں جس طرح دُنیا کو تپ محرقہ اور چیچک سے کاملاً نجات دلا دینا کوئی موہوم تصور نہیں۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ تعصبات کی تعلیم کا سلسلہ ختم کر دیا جائے۔

قومی فکر قوت کا ایک لازمی مرض ہے۔ اور قوت کسی شکل میں بھی ہو۔ (قوتِ رہبری۔ قوتِ قیادت۔ قوتِ قابلیت) یہ ہمیشہ ضروری۔ پسندیدہ، قیمتی اور ناگزیر ہوتی ہے۔ یہ صحیح ہے لیکن یہ مفید قوت اُس قسم کی قوت نہیں۔ جو قدرتی طور پر "لقمۂ تر" کھلانے سے قائم رہے ہم ہر اعتبار سے چاہتے ہیں۔ کہ قدرتی "عدم مساوات۔ قابلیت عقل و دانش اور حقیقی بصیرت وجود میں آئے۔ اور "لیڈر" پیدا ہوں لیکن "لیڈری" کے لئے گراں قدر اُجرتیں پیش کرنا ٹھیک نہیں۔ اس طریقے سے "لیڈری" ہرگز حاصل نہیں ہو سکتی۔ اگر ان سب لوگوں کو زندگی کا ایک عمدہ معیار حاصل ہو جائے۔ تو "آپ کا سچا "لیڈر" اُجرت سے بالکل دست بردار ہو سکتا ہے۔ دُنیائے انسانی میں وظائف کے فرق و تفاوت کے مسئلے کی حقیقی دشواری یہ ہے۔ کہ کسی کو "لیڈری" سپرد کر دینا اتنا مشکل نہیں۔ جتنا گندا کام سپرد کرنا۔ اگر مساوی مواقع کے عقلی حالات موجود ہوں۔ تو جونہی آپ "لیڈر" کے لئے اشتہار دینا بلند کر دیں گے جس میں اس کے وظائف کو کسی "ایرانی حاکم" کے مجسّمے کی طرح آبائی صلاحیتوں کا حامل قرار دیا گیا ہو تو آپ کا لیڈر خود بخود ہی نمودار ہو جائے گا۔ اس سے بڑی مشکل یہ ہے۔ کہ جب انسانوں کو دُنیا کے گندے کام پر مامور کیا جائے۔ تو انھیں درندہ بننے سے محفوظ رکھا جائے۔ انھیں بہتر اُجرت دی جائے۔ جو قوت "لقمۂ تر" سے الگ رہے گی۔ وہ لازماً دباؤ اور بیماری پیدا کرنے کا باعث نہ ہوگی۔

ایک عمل جس سے قومی فکر کا علاج انتقاپذیر ہو سکتا ہے۔ نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ بلاشبہ قومی فکر دباؤ اور جبر کے ماتحت کسی قدر غیاضانہ ہو گیا ہے۔ کیونکہ اسے ضرورت کے تقاضے سے عقلی فکر کے سامنے جدید تشکیل اختیار کرنی پڑتی ہے۔ اب وہ اتنا مہلک نہیں رہا۔ جتنا کبھی ہوا کرتا تھا۔ آج کل کا رجعت پسند جس قسم کے خیالات اور جس طرز عمل کو اختیار کرنے پر مجبور ہے۔ یا بظاہر ان کو اختیار کرنا چاہتا ہے۔ آج سے ایک سو سال پیشتر ہوتا۔ تو لوگ اسے خوفناک انقلابی قرار دے کر پھانسی پر لٹکا دیتے۔ خود حفاظتی کی حیوانی جبلتیں نہایت پُرفریب ہیں اور حفاظتی رنگ ڈھنگ اور نقالیاں پیدا کر لیتی ہیں۔ رجعت پرستی آزاد خیالی آزادی اور ترقی کے نام سے بات چیت کرتی ہے۔ ہمارے ٹوری "قدامت پسند" "اصلاح" کے حامی بنے پھرتے ہیں۔ اور ہمارے ظلمت پسند "تعلیم" اور "روشن خیالی" کی حمایت کرتے ہیں۔ مزید براں خود حفاظتی کی جبلت نے تجربے سے بہت کچھ سیکھ لیا ہے۔ مثلاً اس نے یہ سیکھ لیا ہے کہ بغاوت کے خوف سے اصلاح پر مجبور ہونے کے وقت تک احمقانہ انتظار کرنے کی نسبت ایک بہتر طریقہ بھی ہے۔ کہ جب یہ چیز ناگزیر ہو جائے۔ تو آدھا راستہ چل کر اس کا استقبال کیا جائے۔ اور خود حامی اصلاح بن کر انتہائی خرابی سے محفوظ رہا جائے۔ لیکن یہ رویہ صرف خود حفاظتی کی نقالی ہے۔ اور اس کی قدر و قیمت بھی اسی قدر ہے لیکن پھر بھی اس کا مطلب یہ ہے کہ قومی مفاد کا زاویۂ نظر مجبوراً زیادہ وسیع ہو جاتا ہے۔ اور اس کی نگاہ دور بین ہو جاتی ہے۔ فرض کرو۔ اگر یہ نگاہ زیادہ دور رس ہو جائے۔ تو کیا یہ ممکن نہیں کہ صداقت اور انصاف بھی بالآخر اسی دائرۂ نظر میں آ کر خود اس کا آخری اور قطعی مفاد بن جائیں؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ خود طاقت کا دیوتا یہ محسوس کرنے لگے۔ کہ اس کے قومی فکر نے اپنی تمام تر عیارانہ اور حیوانی خود حفاظتی جبلت کی وجہ سے نہ صرف انسانیت کو تباہ و ویران کر دیا ہے۔ بلکہ خود اس کو بھی ختم کر دیا ہے؟

دوسرا باب

قنوطیّت کی اُمید افزائی!

"دُنیا کے انسان" اپنی ذہنی قوتوں سے پرورش پاکر آج یہ حالت اختیار کر چکی ہے۔ کہ وہ بیک وقت کائنات میں محترم ترین اور حقیر ترین حقیقت بھی ہے۔ اور ایسی چیز بھی ہے جس پہ فرشتے بھی رو دیں۔ وہ ایک ہی وقت میں عظمت بھی ہے اور لعنت بھی۔ محرک بھی ہے اور مزاحم بھی۔ مقدس بھی ہے اور ناپاک بھی۔ رفیع و برتر بھی ہے اور بے ڈھنگی بھی۔ قابلِ پرستش بھی ہے اور لائق حقارت بھی۔ باعثِ فخر بھی ہے اور باعثِ شرم بھی۔ سرمایۂ امید بھی ہے اور موجب یاس بھی۔ جب ہم اسے اس حیثیت دیکھتے ہیں۔ کہ اس نے خام اور ادھوری شروعات سے کس طرح نشو ونما پائی۔ یا اپنے علم اور اپنے تصورات کی روشنی میں اس پر نظر ڈالتے ہیں کہ اس کو کیا ہونا چاہیئے تھا۔ یہ کیا ہو سکتی تھی۔ اور اسے اب کیا ہونا چاہیئے۔ تو ہمارے دل میں یا تو مذہبی احترام پیدا ہوتا ہے۔ یا نفرت و استہزا کا احساس بیدار ہو جاتا ہے۔ یہی رجائیت اور یہی قنوطیت ہمارے تمام نظریات اور تخمینوں کی تشکیل کرتی ہے۔

تاریک ترین نقطۂ نگاہ کی تائید میں دلائل بکثرت ہیں۔ نوعِ انسانی

نے ازمنۂ قدیمہ سے بدی کی طاقتوں کے خلاف جد و جہد کی ہے۔ اگرچہ یہ قوتیں اب اپنی شکل بدل چکی ہیں۔ اور ان میں خاصی تخفیف ہو چکی ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ نہایت سرکشی اور تمرّد کے ساتھ تیز و تند لڑائی لڑ رہی ہیں۔ وہ انصاف، آزادی، عقل اور سچائی کی مخالفت کر رہی ہیں۔ پُرانے زمانے کی طرح آج بھی وہ اپنے مفادات و مقاصد کی خاطر ذہنی دُنیا کو بدرنگ اور بد شکل بنانے میں مصروف ہیں۔ اگرچہ ہزاروں بدعنوانیاں ختم ہو چکی ہیں لیکن دُنیا اب تک ناشائستہ، فاش و ظاہر، کھُلی ہوئی اور مجرمانہ بدعنوانیوں سے بھری ہوئی ہے۔ انسانی ترقی کی تمام عظمتوں کے باوجود غلط زمانی عقاید۔ دقیانوسی تصوّرات اور اوہام (بالکل اس لفظ کے صرفی معنی میں) جو وحشت و بربریت کے زمانے سے چلے آ رہے ہیں۔ اور دَورِ حاضرہ کے انسان کے علم اور اندازے کے سخت منافی ہیں۔ آج بھی دُنیا کے طول و عرض میں دلیرانہ طمطراق کے ساتھ نمایاں ہیں۔

اقتصادی وراثت کے اصول نے اکثر نسلِ انسانی کو طبعی، مادّی اور ذہنی تنزل میں دھکیل دیا ہے۔ قومی ریاست کا اصول غیر اخلاقی مفادات کا مالک ہے۔ اور اخلاقیاتی قوانین کے دائرے سے باہر ہے۔ قومیت اور فوجی قوت کے فرسودہ نعرے اپنے لازمی اثرات و نتائج کی شکل میں سامنے آ گئے ہیں۔ اور اُنھوں نے دُنیا کو اس قدر ہولناک تباہی کے سیلاب میں ڈال دیا ہے۔ کہ تاریخ قدیم کے خون آلود صفحات اس کی مثال پیش کرنے سے عاجز ہیں۔ جنسی زندگی گمراہ و بیداہ ہو چکی ہے۔ اور ان تصوّرات اور اداراات سے مبتلائے اذیّت ہے۔ جو عورتوں کے متعلق قدیم تصوّرِ ملکیت پر مبنی ہیں۔ انسان کی ذہنی زندگی افراتفری میں مبتلا ہے۔ قدیم دیوتا "مولوک" آج بھی چھوٹے بچّوں کو نِگل رہا ہے۔ اور ذہنی بچہ کُشی کے حق پہ اصرار اور عمل کر رہا ہے۔ تبلیغِ خیالات کا ہر منظم اور مُسلّم ذریعہ (مثلاً اخبار۔ مدارس اور خطابت)

دروغ بافیوں سے لبریز کیا جا رہا ہے۔ ذہن انسانی نے اپنی طویل اور پُر عظمت ترقی کے دوران میں جو نشو و نما حاصل کی ہے۔ اس کو نہایت تُندی سے بالائے طاق رکھا جاتا ہے۔ چھپایا جاتا ہے۔ دبایا جاتا ہے۔ اور اس کا گلا گھونٹا جاتا ہے۔ غرض ایک ایسے زمانے میں جب انسان کو دُور رس عقلی فکر کے وہ وسائل و حقائق میسّر ہیں۔ جو سابق میں کبھی حاصل نہ تھے۔ اور وہ جاننے سوچنے اور فیصلہ کرنے کا ہمیشہ سے بہتر اہل ہو چکا ہے۔ آج اُس کے لئے بالکل ناممکن ہے۔ کہ فکر کے تمام قائم شدہ اور مُسلّمہ اصولوں کی مخالفت کرنے اور غلط طور پر ذاتی سعی سے کام لینے کے بغیر جاننے۔ سوچنے اور فیصلہ کرنے کے قابل ہو جائے۔ موجودہ تہذیب کا تمام تانا بانا اپنی نسلی۔ اقتصادی۔ خاندانی۔ اخلاقی۔ مذہبی اور ذہنی تنظیم میں ایک ایسی ساخت پیش کر رہا ہے۔ جو غلط کاری۔ حماقت۔ جہالت۔ دروغ بافی اور بداعمالی پر مبنی ہے۔

جنگ اور اُس کے ہولناک مظاہر جو آج ہمارے شعور کو ہراس و پریشانی سے معمور کئے ہوئے ہیں۔ کوئی مفاجاتی طوفان اور اتفاقی مظہر نہیں ہیں۔ تمام مجرمانہ بیہودگیاں۔ تمام ریاکاریاں۔ تمام کفو دروغ۔ تمام بیدردی۔ تمام پریشان کن ضیاع۔ انسانی زندگی۔ قوت اور دولت کی تمام مجنونانہ تباہی غرض یہ تمام پاگل پن اور اس کا ایک ایک جُزو ہماری قبلِ جنگ کی یورپی تہذیب میں موجود تھا۔ جنگ صرف اس کا مرئی مظہر تھا۔ ان بے شمار لعنتوں کا ایک مادّی نتیجہ تھا۔ جن کے درمیان ہم زندگی بسر کر رہے تھے۔ اُس نے صرف نقاب چاک کر دیا ہے۔

اگر ہم نے انسانی ترقی کے گزشتہ نشو و ارتقا اور اُس لانے والی قوتوں کا واضح طور پر اندازہ کر لیا ہے۔ تو انسانیت اور اُس کی تقدیر دل پر ہمارا یقین و اعتماد ہرگز متزلزل نہ ہوگا۔ کیونکہ یہ درد رسیدہ اور مظلوم دُنیا نسل انسانی کی عروجی جدوجہد کے دوران میں ماضی کی ہر منزل سے گزر چکی ہے۔ اور اب بھی گندہی

جائے گی۔ اُن تمام عیوب میں اس حماقت اور بے انصافی اور جہالت کے ہر پہلو میں جس کے بوجھ تلے ہماری موجودہ دُنیا ناقابلِ اصلاح طور پر ٹھوکریں کھاتی ہوئی نظر آتی ہے۔ صاف نظر آتا ہے۔ کہ جس کابوس نے سابق میں اس کی نشو ونما پر دباؤ ڈال رکھا تھا۔ اُس میں خاصی تخفیف ہو چکی ہے۔ بلاشبہ ظلمت کی قوتوں کا "ہُراؤ تار" نہایت نفرت انگیز ناقابلِ برداشت تیز و تند اور متمرد نظر آتا ہے۔ لیکن یہ صرف اس ظلم وستم کا صرف سایہ سا ہے۔ جو ایک زمانے میں بے پایاں اور بے قیاس تھا۔ ہمارے تخیّل پر بے حد دباؤ پڑ رہا ہے۔ ہم شکایت کرتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں۔ کہ دُنیا ان غیر ذہنی عیوب سے پاک کر دی جائے۔ لیکن درحقیقت یہ امر اور بھی زیادہ مشکل ہے کہ ہم اُن مادی اور ذہنی حالات اور اُن منازل کا صحیح تصوّر کر سکیں۔ جن میں سے ہماری دُنیا گزر آئی ہے۔ دوسری بات یہ ہے جو اس سے قبل موجود نہ تھی۔ کہ آج ہمیں اُن تمام بدیوں کی بیہودگی۔ بے انصافی۔ منزوکیت اور قطعی فضولیت کی واضح ترین بصیرت حاصل ہے۔ وہ زمانہ گزر گیا۔ جب شیکپیئر یا ایڈیسن کے شیخ پیغلط زمانی" چیزیں پیش ہوتی تھیں۔ اور کوئی پرواہ نہ کرتا تھا۔ اب پارینہ حماقت اور نا انصافی زیادہ واضح اور بیّن نظر آتی ہے۔ کیونکہ دانشمندی اور حق و انصاف کے متعلق ہمارا شعور بے انتہا واضح ہو چکا ہے۔ ہمارے علم ہمارے شعور اور حقیقت حاضرہ کے درمیان تفاوت کبھی اتنا سخت نہ تھا۔ اس سے پیشتر انسانی فکر اور اُس فکر کے درمیان جس پر اس کی دُنیا کے نظام مبنی تھے۔ اتنا شدید تضاد ہرگز نہ تھا۔

اور ٹھیک یہی تفاوت ہے جو مستقبل کی سب سے زیادہ یقینی علامت ہے۔ انسان کی دُنیا اس کے ذہن کی ایک ساخت اور اس کی مادی مظہر ہے۔ اسی کے فکر سے وہ نشو ونما پاکر موجودہ صورت تک پہنچی ہے۔ اور اسی کے فکر نے رفتہ رفتہ بُرائی کا اخراج کیا ہے۔ انسان کے عقلی نتائج

کا استخراج یعنی اُس کے ادراک میں کونسی چیز راست ہے۔ کونسی حق ہے۔ کونسی منصفانہ ہے۔ یہ ایسا ہی ناگزیر ہے۔ جیسے ستاروں کی روش لازوال ہے۔ انسانی دُنیا اور انسانی روح کے درمیان جتنا زیادہ تضاد ہوگا۔ اُسی قدر مستقبل کا یقین و اعتماد زیادہ ہوگا۔

ہم سے کہا گیا تھا۔ کہ جنگ نے ہماری تہذیب کے وجود اور مستقبل کو خطرے میں ڈال دیا ہے لیکن درحقیقت جس چیز کو مُہلک خطرہ درپیش ہے۔ وہ تہذیب نہیں بلکہ خود جنگ ہے۔ یعنی جنگ اور وہ فاش و بے نقاب قوتیں جنہوں نے جنگ کو ممکن بنایا۔ اور جن کا مرئی مجسمہ اور منطقی نتیجہ جنگ تھا۔ جنگ کے عین درمیان میں دُنیا ہمیشہ سے زیادہ "مجوزِ صلح" ہوگئی تھی۔ کیونکہ اسے تمام جنگی بربریتوں کے خاتمے کا نظارہ واضح طور پر دکھائی دے رہا تھا۔ اس تمائندہ "غلط زمانی کیفیت" کے متعلق جو کچھ صحیح ہے۔ وہی دوسری چیزوں پر بھی صادق آتا ہے۔ ظلمت پرستی اور رجعت پسندی کی قوتیں اس وقت بہت زیادہ خطرناک ہوجاتی ہیں۔ جب ان کے زوال کا زمانہ قریب آجاتا ہے۔ جب خود انسانی وجود ہی خطرے میں پڑ جاتے۔ تو تمام نفیس تر انکسارات اور اجتنابات ختم کر دیئے جاتے ہیں۔ مقاصد وا انکشاف ہوجاتے ہیں۔ اور وجود کی مدافعت و حفاظت دس گنا سختی سے کی جاتی ہے۔ لیکن ظاہری فتح و ظفر سے زمانۂ حال کے ساتھ بے آہنگی اور عدم مطابقت زیادہ واضح ہوجاتی ہے۔ اور انسانیت کی نجات کا زمانہ قریب تر آجاتا ہے۔

قومی امور تنقیح طلب کتنے ہی غیر مستند اور غیر یقینی ہوں لیکن آخری اور قطعی امور یقینی اور ناگزیر ہوتے ہیں۔ قدرتی عمل کی عام رفتار کے دوران میں تاخیر (التوا)، حماقت کی کامرانی، استغفاق کی خیرہ چشمی، مذلل دروغ بافیوں کی سرکشی تباہی اور بربادی کوئی خاص حیثیت نہیں رکھتیں۔ یہ عارضی حادثات ہیں۔ اور ہمیں معلوم ہے۔ کہ اتفاقی قوتیں حادثوں اور

رکاوٹوں کو بھی اپنے لئے مفید بنالیا کرتی ہیں ۔ تباہی اُسی چیز پہ غالب آتی ہے۔ جس کی قسمت میں تباہ ہونا ہوتا ہے ۔ لیکن لازوال چیزوں کو آزاد کر دیتی ہے۔ جتنی بھی آفتیں ارتقائے انسانیت کے لئے مضرت رساں معلوم ہوتی تھیں ۔ اُن سب کا نتیجہ یہی مترتب ہوتا ہے۔

گزشتہ نشو و ارتقا کے واضح فہم کی روشنی میں تمام موجودہ تشکک اور کلبیت بالکل برائے نام رہ جاتی ہے۔ یوٹوپیا (خیالی دُنیا) کا احمقانہ نعرہ محض بے معنی شور و غوغا ہے۔ جس شخص نے بھی نوع انسانی کے گزشتہ ارتقا کی اہمیت کو کما حقہٗ سمجھ لیا ہے ۔ اُس پہ واضح ہے ۔ کہ ہمارے "دَورِ سعادت" کے تمام خواب مقابلتہً نہایت خفیف اور بے حقیقت ہیں ۔ تمام خیالی دُنیاؤں کا نہایت وہمی تصورِ حقیقتِ حاصلہ کا راجع بہ ماضی منظر ہے ۔ اس کے مقابلے میں وہ کام جو ہماری محدود نظر کو مستقبل میں نظر آتے ہیں ۔ نہایت انوکھے طریقے سے سادہ معلوم ہوتے ہیں ۔

تیسرا باب

انسانی ارتقا پر قابو

ارتقائے انسانی غالباً ابھی نسبتۃً ابتدائی مرحلے میں ہے۔ یہ فرض کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ کہ یہ موجودہ منازل سے آگے بڑھ کر بہتر مرحلوں پر فائز ہو جائے گا۔ بعینہٖ جس طرح انسانی زندگی کی دھندلی سی ابتدا سے بڑھ کر موجودہ منزل تک پہنچا ہے۔ کوئی وجہ نہیں۔ کہ جن افراد کو ہم "عظیم" کہتے ہیں۔ وہ انسانی قُوا اوصاف کے نشو و ارتقا کے جس معیار پر فائز ہو چکے ہیں۔ وہ اوسطاً ساری نسل انسانی کا معیار نہ بن جائے۔ یہ ارتقا کی معمولی روش ہے۔ انفرادی استثنا ہی نسل انسانی کا نمونہ بن جاتا ہے۔

صحیح طور پر کہا جائے۔ تو ابھی مخصوص انسانی ارتقا کا عمل شروع بھی نہیں ہوا۔ جن مدارج میں سے نوعِ انسانی گزر چکی ہے۔ اور جن میں سے اب فوری طور پر گزرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اُن کی نوعیت محض "تجربے" کی ہے۔ کیونکہ اب تک انسانیت کی تمام تر نشو و نما کا مقصد یہ رہا ہے۔ کہ انسان اپنے ارتقا کے ذرائع و وسائل کو ترقی دے۔ اب تک ان کے استعمال و اطلاق کے لئے کام نہیں کیا گیا۔ جن منازلِ مقصود کا تصوّر آج کل انسانیت کے پیش نظر ہے۔ وہ پختگی اور تکمیل کے نصب العین نہیں

ہیں (اور "تکمیل" توکسی ارتقائی عمل میں وجود ہی نہیں رکھتی) بلکہ اس کی آزادانہ نشو و ارتقا کے لئے مناسب و موزون ساز و سامان مہیا کرنے کی شرط ہیں۔ نوع انسانی کے پاس حالاتِ زندگی پر قابو پانے کے جو ذرائع ہیں۔ اُن کا استعمال اب تک منظم و منضبط ہی نہیں ہو سکا۔ چہ جائیکہ ان ذرائع کو تسلیم کیا جائے۔ یا واضح طور پر ان کا فہم حاصل ہو۔

میکانکی زبان میں بات کی جائے۔ تو ترقی پسند قوتوں کا عمل اب تک انتہائی بد اسلوب اور بے سلیقہ رہا ہے۔ ضیاع نہایت خوفناک ہے۔ انسانی قوت کا ایک نہایت خفیف حصہ نشو و ارتقا کے کاموں میں صرف کیا گیا ہے۔ ارتقائی عمل کی رفتار خود ساختہ رکاوٹوں کی وجہ سے رُکتی رہی ہے۔ اور زیادہ تر ترقی پسند مساعی انہی پر غالب آنے میں صرف ہوتی رہی ہیں۔ ہر متروک الاستعمال چیز کی تنسیخ کا مطلب صرف یہی نہیں۔ کہ ایک رُکاوٹ دُور ہو گئی۔ بلکہ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ وہ تمام قوت آزاد ہو جاتی ہے۔ جو اس رُکاوٹ کے خلاف جد و جہد کرنے میں صرف ہو رہی تھی۔ قوت کے عظیم سرچشمے ابھی آزادی و مخلصی کے منتظر ہیں۔ اور توانائی کے بے اندازہ ذخیرے ابھی بند پڑے ہیں۔ جن سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا گیا۔

لیکن اگر انسانی ارتقا کے تمام نتائج اب تک انہی ذرائع کے شرمندۂ احسان ہیں۔ جو انسانیت کی قوت کا صرف ایک خفیف حصّہ ہیں۔ اور ان کو بھی صرف جزوی حیثیت سے اخذ کر کے مفید طور پر منطبق کیا گیا ہے۔ تو اس ارتقا کا ایک پہلو ایسا بھی ہے۔ جس کی امداد کرنے اور جس پر قابو پانے کے لئے انسانی سعی و کوشش نے اب تک کچھ بھی نہیں کیا۔ اور وہ پہلو ارتقائی عمل کا نصف حصہ ہے۔ یعنی اس کے نتائج کو ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچانا اشد ضروری ہے۔

جب کبھی ترقی۔ اصلاح اور تعمیرِ نو پر بحث کی جاتی ہے۔ تو دُنیا دی دانش کے اعتدال پسند عَلَم بردار عام طور پر مندرجہ ذیل قسم کی آرا کا اظہار کرتے ہیں :—

"جن مقاصد و غایات کی تکمیل ہم سب دل سے چاہتے ہیں۔ مثلاً غلط زمانی چیزوں اور ناشائستہ اور کھُلی ہوتی بیہودگیوں کی تنسیخ بہت ہی آسان ہو جاتے۔ بلکہ خود بخود واقع ہو جاتے۔ یہ سب ممکن ہے۔ بشرطیکہ انسانوں کی اکثریت میری اور آپ کی طرح عقل و دلیل کے آگے سر جھکا دے۔ روشن دماغ جن چیزوں سے اثر پذیر ہو۔ سادہ غور و فکر کی اہلیت کی حامل ہو۔ اور ان چیزوں سے حقیقت میں دلچسپی رکھتی ہو۔ ظاہر ہے۔ کہ اگر احمق ہی دُنیا میں موجود نہ ہوں۔ تو حماقت بھی نہ ہوگی۔ لیکن جناب والا آپ مردوں اور عورتوں کے جس ہجوم پر چاہیں۔ نظر ڈالیں۔ اور ایک لمحے کے لئے ان مخصوص افرادِ انسانی پر غور کریں۔ جو اس مجموعے کے اجزا ہیں۔ اگر اُن میں آپ کو ذہانت و طباعی کی سعی و کوشش نظر آتے۔ جس کو آپ ایک بلند انسانیت کے جز ثومے کی لطیف صورت مے سکیں۔ تو سبحان اللہ۔ یہ انسانیت کیا ہے؟ اس میں وہ سبزی فروش ہے۔ وہ بساطی ہے۔ وہ چور ہے۔ وہ گرجا کا جمعدار ہے۔ وہ گھوڑوں کا سدھانے والا ہے۔ وہ دُبلا سا کلرک ہے۔ وہ موٹا سا سرکاری افسر ہے۔ جو اپنی پیشانی سے نہایت طمطراق کے ساتھ پسینہ پُونچھ رہا ہے۔ وہ دیہاتی مالک اراضی ہے۔ جو "سختی شرائین" کا مریض اور روایات زمینداری میں لت پت ہے۔ وہ نوجوان ہیں جن کو دُنیا میں صرف ایک ہی اندیشہ ہے۔ کہ وہ کہیں اپنے آپ ہی سے بیزار نہ ہو جائیں۔ اُن کے ذہن تھئیٹروں۔ ہوٹلوں کھیل تماشوں ہی کے چکر میں گھومتے ہیں۔ ایٹن اور آکسفرڈ کے ٹھس اور جامد دماغ۔ وہ فضلات کے رہنے والے غلیظ و کثیف لوگ جو اپنے ادنیٰ انفرادی مسائل کے لئے فکرمند ہیں۔ پھر ہمارے

مسخرے ایکٹروں کی دلدادہ زندگی اور اس کے علاوہ حیوانیت کا یہ پست اور بے زبان ہجوم! یہ آپ کی انسانیت ہے! ان کے کیپ سٹالوں۔ ان کے ادبیات اور ان کے اخبارات کو دیکھئے۔ اور ان کی دھندلی ذہنیت کی غذا پر غور کیجئے ان کے خیالات و افکار کیا ہیں؟ کیا ان خیالات سے آپ ترقی کے کسی خفیف و بے حقیقت دعوے کے متعلق بھی کسی عقلی محرک کا سراغ لگا سکتے ہیں؟ کون سی قوت ہے (سوائے اس عادی ٹیپ ٹاپ اور ظاہر داری کے جس سے عام طور پر کام لیا جاتا ہے) جو اس لاعلاج جمود کے انبار کو حرکت میں لا سکتی ہے۔

میں اس سے آگے بھی کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کی "ترقی" (آپ اس کے متعلق کچھ بھی کہئے) بہت بڑی حد تک "فریب نظر" کے سوا کچھ نہیں اس کے مادی پہلوؤں سے الگ ہو کر دیکھا جائے۔ تو اس نے نسل انسانی کے بہت ہی خفیف اور قلیل حصے پر کسی لازمی تغیر یا حقیقی ارتقا کا اثر ڈالا ہے۔ وسیع النظری۔ کشادہ دوائر نگاہ اور واضح تر شعور و ضمیر نسل انسانی کے صرف ایک قلیل طبقے کی جائداد ہے۔ اور ممکن ہے۔ ازمنۂ ماضیہ میں یہ طبقہ زیادہ وسیع ہو۔ یا ممکن ہے۔ اب یہ کوئی مخصوص اور حامل اسرار طبقہ نہ رہا ہو۔ اگرچہ پوری انسانی برادری عقل اور فکر کی فتوحات کے فوائد سے غیر شعوری طور پر مستفید ہو رہی ہے۔ جس طرح مادی قوت کی ترقی سے فیض حاصل کر رہی ہے۔ لیکن نوع انسانی کا ایک وسیع انبوہ تغیر پذیر تہذیب کی ظاہری ٹیپ ٹاپ کے باوجود تبدیلیوں سے بالکل وہی ہے۔ جو وحشی اور ساحر زمانوں میں تھا۔ انسان اب تک ویسا ہی بربری۔ ویسا ہی لاتعقل۔ ویسا ہی جاہل۔ ذہنی اعتبار سے ویسا ہی بے بس۔ ویسے ہی اوہام و اعتقادات کا شکار ہے۔ انہی غیر شائستہ جذبات کی اندھا دھند پیروی کر رہا ہے۔ اور انسانوں کے اذہان و قلوب اور ان کی

زندگیاں اسی محدود دائرے میں گھوم رہی ہیں۔ جو وحشی اور بربری انسانوں کا دائرہ تھا۔ اور ہر وقت اس امر کا اندیشہ ہے۔ کہ وہ اپنے موجودہ نقاب کو چاک کر کے بالکل قدیم وحشت و بربریت کی صورت میں نمایاں ہو جائینگے"

افسوس ہے۔ کہ ہم تہذیب انسانی کے اس "نقابی" نقطۂ نگاہ کو صحیح تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔ ہم انسانی ارتقا کے ایک خاص مرحلے میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ جس کو "بیسویں صدی" کہتے ہیں۔ اور جو انسانی ذہن اس کی قوتوں۔ اس کے تجربات اور اس کے میلان و رجحان کی نشو و نما میں ایک مخصوص کامیابی کی مظہر ہے لیکن انسانوں کی عظیم و وسیع اکثریت قطعی طور پر اس مرحلے سے واسطہ نہیں رکھتی۔ موجودہ زمانے کی بلند و پست آبادی میں انسانی ارتقا کے ہر مرحلے (عہد حجری سے لے کر اب تک) کی نمایندگی موجود ہے۔ وہ حقیقی آدمی جو ہمارے ارد گرد نظر آتے ہیں۔ ہرگز "بیسویں صدی" کے انسان نہیں ہیں۔ بلکہ پتھر کے زمانے کے لوگ، پندرھویں صدی کے انسان (ایم۔ اے کی ڈگریاں پاتے ہوتے) نارمن سردار۔ ٹیوڈر لوگ اور ملکہ وکٹوریا کے زمانے کے انسان سب جمع ہو رہے ہیں۔ وہ ریلوں میں سفر کرتے ہیں۔ طیاروں میں اڑتے ہیں۔ ٹیلیفون استعمال کرتے ہیں۔ اپنے خانگی جھگڑوں کا فیصلہ پتھر کی کلھاڑیوں نہیں کرتے۔ اپنی انگلیوں سے کھانا نہیں کھاتے۔ لیکن یہ سب کچھ محض ایک "نقاب" ہی تو ہے۔ ان تمام چیزوں کے اعتبار سے جو ارتقائے انسانی کے شجرۂ نسب میں ان کا حقیقی مقام تجویز کریں۔ اور اپنے اذہان و خیالات کے لحاظ سے وہ لازماً بیسویں صدی سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ بلکہ کسی نہایت قدیم اور دور دراز ماضی کے زمانے کی پیداوار معلوم ہوتے ہیں۔ جہاں تک ان کا تعلق ہے۔ تہذیب محض ایک مادی منظر ہے۔ جو ان کے کپڑوں کی وضع قطع سے زیادہ

کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔

لیکن یہ حقیقت فی الواقع کیا معنی رکھتی ہے۔ اور اس سے کیا سمجھنا چاہیئے؟ اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ عہد حجری، ٹیوڈروں کے زمانے اور ملکہ وکٹوریا کے دور سے لے کر اب تک انسانی ارتقاء کے جو نتائج و حاصلات ہیں۔ وہ اُن لوگوں تک پہنچائے نہیں گئے۔ یہ ترسیل و ایصال کا عمل صرف ایک چیز ہی انجام دے سکتی ہے۔ یعنی انسانی ماحول اور انسانی تنظیم۔ لیکن یہ وظیفہ یا تو محض جزوی اور نامکمل طور پر ادا کیا گیا ہے۔ یا بالکل ہی ادا نہیں کیا گیا۔ ارتقاء کے "تسلسل" نے جس پر ان لوگوں نے اپنے انسانی ورثے کا کلی انحصار رکھا ہے۔ ان کو ریلیں اور پولیس مین تو مہیا کر دیئے ہیں۔ لیکن اصلی ارتقاء کے حقیقی لوازم قطعی طور پر نہیں بہم پہنچائے۔ اس میں کسی لاعلاج "فطرت انسانی" یا ناقابل اصلاح نادانی و حماقت کا قصور نہیں بلکہ ارتقائے انسانی کی ترکیب و ترتیب کا قصور ہے۔ اگر وہ اب تک غار نشین اور وحشی ہیں۔ تو اس کی ذمہ داری ان کے پروٹوپلازم یا خون پر عائد نہیں ہوتی۔ اُن کی حالت وہی ہو سکتی ہے۔ جو انسانی تنظیم نے غار نشینی اور بربریت سے لے کر اب تک انسانیت کے نشو و نما کے متعلق اُن تک پہنچائی ہے۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ انسانی مقصد نے اب تک اس وظیفے پر قابو پانے کا کبھی خیال بھی نہیں کیا۔ نسلِ انسانی نے اپنے ارتقاء کے اثاثات کی ترسیل کے لئے کوئی تدابیر اختیار نہیں کیں۔ نوع بشر نے اپنی نقل و ترسیل کی میکانکیت کو کبھی بالارادہ منظم نہیں کیا۔

یہ صحیح ہے۔ کہ ہم سے اکثر و بیشتر "تعلیم" کی بات چیت کی جاتی ہے لیکن یہ شاذ ہی ممکن ہو۔ کہ تعلیم کو مذکورہ بالا وظیفے کی بجا آوری میں سنجیدگی کے ساتھ کارآمد سمجھا جا سکے۔ تعلیم اس قدر واضح طور پر مضحکہ خیز اور عجیب دقیانوسی واقع ہوتی ہے۔ کہ اس کو اسی نام سے موسوم کرنا اور

پھر ارتقائے انسانی کے حاصلات کی ترسیل کو منظم کرنے کی کوشش کرنا بے انتہا مشکل ہے جس چیز کو آج کل کے زمانے میں "تعلیم" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اُس کے اور ذہن انسانی کی تحقیقی کامیابیوں اور کامرانیوں کے درمیان کوئی چیز مشترک نہیں۔ بلکہ اس کے برعکس یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہماری "تعلیمات" قوت اور علم کی اُن تمام برکات کو جو چودھویں صدی سے لے کر اب تک ذہن انسانی کو حاصل ہوتی ہیں۔ جان بوجھ کر معدوم کر دینا۔ چھپا دینا۔ دفن کر دینا اور ناقابلِ حصول بنا دینا چاہتی ہیں۔ اور اُن کا مطلب یہ ہے۔ کہ کہیں لوگ اس کے حصول سے "خطرے" میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ آج کل جتنی دقیانوسی اور غلط زمانی چیزیں باقی رہ گئی ہیں اُن میں سب سے زیادہ قدیمی و ابتدائی چیز وہی ہے۔ جسے ہم "تعلیم" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ وہ مضمون ہے۔ جس کے متعلق ہمارے نہایت ترقی یافتہ تصورات بھی ابتدائی عمل کی سطح سے بلند ہونے میں عام طور پر ناکام ہو چکے ہیں۔

جس چیز کو "تعلیم" کہا جاتا ہے۔ وہ پدری اقتدار کے اُس تصور پر مبنی ہے۔ کہ باپ کا یہ مقدس حق ہے۔ کہ اپنے بچے یعنی اپنی جائداد کے وارث کے ذہن کو جس سانچے میں چاہے۔ ڈھال دے۔ چونکہ باپ کو بچے کے ذہن کی تربیت کے لئے نہ تو علم حاصل ہوتا ہے۔ نہ ذرائع اور قوت مہیا ہوتی ہے۔ اور نہ کسی اعتبار سے اُسے نسل انسانی کے ارتقا پر قابو پانے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ لہٰذا بچہ سکول میں بھیج دیا جاتا ہے سکول کے مصارف کم و بیش باپ کے مالی وسائل۔ اس کے حوصلے اور پندار کے مطابق ہوتے ہیں۔ ہمارے تمام سکول براہ راست اُن خانقاہی مدارس کا صحیح پہلو ہیں۔ جو یورپ کے قرونِ مظلمہ میں پادریوں کی تیاری کے لئے قائم کئے گئے تھے۔ آج بھی اُن میں وہی مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔

وہی اسلوب تعلیم اختیار کیا جاتا ہے۔ جو اُس زمانے تک چار علمی نصاب " سے مخصوص تھا۔ جب ذہن انسانی انتہائی تنزل کی گہرائیوں میں غرق ہو چکا تھا ان علوم میں اُن مضامین کا اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ جن کا میلان نام نہاد نشاۃ الثانیہ کے انسانیت پروروں نے ظاہر کیا تھا۔ یہی وہ لوگ تھے جنھوں نے زمانۂ حاضر کے یورپ کی ترقی کو تباہ کن راستے پر موڑ دیا تھا۔

اِن مضامین میں سب سے زیادہ اہم لاطینی تھی۔ جو کلیسا نے رومی، کلیسا نے یونانی اور نشاۃ الثانیہ کے انسانیت پروروں کی زبان تھی۔ گویا بیسویں صدی کے نوجوانوں کو وہ کلید مہیا کر دی گئی ہے جس سے وہ " قدما کی دانش کے خزانوں " کو کھول سکتے ہیں۔ تدریس کا کام پادری انجام دیتے ہیں۔ اور پادری ہی اُن کی نگرانی کرتے ہیں۔ مضامین، اسالیب اور مُدرسین بالکل ویسے ہی ہیں۔ جیسے پندرھویں صدی میں تھے۔ اور پندرھویں صدی کی بہترین ذہنیت کی سطح کے برابر بھی نہ پہنچتے تھے۔ پندرھویں صدی کا علم بیسویں صدی کے فکر کا وسیلہ نہیں ہے۔

جہاں تک " ادنیٰ طبقات " کی تعلیم کا تعلق ہے۔ اُس میں چونکہ کلیسیا کے مدارس کی بعض روایات حذف کر دی جاتی ہیں۔ اس لئے اُن کی تدریس کا لہجہ کثیر المصارف سکولوں کے مقابلے میں زیادہ حقیقی اور صحت مند ہوتا ہے۔ یہ تعلیم اس قدر ابتدائی ہوتی ہے۔ کہ اس سے محض " خواندگی " سے زیادہ کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ اس میں بچے کو صرف اتنا حروف شناس کر دیا جاتا ہے۔ کہ وہ " شلنگ شاکر " (ایک ایک شلنگ کی چھوٹی چھوٹی کہانیوں اور تصویروں کی کتابیں) پڑھنے لگتا ہے۔ اور دکانداری اور فریب کاری کے کانی گُر سیکھ لیتا ہے (زیادہ پیسے والے بچے جو قدجل یا زینوفون میں پڑھتے ہیں۔ ایسی کتابیں چھ چھ شلنگ میں خریدتے ہیں)

آج کل نوعِ انسانی کے ذہنی ارتقا کی پیداوار ہیں (اس تمام نظامِ تعلیم کے باوجود۔ بلکہ اس کے قطعی خلاف) اُس پختہ عزمِ فردی کے ہاتھوں جو اس کے اثرات کو ترک کر رہا ہے۔ صرف طباعت واشاعت کے ذریعے سے پھیلائی جا رہی ہیں۔ پچھلے دنوں ایک ناقابلِ ذکر بیہودگی کا بے حد چرچا ہو چکا ہے۔ جس پر تفصیل سے اظہارِ خیال کی ضرورت نہیں۔ لیکن یہ اشارہ کرنا غالباً بے جا نہ ہوگا۔ کہ اس کے خلاف زیادہ تر نکتہ چینی بالکل بیکار و بے اثر ہوتی ہے۔ بلکہ اُس نے محافظین روایات کے ہاتھ میں ایک آلے کا کام دیا ہے۔ چنانچہ اس کی پجاریوں کی سی نارسائیوں کے خلاف "افادی تعلیم" کا نصب العین قائم کر دیا گیا ہے۔

یہ بالکل صحیح اور معقول بات ہے۔ کہ ہر شخص جس مخصوص کام کو اپنی زندگی کا مشغلہ قرار دے۔ اُس کا علم اور اُس کی تربیت ضرور حاصل کرے۔ لیکن یہ تعلیم کا مقصدِ اولین نہیں ہے۔ نہ اس قسم کی تعلیم صحیح معنی میں تعلیم کہلا سکتی ہے۔ یہ صحیح ہے۔ کہ نجار کو نجاری کا کام سیکھنا چاہیئے۔ ڈاکٹر کو طب کی تحصیل کرنی چاہیئے۔ اور کسان کو فنِ کاشتکاری کی تربیت حاصل کرنی چاہیئے۔ لیکن یہ نہ بھولنا چاہیئے۔ کہ انسان نجار۔ ڈاکٹر اور کسان ہونے سے پہلے اور مقدم طور پر "انسان" ہے۔ نجاری۔ طبابت اور کاشتکاری کے ساتھ ساتھ مسالے اور کاریگری۔ علم الامراض اور اراضی کی کیمیاوی معلومات کے ساتھ ساتھ اس کو مسائلِ زندگی یعنی دُنیائے زندہ کے مسائل کا سامنا بھی درپیش ہے۔ دُنیا کے نظامِ تقسیمِ عمل میں وہ "فردِ کاسب" ہونے کے ساتھ ہی ایک "زندہ ذہن" بھی ہے۔ وہ تمام ازمنہ کا وارث ہے۔ اور انسانیت کی اس پیچیدہ عضویت کا حاصل ہے۔ جسے ارتقا کا عمل حرکت دے رہا ہے۔ وہ حق رکھتا ہے۔ کہ اپنے انسانی ورثے

کو حاصل کرے۔ اور جہاں تک اس مسئلے کے مطابق ممکن ہو۔ اپنی قوتوں کو پوری حد تک ترقی دے۔ وہ مستقبل کا معمار ہے۔ اور انسانیت کے ایک شہری کی حیثیت سے اپنی استطاعت کے مطابق اس کی نشو ونما میں حصہ لے رہا ہے۔ "تعلیم" کا منشا یہ ہے۔ کہ ہر شخص کو عقلی فکر کے وسائل و اسالیب سے مطلع کر دیا جائے۔

اگر ہم اس مسئلے پر مفصل بحث کریں۔ کہ نئے افراد کو انسانی قوت کی اس منظم ترسیل سے بہرہ ور بنانے کے لئے کیا کچھ کرنا ضروری ہوگا۔ تو یہ بحث ہمارے موجودہ مقصد سے بالکل غیر متناسب ہوگی۔ میں یہ بات پڑھنے والوں پر چھوڑتا ہوں۔ کہ وہ تعلیم کے ایک حقیقی نظام کا خاکہ تیار کریں۔ جو تنظیم انسانی کی محض ایک فرونٹر پگڈنڈی نہ ہو۔ بلکہ اس کے عمل و سعی کا سب سے بڑا اور مقتدر دائرہ سمجھا جائے۔ جس میں پوری نسل انسانی کی حیثیت سے بچے کی نشو ونما اور اس کے ذہن کی ترقی کا کام کیا جائے۔ اور یہ کام ایسی فضا میں ہونا چاہئے۔ کہ صحت مندی اور حسن کے وہ تمام اثمات جو انسانی تخیل میں آسکیں۔ اس فضا میں موجود ہوں۔ سکولوں کو نسل انسانی کے معبد، محلات اور خزانے بنایا جائے اور ان کو نہایت محبت کے ساتھ اُن تمام حسین اور بیش بہا چیزوں سے آراستہ کیا جائے۔ جن کو انسانی فن اور دولت مہیا کر سکیں۔

ان میں بچے کے اندر صحت۔ کام اور فکر کا ضبط و نظم پیدا کیا جائے۔

ان میں بچے کو اُس کے مقررہ کام کی انتہائی عمدہ تربیت دی جائے۔ لیکن اولیں اور مقدم درجے پر اُس کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ "انسان" اور انسانیت کا شہری بن سکے۔

ان میں بچوں کو اپنی قوتوں اور اپنی عقلوں کا آزادانہ نشو و ارتقا

مشقت نہیں۔ بلکہ مسرت معلوم ہو۔ جن میں اُن کے ذہن کو ماہرانہ حقائق کی تدریس و تعلیم تمام حواس و مُدرکات سے دی جاتے۔ اور اس کے لئے خاص زندگی اور ماحول ہو۔ تصویری فن کاروں کے مجموعے ہوں۔ تھیٹر ہو۔ سینما ہو۔ موسیقی ہو۔ سفر و سیاحت کی مصروفیتیں ہوں۔ غیر اِذعانی موضوعات و مسائل پر تقریریں ہوں۔ اور بے شمار اور غیر محدود کتابوں تک رسائی بھی حاصل ہو۔ ان تمام چیزوں کے ساتھ روزانہ ارتباط سے وہ اکثر مضامین کی براہِ راست واقفیت اور بعض کا علم حاصل کر سکے گا۔ اور جہاں اُس کے ذہن کو لازمی اور نمایندہ دوائر کی تربیت حاصل ہوگی۔ وہاں وہ دوسرے دوائر سے بھی اجنبی نہ رہے گا۔

ان میں اگر طالب العلم کا رُجحان ہو۔ اور یہ چیز اُس کی زندگی کے مشغلے پر اثر انداز ہوتی ہو۔ تو وہ یونانی زبان کا علم عروض بھی سیکھ سکے گا لیکن ہر حالت میں یونانی وجدان اور اُس کی آزادی کے حُسن کا مطالعہ ضرور کرے گا۔ بلکہ اُن تمام ازمنہ و ادوار کی روحیت اور کامرانی کا علم بھی جس کا وہ خود وارث ہے۔ وہ معلوم کرے گا۔ کہ اُن زمانوں نے اُس کے لئے کیا کیا۔ اور اُس کے لئے کیا کیا وراثت چھوڑی ہے۔

ان میں وہ اپنی دُنیا کے متعلق کچھ معلومات حاصل کرے گا۔ دُوربین سے اس کی لا انتہا وسعت و عظمت کا مشاہدہ کرے گا۔ خوردبین سے اس کی باریک ترین تکمیل اور کاری گری دیکھے گا۔ زندگی اور اس کے وظائف کا علم حاصل کرے گا۔ اس کی مختلف شکلوں کے ارتقا کا معائنہ کرے گا۔ جس کے لئے سیر و سیاحت اور دوسرے مُلکوں کے بچّوں سے تبادلِ خیالات میں کچھ زمانہ بسر کرنا ہوگا۔ اگر وہ چاہیگا تو

یونان میں جاکر یونانی زبان اور فرانس میں جاکر فرانسیسی زبان اور دُوسرے ملکوں میں جاکر دوسرے ملکوں کی زبانیں سیکھ سکے گا۔

ان میں جب بچہ کسی قدر سیانا ہو جائے گا۔ اور پسند و انتخاب میں آزاد ہوگا۔ تو ہر قسم کے افکار و آرا کے نمایندے آزادانہ اپنی تعبیرات و تاویلات اس کے سامنے پیش کر سکیں گے۔

ان میں اُس کی قوتیں اپنے ہم جماعتوں کے درمیان اظہار و ابلاغ اور غور و بحث سے استعمال میں آئیں گی۔ اور پرکھی جائیں گی۔ مباحثہ کا کمرہ ہی امتحان کا کمرہ ہوگا۔ اسی طرح بچہ مسلسل و متواتر مدارج سے شہریوں اور قوموں کی کونسلوں تک پہنچ جائے گا۔

ان میں بچے کو ہر چیز مہیا ہوگی۔ اور قوم، جس کا وہ عزیز و محبوب وارث ہے۔ اُس کے کھانے۔ پہننے اور اُس کے آرام و آسائش کا شاہانہ انتظام کرے گی۔ لیکن وہ روزِ اول ہی سے اپنی مشقت اور اپنے کام سے برابر حصہ لے گا۔ اس کو ضبط و نظم اور جفاکشی کی عادتیں ڈالی جائیں گی۔ اور مسرّت و قوت کے متعلق بھی تربیت دی جائے گی۔

ان میں کام اور جسم و رُوح کی تربیت عناں در عناں چلیں گی۔ اور یہ تربیت صرف طفولیت ہی کے کسی عہد کے ساتھ ختم نہ ہو جائے گی۔ بلکہ زندگی بھر مہیا ہو سکے گی۔ اور اس کو ہمیشہ پسندیدہ بنایا جائے گا۔

ان میں شاگرد "ذلیل ترین کام" اور "بلند ترین فکر" کا عادی بنایا جائے گا۔ اور ان میں انسانی مساوات کے ایک ہی معنی معتبر سمجھے جائیں گے۔ یعنی آزادانہ نشو و ارتقا کا مساوی موقع ہر شخص کو حاصل ہونا چاہیے۔

انسانی دُنیا (ہماری تمام مجروح توقعات اور ہزیمت خوردہ حوصلوں کے باوجود) اب تک اپنے ممکنات اور روز افزوں جوہر کے اعتبار سے کافی بھرپور ہے۔ لیکن اس کے آیندہ نشو و ارتقا کے متعلق پیشگوئی کرنا ہمارے موجودہ دائرے سے باہر ہے۔ ہمارے پیش نظر صرف یہ کام رہا ہے کہ اس کے ماضی کی نشو و نما کا سراغ لگائیں۔ اور اس کی پیچیدہ اور ناہموار شکل میں سے اُن روز افزوں قوتوں کا پتہ چلائیں جو ہمیشہ ہلکے قدموں سے بڑھتی چلی آئیں۔ اور راحت اور مسرت دونوں حالتوں میں تخلیقی کام میں مصروف رہیں۔ دُنیا کئی پہلوؤں میں مخلصی اور احیا و تجدید کے لئے باواز بلند پکار رہی ہے۔ اور ان کے لئے پختہ بھی ہو چکی ہے۔ کیونکہ اس کے افکار اور اس کی ساخت کے بندھنوں کے درمیان بے آہنگی عدم مطابقت کی اس انتہا کو پہنچ گئی ہے۔ کہ اس کے بعد کامل استحالہ اور قلبِ ماہیت سے کم کوئی چیز ممکن نہ ہوگی ہم نے جو جائزہ لیا ہے۔ اس سے ایک نہایت واضح اور پُر نور سبق نمایاں ہے۔ گزشتہ ترقی کی رفتار کے ہر اہم قدم کی مانند، موجودہ و آیندہ مساعی کی کامیاب تکمیل انسانیت کے ذہنی ساز و سامان سے مشروط ہے۔ جس مرحلے میں اس کے ارتقائی مقاصد پہنچ چکے ہیں۔ اگر وہ آزمائش اور ناکامی کے طویل عمل میں صرف مراحل ہی کا حکم رکھتے ہیں۔ تو پہلی ناگزیر اصلاح (جو دوسری اصلاحات سے قبل یا اُن کے ساتھ ہی ساتھ ہونی چاہیئے) یہ ہے۔ کہ ایک منظم کوشش کی جائے۔ تاکہ انسان کی تمام حاصل کردہ قوتوں کو نہایت دیانت داری کے ساتھ تمام و کمال آیندہ نسل کے سپرد کیا جا سکے۔ اگر ایسا انتظام نہ کیا جا سکا۔ تو غار نشینی وحشت و بربریت برابر ہمارے شاملِ حال رہے گی۔ اور غیر مدفون"

جتاقی کے بوجھ کو اُتار پھینکنے کی تمام کوششیں لازماً بےنتیجہ اور غیر موثر رہیں گی۔ اور اگر ایسا انتظام ہو جاتے۔ تو صرف اسی کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ جتنی منازل مقصود کی طرف انسانیت پریشانی اور اُلجھن کے درمیان بڑھنے کے لئے کوشش کر رہی ہے۔ اُن میں سے نصف منزلیں خود بخود ہی طے ہو جائیں گی۔

(کلیمی تحریر نمود)